5180

سلسلہ مواعظ اشرفیہ (۵)

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ

OSMANIA BOOK DEPOT
عثمانیہ بک ڈپو
۱۰۲/۳ لوئر چیت پور روڈ
کلکتہ ۱
LOWER CHITPORE RD. CAL.

حقوق و فرائض

از افاضات

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح

مرتبہ

منشی عبد الرحمن خاں

شائع کردہ

مکتبہ اشرف المعارف چہلیک ملتان شہر

براہ کرم ورق نہ موڑیں

نقش جدید

بار اوّل ——— ۱۱۰۰

قیمت ——— چھ روپے ۱۲ آنے

تاریخ اشاعت ——— جون ۱۹۶۰ء

ناشر

مکتبہ اشرف المعارف، پھاٹک ملتان شہر

طابع

ویسٹ پنجاب پرنٹنگ پریس۔ لاہور

وما اموالكم ولا اولادكم
بالتي تقربكم عندنا زلفى الا
من امن وعمل صالحا

5180

HINDUSTANI LIBRARY:
Estd.
ہندستانی لائبریری
Garden Reach, Calcutta.

تمہارے مال اور تمہاری اولاد ایسی
نہیں، جو تم کو ہمارا مقرب بنائے
ہاں مگر جو ایمان لاوے اور بھلے کام کرے

براہ کرم ورق نہ موڑیں

ترتیب

5180

تفصیل

(۱)
حقوق القرآن

(۲)
آداب المساجد

(۳)

العبد الربانی

(۴)

علو العباد من علوم الارشاد

(۶)
خیر الارشاد فی حقوق العباد

(۷)

کف الاذیٰ

(۸)

اصلاح الیتامیٰ

(۱۳)

العُشر

حقوق القرآن

HINDUSTANI LIBRARY
Estd. 19??.
ہندستانی لائبریری
Garden Reach, Calcutta.

ترغیب تکمیل تعلیم قرآن کے متعلق یہ وعظ
۱۳ ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ یوم دوشنبہ کو
مدرسہ خادم العلوم شہر میرٹھ میں ہوا،
جسے حکیم محمد مصطفےٰ صاحب بجنوری نے
قلمبند کیا۔ ———————

تلاوت قرآن مجید کے تین مرتبے ہیں۔ ایک مرتبہ الفاظ ظاہری کا ہے یعنی ہر ہر حرف کو علیحدہ علیحدہ صاف صاف اور اپنے مخرج سے ادا کرنا اور ایک مرتبہ معنی کا ہے یعنی مدلول الفاظ کو سمجھ لینا، یہ مرتبہ حق باطنی کا ہے، اور ایک مرتبہ اس سے بھی ابطن ہے، وہ اس کے احکام پر عمل کرنا ہے، جب یہ تینوں باتیں جمع ہوں گی، تب کہا جائے گا کہ حق تلاوت ادا ہوا۔

براہ کرم ورق نہ موڑیں

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ و
نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ
فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ
لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ۔ اما بعد
فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ اَلَّذِیْنَ
اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ ۔ اُولٰٓئِکَ
یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ

HINDUSTANI LIBRARY:
Estd. 19..
ہندستانی لائبریری
Garden Reach, Calcutta.

ہندوستانی لائبریری
گارڈن ریچ روڈ۔ مٹیابرج۔ کلکتہ

تمہید

یہ آیت سورۂ بقر کی ہے، ترجمہ اس کا یہ ہے، کہ جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ حق ہے تلاوت کا، ایمان والے یہی ہیں، اور جو کتاب پہ ایمان نہ لائے وہ خسارہ والے ہیں۔

اس کی دو تفسیریں ہیں مگر دونوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ تلاوت کرنیوالوں کی مدح ہے اس آیت میں، ہر چند کہ کتاب سے مراد توریت ہے مگر ظاہر ہے کہ توریت کی تلاوت کے قابل مدح ہونے کا سبب توریت کا کتاب اللہ ہونا ہے، محض کتاب ہونا نہیں ہے اور چونکہ قرآن پاک افضل کتاب ہے تو اس کی تلاوت اور زیادہ قابل مدح ہوگی۔
اور اسی آیت سے اُس کی فضیلت بطریقِ اُولیٰ ثابت ہوگئی۔ چونکہ اس مدرسے کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے اس لئے بیان کے لئے یہ آیت زیادہ مناسب معلوم ہوئی۔ اس آیت سے قرآن مجید کی تلاوت کرنے کی اور اس کے حقوق ادا کرنے کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور یہ بات بدیہی ہے کہ تلاوت بلا سیکھے ہوئے اور پڑھے ہوئے کیسے ہو سکتی ہے۔ سیکھنا اور پڑھنا اس کا موقوف علیہ ہے اور مقدمہ ضروری کا ضروری ہوتا ہے۔ اگر آپ باورچی کو حکم دیں کہ کھانا پکاؤ، اُس کا مطلب صرف یہی نہیں کہ ہانڈی چولھے پر

رکھ کر آنچ دے۔ بلکہ بازار سے گوشت لا، اور مصالحہ لا، اور اناج لا اور پکانے کے برتن مہیا کر اور آگ جلا تب ہانڈی کو آنچ دے، چنانچہ کھانا پکانے کے حکم کے بعد باورچی کا ان سامانوں میں لگا رہنا آپ کے نزدیک اور کاموں کے نہ کرنے کا عذر سمجھا جاتا ہے اور ان کاموں میں اس کا لگا رہنا پکانے ہی کے حکم کی تعمیل سمجھا جاتا ہے۔ اگر اناج مثلاً نہ ہو اور وہ بیٹھا رہے اور یہی دقت پر عذر کرے تو یہ عذر اس کا آپ ہرگز نہ سنیں گے کہ حضور آپ نے مجھے صرف پکانے کا حکم دیا تھا یہ نہیں فرمایا تھا کہ اناج بھی منگانا۔ اس عذر کے نہ سننے کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ کسی چیز کا حکم اس کے اسباب و مقدمات کا بھی حکم ہے۔

الشیئ اذا ثبت بلوازمہ

بنا بریں تلاوت کتاب کا مطلوب ہونا اس کے سیکھنے اور پڑھنے کا بھی مطلوب ہونا ہے، جو فضیلت تلاوت کی ہوگی، اتنی ہی ضرورت سیکھنے کی بھی ہوگی۔ غرض قرآن شریف کا سیکھنا ضروری ہوا۔ اور دیکھئے حق سبحانہ تعالیٰ نے صرف یتلون نہیں فرمایا، بلکہ حق تلاوتہ کی قید بھی بڑھا دی اور اس میں اور اس میں بڑا فرق ہے۔ مثلاً ایک تو یوں کہیں کہ یہ کام کر لاؤ اور ایک یہ کہ یہ کام خوب سمجھ کر لاؤ۔ اس دوسرے لفظ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نفس کام کرنے سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ وہ من کل الوجوہ مکمل نہ ہو۔ اس سے نفس امر کی زیادہ تاکید ہو جاتی ہے تو آیت میں نفس تلاوت کی اور زیادہ تاکید ہو گئی۔ پھر نفس تلاوت میں تشدید ہو جانے سے اس کے مقدمہ یعنی سیکھنے کے حکم میں بھی تشدید ہو گئی۔ غرض قرآن شریف کا سیکھنا ضروری ہوا، پھر اتنا سیکھنا بھی کافی نہیں ہوگا کہ نفس تلاوت

کا ذریعہ ہو بلکہ اتنا سیکھنا چاہیے کہ حقِ تلاوت ادا ہو۔

تلاوت کی حقیقت

اب سمجھیے کہ حقِ تلاوت کیا ہے، ہمیشہ یاد رکھیے کہ جس چیز کی فضیلت بیان ہو، اور جس چیز کی برائی بیان ہو اس کی حقیقت سمجھ لینا چاہیے، اگر وہ چیز اپنی حقیقت پر ہے تو قابلِ فضیلت یا برائی ہے ورنہ نہیں۔ یہاں تلاوت کتاب اللہ کی فضیلت بیان ہوئی لہٰذا اس کی حقیقت سمجھ لیجیے کہ حق سبحانہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اتاری جو مجموعہ ہے علوم اور اخلاق اور قصص اور حکایات کا اور احکام کا اور جامع ہے تمام خوبیوں کو۔ قطع نظر تمام خوبیوں سے محض کلام اللہ ہی ہونا اس کا مقتضی ہے اس امر کا ہے کہ ہم جیسے ناچیز بندوں کی اس تک رسائی بھی نہ ہوتی، کہاں وہ کلامِ معظم کہاں ہم حقیر بندے۔ دیکھ لیجیے دنیا کے ذرا ذرا سے بادشاہوں کے دربار کی حاضری کے لیے لوگ کتنی کتنی کوششیں کرتے ہیں اور عمریں گزار دیتے ہیں تب کہیں کلام کرنے کا موقع ملتا ہے اور جس کو ایک دو بات کرنے کا موقع مل گیا وہ اپنے آپ کو کتنا کچھ سمجھنے لگتا ہے اور تمام سلطنت بھر میں اس کی کیا عزت ہو جاتی ہے۔ جب کلامِ شاہانِ دنیا کی یہ عزت ہے تو شاہِ شاہاں اور احکم الحاکمین کے کلام کی کیا کچھ عزت ہونی چاہیے، شاہانِ دنیا کا کلام دو چار برس کی تمنا اور کوشش کے بعد میسر ہوتا ہے تو کلامِ الٰہی کچھ بھی نہیں تو دو چار سو برس کی محنت کے بعد تو نصیب ہونا چاہیے۔ مگر نہیں کس درجہ رحمت ہے اللہ میاں کی کہ ہمارے ہاتھوں میں اپنی کتاب دے دی اور اذنِ عام دے دیا، کہ جس کا جس وقت

جی چاہے ہم سے باتیں کرے، پھر صرف اذن ہی نہیں بلکہ مطالبہ بھی ہے بندوں سے کہ باتیں کرو۔ اب ہم بندے اپنی ذلت اور احکم الحاکمین کی عزت کو پیش نظر کر کے دیکھیں کہ یہ باتیں کرنے کی فرمائش کیا چیز ہے سوائے اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا، کہ محض فضل ہے۔

حقوق کی حقیقت

معلوم ہو گیا ہو گا کہ تلاوت کتاب اللہ کی حقیقت اللہ میاں سے باتیں کرنا ہے۔ اب اس آیت میں فرماتے ہیں، کہ تم ہم سے باتیں تو کرو گے مگر قاعدے اور ادب کے ساتھ کرنا۔

یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ

ترکیبا تو اخبار ہے۔ مگر مقصود انشاء ہے یعنی تلاوت کرنے والوں کو چاہیے کہ تلاوت کے حقوق ادا کریں، جب تلاوت کی حقیقت معلوم ہو گئی تو اب سمجھ لیجیے کہ حقوق دو طرح کے ہوتے ہیں باطنی اور ظاہری۔ قربان جائیے تعلیم شریعت کے کہ اعمال میں صرف بناوٹ نہیں سکھلائی بلکہ ظاہری حقوق بھی بتائے اور باطنی بھی، اور باطنی کو ظاہری سے زیادہ ضروری رکھا مثلاً ماں باپ کے حق ظاہری کو فرمایا۔ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ

کہ ان کے سامنے پستی اختیار کرو۔ وضع میں قطع میں تکلم میں نشست و برخاست میں غرض ہر چیز میں ان سے تذلل برتو۔ کسی بات میں ان پر ترفع مت کرو، یہ تو حق ظاہری ہے، اور حق باطنی کو سبحان اللہ کیسے ذرا سے لفظ سے ادا فرما دیا

یعنی "مِنَ الرَّحْمَۃِ" یعنی اُن کے سامنے نری ظاہری پستی پہ اکتفا نہ کرو۔ اس کا کچھ اعتبار نہیں بلکہ اس ظاہری پستی کا منشا رحمت ہو۔ رحمت رقت قلب کو کہتے ہیں۔ یعنی ان کی خدمت دل سے کرو۔ جیسا کہ ظاہر ان کے سامنے پست کیا ہے باطن کو بھی پست کرو۔ دل کے اندر خشوع بھی ہو خضوع بھی ہو۔ قرآن میں کوئی ضروری بات چھوڑی نہیں جاتی۔ یہی خوبی ہے کلام اللہ کی تعلیم کی۔ کسی حکیم یا کسی فلسفی کی تعلیم میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ اور اس پہ بھی اکتفا نہیں کیا آگے فرماتے ہیں:

وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا

اوپر تو ان حقوق کا حکم تھا جن کی ادا کا علم والدین کو اور لوگوں کو وقت ادا ہو جائیگا۔ اور اس میں فرمادیا تھا کہ صرف ظاہری بناوٹ نہ ہو۔ ان کو بھی دل سے ادا کرو۔ یہاں حکم ہے اُن حقوق کو بھی ادا کرو جن کی اطلاع بھی نہ ہو۔ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا یعنی ان کے لئے دعا بھی کرو۔ یہ بھی ایک حق باطنی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ حق تین ہیں ظاہری اور باطنی اور ابطن اور تینوں قسموں کے ادا کا حکم ہے۔ اسی طرح حق خدمت بھی مختلف ہوتے ہیں۔ میں اُس کی ایک مثال دیتا ہوں۔ جس سے اچھی طرح توضیح ہو جائے گی۔ فرض کیجئے کہ بادشاہ کسی کے ہاتھ میں شاہی قانون دیکر کہے کہ اس کو پڑھو تو اس کی حالت پڑھنے کے وقت یہ ہوگی کہ ہر ہر لفظ کو صاف صاف پڑھیگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا پڑھنا بادشاہ کے ناپسند ہو اور اس کے معنی اور مفہوم کو بھی سمجھتا جائے گا۔ ایک تو اس خیال سے کہ عبارت کا لہجہ بلا معنی سمجھے ہوئے ٹھیک نہیں ہو سکتا اور ایک اس خیال سے

کہ شاید کہیں بادشاہ پوچھ بیٹھے کہ کیا مطلب سمجھا تو خفت نہ ہو۔ اور ایک حالت
پڑھنے والے کی یہ ہوگی کہ دل میں اس قانون کے احکام کی تعمیل کا بھی عزم ہوگا
اور یہ کسی قرینہ سے ظاہر نہ ہونے دے گا کہ میں اس کی پابندی میں کچھ کوتاہی
کرتا ہوں۔ بلکہ حال قال سے یہی ظاہر کرے گا کہ میں سب سے زیادہ تعمیل کرنے والا
ہوں۔ پس اس مثال کو ذہن میں حاضر رکھیئے اور سمجھیئے کہ قرآن مجید کی تلاوت میں
بھی اسی طرح کے تین مرتبے ہیں، ایک مرتبہ الفاظ ظاہری کا ہے، یعنی ہر ہر حرف
کو علیحدہ علیحدہ صاف صاف اور اپنے مخرج سے ادا کرنا اور ایک مرتبہ معنی کا
یعنی مدلول الفاظ کو سمجھ لینا۔ یہ نہیں کہ خیال کہیں ہے صرف طوطے کی طرح لفظ ادا
کر دیئے یہ مرتبہ حق باطنی کا ہے۔ اور ایک مرتبہ اس سے بھی ابطن ہے وہ اس کے
احکام پر عمل کرنا ہے۔ جب یہ تینوں باتیں جمع ہوں گی تب کہا جائیگا کہ حق تلاوت
کا ادا کیا۔ غرض کُل تین حق ہوئے۔ ایک حق ظاہری یعنی تلاوت، دوسرا حق باطنی
یعنی معنی سمجھ لینا، تیسرا عمل کرنا یہ بمقابلہ دوسرے کے بھی باطن ہے تو اس کو ابطن
کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ معاملہ فی ما بینہ، وبین اللہ ہے۔ ان تینوں میں وجوداً سب
سے مقدم حق ظاہری ہے اور موکد سب سے زیادہ تیسرا درجہ ہے یعنی عمل، ان
دونوں میں حقیقت اور صورۃ کا فرق ہے۔ اصل چیز حقیقت ہی ہوتی ہے لیکن
وجود اس کا لباس صورت میں ہوتا ہے اسی وجہ سے صورت مقدم ہوتی ہے اور
ضروری دونوں ہیں۔ پس حقیقت بلا صورت کے باطل ہے اور صورت بلا حقیقت
کے عاطلؔ۔ لہذا ثابت ہوا کہ عمل بھی ایک حق ضروری ہے۔ یہ نہیں کہ محض مرتبہ مستحب
ہی میں ہے۔ دیکھئے اللہ میاں نے آگے فرما دیا:

ع یعنی بیکار ۱۲.

أُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهٖ

جو لوگ تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں وہی ایمان رکھتے ہیں یعنی کامل ایمان انہی کا ہے پس عمل کو توقف علیہ ہے کمال ایمان کا اور کمال ایمان کی تحصیل واجب ہے. ضرور عمل بھی واجب ہوگا۔ کمال ایمان کا وجوب اس آیت میں صاف مصرح ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ ۝

اس میں صیغہ امر کا ہے اور امر وجوب کے لیے ہوتا ہے۔ اگر کوئی صاحب کہیں کہ آیت اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ دوسری آیت فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ سے منسوخ ہے تو سمجھ لیجئے کہ نسخ فرع ہے تعارض کی اور ان دونوں میں خود تعارض نہیں، بلکہ دوسری آیت پہلی کی موضح ہے، کیونکہ جب:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ

اتری تو صحابہؓ کو شبہ ہوا کہ امر کا ہے فور میں مستعمل ہوتا ہے اس آیت میں کہیں یہی مراد نہ ہو اور ایسے امر عظیم میں فور دشوار تھا اس لئے دوسری آیت میں مراد بیان فرما دی کہ تکلیف بقدر استطاعت ہے تدریجاً مامور بہ کو حاصل کر لو۔ اس کو بعض روایات میں نسخ سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ سلف کی اصطلاح اس لفظ میں اصطلاح مشہور سے عام تھی اور ہر چند کہ امر سے فور کا مفہوم ہونا موقوف قرینے پر ہے لیکن صحابہؓ کو بوجہ غلبۂ خشیت کے اس کا احتمال ہوا۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

با سایہ ترا نمی پسندم
عشق است و ہزار بدگمانی

اس توجیہ سے دونوں آیتوں میں تطبیق ہو گئی اور نسخ لازم نہ آیا۔

غرض حق تلاوت کا تیسرا درجہ مستحب نہیں بلکہ واجب ہے اس لئے جو سب سے فی الفور
نہیں تدریجاً ہے۔ مسلمان ہوتے ہی یہ فرض نہیں ہو جاتا کہ جملہ فروع ایمان پر اسی
ہو جائے اور نہ ہی یہ فرض ہو جاتا ہے کہ قرآن شریف کے تینوں حق فوراً ہی ادا کرے
بلکہ مہلت دی گئی ہے کہ اس میں سیکھ لینا چاہئے، البتہ یہ جائز نہیں کہ بالکل بیٹھ رہے
اور کمال کی طرف توجہ نہ کرے۔

ترتیل کے معنے

غرض حق ظاہری تو یہ ہے کہ ترتیل کے ساتھ پڑھا جائے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ترتیل کی یہ تفسیر منقول ہے:

تجوید الحروف ومعرفة الوقوف

ترتیل اس کو کہتے ہیں۔ پھر ہم آج کل کی حالت دیکھتے ہیں کہ ہمارے امام جن کو بڑی بڑی جماعتیں میں منتخب کرکے مقرر کرتے ہیں وہ بھی قرآن صحیح نہیں پڑھتے، اس سے تمام مسلمانوں کے پڑھنے کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب امام جو کہ ہم میں افضل الناس اور منتخب ہیں وہی غلط پڑھتے ہیں تو عام لوگ کیا صحیح پڑھتے ہوں گے۔ اس ظاہری حق کی ادائی یہ کیفیت ہے، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترتیل سکھائی ہے اور وہی آج تک چلی آ رہی ہے اور حضور کا سکھانا باری تعالیٰ کی تعلیم ہے اسی کو کہا ہے ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

اور حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۔

یعنی آپ کی زبان سے کوئی بات اپنی طرف سے نہیں نکلتی اس دلیل سے ترتیل باری تعالیٰ کی سکھلائی ہوئی ٹھہری۔ پھر اس نعمت عظمیٰ کی کیا ہی قدر ہے کہ اس کو اس طرح سے غارت کیا جائے۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ کو تو اس کا اتنا اہتمام کہ حدیث میں ہے:

لَا يَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِيْ مَنْصُوْرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ ۔

میری امت میں ایک گروہ حق پر ہمیشہ کامیاب رہیگا۔ کہ اس کو کسی کے ساتھ چھوڑ دینے سے نقصان نہ پہنچے گا۔ اس گروہ میں تمام وہ لوگ داخل ہیں، جو دین کی کسی قسم کی علمی یا عملی خدمت کر رہے ہیں۔ اسی میں علوم قرآن کی خدمت بھی آگئی پس اس میں خادمانِ قرآن کے قائم رکھنے کا وعدہ ہے اور خود قرآن میں بھی وعدہ فرمایا گیا ہے:

وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○

کہ ہم خود اس کے محافظ ہیں۔ اور یہ بڑی بات ہے کہ اللہ میاں نے کسی تالے میں بند کر کے تو اس کی حفاظت نہیں کی۔ اللہ میاں کی حفاظت کی صورت یہی ہے کہ اپنے چند بندوں کو اس کام پر تعینات رکھیں گے۔ معلوم ہوا کہ ہمیشہ ایک گروہ ایسا رہے گا کہ تصوف پڑھے پڑھائیگا اور ایک گروہ ایسا بھی رہیگا کہ فقہ سکھائیگا۔ اور ایک گروہ ایسا بھی رہیگا کہ حدیث شریف کی خدمت کرے گا، اور ایک گروہ ایسا بھی رہیگا کہ تفسیر کا مشغلہ رکھے گا۔ اور ان کے ساتھ ایک گروہ ایسا بھی

رہے گا کہ قرآن شریف پڑھیگا اور قرأت کا محافظ ہوگا۔ غرض حق سبحانہٗ تعالیٰ کو تو اس کا اہتمام۔ اتنا اور ان کے بندوں کو اتنی بے پروائی کہ مسلمانوں میں ہزار بھی ایک قاری نہیں، افسوس کہ اس طرف توجہ ہی نہیں رہی اور اگر کوئی توجہ بھی کرتا ہے تو اس کی بڑی دوڑ یہ ہوتی ہے کہ ضاد اور ظاء کا مباحثہ شروع کر دیا، اس میں رسالے لکھے جا رہے ہیں اور کتابیں تصنیف ہو رہی ہیں، علماء کے پاس استفتے بھیجے جاتے ہیں اور اکثر تو یہی دیکھا ہے کہ اکثر اس پوچھنے سے اصلی غرض صرف اپنی بات اونچی کرنی ہوتی ہے، تحقیق کسی کو مقصود نہیں ہوتی، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے جھگڑا کرنے والے دور ہی سے استفتے بھیجتے ہیں، یہ توفیق نہیں ہوتی کہ تھوڑا خرچ گوارا کر کے دونوں کسی ماہر کے پاس چلے جائیں اور اس حرف کو صحیح طور پر سیکھ لیں، میں کہتا ہوں اس استفتے کے جواب میں مجیب کیا لکھے گا سوائے اس کے کہ مخرج بیان کر دے سو یہ تو کتابوں میں بھی لکھا ہے۔ پھر جو اختلاف اور نزاع باوجود کتاب میں مخرج لکھے ہونے کے ہوا ہے وہی اس فتوے کے بعد بھی ہوگا، کیونکہ مفتی ضاد کی صوت کو کاغذ پر نہیں لکھ سکتا ؎

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید
لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید

علمِ موسیقی اور قرأت میں تو سننے ہی کی ضرورت ہے لکھ بھیجنے سے کیا ہوتا ہے، صوت کی صورت کاغذ پر کیسے آسکتی ہے، بعض لوگ فنِ قراءت کو حاصل نہ کرنے کا یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ ہم قاری تو ہونے سے رہے، پھر اس کے پیچھے کیوں پڑتے ہو۔ کام ہو تو پوری طرح ہو نہیں تو چھیڑنا فضول۔

صاحبو! یہ محض حیلۂ نفس ہے، اگر قرأت میں عاصمؒ اور حفصؒ نہیں ہو جاؤ گے تو اچھا فقہ میں بھی تو ابو حنیفہؒ نہیں ہو جاتے پھر فقہ کیوں پڑھتے ہو، اور دنیا میں بھی ہر شخص بادشاہ نہیں ہو جاتا پھر دنیا کی طلب کیوں کرتے ہو۔ اس میں یہ قاعدہ جاری نہیں کرتے کہ کام ہو تو پوری طرح ہو ورنہ چھیڑنا فضول ہے۔

تجوید قرآن کی مقدار

صاحبو! قرأت میں عاصمؒ اور حفصؒ ہونے کی اور فقہ میں ابو حنیفہؒ ہونے کی تکلیف آپ کو نہیں دی جاتی، صرف اس قدر تکلیف دی جاتی ہے کہ بقدر وسعت کوشش کرو اور بقدر ضرورت، قرآن شریف کو صحیح کرلو۔ اگر آپ اپنی حیثیت کے مطابق کوشش کریں تو قدر ضروری تو حاصل ہو جائے گا۔ بالفرض اگر کوشش پر کامیابی بھی نہ ہو تب بھی کچھ غم نہیں، اللہ میاں کے یہاں تو زمرۂ قراء میں لکھ لیے جاؤ گے۔ کسی کا قول ہے ؎

ہمینم بس کہ داند ماہ رویم
کہ من نیز از خریداران اویم

میں نے اپنے ایک بزرگ سے سنا کہ فرماتے تھے طلب مقصود ہے وصول مقصود نہیں، اور ظاہر بھی ہے کہ اللہ میاں نے تکلیف مالا یطاق نہیں دی صرف امور اختیاریہ کی تکلیف دی ہے اور مقصود تک پہنچ جانا بندے کے اختیار میں ہے نہیں تو اس کی تکلیف کیوں ہوگی۔

کیا اچھا کہا ہے ؎

ہندوستانی لائبریری
گارڈن ریچ روڈ۔ مٹیا برج۔ کلکتہ

گر مرادت را مذاقِ شکر ست
نامرادی نے مرادِ دلبر ست

اور رہا جو ضروری قرأت تو کچھ مشکل بھی نہیں کُل اٹھائیس حرف ہیں، اگر ایک ایک دن میں ایک ایک حرف سیکھے تب اٹھائیس دن میں بقدرِ ضروری قاری بن سکتا ہے، مگر بات یہ ہے کہ شیطان نے رہزنی کر رکھی ہے، جب کوئی اس کا ارادہ کرتا ہے، تب ہی وہ کہہ دیتا ہے میاں قرأت کہیں تمہارے بس کی ہے، جب کسی سے کہا جاتا ہے قرآن شریف صحیح کرو تو کہتے ہیں ہم بڈھے طوطے ہیں اب ہماری زبان کہیں ٹوٹ سکتی ہے، اچھا صاحب آپ تو بڈھے طوطے ہیں، بھلا اولاد نے کیا قصور کیا، ان کو کیوں نہیں سکھاتے؟ یاد رکھو جیسے اولاد کے اور حقوق آپ پر ہیں ویسے ہی یہ بھی حق ہے، اگر آپ نے یہ حق ادا نہ کیا، اور وہ تمام عمر قرآن شریف غلط پڑھتے رہے تو اس کی جوابدہی آپ کے ذمہ ہوگی۔

لوگوں کے حیلے

لیکن قرآن کی طرف توجہ ہی نہیں، قرأت تو درکنار اس کا تو پڑھنا بھی بہت کم ہوتا جاتا ہے، بعضے کہتے ہیں اس سے دماغ خراب ہوتا ہے، انگریزی کے قابل نہیں رہتا، بعض کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جب سمجھ میں نہ آیا تو نرے پڑھنے سے کیا فائدہ۔ میں کہتا ہوں کیا فائدہ سمجھنے ہی میں منحصر ہے، بس فائدے کا ایک ہی مصداق ہے کیا اور کوئی مصداق نہیں۔ یاد رکھو اس کے بلا سمجھے ہوئے پڑھنے میں بھی فائدہ ہے، جس کی خبر حدیث شریف میں ہے کہ ہر حرف پر

دس نیکیاں ملتی ہیں تو کیا نیکیاں ملنا فائدہ نہیں ہے، اور دوسرا فائدہ وہ ہے جو دوسری حدیث شریف میں ہے

مَا اَذِنَ اللّٰہُ لِشَیۡءٍ مَا اَذِنَ لِنَبِیٍّ یَتَغَنّٰی بِالۡقُرۡاٰنِ

یعنی اللہ میاں کسی چیز کو ایسا کان لگا کر نہیں سنتے جیسا کہ قرآن شریف کو سنتے ہیں جب کہ اس کو نبی خوش آوازی سے پڑھتے ہوں۔ اس میں نبی کی تخصیص اتفاقی ہے اور تغنی کی تفسیر خود روایات میں آئی ہے کہ خشوع سے پڑھتا ہو۔ تو کیا خدا تعالیٰ کا متوجہ ہونا بندہ کی طرف بے فائدہ نہیں ہے۔

ایک قصہ یاد آیا میرے مرشد علیہ الرحمۃ فرماتے تھے کہ ایک بار دہلی میں ایک دوکان پر گذر ہوا تو کیا دیکھتے ہیں ایک ہجوم ہو رہا ہے اور درمیان میں ایک شخص بیٹھا ہوا رسالہ درد نامہ جو حضرت مرشد کا کلام ہے ذوق شوق سے پڑھ رہا ہے۔ حضرت بھی اس کو سننے کے لئے کھڑے ہو گئے اور خوش ہوئے۔ ایسا ہی واقعہ ایک بار پانی پت کو جاتے ہوئے راہ میں پیش آیا۔ غرض قاعدہ ہے کہ مصنف جب کسی کو اپنی تصنیف پڑھتے دیکھتا ہے تو خوش ہوتا ہے اور اس طرف متوجہ ہوتا ہے۔ قرآن شریف کیا ہے حق سبحانہ کی تصنیف ہے، جب یہ پڑھا جاتا ہے تو حق تعالےٰ متوجہ ہوتے ہیں کہ میرا بندہ میری تصنیف پڑھ رہا ہے، اگر کچھ بھی نہ ہو تو یہ کیا کم ہے کہ اللہ میاں کی خوشنودی ہوتی ہے۔ ذرا ذرا سے حکام کی خوشنودی کے لئے لوگ کیا کیا کلفتیں گوارا کرتے ہیں اور کتنے کتنے خرچ کے متحمل ہوتے ہیں، کہیں ڈالیاں بھیجی جاتی ہیں، کہیں دعوتیں ہوتی ہیں اپنے بہت کام حرج کئے جاتے ہیں، کیا حق سبحانہ تعالیٰ کا اتنا بھی حق نہیں۔ اس غلطی میں بہت سے لوگ مبتلا ہیں

کہ فائدہ کو منحصر جان لیا ہے معانی کے سمجھنے میں اسی وجہ سے کہہ دیتے ہیں، کہ بچوں کو قرآن شریف پڑھانے سے کیا فائدہ بس پڑھانا ہی چھوڑ دیا، اگر کسی نے پڑھا بھی لیکن حفظ کرنے کا رواج چھوڑ دیا، اکثر دیکھا گیا ہے کہ قرآن کو چھوڑ کر لوگ وظیفوں پہ مرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے تسخیر کا کوئی عمل بتلایئے، کوئی کہتا ہے دست غیب کی ترکیب بتا دیجئے، کوئی کہتا ہے اولاد ہونے کے لئے کوئی نقش کر دیجئے، غرض وظیفوں کو بہت سہل پا لیا ہے، ساری دنیا کے کام وظیفوں ہی سے بیٹھے بیٹھے ہو سکتے ہیں میں کہتا ہوں اگر یہی بات ہے تو کھاؤ پیو بھی مت، نکاح بھی نہ کرو۔ نوکری چاکری کے جھگڑے میں بھی مت پڑو۔ وظیفوں ہی سے پیٹ بھی بھر جائے گا اور انہی سے اولاد بھی ہو جائے گی اور انہی سے گھر بیٹھے روپے مل جایا کریں گے۔ آپ یہ کہیں گے کہ اللہ میاں کے نام میں تو بڑے بڑے اثر ہیں۔ اس کے جواب میں میں کہتا ہوں کہ غور کر کے دیکھئے کہ آج کل وظیفوں کی طرف زیادہ میلان کا سبب اللہ میاں کے نام کی عظمت نہیں ہے بلکہ اس کا سبب صرف کم ہمتی ہے۔ جو لوگ اپنی عمر ابتداء میں لہو ولعب میں برباد کر دیتے ہیں، جب بار اپنے سر پر پڑتا ہے اس وقت حسرت وندامت ہوتی ہے کہ اس عمر میں کوئی بھی کمال حاصل نہیں کیا جو اب کام دیتا اور ضرورت سر پر آ ہی پڑتی ہے، اس لئے چاروں طرف نظر دوڑتی ہے اور ہر کام مشکل اور اختیار سے خارج نظر آتا ہے۔ پس اگر کوئی چیز سہل اور اپنے اختیار میں دکھائی پڑتی ہے تو وہ عمل ہے کہ اس میں نہ کسی کی خوشامد ہے، نہ کوئی امتحان دینا ہے، نہ کچھ خرچ ہے، زبان کا کام ہے تھوڑی سی تکلیف گوارا کر کے پڑھ سکتے ہیں، پس یہ وجہ ہے عمل کی طرف میلان کی۔ اور اگر یا اس کی وجہ عظمت

[illegible] اللہ ہوتی تو [illegible] بڑا وظیفہ [illegible] سے مفید عمل وہ سمجھتے جس کو اللہ
[illegible] نے نازل فرمایا، یعنی قرآن پاک

شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ اور رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ

خود باری تعالیٰ نے ہی اس کی شان میں فرمایا ہے، مگر نہیں تھی۔ تحقیقت وجہ وہی ہے جو میں نے عرض کی۔ اسی واسطے ان عملیات سے بھی اجتناب نہیں ہوتا جو خلاف شرع ہیں۔ خوب یاد رکھئے کہ عملیات میں زیادہ پڑنے میں بہت سے مفاسد ہیں، جس کو دست غیب کہتے ہیں اس طریق سے روپیہ حاصل کرنا حرام ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوا کہ اس عمل کی حقیقت یہ ہے کہ جن تابع ہو جاتے ہیں، وہ روپیہ چورا چرا کر لا دیتے ہیں، یہ ایسا ہے جیسے چند بدمعاش کوئی نوکر رکھ لے اور ان سے چوری کرایا کرے۔ اور اگر کوئی ایسا عمل ہو کہ اس میں وہ اپنے ہی پاس سے لاتے ہوں تو یہ جبر اور غصب ہے کہ ان کا مال جبراً عامل لوگ لے لیتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے عملیات میں خرابیاں ہیں۔ سب سے بہتر اور سہل عمل تو دعا ہے اسے کیوں نہ اختیار کیا، حق تعالیٰ کی اجازت ہے کہ جس کام کے لئے چاہو دعا کرو (بشرطیکہ وہ کام ناجائز نہ ہو) بلکہ دعا نہ کرنا باعث عتاب ہے۔ اگر وظیفوں ہی کا شوق تھا تو قرآن شریف پڑھ پڑھ کر حق تعالیٰ سے دعا مانگی ہوتی، سب سے بڑا وظیفہ یہ تھا جس میں کوئی محذور لازم نہیں آتا۔ مگر افسوس جو لوگ قرآن شریف بھی پڑھتے ہیں ان کی نیت درست نہیں ہوتی۔ ایک شخص نے خواب میں دیکھا، کہ میں مسجد میں قضائے حاجت کر رہا ہوں، یہ خواب ایک بزرگ سے بیان کیا،

فرمایا معلوم ہوتا ہے کہ تم کوئی عمل دنیا کے لئے مجھ سے پڑھتے ہو، غرض ہر کام کے لئے وظیفوں کو بہت سہل پالیا ہے، اس کی وجہ صرف کم ہمتی ہے، دنیا کے لئے بڑی ہمت کی تو وظیفے پڑھ لئے اور دین کے لئے ہمت کی تو کہتے ہیں کہ صاحب کچھ سینے میں سے دلوائیے۔ سینہ کوئی خزینہ ہے اس میں ہاتھ ڈالا اور جو چاہا نکال کر دے دیا، اور اگر دیا بھی جائے تو اسے رکھے گا کون جو چیز بے محنت ملتی ہے اس کی قدر نہیں ہوتی۔

ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد
گوہرے طفلے بقرصِ ناں دہد

جو طریقہ ہے حاصل کرنے کا اُس طرح حاصل کرو، دنیا حاصل کرو تدبیر مشروع سے، دین حاصل کرو علم و عمل سے جس کی فرد اعظم قرآن ہے، جس کو چھوڑ ہی دیا۔

آج کل قرآن کا مصرف

ایک اس کام کے لئے قرآن شریف رہ گیا ہے کہ جب کسی کے یہاں بچہ ہوا تو اس میں سے نام نکال لیا کہ سات ورق الٹ کر ساتویں سطر میں دیکھ لیا، اگر شروع میں الف ہوا تو اللہ بخش اور خ ہوا تو خدا بخش اور ر ہوا، تو رمضان اور ع ہوا تو عید و نام رکھ لیا، کہ بڑا متبرک نام ہے، اللہ میاں کے کلام میں نازل ہوا ہے۔

ایک اس کام کے لئے رہ گیا ہے کہ جب کوئی مرا تو تیجہ میں پڑھوا دیا، مٹھی

مٹھی بھر چنوں کے لالچ میں کیسی گت قرآن شریف کی بنتی ہے، بہت سے پڑھنے کے لیے بے وضو ہو جاتے ہیں۔ بہت سے صرف پابندی رسم کی نیت سے شریک ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی نہ آئے شکایت ہوتی ہے اور اگر آجائے اور عذر کرکے جائے تو شکایت نہیں رہتی۔ معلوم ہوا کہ پڑھنا غرض نہیں صرف رفع شکایت منظور ہے۔ بہت جگہ نقد اجرت دیکر پڑھوایا جاتا ہے، حالانکہ اجرت علی العبادت حرام ہے۔

آپ شاید کہیں گے کہ یہ مولوی لوگ ایصال ثواب سے منع کرتے ہیں میں کہتا ہوں کہ بعض اوقات آپ بھی تو نماز سے منع کرتے ہیں حالانکہ افضل اعمال ہے، میں آپ سے استفسار کرتا ہوں کہ عین دوپہر کے وقت نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور قبلہ کی طرف پشت کرکے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور حیض کے زمانہ میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور جنابت کے ساتھ نماز پڑھنا کیسا ہے؟ سب کا جواب یہ ہے، کہ لایجوز[لہ] لایجوز۔ میں کہتا ہوں آپ نماز سے منع کرتے ہیں، بس ایسے ہی ہم بھی رسموں سے منع کرتے ہیں، اجی جانتے سب ہیں کہ رسموں میں یہ یہ خرابیاں ہیں، مگر کسی بات کا رواج پاجانے کے بعد چھوڑنا مشکل ہوتا ہے نیز رسموں میں ظاہری رونق بھی ہے اور ان کے چھوڑنے سے سادگی لازمی ہے اس لئے بھی چھوڑنا مشکل ہے۔ شادی میں ناچ گانا نہ ہو تو کہتے ہیں چلو بھائی چنے پڑھ آویں، یہ اللہ والوں کی شادی ہے یہ خطاب ہم کو تو بسر وچشم قبول ہے ؎

ما اگر قلاشیم و گر دیوانہ ایم
مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

لہ۔ جائز نہیں ۱۲

اور آپ کے اس طعن کا جواب لور بھی ہے مگر تہذیب سے خارج ہے میں دینا نہیں چاہتا۔

شرطِ تبلیغ

بلکہ بجائے ان لوگوں کو جواب دینے کے اپنے ہی لوگوں کو کہتا ہوں کہ منکرات کو منع تو کریں مگر اس طرح کہ نفسانیت کو دخل نہ ہونے پائے، پھر انشاء اللہ ضرور اثر ہوگا کسی پر انکار کرنے کا مضائقہ نہیں ہاں اتنا ہو کہ خلوص ہو، مگر یہ مرض عام ہو چلا ہے، کہ تقوے کی صورت میں نفسانیت کو ادا کرتے ہیں، علماء کو چاہئے اس سے محفوظ رہیں۔

آج کل دیکھا جاتا ہے کہ جس طرح منع کرنے والے تقوے کی صورت میں نفسانیت کو برتتے ہیں اسی طرح تداعی الی الخیر میں خوشامد کی جاتی ہے، مدرسے میں جس کا چندہ داخل ہے اس کا مدرسین اور طلبہ سب دبے جاتے ہیں، سلام اور مزاج پرسی کیلئے جاتے ہیں، بات بات پر ان کی بے جا مدح کی جاتی ہے حالانکہ اس خوشامد کی ضرورت نہیں، یہ کچھ مدرسین کا ذاتی کام تو نہیں ہے، یہ کام تو ہو ہی گا، یہ نہ کریں گے تو کوئی اور کرے گا، وہ نہ کریں گے کوئی اور کرے گا۔

میں سچ عرض کرتا ہوں علماء کو استغناء کی ضرورت ہے کسی کی خوشامد کی ضرورت نہیں، کوئی اس خیال میں نہ رہے کہ ہم پیچھے ہٹ گئے تو یہ کام بند ہو جائے گا۔

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ

اگر تم منہ پھیروگے تو تمہاری جگہ دوسری قوم کو کھڑا کریں گے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ علماء کو احتیاج نہیں ہاں اس احتیاج کو کسی کے سامنے لے جانے کی ضرورت نہیں، یہ کام دین کا ہے اور دین کے اللہ میاں کفیل ہیں، میں بد خلقی نہیں سکھاتا ہوں، خلق ضروری چیز ہے اور ہر شخص سے نرمی کے ساتھ پیش آئیں مگر ان کے اموال پر نظر نہ رکھیں اور کسی خاص شخص کی اعانت کو دین کا موقوف علیہ نہ سمجھیں، البتہ ترغیب اور اظہار ضرورت کا مضائقہ نہیں یہ طریقہ مسنون ہے۔

اس میں راز یہ ہے کہ فی الحقیقت کام کے کفیل اللہ میاں ہیں اور ظاہری صورت اس کی تکمیل کی یہ رکھی گئی ہے کہ بندے ایک دوسرے کی اعانت کریں اور اس کو انجام دیں۔ اگر بندوں کو اطلاع نہ ہوگی تو وہ کیوں کر شریک ہوں گے۔ یہ ضرورت ان کو اطلاع دینے کی ہے، اطلاع نہ کرنے میں صورت کام کو بگاڑ دینا ہے اور خوشامد کرنے میں بندوں پر تکیہ لازم آتا ہے، اس میں حقیقتاً کام کو بگاڑنا ہے اس وجہ سے خوشامد سے منع کیا جاتا ہے، غرض محض اگر کوئی ظاہراً معین ہوتا ہے وہ اعانت بھی در حقیقت کارساز حقیقی ہی کی اعانت ہے ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

بد خلقی اور استغنا کا فرق

اس لئے کہا جاتا ہے کہ خوشامد نہ کرو اور یہ بد خلقی نہیں، بد خلقی اور چیز ہے اور

استغناء اور چیز۔ بدخلقی تو دوسرے کے حقوق ادا نہ کرنا ہے اور استغناء اپنے حقوق دوسرے کے سامنے نہ لے جانا۔ آج کل اس کی احتیاط بہت کم لوگ کرتے ہیں جو اپنی احتیاج لوگوں کے سامنے لے جاتے ہیں اور اس کا بھی لحاظ نہیں رکھتے کہ وہ لوگ اس کے اہل ہیں یا نہیں۔ بہت سے امراء فاسق و فاجر ہوتے ہیں اور ان اہل غرض کو ان کا فسق و فجور دیکھنا پڑتا ہے اور چونکہ حاجت مند بن گئے ہیں کان نہیں ہلا سکتے۔ یاد رکھو کہ باوجود قدرت کے منکر کی تغییر نہ کرنا اور سکوت کرنا اس میں شامل ہونا ہے۔ حدیث شریف [illegible] علیہ السلام کو ایک گاؤں کی نسبت حکم ہوا کہ اس گاؤں کو الٹ دو۔ عرض کیا یا اللہ اس میں ایک ایسا آدمی بھی ہے جس نے کبھی گناہ نہیں کیا، کیا حکم ہے اس کے سمیت الٹ دوں؟ حکم ہوا ہاں۔ اگرچہ اس نے گناہ نہیں کیا لیکن

لَمْ يَتَمَعَّرْ فِي وَجْهِهِ قَطُّ

یعنی ہماری نافرمانی دیکھتا تھا اور کبھی اس کی پیشانی پر بل نہیں پڑا۔ یہ وبال ہے منکر پر سکوت کرنے کا۔ اس پر بعض پڑھے لکھے لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ سکوت میں مصلحت ہے اس سے چندہ ملتا ہے۔ کیوں صاحب! کیا اس کے چندے پر اللہ میاں کا کام موقوف ہے؟ اللہ میاں خود ذمہ دار ہیں پھر وہ مصلحت کیا ہے۔

خلیل آسا در ملک یقین زن!
ندائے لا احب الآفلین زن!

دین کے کام تو اللہ میاں بناتے ہیں۔ یہ اللہ کا کام کیا بنائیں گے۔ میں یقین

براہ کرم ورق نہ موڑیں

کے ساتھ کہتا ہوں کہ علماء کو استغناء کی ضرورت ہے اسی کو چھوڑ کر اپنی وقعت کھو دی ہے۔ اور طرح طرح کی خرابیاں مول لے لی ہیں۔ جب اہل دنیا ان سے کھنچتے ہیں تو یہ کیوں اُن کی طرف جھکیں۔

میں نے مولویوں کو خطاب کیا حالانکہ وہ خود زیادہ جانتے ہیں، اس واسطے کہ اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مولویوں کو چاہئے کہ اہل دنیا سے استغناء برتیں، ہاں اس کی بناء نفسانیت اور ترفع نہ ہو اور اپنے کام کو خلوص سے کریں، اور کسی کو دخل نہ دیں۔ دخل نہ دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قاعدے کے بھی پابند نہ ہوں، بلکہ ان قواعد کے انضباط میں ہر کس و ناکس کی رائے محض اس وجہ سے کہ چندے میں شریک ہے لینے کی ضرورت نہیں۔ آج کل یہ بھی ایک خبط ہو گیا ہے کہ ہر چندہ دینے والے کو یہ حوصلہ ہے کہ میری رائے کیوں نہیں لی جاتی۔ میں انضباط قواعد کا راز بتلائے دیتا ہوں، جس سے انشاء اللہ بخوبی واضح ہو جائے گا کہ ہر شخص کی رائے لینا کیوں مناسب نہیں۔ سنئے دو قسم کی چیزیں ہوا کرتی ہیں، ایک آلات و ذرائع، دوسری مقاصد۔ مقاصد مقصود بالذات ہوتے ہیں، اور آلات صرف:

— من وجهة الایصال الی المقصود

مقصود ہوتے ہیں، خود مقصود نہیں ہوتے۔ اب میں کہتا ہوں کہ مدرسوں کیلئے جو قواعد منضبط کئے جاتے ہیں یہ قواعد مقاصد نہیں ہیں۔ یہ صرف اس واسطے ہیں کہ درس کا انتظام ہے، تو گویا یہ درس کے لئے آلات ہیں اور مقصود اصلی درس ہے اب میں ایک مثال میں پوچھتا ہوں کہ بڑھئی کا کام جاننے والا بڑھئی

کے اوزاروں کی تعداد اچھی طرح جان سکتا ہے یا اور کوئی پڑھا لکھا قابل آدمی؟
اس کا جواب یہی ہے کہ بڑھئی ہی جان سکتا ہے۔ بس افسوس ہے کہ بڑھئی کے
آلات کے انتخاب کے لئے تو بڑھئی ہی کی ضرورت ہے اور دیگر بڑے بڑے
علوم کی قابلیت کچھ کام نہیں آتی۔ اور علم دین کے آلات کے انتخاب کیلئے
علماء کی ضرورت نہیں اور ہر چھوٹے سے چھوٹے علم اور پیشہ کی قابلیت اس میں
رائے دینے کے لئے کافی ہے۔ علماء کو ان کے کام میں ان کی رائے پر چھوڑ دو وہی
درس کرتے ہیں اور وہی اس کی ضروریات کو سمجھ سکتے ہیں۔ بلکہ تم ان سے یہ کام لو
کہ پڑھنے کا طریقہ سیکھو۔ دین کی جو باتیں بتائیں اس کے موافق عمل کرو۔ جس طرح
قرآن شریف پڑھائیں اسی طرح پڑھو۔ جو جو حق اس کے بتائیں ان کو ادا کرو۔

قرآن مجید کی بے قدری

ایک کام عورتوں نے قرآن مجید سے لیا ہے کہ چادر میں رکھ کر دو عورتوں
نے اس چادر کو پکڑ لیا اور بچے کو اس کے نیچے سے نکال دیا کہ جملہ بلاؤں کی حفاظت
ہو جاتی ہے۔ اب نہ اس پر جادو چل سکتا ہے نہ نظر لگ سکتی ہے اور نہ کوئی
اور آفت آ سکتی ہے۔ یوں کہتی ہیں کہ اللہ میاں کے نام کی برکت سے جو کچھ
ہو کم ہے۔ جیسے دعائے گنج العرش جو کوئی بازو پر باندھ لے اس پر تلوار اثر کرے
نہ پانی میں ڈوبے نہ آگ میں جلے نہ سولی پر چڑھے۔ دعائے گنج العرش باندھ
کر چوری کیا کرو۔ خوب بے دھڑک ہو کر جو چاہو سو کیا کرو۔ کیونکہ کوئی آفت
تو آنے ہی کی نہیں۔! انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ایک کام قرآن شریف سے چھاپہ خانہ والوں نے لیا ہے کہ اس کو فوٹو کے ذریعہ سے اتنا چھوٹا کر لیا کہ بلا شیشے کے پڑھا نہیں جا سکتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چھوٹا قرآن شریف ایک شخص کے پاس دیکھا تو اس کو درّے سے مارا کہ قرآن شریف کی توہین کرتا ہے اور فرمایا کہ ایک ایک حرف الگ الگ لکھو اور صاف صاف چمکتا ہوا لکھو اور اس کو بڑا کمال سمجھ کر شائع کیا جاتا ہے کہ لو اب تمام عملیات اور تعویذوں کا اصل اصول ہی ایک تعویذ کی صورت میں آگیا۔ ہر شخص کو بازو پہ باندھنا چاہیئے یہ گت بنی قرآن شریف کی کہ تماشے کے طور پر شیشے سے دیکھا جاتا ہے اور جب تمام عملیات کا اصل اصول ہی پاس ہے تو کسی آفت کا خوف نہیں رہا۔ اعمال سیئہ کی جرأت بڑھ گئی، گھر میں بیٹھے ہیں تب باندھے بندھا ہے، پاخانہ میں ہیں تب پاس ہے، عورت کے پاس جائیں تب ساتھ ہے۔ جنابت کی حالت میں ہوں تب لئے ہوئے ہیں۔ یہ حق قرآن شریف کا چھاپے والوں نے ادا کیا۔ حضرت قرآن شریف وہ چیز تھی کہ دور سے آتا ہوا دیکھتے تو ہیبت ہوتی اور بے اختیار کھڑے ہو جاتے نہ یہ کہ شیشے سے اس کا تماشا بنائیں اس میں یہ بھی ہے کہ دلی تعظیم اور توقیر کو دخل ہے جسامت کو بھی دخل ہے۔ بڑی چیز کو دیکھ کر خواہ مخواہ بھی قلب میں ایک اثر ہوتا ہے۔

ایک کام قرآن شریف سے یہ لیا گیا کہ فوٹو گراف میں سورتیں بند کھچائی ہیں اور دو دو پیسے کو سستی بکتی جاتی ہیں۔ یہ اس آیت پر عمل ہے

لا تشتروا بآیت اللہ ثمنا قلیلا

اللہ میاں کی آیتوں کی یہ قدر کہ کوڑیوں پہ بازار میں ماری پھریں۔ فقہا رحمہم

زیادہ کلام کر سکتے ہیں، میں تو کچھ نہیں جانتا ہوں۔ اتنی بات تو ظاہر معلوم ہوتی ہے کہ یہ محض لہو ولعب ہے جہاں گویوں کے راگ بھرے ہوئے ہیں، قرآن شریف بھی ہے تاکہ جو لوگ راگ گانے سے احتیاط کرتے ہیں وہ اس ذریعہ سے لہو میں شامل ہوں، کہاں گویوں کے راگ اور کہاں قرآن پاک، جہاں برہمن وہیں تعالیٰ۔ غرض قرآن پاک سے بچا نے اس لئے کہ اس کو پڑھا جاتا اور قراءت سیکھی جاتی آج کل یہ کام لئے جاتے ہیں اور قراءت کو بہت مشکل سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ بقدر ضرورت صحت کیلئے صرف اٹھائیس دن محنت کی ضرورت ہے جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں۔

تجوید کی ضرورت

مسلمانوں سے میں یہ نہیں کہتا کہ سب کے سب قاری بن جائیں۔ ہاں یہ سب کے ذمہ ہے کہ بقدر ضرورت قرآن کو صحیح کر لیں اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ کوئی استاد سکھانے والا ہو، اور تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ سیکھنے والا خواہ کسی حد تک کوئی فن سیکھنا چاہے مگر سکھانے والا پورے فن کا ماہر ہونا چاہئے حاصل یہ کہ قرآن شریف صحیح کرنے کے لئے ایک قاری کی ضرورت ہے بغیر اس کے تو یا کوئی نہیں ہوتا۔ جب قاری رہے تو اس کے اخراجات کی کفالت آپ کے ذمہ ہے اور ہر فن کے لئے کچھ آلات کی ضرورت ہوتی ہے۔ قاری کے لئے کچھ کتابیں بھی مہیا کی جائیں، اور جتنے امور ضروری ہیں ان سب کی کفالت آپ کو کرنی چاہئے پھر اس کی کفالت کے دو طریقے ہیں، ایک تو یہ کہ ہر ہر شخص کے یہاں دیکھ ایک

قاری رہے اور ہر جگہ کتابیں اور دیگر سامان ضروری منگایا جائے۔ اور ایک یہ کہ
ایک جگہ اس کا انتظام کافی طور سے کر لیا جائے اور سب اس سے مستفیض ہوں۔
اس میں بہت سہولت ہے، آپ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اس مکان میں جہاں
آپ بیٹھے ہیں یہ انتظام کیا گیا ہے کہ قرأت سکھائی جائے اور اس کے لئے جتنے
سامان کی ضرورت ہے سب یکجائی حیثیت سے جمع کیا جائے، قرأت سیکھنے اور
قرآن شریف کے صحیح کرنے کی ضرورت تو ہر شخص کے لئے ثابت ہو گئی پھر اس
ضرورت کے پورا کرنے کے لئے جو بھی طریق ہوتا خواہ کیسا ہی مشکل ہوتا اختیار کرنا
ضرور تھا۔ مگر حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے آسانی کر دی کہ اپنے کچھ بندوں کو اس
طرف متوجہ کر دیا، اور اللہ میاں کا نام لیکر اس کام کو شروع کیا ہے، میں کہتا ہوں
کہ مدرسہ میں عجیب خوبی ہے کہ تھوڑی رقم میں بے بہا دولت ملتی ہے۔ کاش اس
دولت کی ضرورت لوگوں کو محسوس ہو جائے۔ تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جب
تک کسی چیز کی ضرورت نہیں ثابت ہوتی اس وقت تک اس میں دیر ہوتی ہے۔
اور جہاں ضرورت ذہن نشین ہوئی پھر کہیں نہ کہیں سے اس کا سامان ہو ہی جاتا ہے
ان آدمیوں کو دیکھئے جن کی اوقات بہت ہی تھوڑی ہے اگر ان سے کہا جائے، کہ
مسجد یا مدرسے میں چندے کی ضرورت ہے تو عذر کریں گے کہ ہم خود مفلس ہیں اور
جب شادی ہو تو انہی کے پاس کہیں نہ کہیں سے مال آجاتا ہے۔ وجہ کیا ہے کہ شادی
کے خرچ کی ضرورت اُن کے ذہن میں ثابت ہو گئی کہ برادری میں نک کٹی ہوگی اور
مسجد اور مدرسے کے چندے کی ضرورت ثابت نہیں ہوئی اور مسجد اور مدرسے
کی بھی جہاں ضرورت ثابت ہو جاتی ہے تو بحمد اللہ مسلمان اس کام کو بھی انجام دیتے

ہی ہیں۔ مسلمانوں میں جوش تو ہے، مگر ہے

لوگ کہتے ہیں چپ ساہ مشکل ہے

سب غلط ہے نباہ مشکل ہے

ایسے لوگ کم ہیں کہ اپنی بات کو نباہ دیں۔

چندہ دہندگان کو مشورہ

چندہ دینے والوں کے لئے دو باتیں ہیں کہ خیال رکھنے کے قابل ہیں، ایک یہ کہ اپنی وسعت سے کم مت دو اور خواہ تھوڑا دو مگر نباہ دو۔

اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَی اللّٰہِ اَدْوَمُھَا وَاِنْ قَلَّ

دوسرے یہ کہ چندہ دے کر مدرسے کو اپنی ملکیت مت سمجھو، اور منتظمین کی رائے میں دخل مت دو۔ آج کل یہ مرض بکثرت شائع ہو گیا ہے کہ ذرا سا چندہ دے کر حکومت کرتے ہیں۔ ایک پیسہ بھی جس کا مدرسے میں شامل ہے وہ مدرسے کے ہر کام میں دخل دینے کو تیار ہے اور اپنی ہی رائے کو ترجیح دینا چاہتا ہے اور اگر بلا رائے اُن کے کوئی انتظام کر لیا جائے تو چندہ بند کر لیتے ہیں۔ بعض لوگوں کی تو یہاں تک عادت ہے کہ خواہ مخواہ اعتراض کیا کرتے ہیں، خود کوئی تدبیر اصلاح کی نہیں کرتے اور دوسروں کی تجویزوں میں عیب چھانٹا کرتے ہیں۔ ان کی وہ حالت ہے کہ ایک لڑائی میں کشت و خون زیادہ ہوا تھا۔ میدان جنگ میں صدہا مُردے پڑے ہوئے تھے۔ ایک صاحب اُن میں ایسے بھی پڑے تھے کہ وہ مرے تو نہ تھے، مگر زخم ایسے لگے تھے کہ اُٹھ نہیں سکتے تھے۔ اتفاقاً لشکر کا بنیا ان کے پاس کو ہو کر

نکلا، انہوں نے آواز دی کہ بھائی ذرا سنتے جاؤ تمہارے کام کی بات ہے۔ بنئے نے تھوڑی دور کھڑے ہو کر پوچھا کیا ہے، کہا میں تو اب مر ہی جاؤں گا میری کمر میں ہمیانی ہے وہ تم کھول لو، تمہارے ہی کام آئیگی مبادا کسی اور کے ہاتھ پڑ جائے بنئے لالچی ہوتے ہی ہیں، یہ آگے بڑھے جب خوب قریب پہنچ گئے تو ان مجروح صاحب نے اپنے پورے زور سے ان کی ٹانگ میں ایک تلوار ماری کہ ہڈی ٹوٹ گئی، بنئے نے کہا کمبخت تو نے یہ کیا حرکت کی؟ تو کہا کہ ہمیانی تو کہاں رکھی ہے، کوئی ہمیانی بھی باندھ کر لڑائی میں آتا ہے، اس میدان میں رات کو اکیلے پڑے رہتے، دوسرا ساتھ کے لئے تمہیں بھی پالیا۔ تو وہ بنیا کیا کہتا ہے کہ اوت گئے اوت نہ آپ چلے نہ اور کو چلنے دیا۔ بس یہی حال ان معترضین کا ہے کہ نہ خود چلیں نہ دوسروں کو چلنے دیں۔ ایسے لوگوں سے یہ التماس ہے۔ کہ ہم نے آپ کے چندے سے دست برداری دی، ہمارے کام میں رخنہ مت ڈالو۔ فقط

مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں

ہم لوگوں کی خاصیت بچھو کی سی ہو گئی ہے، اس کی خیر یہی ہے کہ شر نہ پہنچاتے تو خود سہارا نہ دیں مگر دوسروں کے کام کو تو نہ بگاڑیں، رہا اعتراض کرنا اور عیب نکالنا، سو بے عیب تو خدا کی ذات ہے، جن کو عقل دی گئی ہے، وہ دوسرے عیب پر نظر نہیں کرتے، جہاں عیب دوسروں میں پاتے ہیں ہنر کی طرف دیکھتے ہیں اور عیب کو چھپا دیتے ہیں یا اصلاح کر دیتے ہیں اور عناد کی تو بات ہی دوسری ہے، اور یوں ہی اعتراض پیدا ہوتے کیا مشکل ہیں جبکہ

مدرسوں کے اصل اصول بھی نہیں چھوڑے۔ چنانچہ یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ پر وحی کون لاتا ہے آپ نے جواب دیا جبریل علیہ السلام لاتے ہیں، کہنے لگے جبریل تو ہمارا دشمن ہے، اگر میکائیل علیہ السلام لاتے تو ہم بھی ایمان لے آتے یہ بھی تو اعتراض ہی تھا، ایسے اعتراضوں سے تو کوئی بھی نہیں بچا — اہل مدرسہ پر اگر کئے جائیں تو کیا بعید ہے۔ صاحبو! آپ کو دل و جان سے اصلاح کرنی چاہئے نہ کہ عیب نکالنا، ہاں اگر کوئی عیب آپ کے نزدیک ثابت ہو تو اس کو اس طرح سے رفع کیجئے جو اس کا طریقہ ہے۔ حدیث میں ہے (قربان جائیے شریعت کی تعلیم کے) فرماتے ہیں:

اَلْمُؤْمِنُ مِرْآةُ الْمُؤْمِنِ

لوگوں نے اس کی تفسیر کئی طرح سے کی ہے مگر جو ہمارے مشائخ کے نزدیک ہے وہ یہ ہے کہ مومن کو مومن کے لئے آئینہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اس بات میں کہ آئینہ دیکھنے والے کا رازدار ہوتا ہے اس کے عیب کو اسی کے سامنے ظاہر کرتا ہے دوسروں سے ہرگز نہیں کہتا، اسی طرح ہر کسی کو بھی اہل مدرسہ کے عیب چھپانا کرے ہمارا یقین تو یہ ہے، اس سے اصلاح ہوتی ہے مگر ایسے آدمی کم ہیں۔ آج کل تو عرف یہ ہے کہ چندہ دینے سے یہ خیال ہو جاتا ہے کہ ہم مدرسہ کے مالک ہیں، اور یہ لوگ اس خیال سے چندہ بھی چاہتے ہیں بسا اوقات ان کو بھی رائے دیتے وقت اشتباہ ہو جاتا ہے کہ عیب جس کو وہ عیب سمجھتے ہیں، پھر نصیحت کی صورت میں عیب جوئی میں پڑ جاتے ہیں، اس سے بچنے کا طریقہ میں بتائے دیتا ہوں کہ آپ کے نزدیک جو بات قابل اعتراض ہو اس کو

علی الاعلان پھیلاتے نہ پھریئے، خلوت میں مہتمم یا کسی مدرس پر ظاہر کیجئے اور پھر یہ انتظار نہ رکھئے کہ ہمارے کہنے کے موافق ہی ہو جائے، اس طرح آپ ناصحین میں شمار ہوں گے اور عیب جوئی سے بچ جائیں گے، خلاصہ یہ کہ رائے دو اور انتظام میں دخل نہ دو، مدرسے کو اللہ میاں کا سمجھ کر کام کرو اپنا مت سمجھو، یہ وہ گر ہے کہ اگر اس کا سب خیال رکھیں تو کوئی بھی خرابی پیدا نہ ہو چندہ دینے والے اس کا خیال اسی طرح رکھ سکتے ہیں جیسے میں نے عرض کیا اور مہتممین یوں رکھ سکتے ہیں کہ اس کی رقم کو امانت سمجھیں اور اپنی اپنی خدمات منصبیہ کو حق اللہ سمجھیں اور ان کو نہایت خلوص کے ساتھ بجا لائیں، اور خلوص کے دو جزو ہیں ایک ظاہری اور ایک باطنی۔ باطنی تو یہ ہے کہ اپنے آپ کو عبد اور حق تعالیٰ کو مولیٰ سمجھ کر احکام کی تعمیل کریں اور ظاہری یہ ہے کہ اپنے آپ کو عالم نہ کہیں بلکہ وہ خادم کہیں، اور نام تک نہ اختیار کریں جن سے حکومت اور ترفع پایا جائے۔

ہوسِ جاہ

آج کل یہ بھی ایک خبط ذہنوں میں سما گیا ہے کہ کام چاہے کتنا ہی ذرا سا شروع کریں، مگر عہدے اور خطابات بڑے بڑے اختراع کر لیتے ہیں، کوئی سیکرٹری بنتا ہے کوئی پریذیڈنٹ ہوتا ہے، ایک صاحب کا خط میرے پاس آیا، جس پر کاتب صاحب ہی کے قلم کا لکھا ہوا تھا۔ "مہتمم فلاں گورنر یتیم خانہ مقام فلاں۔" میں نے کہا کہ بہتر تھا، کہ خادم یتیم خانہ لکھتے۔ بہت جگہ یہ تجربہ ہوا کہ جہاں یہ خطابات لمبے چوڑے ہوتے

ہیں وہاں کا رہنمائی صرف رجسٹر ہی تک محدود رہتی ہے، خارجی وجود کی نوبت نہیں آتی، چند روز کے نئے عہدے البتہ مل جاتے ہیں، سو یہ بچوں کا کھیل ہی ہوا۔ یا کچھ اور، ان الفاظ کو اختیار مت کرو۔ اس سے برکت نہیں رہتی، یہ غیر قوموں کی تقلید ہے۔

مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ

یہ حدیث لباس اور وضع کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے، جس بات میں مشابہت پائی جائے سب اسی کے اندر داخل ہیں۔ یہ اچھا ہے کہ تم اپنے آپ کو خادم کہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تسلیما تمہارا نام سردار رکھیں۔

سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ

یہ کتنی برکت کا سبب ہے آج کل لوگوں نے اس کے برعکس کر رکھا ہے، کہ بڑے بڑے خطاب لیتے ہیں خواہ ان کی اہلیت ہو یا نہ ہو۔ حدیث شریف میں ہے

اِذَا مُدِحَ الْفَاسِقُ اهْتَزَّ لَهُ الْعَرْشُ

یعنی جب فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو عرش کانپ اٹھتا ہے، اور آج کل اکثر بڑے فساق ہی کے ہاتھ میں ہیں اور ان کی مدح ہوتی ہے پھر زمین کانپ اٹھتی ہے، تو کیوں تعجب کیا جاتا ہے، زلزلہ کو بہت لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے اور کیوں آتا ہے، زلزلہ کے متعلق لوگوں کے خیالات عجیب طرح مختلف ہیں، کوئی کہتا ہے گائے سینگ بدلتی ہے، یہ وہ حرکت ہے، کوئی کچھ کہتا ہے، اور کوئی کچھ۔ آج کل جو مدعیان تحقیق ہیں ان کی بڑی دوڑ یہ ہے کہ مسامات منفوذ بند ہونے سے زمین کے بخارات نفوذ کرتے ہیں، اس سے یہ حرکت ہوتی ہے۔

میں کہتا ہوں یہ صرف تخمین ہے اس پر کوئی دلیل قطعی نہیں ہے، اور اگر کبھی بخارات سے بھی یہ حرکت واقع ہو تو ہم انکار نہیں کرتے لیکن اس کی کیا دلیل ہے کہ ہمیشہ یہی سبب ہوتا ہے، ممکن ہے کہ یہ حرکت کبھی بخارات سے ہوتی ہو اور کبھی کسی اور سبب سے۔ لیکن کسی سبب سے بھی ہو یہ بات تو مسلم ہے کہ سبب میں تاثیر بالذات نہیں، پھر اگر سبب کو صحیح طور پر معلوم بھی کر لیا تو کیا نتیجہ، مسبب ہی کی طرف کیوں نہ رجوع کیا جائے تا کہ بلا ٹلے، مگر مرض یہ ہے کہ سبب کی تحقیق میں لگ جاتے ہیں اور جو واہی تباہی سمجھ میں آ جائے اسی کو یقینی اور قطعی سمجھ لیتے ہیں، زلزلہ کے لئے بخارات کو یقینی سبب جان لیا ہے۔ میں کہتا ہوں اگر قیامت آ جائے اور اس کے بعد ایک اور قیامت آ جائے اور اس کے بعد ایک اور قیامت آ جائے، اسی طرح قیامت بر قیامت ہو جائیں مگر انحصار کی دلیل نہ لا سکیں گے، کہ سوائے بخارات کے اور کوئی سبب زلزلہ کا نہیں ہو سکتا اور کوئی دلیل ہے کسی کے پاس تو میں بھی سننا چاہتا ہوں۔

غرض ان خرافات کا لوگوں کو بہت شوق ہے اور اپنی تخمین کو یقینی دلیل سمجھ لیتے ہیں۔ صاحبو! تمام آفتیں گناہوں سے آتی ہیں، گناہوں کو چھوڑ دو، منجملہ گناہوں کے فاسق کی مدح و ترفیع بھی ہے جس سے عرش کو زلزلہ ہو جاتا ہے اگر کبھی زمین کو بھی ہو جائے تو کیا تعجب ہے اور ان بڑے بڑے خطابات میں یہ مدح بلازم آتی ہے لہذا یہ الفاظ مت اختیار کرو۔ انکسار اختیار کرو۔ اہل علم کے لئے یہ الفاظ زیبا نہیں ہیں۔ سچ کہتا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت میں تشریف رکھتے ہوتے تو ان الفاظ سے ضرور منع فرماتے۔

لفظ راعنا تک صرف یہی قرآن شریف میں موجود ہے، صرف اس وجہ سے کہ
مشابہت کفار لازم آتی ہے چہ جائیکہ یہ الفاظ ان میں علاوہ مشابہت کے ترفع
اور تکبر بھی ہے، اگر فرض کر لیجئے کہ مشابہت کفار بھی نہ ہوتی تب بھی وجوہ ترفع
تکبر کے ان کے منع کر دینے کو کافی تھا۔ کیا ممبر اور گورنری لفظ رہ گئے ہیں، اگر
ضرورت ہے تو اپنے قرآن شریف میں سے تلاش کر لو، فرماتے ہیں:۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ

اس سے رائے دہندوں کا نام مشیر اور مکان کا نام مجلس شوریٰ اختیار کیا
جا سکتا ہے، یہ الفاظ ممبر اور کمیٹی کا کام بخوبی دے سکتے ہیں، بہتر ہو کہ دوسروں کی
شاگردی کی جائے، اور رہا تجربہ! تجربہ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان الفاظ کی بھی
چنداں ضرورت نہیں کام پورا ہونا چاہئے، جہاں خطابات اور ضوابط پر سے گئے
سمجھے وہاں کام خاک بھی نہیں پایا، وہاں بھی کاروائی صرف ریزولیوشن ہی تک محدود
رہتی ہے۔ ان فضول باتوں کو چھوڑو اور اصل کام خلوص اور قربانی کے ساتھ کرو جس سے
نہیں صرف ممبر یا مشیری سے نہ بلکہ ارکان کو تعلیم اور یہی اصل کام ہے یعنی قرآن شریف
کی تعلیم اس کو کہاں تک پہنچا کر دکھاؤ

ہندوستانی لائبریری
گارڈن ریچ روڈ، مٹیا برج، کلکتہ

ترجمہ کی اہمیت

اللہ میاں یہ نہیں پوچھیں گے کہ ممبری یا گورنری کا خطاب بھی حاصل کیا تھا یا
نہیں، ہاں یہ پوچھیں گے کہ قرآن کو قرآن ہی کی طرح پڑھا تھا یا نہیں، اس کا حق ادا
کیا تھا یا نہیں۔ یہ خدمت الفاظ کی ہوئی اور دوسری خدمت قرآن شریف کی

یہ ہے کہ الفاظ کے مفہوم کو سمجھیں، جب تصحیح الفاظ سے فراغت ہو تو اس کا ترجمہ پڑھیں تاکہ احکام سے آگاہی ہو۔ آج کل اس میں بھی لوگوں نے خبط کر دیا، اوّل تو ہمت کا منتہا صرف عبارت ہی پڑھنے تک رہتا ہے اور اگر کسی نے شوق کیا اور ترجمہ دیکھنا شروع کیا تو ترجمہ بھی کسی بڑے آدمی کا تلاش کیا جائیگا۔ جیسا کہ دنیاوی امور میں تمول اور جاہ مابہ الامتیاز قرار دیا گیا ہے ایسے ہی دین میں بھی بڑا آدمی ہونا دیکھا جاتا ہے۔ خیال یہ ہے کہ ڈپٹی صاحب کا ترجمہ بھی ڈپٹی اور تحصیلدار صاحب کا ترجمہ بھی تحصیلدار ہی ہوگا۔ حالانکہ

لکل فن رجال

ہر کام کے لئے کچھ آدمی ہوتے ہیں۔ کسان کسان ہی کا کام کر سکتا ہے اور بڑھئی بڑھئی ہی کا کام اور لوہار لوہار ہی کا کام کر سکتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں ڈپٹی صاحب اور تحصیلدار صاحب کا کام مولوی لوگ بھی کر سکتے ہیں؟ اور اُن کو اُن کے کام میں دخل دینا زیبا ہے؟ جواب یہی ہے کہ نہیں کر سکتے اور اُن کو دخل دینا نازیبا ہے۔ پھر ڈپٹی صاحب اور تحصیلدار صاحب کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ اُن کا کام کرنے لگے۔ اُن سے اپنا ہی کام خوب ہوتا ہے اس خدمت کو اُنہی کے لئے چھوڑ دیا ہوتا یہ اُن کا کام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے فاش غلطیاں کی ہیں۔ قرآن شریف کے ترجمہ کے لئے علماء ہی کا مذاق موزوں ہے۔ کتاب اللہ ہے، جیسے کہ اصل کتاب میں شان سلطانی برستی ہے ایسے ہی ترجمہ میں بھی ہونی چاہیئے، زبان میں بناوٹ نہ ہو، زنانہ پن نہ ہو۔ جب پڑھا جاوے تو یہ معلوم ہو کہ شاہی حکم رعایا کو سنایا جاتا ہے۔ کوئی لفظ آداب شاہی کے خلاف نہ ہو۔ قرآن شریف کا ترجمہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ

ذهبنا نستبق

کے معنے سمجھے ہیں ہم کبڈی کھیلنے لگے، حالانکہ قطع نظر اس کے کہ یہ لفظ رکیک ہے خود لغت کے بھی خلاف ہے، کیونکہ استباق سبق سے بنے، اسبق سے مراد آگے بڑھنا۔ استباق سے مراد یہ ہے کہ ہم اس لئے دوڑے کہ دیکھیں کون آگے نکلے، اور کبڈی میں یہ مراد مقصود نہیں پھر خود عقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ کبڈی میں حافظ متاع نظر سے غائب نہیں ہو جاتا کہ بھیڑیے کے لے جانے کا عذر ہو سکے لیجئے یہ ترجمہ ہے۔ بات یہ ہے کہ صرف زبان عربی جاننے سے ترجمہ نہیں ہو سکتا، قرآن مجید کے ترجمے کے لئے مختلف علوم کی ضرورت ہے اور اور لوگ صرف ظاہر رنگ دیکھ کر ڈھلتے ہیں۔ اتنا مادہ نہیں کہ بھلے برے کو پہچانیں۔ پس خود گمراہ ہوتے ہیں اور اوروں کو گمراہ کرتے ہیں۔ جنہوں نے اپنی اولاد کو قرآن شریف پڑھایا بھی تو اکثر تو یہ ہے کہ بس صرف الفاظ پڑھا دئے اور اس کے لہجے اور آواز کو سن کر خوش ہوتے ہیں کہ بچہ طوطے کی طرح پڑھتا ہے، سو امید ان رکھئے طوطا ہی رہیگا۔ انشاء اللہ آدمی نہیں ہوگا۔ آدمی ہوتا ہے علم سے، اور علم صرف الفاظ ہی کا نام نہیں ہے۔

صاحبو! اس کو آدمی بنائیے اور وہ علوم پڑھائیے کہ الفاظ کے مفہوم کو سمجھے اور صحیح اور غلط ترجمہ میں تمیز کر سکے تاکہ گمراہی سے خود بھی بچے اور اوروں کو بھی بچائے، مگر اس کی تو ضرورت ہی ذہنوں سے نکل گئی اور عام لوگوں کا اعتراض ہے، کہ اگر تمام عمر ان علوم میں صرف کی جائے، تو نہ بڑھئی بڑھئی رہیگا اور نہ لوہار لوہار، پھر دنیا کا کام کیسے ہو، معاش کی کیا تدبیر ہے۔ جواب یہ ہے

کہ یہ تو نہیں کہا جاتا کہ سب کے سب متبحر عالم ہی بن جاؤ، عربی ہی میں تکمیل کرو، بلکہ ضرورت کے موافق احکام الٰہی سیکھ لو، اور اس سیکھنے کی صورتیں مختلف ہیں، جس کو جس طرح آسان ہو، عربی میں ممکن ہو عربی ورنہ چھوٹے چھوٹے اردو کے رسالے پڑھ لو۔

مختصر نصاب کی ضرورت

اس ضرورت کو دیکھ کر نصاب تعلیم کا اختصار کیا گیا ہے کہ جہاں پہلے دس برس صرف ہوتے تھے، اس میں صرف ڈھائی برس لگتے ہیں۔ اس کو نئی بات سمجھ کر آپ چونکیں نہیں اور یہ نہ کہیں کہ جب ڈھائی برس میں وہی کام ہوتا ہے جو دس برس میں ہوتا تھا، تو کیا پہلے علماء نے وقت ضائع کرنے کو یہ مدت رکھی تھی، کیونکہ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ بعینہٖ وہی تعلیم جو دس برس میں ہوتی تھی اب ڈھائی برس میں ہوا کرے گی بلکہ ضروریات کو منتخب کر لیا گیا ہے کہ ان کو معلوم کر کے آدمی اپنے دین کو مستحکم کر سکتا ہے اور متوسط استعداد کا مولوی ایک گونہ جامعیت کے ساتھ بن سکتا ہے اگرچہ تبحر نہ ہو مگر اتنی استعداد ہو جائے گی کہ اگر چاہے تو اپنی لیاقت بڑھا سکتا ہے،

یہ نصاب کم فرصت لوگوں کے لئے تو ضروری ہی ہے، اگر وہ لوگ بھی جو نصاب قدیم کی تکمیل چاہتے ہیں پہلے اس کو پورا کر کے نصاب قدیم کو پورا کریں، تو نہایت مفید ہو، مجھے تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ کار آمد شئے ہے۔ میں دھوکا نہیں دیتا ہوں میں نے ایک عرصے تک پہلے اپنے عزیزوں پر تجربہ کیا، جب پورا اطمینان ہو گیا تب شائع کیا ہے۔ اس کے شائع کرنے سے یہ غرض نہیں کہ نصاب قدیم عبث ہے اور

اس کو بالکل چھوڑ دیا جائے، بلکہ جس کو فرصت و ہمت ہو نصاب قدیم کی تکمیل کرے اور جن کو کم فرصتی کا عذر ہو وہ اسے اختیار کریں، کام نکالنے کے لئے کافی ہے۔ چونکہ یہ شکایت عام طور سے زبان زد ہوئی ہے کہ اگر علم دین حاصل کریں تو اور کوئی کام نہیں ہو سکتا، اس لئے بعض اہل رائے کی تجویز ہے کہ دیگر علوم کی گنجائش دینے کو نصاب جدید پڑھایا جائے اور اس کے لئے ہر شہر میں ایک مدرسہ ہو۔ چنانچہ یہاں بھی ایک شاخ اس مدرسے میں اس کے لئے بڑھائی گئی ہے، اب آپ صاحبان کو کوئی عذر علم دین حاصل نہ کرنے کا باقی نہ رہا، لیکن یہ سب اس وقت ہے کہ دین کی ضرورت آپ کے ذہن میں ہو، اگر ضرورت ہی آپ کے ذہن میں نہ ہو تو تھوڑی مدت اور بہت، سب برابر ہیں، مگر میں کہتا ہوں جس کی ضرورت دلیل سے ثابت ہو چکی اس کے ذہن میں نہ ہونے کی کیا وجہ ہے، کوئی صاحب عقل ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کی ضرورت کو تسلیم نہ کرے، پھر باوجود ضرورت کے اگر کوئی اس کو پورا نہ کرے تو اس کو غفلت کہتے ہیں۔ جس کا انجام حسرت و ندامت ہے۔

صاحبو! اس حسرت سے بچئے، دین کی ضروریات دنیا سے زیادہ ثابت ہوتی ہیں اس بنا پر تو دنیا کے علوم میں جتنا وقت صرف ہوتا ہے اس سے زیادہ دین کے علوم میں صرف کرنا چاہیے۔ اگر زیادہ نہ ہو تو برابر تو ہو، لیکن اب تو برابر کو بھی نہیں کہا جاتا ہے، صرف اتنا وقت تجویز کیا گیا ہے، جس میں دیگر علوم کی بھی گنجائش رہے اس مدت میں بچے کو جملہ کاموں سے برطرف کیجئے۔ صرف علم دین میں مشغول رکھئے پھر اختیار ہے جو فن چاہیئے سکھائیے، پھر انشاء اللہ دین میں اس کے کبھی خلل نہ آئے گا۔ اگر ڈاکٹر کسی بچہ کی نسبت کہہ دے کہ تین برس تک انگریزی نہ پڑھاؤ ورنہ دماغ خراب

ہو جائے گا تو آپ مان لیں گے خواہ یہی زمانہ اس کے امتحان اور پاس ہونے کا ہو۔ اور آپ جانتے ہیں، کہ اگر یہ تین برس خالی رہیگا تو پہلا پڑھا ہوا سب بھول جائے گا۔ اور آئندہ پڑھنے کی عمر نہ رہے گی، مگر اس خیال سے ڈاکٹر کا کہا مان لیں گے کہ تندرستی مقدم ہے، اگر پاس بھی ہو گیا اور تندرستی نہ رہی تو نوکری کیسے کرے گا۔ بس اسی طرح سمجھ لو کہ ڈھائی برس کے لئے تم نے بچے کو ہسپتال میں یعنی دینی مدرسے میں بھیجدیا ہے، پہلے اپنی روحانی صحت کو درست کرلے پھر جسمانی صحت بھی درست کرلیگا۔ اوّل تو ڈھائی برس میں دنیا کا کچھ نقصان نہیں، اتنا وقت بسا اوقات لہو و لعب میں غارت ہو جاتا ہے، اور اگر کچھ نقصان بھی ہو، تب بھی مسلمان کے لئے تو دین ہی مقدم ہے۔ احکام خداوندی کے سامنے تو کسی چیز کی بھی وقعت نہیں پہلے ان کی تعمیل چاہئے پھر اور کام۔ ان کی تعمیل جب ہی ہوسکتی ہے، کہ کتاب اللہ کو پڑھے اور کتاب اللہ کے پڑھنے کے معنی یہ نہیں کہ صرف لفظ پڑھ لے بلکہ اس کے مفہوم کو سمجھے جو کہ موقوف ہے تحصیل علوم دین پر۔

تلاوت اور عمل

تیسرا حق تلاوت عمل ہے، اور سب سے زیادہ اہم اور مقصود یہی ہے پہلے دونوں حقوق کو، اس کے ساتھ ذریعہ کو مقصود کے ساتھ جیسی نسبت ہے، میں یہ نہیں کہتا طالبعلموں سے کہ عمل کی نیت نہ ہو تو پڑھو ہی مت، پڑھو تو ضرور ہی لو۔ گو جرأت کی بات ہے مگر میں تجربہ سے کہتا ہوں کہ علم دین شروع کرتے وقت اگر نیت عمل کی نہ بھی ہو تو پرواہ مت کرو۔ علم دین وہ چیز ہے کہ نیت کو بھی ٹھیک کرلے گا، ایک بزرگ

کا قول ہے:

تعلمنا العلم لغیر اللہ فابی العلم الا ان یکون للہ ۰

یعنی ہم نے علم پڑھا تو تھا غیر اللہ کے لئے لیکن علم خود ہی نہ مانا اور اللہ میاں ہی کا ہو کر رہا۔ مطلب یہ ہے کہ ابتداء میں چنداں خلوص نہ تھا مگر انتہا میں خلوص پیدا ہو ہی گیا۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ اگر عمل کی توفیق نہ بھی ہو تب بھی علم پڑھے جاؤ انشاء اللہ ضرور عمل نصیب ہوگا۔ جب آدمی ہمیشہ فقراء و اہل اللہ کے قصے اور حالات پڑھے گا تو کب تک اثر نہ ہوگا۔ ہاں یہ خیال رکھو کہ معصیت کا بھی عزم مت کرو۔ کیونکہ معصیت سے نور علم مٹ جاتا ہے۔ ابتداء میں اگر علماء حق کا سا خلوص نہ ہو تو پرواہ مت کرو لیکن بالقصد معصیت کے پیچھے بھی مت پڑو اور بے باک مت ہو جاؤ۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ہے کہ انہوں نے اپنے استاد سے اپنے حافظہ کی شکایت کی تو انہوں نے جو جواب دیا اس کو اس طرح نقل فرماتے ہیں ؎

شَکَوْتُ اِلٰی وَکِیْعٍ سُوْءَ حِفْظِیْ

فَاَوْصَانِیْ اِلٰی تَرْکِ الْمَعَاصِیْ

فَاِنَّ الْعِلْمَ فَضْلٌ مِّنْ اِلٰہٍ

وَفَضْلُ اللہِ لَا یُعْطٰی لِعَاصِیْ

یعنی میں نے اپنے استاد وکیع سے سوء حفظ کی شکایت کی تو انہوں نے مجھ کو نصیحت کی کہ گناہوں کو چھوڑ دو کیونکہ علم اللہ میاں کا فضل ہے اور اللہ میاں کا فضل گناہگار کو نہیں نصیب ہوتا۔ تجربہ کر لیجئے کہ معصیت سے کھانے

نمک کا مزہ مٹ جاتا ہے، طبیعت کو عجب طرح کی پریشانی ہوتی ہے اگر سونے کا لقمہ بھی ہو تو مٹی سے بدتر ہو جاتا ہے، اس سے زیادہ میں کیسے سمجھا دوں معصیت سے اس نور کو مت مٹاؤ، اس نور کو حاصل کرو پھر پڑھو دوسروں کو پڑھاؤ، اس میں مدد کرو علماء کے زمرے میں شامل رہو۔

الدّالُ علی الخیر کفاعلہٖ

نیک کام کا بتلانے والا بھی کرنے والے کے حکم میں ہوتا ہے۔ بتا دینا ذرا سی امداد ہے، جب اس کا حکم یہ ہے تو پوری امداد دینے والے کا حکم ظاہر ہے روپیہ سے مدد کرو، ہاتھ پاؤں سے مدد کرو۔ بہت سے کام ایسے ہیں کہ روپے سے ہوتے ہیں اس میں روپے سے شریک ہو، اگر کسی کے پاس روپیہ نہ ہو اور ہاتھ پاؤں سے بھی مدد نہ دے سکے تو دعا سے مدد کرے کہ اللہ میاں اس میں سعی کرنے والوں کی مدد فرماویں۔ یہ تو کہیں نہیں گیا۔ اس سے تو کوئی بھی معذور نہیں، غرض ہر طرح مدد کرو اور اس کا خیال رکھو کہ آپس میں اختلاف نہ کرو، سب ملکر خلوص سے کام کرو، یہ قرآن شریف کی خدمت ہے، اگر آپ ہمت کریں گے تو قرآن شریف کے تینوں قسم کے حقوق ادا ہو جائیں گے۔ اور سب ہی کچھ ہو جائے گا۔

ہندوستانی لائبریری
گارڈن ریچ روڈ۔ مٹیابرج۔ کلکتہ

خلاصۂ وعظ

قال اللہ تعالیٰ۔ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ الآیۃ

اس آیت میں توریت کی تلاوت کی مدح ہے اور یہ مستلزم ہے مدح تلاوت قرآن

کو اور یہ ظاہر ہے کہ تلاوت سیکھنے پر موقوف ہے اور مقدمہ ضروری کا ضروری ہوا کرتا ہے تو آیت میں مدح ہوئی قرآن شریف کے سیکھنے کی بھی اور سیکھنا ضروری ہوا اور صرف اتنا سیکھنا نہیں جس سے قرآن شریف فقط پڑھ ہی سکیں، بلکہ اتنا کہ اس سے تلاوت کے پورے پورے حقوق ادا کر سکیں۔ حقوق تلاوت تین قسم کے ہیں، ظاہر اور باطن اور البطن۔ سب سے مقدم ظاہری ہے اور سب سے مؤکد البطن۔

فان الحقیقۃ بدون الصورۃ باطل والصورۃ بدون الحقیقۃ عاطل۔

حق ظاہری ترتیل ہے اور حق باطنی معانی کا سمجھنا اور البطن عمل۔ اب لوگ حق اول کو بھی جو سب سے سہل ہے چھوڑ بیٹھے، نفس کے اس کہنے سے، کہ تم قراۃ میں عاصمؒ یا حفصؒ تو ہو نہیں سکتے پھر سیکھنے سے کیا فائدہ۔ جواب یہ ہے یہ دنیا میں بھی سب کے سب بادشاہ تو ہونے سے رہے، پھر تدبیر کیوں کرتے ہو، اور نفس کے اس کہنے سے کہ صرف الفاظ سے بدون معنی سمجھے کیا فائدہ؟ جواب یہ ہے کہ فائدہ کے فہم معنی میں منحصر ہونے کی کیا دلیل ہے؟ لوگ بجائے قرآن شریف کے وظیفوں اور عملیات پر جھک پڑے اور قرآن شریف سے صرف یہ کام لیتے ہیں کہ بچوں کا نام اس میں سے نکالا جائے۔ یا تیجے وغیرہ میں پڑھا جائے، اور ایسی رسموں سے منع کیا جائے تو کہتے ہیں کار خیر سے روکتے ہو۔

جواب یہ ہے کہ تم بھی تو بعض وقت نماز سے روکتے ہو جیسے نماز بحالت جنابت، مگر ہم ان کو جواب دینے سے اس کو بہتر جانتے ہیں کہ اپنے گروہ سے کہیں

کہ خلوص اختیار کریں اور استغنا برتیں)

ایک یہ کام لیتے ہیں کہ بذریعہ عکس پورے قرآن شریف کو ایک تعویذ کی صورت میں کر لیتے ہیں اور ایک یہ کہ چادر میں رکھ کر بچے کو نیچے سے نکال دیتے ہیں، اور ایک یہ کہ گراموفون میں بند کر کے پیسے کماتے ہیں اور حق تلاوت یعنی قرأت کو مشکل سمجھ کر چھوڑ دیا، میں کہتا ہوں بقدر ضرورت مشکل نہیں ہاں تھوڑے سے اہتمام اور مجمع کی ضرورت ہے، یہ مدرسہ اسی کا مجمع ہے، اس میں سعی کرو اور خیال رکھو کہ اپنی وسعت سے کم نہ دو، اس کو تباہ نہ ہونے دو اور انتظام میں دخل نہ دو۔ سب کے سب اللہ میاں کا کام سمجھ کر کرو۔ چندہ دینے والے تو اس طرح جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے اور اہل مدرسہ اس طرح کہ اس کے مال کو امانت سمجھیں اور خدمات کو اللہ میاں کا کام اور انکسار کو شعار رکھیں، تکبر آمیز الفاظ تک نہ اختیار کریں کہ بسا اوقات فساق کی مدح لازم آتی ہے، اس سے عرش کانپ اٹھتا ہے اور زمین میں زلزلہ آجاتا ہے۔

دوسرا حق تلاوت فہم معانی ہے، اس میں لوگوں کی حالت یہاں تک ہے کہ صحیح و غلط کو تمیز نہیں کر سکتے، ترجمے بھی ڈپٹیوں اور تحصیلداروں ہی کے بڑے سمجھتے ہیں، وجہ یہی ہے کہ علم دین صرف بچوں کو ناظرہ قرآن شریف پڑھا دینے تک محدود کر دیا ہے، آگے کم فرصتی کا عذر ہے۔ اب آپ کو واضح ہو کہ نصاب قدیم کا اختصار کر دیا گیا صرف ڈھائی برس صرف ہوں گے، اب یہ عذر نہیں چل سکتا۔

تیسرا حق تلاوت عمل ہے، یہ سب سے زیادہ مؤکد ہے اس کی ہمت کرو اور

اس کے ذریعہ یعنی علم کو اختیار کرو، علم کو کسی طرح نہ چھوڑو۔ حتیٰ کہ اگر اول میں عمل کا عزم بھی دل میں نہ پاؤ تب بھی پڑھے جاؤ، علم خود دل کو درست کر لے گا۔ ہاں قصداً معاصی میں مت پڑو کہ اس سے نورِ علم مٹ جاتا ہے، غرض علم کے لئے کوشش کرو، مال سے، ہاتھ پاؤں سے اور کچھ بھی نہ ہو تو دعا ہی سے۔ تمہارے ذرا سے ارادے کی دیر ہے سب حقوقِ قرآن ادا ہو سکتے ہیں۔

آداب المساجد

HINDUSTANI LIBRARY:
Estd.
ہندستانی لائبریری
Garden Reach, Calcutta.

مـ آداب مساجد کے متعلق یہ وعظ ۲ محرم سنہ ۱۳۲۹ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر بیان فرمایا، جو ۲½ گھنٹے میں ختم ہوا، اور مولوی نور حسین صاحب نے قلمبند کیا۔

مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا اور دنیا کے کام کرنا
معصیت اور ظلم ہے ، مسجد کا موضوع لہٰذا اصلی
ذکر اللہ ہے. پس اس میں ذکر الدنیا کرنا اس کو
شر البقاع (بازار) بنانا ہے جو اس کی ویرانی ہے

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ و
نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من
شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من
یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ
ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد
ان سیدنا ومولانا محمد اعبدہ ورسولہ۔

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن
الرحیم قال اللہ تعالیٰ (آیت) وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ
اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ
مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا
خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

عمومیت کی حقیقت

شانِ نزول میں گو اختلاف ہو مگر قدر مشترک اتنا ضرور ہے کہ آیت عام اور شامل ہے۔ تعطل مساجد کے بارے میں مسلم اور غیر مسلم کو جیسا آگے آتا ہے، اور جملہ مابعد

أُولَئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا الخ

گویا دلیل کے ہے ماقبل کیلئے گویا یہ فرمایا گیا ہے کہ ان کو تو چاہئے تھا کہ خود بھی جب مساجد میں داخل ہوتے تو خاشع و خاضع ہو کر داخل ہوتے نہ یہ کہ اور دوسرے آنیوالوں کو جو ذاکرین مخلصین ہیں ان کو بھی روکتے ہیں، کیونکہ یہ فعل تو مخوف ہونیکی اور بھی زیادہ علامت ہے، اس لئے ایسا شخص بہت زیادہ ظالم ہو گا۔ یہاں پر ایک طالبعلمانہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ آیت تو کفار کے حق میں ہے، اس کا مصداق اور مخاطب مسلمانوں کو کیوں بنایا جاتا ہے تو اس کا جواب بطور اصولیین کے یہ دیا جا سکتا ہے کہ:

العبرة لعموم اللفظ لا لخصوص المورد

اور اس کی نظیر شرعی مسئلہ لعان و حد زنا ہے اور تمثیل عقلی یہ کہ اگر کوئی شخص

اپنے کسی نوکر کو کسی بات پر سزا دے اور کہے کہ جو ایسی حرکت کریگا اُس کو ایسی سزا ہوگی تو اُس کہنے کا سبب اس وقت یہ خاص نوکر ہے، مگر چونکہ الفاظ عام ہیں اس لئے وہ دوسرے نوکر بھی اپنے لئے اس کو عبرت سمجھتے ہیں اور وُہ کام کرتے ہیں مگر میرے نزدیک یہ قاعدہ اصولیہ کہ العبرۃ لعموم اللفظ الخ اسی عموم کے ساتھ مقید ہے۔ جہاں تک مراد متکلم کی ہو، اس کے آگے تجاوز کرکے زائد عموم کو شامل نہیں ہو سکتا۔ اس کی نظیر حدیث:

لَیْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّیَامُ فِی السَّفَرِ[1]

ہے، کہ باوجود لفظ کے عموم کے چونکہ مطیق[2] کو عام ہونا مراد متکلم کی نہیں ہے ہر مسافر کو شامل نہیں، بلکہ صرف اسی کو جس کو خوف ہلاک واندیاد مرض ہو۔ دوسری نظیر یہ ہے کہ آجکل کوئی شخص کسی عالم سے رہن کا مسئلہ پوچھے تو وہ عالم بوجہ اطلاع عرف متعارف کے حکم منع ہی کا دے گا، کیونکہ عرف رہن مع الانتفاع ہی کا ہے اسلئے مراد بھی رہن خاص ہوگا، گو فتوے کا لفظ یہ ہوگا کہ رہن جائز نہیں۔

پس محض کسی لفظ کا عام ہونا دلیل ہر عموم کی نہیں ہے تاوقتیکہ قرائن مستقلہ سے اس عموم کا مراد متکلم ہونا ثابت نہ ہو جائے۔

مسجد کی اہمیت

حاصل یہ کہ آیت میں لفظاً تعمیم نہیں مسلم وغیر مسلم کو، بلکہ آیت تو کفار ہی کے حق میں ہے، کیونکہ جو منع خاص یہاں مراد ہے ایسا منع مخصوص ہے کفار سے مگر مسلمان کو یہ ذم دوسری طرح سے شامل ہے، وہ یہ کہ منع کے بعد

---

[1] سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے ۱۲ [2] طاقت رکھنے والا ۱۲

سعیٰ فی خرابہا

فرمانا بطور تعلیل کے ہے اور خراب مقابل عمارت کا اور عمارت مسجد کی ذکر و صلوٰۃ سے ہے، بس خراب یعنی ویرانی ایسے امر سے ہوگی جو منافی ہو ذکر و صلوٰۃ کے، پس اگر مسلم سے مسجد میں کوئی فعل خلاف ذکر و صلوٰۃ ہو تو وہ بھی اس ملامت کا مورد ہوگا، بوجہ اشتراک علت کے، رہا یہ کہ قیاس ظنی ہوتا ہے، تو ذم یقینی نہیں، جواب اس کا یہ ہے کہ قیاس ظنی جب ہوتا ہے کہ اس کی علت بھی ظنی ہو اور اگر علت منصوص علیہ قطعی ہو جیسا کہ یہاں ہے تو قیاس بھی قطعی ہوگا۔

رہا یہ مسلمان اگر ایسا فعل بھی کرے تو قصد خرابی مسجد کا تو نہ ہوگا جو متبادر ہے سعی سے پھر اس کو کیسے شامل ہوا۔ جواب یہ ہے کہ اگر سعی خاص ہوتی مباشر کے ساتھ تو اس شبہ کی گنجائش تھی، غور کرنے سے معلوم ہوتا کہ سعی عام ہے مباشر اور مسبب کو، دلیل اس کی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں خواب دیکھا (انبیاء علیہم السلام کی خواب بھی وحی ہے) کہ عمرہ کرنے کے لئے مکہ تشریف لائے اور صحابہؓ سے یہ خواب بیان کیا، گو اس میں یہ نہ تھا کہ اس سال ہوگا، مگر شدت اشتیاق میں صحابہؓ نے سفر کی رائے دی اور آپ نے خوش خلقی سے قبول فرمایا تو کفار قریش نے آپ کو دخول مکہ سے روک دیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس روکنے کو مسجد کی ویرانی کا سبب قرار دیکر ان کو

وسعیٰ فی خرابہا

کا مصداق بنایا، حالانکہ کفار مکہ نہ صرف مسجد حرم بلکہ تمام حد حرم کی غایت تعظیم کرتے تھے اور عمارت کی بھی، مگر بایں ہمہ ان کو وسعیٰ فی خرابہا کا مصداق بنایا گیا

صرف اسلیئے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ کرام کو کہ ذاکرین مخلصین تھے روکا، اب بدلالۃ النص یہ بات ثابت ہوگئی کہ کوئی ایسا کام کرنا مسجد میں جسمیں ذکر اللہ سے اس کا تعطل ہو علی سبیل التسبب ہی ہی

منع مساجد اللّٰہ وسعی فی خرابہا

کا مصداق بنتا ہے ورنہ کفار نے کوئی مسجد میں قفل نہیں ڈالا تھا اور نہ مسجد کی بے تعظیمی کی تھی اور نہ عمارت میں کوئی خرابی کی تھی اور رہا ہوہے کہ مسجد میں بلاضرورت دنیا کی باتیں کرنا دنیا کے کام کرنا نہ ذکر ہے نہ ذکر کے متعلق ہے، اس لئے بلا شبہ معصیت اور ظلم ہے، پھر ان یہ ذکر کی تقریب سے فضیلت ذکر کے متعلق متعدد واقعات بیان کئے گئے، اس میں یہ بھی بیان تھا کہ بعضے آدمی ذکر و تلاوت پر عوض مزدوری لیتے ہیں حالانکہ اللہ کا نام ایسا گرانمایہ ہے کہ دونوں عالم بھی اس کی قیمت نہیں ہوسکتے اور یہ شعر پڑھا ؎

قیمت خود ہر دو عالم گفتۂ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

مگر اس کا ذوق وہی پا سکتا ہے جو شناسا ہو ؎

گفت لیلے را خلیفہ کاں توئی
کز تو مجنوں شد پریشان و غوی
از ہمہ خوباں تو افزوں نیستی
گفت خامش چوں تو مجنوں نیستی
دیدۂ مجنوں اگر بودے ترا
ہر دو عالم بے خطر بودے ترا

ے عجب داری از سالکان طریق
کہ باشند در بحر معنے غریق
ے عشق مولے کے کم از لیلے بود
گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

رشوت کی صورت

اس تقریب میں ختم کلام مجید حفاظ کا بعوض مال رمضان میں یا سوم وغیرہ میں یا قبور پر باجرت پڑھنے کا ممنوع ہونا بیان ہوا۔ اور اہل اللہ دنیا کو تو اللہ کے نام اور رضا سے بڑا کیا سمجھتے، آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دولت تو نعمائے جنت سے بھی افضل ہے۔

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ

نص صریح ہے اور اس دین فروشی کے شبہ سے بچنے کے لئے بعض بزرگ بازار میں نہیں جاتے کہ شاید ان کو دیندار سمجھ کر ان کے دین کی وجہ سے کوئی دوکاندار داموں میں رعایت کرے تو وہ ایک قسم کا عوض ہو جائیگا دین کا۔ پس نہ جانا بازار میں دو وجہ سے ہوتا ہے ایک کبر کی وجہ سے وہ تو حرام ہے دوسرا اس وجہ سے کہ لوگوں پر ہماری وجاہت سے دباؤ پڑیگا اور وہ دب کر ارزاں دیں گے جس سے ان کو نقصان ہوگا، سو یہ مستحسن اور ضروری ہے، اس میں شبہ دین فروشی سے بچنے کے علاوہ رفع ایذا عن الخلق بھی ہے پس جاہ کے اثر سے لینا یہ ایک قسم کی رشوت ہے، اسی لئے حاکم کو ہدیہ لینے کی اجازت نہیں، اس میں اس خدشے کو

درج کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باوجود حاکم ہونے کے ہدیہ قبول فرماتے تھے کیونکہ وہ محض محبت کیوجہ سے ہوتا تھا نہ حاکم ہونے کی وجہ سے اور اب ہدیہ نہیں رشوت ہے، الا ماشاء اللہ!

تعمیر مساجد کا مقصد

اوپر جو کہا گیا ہے کہ عمارت مسجد کی ذکر و صلٰوۃ سے ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے
ما کان للمشرکین ان یعمروا مساجد اللہ الی قولہ من المھتدین۔

بعض نے اس آیت ما کان للمشرکین الخ سے تعمیر مساجد کا مسئلہ مراد لیا ہے اور اس سے مسجدیں کافر کا روپیہ نہ لگانے میں استدلال کیا ہے، مگر میرے نزدیک خود وہ مسئلہ مستقلہ دوسرے دلائل سے متعلق ہے، لیکن اس آیت سے مراد یہ ہے کہ مشرکین اس کے اہل نہیں ورنہ اگر اس آیت سے یہ مراد ہوتی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بنائے قریش کو باقی نہ رکھتے، قریش نے خرچ کافی نہ ہونے کے بیت کو بنائے ابراہیمی سے گھٹا دیا تھا اور حطیم کو کہ داخل بیت ہے خارج کر دیا تھا اور دروازہ صرف ایک رکھا تھا اور وہ بھی اونچا، پھر بعد انقضائے زمانہ خلفائے راشدین حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ نے اپنی خالہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اس حدیث کو سن کر موافق ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم از سر نو بنائے ابراہیمی پر بیت کو بنوایا۔ پھر عبد الملک کی خلافت میں اس کے عامل حجاج بن یوسف نے عبد اللہ بن زبیرؓ کے قتل کے بعد ان کی بنا کو تڑوا کر دوبارہ بنائے قریش

قائم کی، جس کے بعد خلیفہ ہارون رشید نے پھر بنائے ابراہیمی کی نسبت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے استصواب کیا۔ انہوں نے بدیں وجہ کہ بیت اللہ تختۂ مشق سلاطین بن جائیگا اسی بنا پر قائم رہنے کی رائے دی، جب سے آج تک اسی بنا پر ہے اور گو عبد اللہ بن زبیرؓ کی بنا کا نہ رہنا ظاہرا کسی قدر افسوس کے قابل ہے کیونکہ وہ متضمن مصالح کو تھا لیکن اس بنائے قریش پر قائم رہنے میں حق جل و علی کی معلوم نہیں کتنی مصلحتیں ہوں گی، مگر ایک بہت بڑی مصلحت اور کھلی حکمت جسکو گنوار سے گنوار بھی سمجھ سکتا ہے یہ ہے کہ اگر عبد اللہ بن زبیرؓ کی بنا پر رہتا گو دروازے بھی زمین کے برابر دونوں ہو جاتے مگر تاہم قفل کنجیاں تو خدام ہی کے ہاتھ میں رہتیں اور ہر کسی کو بیت اللہ کے اندر جانا نصیب ہوتا، مگر اس صورت موجودہ میں حطیم کے درحقیقت داخل بیت تھا باہر ہے اگر کوئی شخص خدام کے منع کرنیکی وجہ سے اندر بیت کے نہ جاسکے تو بلا روک ٹوک حطیم میں جاسکتا ہے اور دخول بیت کی برکت حاصل کر سکتا ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کفار مکہ نے بھی باوجود شرک و کفر بیت اللہ کی تعمیر میں صرف مال حلال خرچ کیا تھا اسی وجہ سے خرچ کم ہو گیا اور پورے طور پر بنائے ابراہیمی کو پورا نہ کر سکے۔ غرض

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ

کا حاصل یہ ہے کہ مشرکین میں لیاقت مسجد کے آباد کرنے کی نہیں، کیونکہ جس چیز سے اس کی آبادی ہے اس کا ذکر آیت آئندہ میں ہے وہ ان میں نہیں ہے یعنی وہ تعمیر ذکر اللہ ہے جس کا بیان اس آیت میں ہے۔

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ   الخ الآية

اس آیت میں مقصود اصلی اقام الصلوٰۃ ہے جس کے لیے مسجد موضوع ہے
اور آمن بطور شرط کے لایا گیا اور اتی الزکوٰۃ اقام کی تیمم ہے یعنی اقامت
یعنی ادائے حقوق صلوٰۃ موقوف ہے خلوص اور محبت پر اور اس کی ایک علامت
انفاق اموال ہے حاصل یہ کہ نرا ذکر زبان سے جیسا کہ نماز میں ہوتا ہے دلیل خلوص
قلب کی نہیں بلکہ کچھ مال بھی دینا چاہیے اور زکوٰۃ وہی دیگا جس کے قلب میں
خلوص ہو کیونکہ کوئی حاکم تو مطالبہ کرنے والا ہے ہی نہیں اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو
کہ زمانہ رسالت میں تو تحصیل زکوٰۃ کے لیے عامل مقرر تھے وہ جبراً لیتے ہوں گے۔
پھر اس میں خلوص کہاں رہا، جواب یہ ہے کہ عامل صرف مواشی کی زکوٰۃ لیتے تھے اور اموال
باطنہ زر و سیم خود مالک کے اختیار میں تھے، مواشی کے لیے بھی عامل کا تقرر تحصیل مال یا
ظلم کی وجہ سے نہ تھا بلکہ محض بہ نظر سہولت مصارف تاکہ اصحاب اموال کو تقسیم اموال
میں دقت نہ ہو اور مال پورے طور پر مستحقین کو مل جائے اور اموال تجارت میں
میں بھی عاشر کیطرف سے کچھ زبردستی نہ تھی بلکہ پوچھا جاتا تھا حولان حول[ف] ہوا یا نہیں
اگر کسی نے کہا نہیں گزرا تو چھوڑ دیا اور اگر کسی نے کہا کہ ہم نے زکوٰۃ خود دیدی ہے
تب بھی چھوڑ دیا۔

احترام مسجد کی صورت

دوسری دلیل اس دعوے کی کہ مسجد کا موضوع لہ ذکر ہے یہ آیت ہے
فِي بُيُوتٍ أَذِنَ اللَّهُ أَنْ تُرْفَعَ - الخ
اس آیت میں رفعت معنویہ مراد ہے۔ تیسری دلیل حدیث ہے:

ف۔ مال پر پورا سال گزر جانا ۱۲

اِنَّمَا بُنِیَتِ الْمَسَاجِدُ لِذِکْرِ اللہِ

پس جو کام ذکر کے متعلق نہ ہو وہ مسجد کی ویرانی ہے منع ہے جیسا بعض کاتب
بہ اجرت مسجد میں لکھنے بیٹھ جاتے ہیں یا درزی سینے بیٹھ جاتے ہیں۔ بلکہ فقہاء نے
یہاں تک لکھا ہے کہ جو شخص اجرت پر علم دین پڑھاتا ہو اس کو بھی مسجد میں بیٹھ کر پڑھانا
نہ چاہیے۔ علیٰ ہذا القیاس مسجد میں قرآن خوان لڑکوں کا پڑھانا جن سے کسی قسم کی اجرت
لی جاتی ہے ممنوع ہے، البتہ درس دینیات بلا اجرت خود ذکر ہے اس کا کچھ مضائقہ
نہیں۔ ایسا ہی معتکف کیلئے جو ذکر اللہ کی غرض سے مسجد میں آبیٹھا ہے، اس کو بیع و
شرا کا معاملہ بلا حضور مبیع بضرورت جائز ہے تاکہ ذکر اللہ سے حرمان نہ رہے ورنہ
مشتغلین بالتجارت کو اعتکاف کبھی میسر نہ آتا اور یہ شرط عدم حضور مبیع کی اس وقت
ہے، جب وہ متاع مسجد کی جگہ کو گھیرے، ورنہ اگر کوئی مختصر سی چیز ہو تو احضار[1] بھی
جائز ہے اور بجز معتکف کے دوسرے کو خرید و فروخت کا معاملہ خواہ کیسا ہی چھوٹا ہو مثلاً
ریزہ نگاری وغیرہ کا لین دین مسجد میں منع ہے، اسی طرح کسی ایسی چیز کا اعلان سے پوچھنا
جو مسجد سے کہیں باہر کھوئی گئی ہو منع ہے، البتہ اگر مسجد کے اندر کوئی چیز گم ہو گئی ہو،
تو اس کا پوچھ لینا مضائقہ نہیں۔ اسی طرح اپنی تجارت کے اشتہار مسجد میں تقسیم کرنا ممنوع
ہے، چوتھی دلیل دعویٰ مذکورہ کی یہ کہ حدیث میں قرب قیامت کی علامات میں
وارد ہے۔ مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِیَ خَرَابٌ[2]

عمارت اور خرابی کا جمع ہونا اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ظاہری عمارت میں تو بڑی
زیب و زینت اور مجمع کی کثرت ہوگی مگر معنوی آبادی کہ ذکر و خلوص ہے کم ہوگا۔

---

[1] سامان کو مسجد میں لانا ۱۲۔ [2] ان لوگوں کی مسجدیں بظاہر آباد (پُر رونق) ہوں گی۔ مگر حقیقت میں ویران ہوں گی۔

اس سے بھی وہی بات ثابت ہوئی، پانچویں دلیل یہ ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ شر البقاع کیا چیز ہے اور خیر البقاع کونسی جگہ ہے، فرمایا مجھے معلوم نہیں، جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا، انھوں نے بھی یہی جواب دیا اور یہ کہا کہ دربار خداوندی سے دریافت کر کے جواب دونگا، چنانچہ وہ پوچھنے گئے، اس وقت بہ برکت اس مسئلہ کے پوچھنے کے حضور اقدس کے لئے ان کو اس قدر قرب ہوا کہ وہ فرماتے ہیں کہ مجھکو کبھی اتنا قرب نہیں ہوا یعنی ستر ہزار حجاب درمیان میں رہ گئے۔ غرض دربار خداوندی سے جواب ارشاد ہوا کہ شر البقاع بازار ہے اور خیر البقاع مسجد سو غور کرنا چاہیئے کہ دونوں میں مابہ الامتیاز کیا ہے بجز ذکر اللہ و ذکر الدنیا۔ پس معلوم ہوا کہ مسجد کا موضوع لہٗ اصلی ذکر اللہ ہے، پس اس میں ذکر الدنیا کرنا اس کو شر البقاع بناتا ہے، جو کہ اس کی ویرانی ہے۔

درس عبرت

اس جگہ پر آپ کے اور جبرئیل علیہ السلام کے لَا اَدْرِیْ فرما دینے سے ان لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیے کہ جو باوجود نہ معلوم ہونے کے مسائل کا غلط سلط جواب دینے پر مستعد ہو بیٹھتے ہیں، نیز وہ لوگ سمجھیں اور متنبہ ہوں جو باوجودیکہ کتاب کا مطلب نہ آنیکے طالب علموں کو کچھ نہ کچھ جواب دیئے چلے جاتے ہیں اور یہ نہیں کہدیتے کہ یہ مقام نہیں آتا، جو نہ معلوم ہو کہدینا چاہیئے کہ نہیں معلوم۔ بزرجمہر سے کسی بڑھیا نے کچھ پوچھا اس نے جواب دیا کہ مجھے معلوم نہیں۔ بڑھیا نے کہا کہ امین تم بادشاہ کی اتنی تنخواہ کھاتے ہو اور یہ بات تم کو معلوم نہیں۔ بزرجمہر نے کہا کہ تنخواہ تو مجھے معلومات کی ملتی ہے، اگر

مجہولات کی ملنے لگے تو بادشاہ کا سارا خزانہ بھی کافی نہ ہو۔ اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کا ستر ہزار حجاب کو کمال قرب کہنا قابل غور ہے کہ جو لوگ دنیا میں تھوڑا سا ذکر و شغل کر کے حق تعالیٰ کی رویت کی ہوس میں پڑتے ہیں کتنی بڑی غلطی ہے کیا جبرئیل علیہ السلام سے زیادہ قرب چاہتے ہیں، اور اس سے بھی بڑی غلطی ہے اگر رویت سے بڑھکر ذات کی کنہ کو ادراک کرنا چاہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کی ذات کی کنہ تک رسائی نہیں ہو سکتی اسلئے اس کو ہرگز نہ کریدنا چاہیے، البتہ افعال خداوندی میں غور اور تدبر کرنا چاہیے۔

تَفَكَّرُوا فِي آلَاءِ اللّٰهِ وَلَا تَفَكَّرُوا فِي ذَاتِہٖ ؎

کسی بزرگ کا قول ہے ؎

دور بیناں بارگاہِ الست
غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست
آنچہ اندر راہ مے آید بدست
حیرت اندر حیرت اندر حیرت است

؎ اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہرچہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

ہاں البتہ قیامت میں حسب وعدہ رویت ذات بلا حجاب ہو گی اور حدیث میں جو آیا ہے کہ اس دن کوئی اور پردہ نہ ہو گا بجز رداء الکبریائی کے اس سے بلا حجاب ہونے پر شبہ نہ ہوا کیونکہ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ رویت تو بلا حجاب ہو گی

مگر عظمت و جلال و کبریائی کی وجہ سے احاطہ نہ ہو سکے گا۔ ردائے کبریا اس کو فرمایا ہے، دنیا میں بلا حجاب رویت نہیں ہو سکتی۔ یہی عقیدہ اور مسئلہ شرعی ہے اور حضرت پیران پیر سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ العزیز کی طرف یہ شعر منسوب ہے کہ

بے حجابانہ درآ از در کاشانۂ ما الخ

تو یہ مؤدل بحجاب محجوبین غافلین ہے یا قیامت کے روز کے لیے اشتیاق لقا کا اظہار فرماتے ہیں، کیونکہ درآ صیغۂ امر ہے اور وہ استقبال کے لیے ہے اور اگر یہ شعر کسی اور شاعر کا ہو تو ہم کو ضرورت تاویل کی نہیں۔ غرض حدیث مذکور سے بازار کی سی باتیں مسجد میں کرنا مذموم ہونا ثابت ہوا۔ بعض لوگ صحابہ پر تہمت لگاتے ہیں کہ وہ حضرات بھی مساجد میں ہماری طرح خرافات باتیں کیا کرتے تھے۔ سو یہ بالکل تہمت ہی تہمت ہے، اگر صحابۂ کرامؓ ہی ارشاد نبویؐ پر عمل کرنے والے نہ ہوں گے تو اور کون ہو گا۔ ایک تو خود دنیا کی باتیں مسجد میں کرنا ظلم تھا ہی یہ ظالم صحابہؓ پر تہمت لگا کر اور بڑھ کر ظلم کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ خود توبہ کریں، الٹے اخیار امت کو بدنام کرتے ہیں۔

شرعی رعایت

البتہ بعض لوگوں کی یہ بھی غلطی ہے کہ وہ ہر بات کو دنیوی بات سمجھ جاتے ہیں۔ مثلاً بیمار پرسی یا کسی مسلمان کا حال دریافت کرنا۔ جان لینا چاہئے کہ عیادت اور تفقد حال مسلم حقوق شرع میں سے ہیں، ان کا مسجد میں پوچھنا کچھ حرج نہیں اسی طرح اگر کوئی چیز مسجد میں گم ہو جائے تو اس کا پوچھنا بھی جائز ہے۔ علیٰ ہذا القیاس

لـہ۔ یہ ایک گاؤں کے لوگوں کا قول سنا گیا تھا ۱۲۔

معتکف کی خرید و فروخت جیسا اوپر مذکور ہوا اور شریعت نے کیا ہی آسانی رکھی ہے اگر کوئی سوداگر اعتکاف کرنا چاہتا ہے اور اس کے لئے معاملہ مسجد میں ناجائز ہوتا تو وہ بیچارہ اس عبادت سے محروم رہتا، شریعت نے اس کے لئے اجازت دے دی تاکہ وہ اس عبادت سے محروم نہ رہے، ایسی ہی باتیں شریعت کے حق ہونیکی گواہی دیتی ہیں کہ اس میں اہل تعلق کی بھی رعایت ہے ؎

بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ میدارد
برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را

باقی غیر معتکف کیلئے ممانعت بیان ہو چکی۔

ادب کی صورت

ایک بار مجھ کو اپنے ایک دوست کی کہ ان کو تلمذ کا تعلق بھی تھا ایک بات نہایت پسند آئی۔ کہ میں مسجد میں بیٹھا تھا ایک روپیہ کی ریزگاری ایک شخص سے خریدی، انہوں نے فوراً متنبہ کیا کہ یہ بیع ہے اور مسجد میں نہ چاہیئے۔ اہل حق کی یہ شان ہوتی ہے کہ اپنے بڑوں کو بھی کہدے مگر ادب کو نہ چھوڑے۔ اس موقع پر اسی مناسبت سے یہ ذکر آیا کہ حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ مولانا شہید رحمۃ اللہ کے پیر ایک دن صبح کی نماز میں بوجہ نئی شادی ہونے کے ذرا دیر سے پہنچے، ان کے مرید مولوی عبدالحی صاحب نماز کے بعد وعظ فرمانے بیٹھ گئے۔ اس میں یہ بھی کہا، کہ بعض لوگوں کا یہ حال ہے کہ جورو کی بغل میں پڑے رہتے ہیں اور تکبیر اولیٰ قضا ہو جاتی ہے۔ جناب سید صاحب نے نہایت شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ اب ایسا نہیں ہوگا

اس بیان کے بعد فرمایا مولوی عبدالحی صاحب نے باوجودیکہ ظاہراً یہ عنوان خلافِ ادب تھا اس واسطے یہ عنوان کہنے کی جرأت تھی کہ ان کو معلوم تھا کہ سید صاحب کے دل میں اس سے میل نہیں آئیگا بلکہ خوش ہوں گے، ان کے خوش کرنے کو بے ادبی اختیار کی ہے

گفتگوئے عاشقاں در کار رب
جوشش عشق است نے ترک ادب
با ادب ترنیست زو کس در جہاں!
بے ادب ترنیست زو کس در جہاں!

ایسا ہی ایک قصہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا جو حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ جب تم مجھ سے خفا ہوتی ہو تو اس وقت

لَا وَرَبِّ اِبْرَاھِیْمَ

کہتی ہو اور جس وقت خوش ہوتی ہو اس وقت

لَا وَرَبِّ مُحَمَّدٍ

کہتی ہو۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ

لَا اَھْجُرُ اِلَّا اِسْمَكَ

بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر کوئی اور کرے بے ادبی میں داخل ہو جانے، بلکہ کفر ہو جائے، مگر عاشق صادق جوش محبت اور علاقۂ محبت سے کرتا ہے اسلئے وہ عفو ہوتی ہے حاصل یہ کہ ظاہراً باتیں بے ادبوں کی سی ہوتی ہیں اور باطناً ہوتی ہیں باادب

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر
جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد
کم کسے ز ابدالِ حق آگاہ شد
گفت اینک ما بشر ایشاں بشر
ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور
ایں ندانستند ایشاں از عمےٰ
درمیاں فرقے بود بے منتہا
احمد و بوجہل در بت خانہ رفت
زیں شدن تا آں شدن فرقیست ژرف

خلاصہ مطلب یہ کہ آدابِ مسجد کو بلا ارادہ تشبیہ ایسا خیال کرنا چاہیے جیسے
کہ حاکم دنیوی کی حضوری میں قلب اور جوارح کی حالت ہوتی ہے کہ اس کی
مصداق بن جاتا ہے ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی
شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

اتنا تو ہونا چاہیے، اور ایسی حالت اول تو ہر وقت ہو ورنہ حضوری مساجد
کے وقت تو ضروری ہے اور ہر وقت حاصل نہ ہونا اس حالت کا یوں سمجھا جائے کہ
کہ بزرگانِ پیشیں پر ختم ہو سکتا ہے ؎

تو مگو ما را بداں شہ بار نیست
باکریماں کارہا دشوار نیست

دیکھئے صحابہؓ کی کیفیت کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُن دو شخصوں کو جو مسجد نبویؐ میں بلند آوازی سے باتیں کر رہے تھے تنبیہ فرمائی اور فرمایا کہ اگر تم باہر کے مسافر نہ ہوتے تو تمہیں سزا دیتا۔

اَتَرْفَعَانِ اَصْوَاتَكُمَا فِیْ مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ لہ

اور اس میں یہ شبہ نہ ہو کہ یہ حکم عدم رفع صوت مسجد نبویؐ کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ مساجد سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں چنانچہ

فَلَا یَقْرَبَنَّ مَسَاجِدَنَا

میں آپ نے جمیع مساجد کی نسبت اپنی طرف فرمائی، ہاں مسجد نبویؐ کا اور زیادہ ادب ہوگا۔ علاوہ ازیں یہ تو ہے ہی کہ:

اِنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰہِ الخ

اور جب اللہ کی ہوئیں تو یہ ادب کو بدرجۂ اولیٰ مقتضی ہوگا اور جس طرح مسجد قابل ادب ہے، ایسے ہی اہل مسجد کا ادب بھی ضروری ہے، وہ یہ کہ ایسی کوئی حرکت نہ کرے جس سے اہل مسجد کو تاذی ہو، مثلاً یہ خیال رکھنا چاہئے کہ ایسی جگہ کھڑا ہو جہاں اور آنے جانے والوں کو تکلیف نہ ہو، کیونکہ اس میں تکلیف ہے ذاکرین کو علیٰ ہذا ذکر بہ جہر جس وقت کوئی اور شخص نماز پڑھ رہا ہو، نکرنا چاہئے کیونکہ اس کی نماز میں خلل ہوگا اور اس کو تکلیف ہوگی، اس کی وجہ یہ بھی ہے

لہ کیا تم دونوں مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنی آوازوں کو بلند کر رہے ہو ۱۲۔

کہ مسجدیں بموجب ارشاد نبوی ریاض الجنہ ہیں اور جنت میں آزار و تکلیف نہ ہونا چاہیئے سے

بہشت آں جا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد!

العہد الربانی

HINDUSTANI LIBRARY: Estd.
ہندستانی لائبریری
Garden Reach, Calcutta.

حقوق علم و تعلیم کے متعلق یہ وعظ ۱۶ شعبان ۱۳۳۴ھ بروز یکشنبہ مدرسہ عبد الرب دہلی میں بیٹھ کر ارشاد فرمایا جو چار گھنٹہ میں ختم ہوا۔ سامعین کی تعداد ۱۵۰۰ کے قریب تھی۔ یہ وعظ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔

یہ علم حجۃ اللہ علی العبد ہے، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ عمل نہ ہو سکے تو علم ہی نہ پڑھو کہ اپنے اوپر حجت الٰہی کیوں قائم کریں۔ اس وقت آپ پر دو جرم قائم ہوں گے، ایک ترک علم کا ایک ترک عمل کا، اسلئے جو علم عمل سے مجرد ہو گو وہ حجۃ اللہ علی العبد ہے مگر جہل محض سے پھر بھی اچھا ہے۔

ہندستانی لائبریری
گارڈن ریچ روڈ۔ مٹیا برج۔ کلکتہ

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالی علیہ وعلی الہ واصحابہ وسلم

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ۝ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۝ ما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ ولکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتب وبما کنتم تدرسون ولا یامرکم ان تتخذوا الملئکۃ والنبیین اربابا ۝ ایامرکم بالکفر بعد اذ انتم مسلمون ۝

اطاعت اور عبادت کا فرق

یہ ایک آیت ہے جس میں رد ہے بعض اہل عناد کے ایک اعتراض کا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا گیا تھا۔ انہوں نے حضورؐ پر تہمت لگائی تھی کہ آپ نعوذ باللہ لوگوں کو اپنا بندہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس آیت میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ نبوت اور امر بعبادت نفس میں تباین ہے کسی بشر سے یہ بات نہیں ہوسکتی کہ

"اللہ تعالیٰ (تو) اس کو کتاب اور (دین کی) فہم اور نبوت عطا فرمائیں پھر وہ لوگوں سے (یوں) کہنے لگے کہ میرے بندے بن جاؤ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر (خلاصہ یہ کہ نبوت اور امر بالشرک جمع نہیں ہوسکتے) لیکن (ہاں وہ نبی تو یہ) کہیگا کہ تم لوگ اللہ والے بن جاؤ، بوجہ اس کے کہ تم کتاب (الٰہی دوسروں کو بھی) سکھاتے ہو اور خود بھی اس کو پڑھتے ہو اور نہ وہ (بشر جس کو نبوت عطا ہوئی) یہ بتادیگا کہ تم فرشتوں کو اور (یا دوسرے) نبیوں کو رب قرار دے لو، (بھلا) وہ تم کو کفر کی بات بتادیگا بعد اس کے کہ تم (فی الواقع یا بزعم خود) مسلمان ہو۔"

یہ تو ترجمہ آیت کا ہوا، شان نزول اس کا یہ ہے، کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب نجران کے نصاریٰ اور یہود جمع ہوئے اور آپ نے ان کو اسلام کیطرف بلایا تو ایک یہودی (ابو رافع قرظی) نے کہا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں، کہ ہم آپ کی عبادت کرنے لگیں جیسا نصاریٰ حضرت عیسٰی علیہ السلام

کی عبادت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا معاذ اللہ! اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ غالباً اس معترض نے براہِ عناد اطاعت و عبادت کو ایک سمجھا اور دونوں میں فرق نہ کیا تھا اسلئے اعتراض کر دیا کہ کیا آپ ہم کو اپنا بندہ بنانا چاہتے ہیں، جواب میں تصریح کر دی گئی کہ نبی سے غیر اللہ کی عبادت کا امر محال ہے، باقی اطاعت اور عبادت میں فرق ظاہر تھا اس سے تعرض نہیں کیا گیا، کیونکہ قرآن میں بدیہیات سے تعرض نہیں کیا جاتا، اطاعت تو انسان اپنے ماں، باپ اور استاد کی بھی کرتا ہے اور محکوم حاکم کی اطاعت کرتا ہے تو کیا یہ سب معبود ہیں اور ان کی عبادت کی جاتی ہے، ہرگز نہیں پھر رسول کی اطاعت میں عبادت کا شبہ کیوں ہوا محض عناد کی وجہ سے اور کچھ نہیں، یہ تو اجمالاً آیت کا ترجمہ اور اس کی ضروری تفسیر تھی۔ باقی مجھے اس وقت تمام اجزاء کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں مقصود صرف ایک جزو کا بیان کرنا ہے۔

آدابِ تعلیم و تعلّم کا فقدان

وہ جزو یہ ہے۔

لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ
وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۙ

مگر میں نے ادب کی وجہ سے پوری آیت کی تلاوت کر دی ہے اس جزو میں حق تعالیٰ نے تعلیم و تعلّم کے کچھ حقوق بیان فرمائے ہیں اور جو نہایت زیادہ ضروری

اسی مضمون کی ہے، کیونکہ اس وقت زیادہ مقصود جلسہ مدرسہ سے اہل علم کا اجتماع ہے، باقی لوگ ان کے طابع ہیں کیونکہ اس وقت بعض حضرات نے دورۂ حدیث ختم کیا اس لئے ان کو دستار و سند دیجائے گی اور اسی غرض سے ہر سال جلسہ ہوتا ہے کہ فارغ شدہ طلبہ کو سند وغیرہ دیجائے، اور ظاہر ہے کہ اس کام کے لئے صرف علماء ہی کا اجتماع اصل مقصود ہوتا ہے اسلئے مناسب معلوم ہوا کہ ضرورت جلسہ کے موافق مضمون بیان ہو صرف وقت ہی پورا نہ کیا جائے۔ بعض لوگ ایسے موقع میں فضائل علم اور فضائل اعانت علم بیان کیا کرتے ہیں، گو یہ مضامین بھی فی نفسہ مفید اور ضروری ہیں، مگر اس وقت الاہم فالاہم کے لحاظ سے اس سے بھی زیادہ ضروری کو مقدم کیا گیا ہے اور وہ آداب تعلیم و تعلم کا مضمون ہے! اور یہ زیادہ ضروری اس لئے ہے کہ اس کی طرف توجہ کم ہے اور علم و اعانت علم کیطرف توجہ حاصل ہے اور قاعدہ ہے کہ خواص کا اثر عوام پر ہوتا ہے اس لئے جس بات کی طرف خواص کی توجہ ہوگی عوام کو بھی اس پر توجہ ہوگی، پس تاسف وہ حالت ہے جس پر خواص کی ابھی توجہ نہ ہو تو علم و اعانت علم کا مضمون بھی گو ضروری ہے مگر زیادہ ضروری نہیں کیونکہ خواص کو اس پر پہلے سے توجہ ہے اور ان کے اثر سے عوام کو بھی توجہ ہے اور آداب تعلیم و تعلم کی طرف افسوس یہ ہے کہ خواص کو بھی توجہ نہیں اسلئے یہ زیادہ اہم ہے، شاید کسی کو یہاں یہ شبہ ہو کہ اخص الخواص کو تو توجہ ہے، تو ان کے اثر سے خواص کو بھی توجہ ہو جائے گی جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ خواص کے اثر سے عوام کو توجہ ہو جاتی ہے، تو سمجھ لیجئے کہ اخص الخواص کی توجہ

خواص کو متوجہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہوتی کیونکہ توجہ کا اثر اس پر ہوتا ہے جو اپنے کو محتاج اثر سمجھتا ہو اور اپنے کمال کا مدعی نہ ہو، عوام چونکہ اپنے کو مقتدا نہیں سمجھتے اور اپنی کوتاہیوں کے مقر ہوتے ہیں اس لئے خواص کی توجہ کا اثر ان پر کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے بخلاف خواص کے جو اہل علم کہلاتے ہیں کہ وہ خود مقتدا بننے کے مدعی ہیں اور اپنے کو صاحب کمال سمجھ کر اخص الخواص سے مستغنی سمجھتے ہیں ان پر اخص کی توجہ کا اثر کم ہوتا ہے کیونکہ ان میں احتیاج و طلب ہی نہیں وہ تو خود اس کے مدعی ہیں کہ دوسرے ہمارے محتاج ہیں۔

اخص الخواص کی شان

اخص الخواص کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے کمالات کی نفی کرتے ہیں جس سے بعض کوتاہ بین شبہ میں پڑ جاتے ہیں اور یوں سمجھنے لگتے ہیں کہ جب یہ اپنے منہ سے اقرار کرتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں مجھے کچھ نہیں آتا تو اس سے ہم ہی اچھے کیونکہ ہمکو تو بہت کچھ آتا ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ قسم کھا کر فرمایا واللہ میں کچھ نہیں ہوں، بخدا مجھ میں کچھ بھی کمال نہیں۔ یہ سن کر ایک صاحب فرمانے لگے کہ ہم تو مولانا کو سچا سمجھتے ہیں جھوٹا نہیں سمجھتے، جب وہ خود قسم کھا کر یوں کہتے ہیں کہ مجھ میں کچھ کمال نہیں تو ہم بھی ان کو ایسا ہی سمجھتے ہیں کہ وہ صاحب کمال نہیں ہیں، یہ تو اہل عناد کا قول ہے وہ اگر ایسا کہیں تو کچھ تعجب نہیں، مگر غضب یہ ہے کہ اس جملہ سے بعض معتقدین کو بھی شبہ ہو گیا وہ یہ تو نہ کہہ سکے کہ مولانا صاحب کمال نہیں ہیں مگر تردد میں پڑ گئے،

کہ بزرگ جھوٹی قسم نہیں کھا سکتے، جب مولانا قسم کھا کر اپنے کمال کی نفی کر رہے ہیں تو ہم کیا سمجھیں اپنے اعتقاد کو صحیح سمجھیں یا مولانا کی قسم کو، چنانچہ بعض حضرات اہل علم نے خود مجھ سے یہ شبہ بیان کیا، میں نے کہا۔ لا الٰہ الا اللہ تم کس شبہ میں پڑ گئے، میاں تمہارا اعتقاد بھی سچا اور مولانا کی قسم بھی سچی، تم جن کمالات کی وجہ سے مولانا کے معتقد ہو ان کے اعتبار سے مولانا نے قسم نہیں کھائی، اور جن کمالات کے اعتبار سے انہوں نے قسم کھائی ہے وہ اعتقاد کا موقوف علیہ نہیں، تفصیل اس کی یہ ہے کہ کمالات غیر متناہی ہیں، کسی درجہ پر کمال کی انتہا نہیں ہے، ایک عارف فرماتے ہیں، ؎

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا
کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

مولانا فرماتے ہیں ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست
ہرچہ بروے میرسی بروے مایست

یہی توجیہ ہے: رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا
تعلیم فرمانے کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو باوجود افضل الرسل ہونے کے حکم ہو رہا ہے کہ دعا میں " رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا " کہا کیجئے، کیونکہ آپ کے علوم بھی ترقی پذیر ہیں، گو آپ

اَعْلَمُ النَّاسِ وَاَشْرَفُ الْخَلْقِ

ہیں، مگر پھر بھی علوم و معارف کا انتہا نہیں ہوا، ترقی کی آپ درخواست

برابر کرتے رہے، بعض عارفین کا قول ہے کہ جنت میں پہنچ کر بھی یہ ترقی بند نہ ہوگی۔ وہاں بھی روز بروز درجات معرفت بڑھتے رہیں گے۔ اور حق تعالیٰ کی ذات ایسی لامتناہی بالفعل کے اعتبار ان کے کمالات کا کچھ انتہا نہیں ادھر اس کی معرفت کے مراتب یعنی لا تقف عند غیر متناہی کیونکر ہو سکتے ہیں۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

جب مراتب معرفت کا غیر متناہی ہونا معلوم ہو گیا تو اب جواب کا حاصل یہ ہے کہ مولانا کی نظر کمالات موجودہ پر نہ تھی، بلکہ کمالات آئندہ پر تھی، اور آئندہ کے مراتب پر نظر کر کے یہ کہنا صحیح ہے کہ میں کچھ بھی نہیں، جیسے شرح جامی پڑھنے والا منتہی عالم کو دیکھ کر کہتا ہے کہ واللہ میں تو کچھ نہیں، مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا، عالم تو فلاں شخص ہے میں اس کے سامنے جاہل محض ہوں اور جیسا کہ قل ہو اللہ کا حافظ پورے قرآن کے حافظ کو دیکھ کر کہتا ہے کہ واللہ میں حافظ نہیں ہوں حافظ تو یہ ہے تو کیا آپ اس قسم کو جھوٹا کہیں گے ہرگز نہیں کیونکہ وہ جس درجہ پر نظر کر کے قسم کھا رہا ہے اس درجہ کے لحاظ سے اس کی قسم سچی ہے اور جس درجہ میں آپ اس کو عالم یا حافظ سمجھ رہے ہیں، اس درجہ پر اس کی نظر ہی نہیں بلکہ پورے عالم اور پورے حافظ کے سامنے اپنے علم کو علم اور اپنے حفظ کو حفظ کہنے سے بھی شرماتا ہے اسی طرح یہاں سمجھئے کہ جب عارف پر عظمت حق کا انکشاف ہوتا ہے اس وقت وہ اپنے کو لاشئے اور عدم محض سمجھتا ہے۔ حق تعالیٰ کے وجود کے سامنے اپنے وجود کو لاشئے سمجھتا ہے اس کے علم کے سامنے اپنے

علم کو نیست و نابود سمجھتا ہے اور اس کے کمالات کے سامنے اپنے کمالات کو ناقص سمجھتا ہے، اسوقت تو اس کا یہ حال ہوتا ہے ؎

با وجودت ز من آواز نیاید کہ منم

سعدیؒ خوب فرماتے ہیں ؎

یکے قطرہ از ابر نیساں چکید!
خجل شد چو پہنائے دریا بدید

قطرہ اسی وقت تک اپنے کو کچھ سمجھ سکتا ہے جب تک اس نے دریا کو نہیں دیکھا، اور جب دریا سامنے آتا ہے، اس وقت تو شرمندہ ہو کر یوں کہتا ہے ؎

کہ جائے کہ دریاست من کیستم
اگر او ہست حقا کہ من نیستم

اس پر تفریع کر کے سعدیؒ فرماتے ہیں۔

ہمہ ہر چہ ہستند ازاں کمتر اند
کہ با ہستیش نام ہستی برند

حقیقت میں کمالات حق کے سامنے کسی کا منہ نہیں ہے جو اپنے لئے کوئی کمال بھی ثابت کر سکے، مگر چونکہ ہم پر عظمت حق و کمالات حق کا انکشاف نہیں ہوا اور ہمارا دماغ دعووں سے پُر ہے، ہم اپنے کو بہت کچھ سمجھتے ہیں، اسلئے مولانا کی یہ باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور حیرت ہوتی ہے کہ مولانا نے قسم کھا کر کیونکر اپنے کمالات کی نفی کر دی۔ صاحبو! ہمارے اوپر وہ حالت گذری نہیں جو ان پر گذرتی تھی۔ واللہ! مولانا نے جتنی بات کہی ہے

یہ تو کچھ بھی نہیں وہ تو اس سے بھی زیادہ کہتے (یعنی اپنی ہستی کی بھی نفی کرتے) مگر عوام کے فتنہ کے خیال سے پوری حقیقت نہیں کھولی، افسوس ہم آج کل ایسے زمانہ میں ہیں، جس میں ہم کو ان اقوال کی تفسیر کرنا پڑتی ہے، جن میں کچھ بھی اشکال نہیں، اور اگر اس سے زیادہ حقائق کو بیان کیا جائے تو ان کو شاید تفسیر کے بعد بھی لوگ نہ سمجھیں پس سخن کوتاہ باید والسلام۔ غرض اخص تو اپنے کمالات کی نفی کرتے ہیں اور خواص مدعی ہیں، اسلئے کسی امر پر اخص کی توجہ خواص کی توجہ کو مفید نہیں ہوتی، اسلئے وہ اشکال رفع ہو گیا کہ اس مضمون پر اخص الخواص کو تو توجہ ہے ان کے اثر سے خواص کو بھی توجہ ہو جاوے گی۔ جیسا کہ خواص کی توجہ سے عوام کو توجہ ہو جاتی ہے، پھر بیان کی غایت توجہ کیسے ہوگی اور یہاں سے معلوم ہوا کہ سلامتی اس میں ہے یا تو انسان محقق ہو یا مقلد ہو۔ اخص الخواص محقق ہیں اور عوام مقلد محض ہیں اور یہ جو بیچ کے لوگ ہیں یعنی خواص جو نہ محقق ہیں نہ مقلد ہیں یہ خطرہ میں ہیں۔ علامہ غزالیؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ اے عزیز! اگر تو محقق نہیں تو مقلد ہو جا، اور مقلد بھی نہ ہو تو کم از کم محققین کے علوم کا انکار تو نہ کر۔ بعض ایسے بھی ہیں جو ان علوم کی تقلید نہیں کرتے تو انکار بھی نہیں کرتے یہ بھی غنیمت ہیں، مگر بعض تو ان پر اعتراض کرتے ہیں، ان کی اصلاح سے مایوسی ہے غرض یہ مضمون نہایت اہم ہے کیونکہ اس پر عوام و خواص دونوں ہی کو توجہ نہیں ہے۔

صحیح تعلیم

اب وہ مضمون سنئے۔ ارشاد ہے:

ہندستانی لائبریری
گارڈن ریچ روڈ۔ مٹیا برج۔ کلکتہ

وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبَّانِیِّیْنَ

تقدیر کلام اس طرح ہے:۔

وَلٰکِنْ یَنْبَغِیْ لَہٗ اَنْ یَقُوْلَ کُوْنُوْا رَبَّانِیِّیْنَ

یعنی رسول سے یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ لوگوں کو اپنی عبادت کا امر کریں ہاں رسول کی شان یہ ہے کہ وہ یہ حکم دے سکیگا

کُوْنُوْا رَبَّانِیِّیْنَ

جسکے معنی یہ ہیں کہ اللہ والے ہو جاؤ۔ ربانی میں یا نسبت کی ہے اور الف و نون مبالغہ کے لئے بڑھایا گیا ہے، قرآن میں ایک مقام پر اصل کے موافق رِبِّیُّوْنَ بھی آیا ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو اللہ والا بننے کا حکم فرماتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ہے، اس سے بڑھکر اور کیا ہوگا۔

فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ

سب مسلمانوں کو عموماً اور اہل علم کو خصوصاً ضروری ہے اس پر توجہ کریں اور دیکھیں کہ اس میں ان سے کیا کوتاہی ہو رہی ہے، غور کے بعد معلوم ہو جائیگا کہ وہ کوتاہی کیا ہے، آگے اس امر کو اس امر کے ساتھ معلل فرماتے ہیں اس پر بھی اہل علم کو غور کرنا چاہئے، وہ علت یہ ہے:

بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتَابَ وَبِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ

حاصل یہ ہوا کہ چونکہ تم کتاب پڑھتے پڑھاتے ہو اس لئے تم کو اللہ والا بننا چاہئے

کتاب ہے یا تو کتاب معہود مراد ہے (یعنی قرآن) یا جنس کتاب مراد ہے یعنی کتب دینیہ لیکن لام جنس کی صورت میں بھی ہر قسم کی کتابیں خواہ ان کو دین سے تعلق ہو یا نہ ہو مراد نہیں ہو سکتیں بلکہ کتب دینیہ مراد ہیں کیونکہ اس جگہ "تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ" کو علت بنایا گیا ہے "كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ" کا پس اسی کتاب کی تعلیم و تدریس مراد ہو سکتی ہے جسکو اللہ والا بنانے میں دخل ہو اور ظاہر ہے کہ یہ اثر کتب دینیہ ہی کی تعلیم میں ہے نہ کہ اور کتب کی تعلیم و تعلم میں، لہذا جنس کو عموم کلی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تفصیل میں نے اس لئے کی کہ آج کل تعلیم کا لفظ نئی تعلیم پر بھی اطلاق ہونے لگا ہے۔ یعنی انگریزی تعلیم پر، چنانچہ اخباروں اور رسالوں میں جب تعلیم کے اہتمام پر زور دیا جاتا اور انگریزی کی ضرورت کو ظاہر کیا جاتا ہے تو جہل کی مذمت و علم کی فضیلت و ضرورت میں جو آیات و احادیث وارد ہیں ان کو استدلال میں پیش کیا جاتا ہے، جس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان آیات و احادیث میں علم سے مراد عام علم ہے جس کا مصداق علم دنیا بھی ہے، یاد رکھو یہ سراسر تحریف ہے اور اصطلاحات شرعیہ کا بدل دینا ہے، اس سے امام غزالیؒ کی پرانی شکایت تازہ ہو گئی وہ فرماتے ہیں منجملہ احداثات کے ایک احداث یہ بھی ہے کہ الفاظ شرعیہ کو ان کے معانی شرعیہ سے بدلا جاتا ہے، چنانچہ اے عزیز تم نے فقہ کے نئے معنی گھڑ لئے ہیں کہ صرف مسائل حیض و صلوٰۃ وغیرہ کا نام فقہ رکھ لیا ہے اور اس کا فقہ نام رکھ کر تمام ان فضائل کو اپنے اوپر منطبق کر لیا جو فقہاء کے لئے وارد ہوئے ہیں حالانکہ نص میں فقہ سے مراد مجموعہ علم و عمل ہے اور وہ فضائل علماء عاملین کے لئے مخصوص ہیں مگر تم نے اصطلاح شرعی کو بدل کر صغری تو خود گھڑ لیا کہ نحن فقہاء اور کبریٰ نصوص و

احادیث سے اخذ کیا،

وَمَنْ کَانَ فَقِیْهًا فَقَدْ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٖ خَیْرًا وَهُوَ کَذَا وَکَذَا

پھر ان سے نتیجہ نکال لیا۔

فنحن قد اراد اللہ بنا خیرا ونحن کذا ونحن کذا تمنی العلماء ورثۃ الانبیاء۔ وفضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم۔

وفقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد۔ وغیرہ

یاد کر کے اپنے آپ کو بھی علماء و فقہاء میں داخل کر لیا، حالانکہ دیکھنا یہ ہے، کہ قرآن نے بھی آپ کو عالم کہا ہے یا نہیں۔

حقیقی علم

سو سنئے۔ قرآن نے علماء بنی اسرائیل کی نسبت اول تو:

وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ

کہا، پھر فرمایا:

وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ،

اول لَقَدْ عَلِمُوْا ان کی اصطلاح کے موافق فرمایا، کیونکہ وہ بھی محض جان لینے اور لکھ پڑھ لینے کو علم کہتے تھے، پھر لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ اپنی اصطلاح کے موافق فرمایا، جس میں ان سے علم کی نفی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اصطلاح شریعت میں علم الفاظ و معانی کا نام علم نہیں، ورنہ یہ تو علماء بنی اسرائیل کو حاصل تھا، اس سے نفی ان سے کیونکر ہو سکتی ہے، بلکہ علم الفاظ کے ساتھ جب عمل بھی ہو،

اس وقت وہ علم کہلانیکا مستحق ہوتا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں:

إِنَّ مِنَ الْعِلْمِ جَهْلاً

بھی وارد ہے، اور ظاہر بات ہے کہ ایک چیز علم و جہل نہیں ہو سکتی، اسلیے مطلب حدیث کا یہ ہے۔

إِنَّ مِنَ الْعِلْمِ عِنْدَ النَّاسِ لَجَهْلاً عِنْدَ اللّٰهِ،

کہ بعض علم جس کو عرفاً سمجھا جاتا ہے وہ خدا کے نزدیک جہل ہوتا ہے معلوم ہوا کہ شریعت میں محض دانستن و نادانستن کا نام علم نہیں بلکہ ان کی حقیقت کچھ اور ہے، وہ وہی ہے جسکو ایک حدیث میں کہا گیا ہے، کہ بعض علم حجۃ اللہ علی العبد ہے جبکہ وہ اس کے اقتضار پر عمل کرے، پس اب دیکھنا چاہیے کہ ہم جو اپنے کو عالم اور فقیہ سمجھتے ہیں ہمارا علم اس کے موافق کہاں تک ہے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہمارے اندر تکبر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، ہم کو اپنے علم پر ناز ہے، دوسرے مسلمانوں کو ہم اپنے سے کمتر اور حقیر سمجھتے ہیں اور جلسوں میں جو علم کے فضائل ہم بیان کرتے ہیں اس سے مقصود اپنی فضیلت کا ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ ہم اس درجہ کے ہیں ہماری تعظیم کرنا چاہیے، مگر علماء کو اس طرز سے شرم کرنا چاہیے، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ علم حجۃ اللہ علی العبد ہے، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ عمل نہ ہو سکے تو علم ہی نہ پڑھو، کر اپنے اوپر حجت الٰہی کیوں قائم کریں، جیسا کہ میرے پاس ایک صاحب کا خط آیا ہے۔ لکھا ہے کہ میرا جی مرید ہونے کو چاہتا ہے مگر میں نے سنا ہے کہ مرید ہو کر ڈاڑھی رکھنی پڑے گی اسلیے مجبور رہوں کیونکہ میں ڈاڑھی منڈاتا ہوں، اس اللہ کے بندے نے ڈاڑھی کے خیال سے مرید ہونے کا ارادہ ہی ملتوی کر دیا۔

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی
گو مشت خاک ما ہم برباد رفتہ باشد

ہم اس سے خوش ہیں کہ اس نے اتنا تو سمجھا کہ مرید ہو کر داڑھی رکھنا پڑے گی ورنہ آجکل تو یہ آفت ہے کہ بہت لوگ طریقت و شریعت کو جدا جدا سمجھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اعمال ظاہرہ کی کوئی ضرورت نہیں، بس دل سے خدا کی یاد ہونا چاہئے تو بتائیے اس شخص کو آپ کیا رائے دیں گے، کیا آپ یہی کہیں گے کہ تم مرید نہ ہو کیونکہ داڑھی رکھنا پڑے گی، یا کہیں گے کہ بھائی داڑھی بھی رکھو اور مرید بھی ہو جاؤ اگر دونوں کام نہ ہو سکیں تو ایک کی وجہ سے دوسرے کو کیوں ملتوی کیا، مرید ہو جاؤ تاکہ ایک کام تو نیک ہو جائے گو اس کے ساتھ ایک گناہ بھی ملا ہوا ہے اسی طرح بعض عوام کا خیال ہے کہ وعظ سنکر عمل کرنا پڑے گا، اس لئے وعظ ہی نہ سننا چاہئے یہ خیال بالکل غلط ہے کیونکہ اس وقت آپکے اوپر دو جرم قائم ہوں گے، ایک ترک علم کا اور ایک ترک عمل کا، اور وعظ سن کر عمل نہ کیا تو صرف ترک عمل کا گناہ ہو گا، ترک علم کا تو گناہ نہ ہو گا، ایسے ہی یہاں سمجھو کہ جو علم عمل سے مجرد ہو گو وہ حجۃ اللہ علی العبد ہے مگر جہل محض سے پھر اچھا ہے کیونکہ اس پر ایک ہی جرم قائم ہو گا، یعنی ترک عمل کا اور اگر علم بھی حاصل نہ کیا تو دوسرا جرم ترک علم کا بھی قائم ہو گا، غرض گو یہ علم جہل محض سے اچھا ہے، مگر ان فضائل کا مصداق نہیں ہے جو نصوص میں وارد ہیں کیونکہ اس کے مقتضا پر عمل نہیں ہے اور وہ فضائل مجموعۂ علم و عمل کیلئے ہیں۔

ہماری حالت

ہمارے عمل کی یہ حالت ہے کہ مولوی صاحب تکبر کی وجہ سے کسی عامی کو

کبھی خود سلام نہ کریں گے، میں خود اپنی حالت بیان کرتا ہوں، کہ جب راستہ میں کوئی ایسا مسلمان ملتا ہے جو اصطلاحی عالم نہ ہو تو اس کو ابتداءً سلام کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ مگر آج کل عوام نے بھی ہم جیسے متکبر علماء کی حالت پر رحم کر کے اور ہماری رعایت کر کے اپنی صورتیں بگاڑ دیں، کہ بعض دفعہ سلام کرنے کا خیال بھی ہوتا ہے تو صورت دیکھ کر تردد پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ مسلمان ہے یا ہندو، اور اسی طرح سے سلام کرنے سے بچتے رہتے ہیں، سو یہ ان صاحبوں کا احسان ہے کہ ان بیچاروں نے اپنی صورت بگاڑ کر ہمارے ہاتھ میں ایک عذر دیدیا، چنانچہ بریلی میں بھائی سے ملنے کو دو شخص آئے ایک، تھانیدار صاحب تھے یہ مسلمان تھے مگر صورت سے ہندو معلوم ہوتے تھے، ڈاڑھی بالکل صاف تھی اور مونچھیں بڑی بڑی اور ایک تحصیلدار صاحب تھے جنکی ڈاڑھی خوب لمبی اور مونچھیں کتری ہوئی تھیں وہ ہندو تھا۔ بھائی نے نوکر سے پان لانے کو کہا، تو اس نے خاصدان ہندو تحصیلدار کے سامنے رکھ دیا، کیونکہ وہ مسلمان معلوم ہوتا تھا، نوکر کے اس فعل پر تھانیدار نے نوکر فوراً سمجھ گیا، اس نے تھالی ان کے سامنے کر دی، بھائی نے کہا افسوس آپنے ایسی صورت بنائی ہوئی ہے، جس میں اسلام کا کوئی اثر نہیں، تو شاید ان لوگوں نے یہ صورت ہمارے حال پر رحم کر کے اختیار کی ہے تاکہ ہم کو ترک سلام کے لئے بہانہ مل جائے۔ کہ ہم سلام کیسے کریں، یہ تو صورت سے سب ہندو ہی معلوم ہوتے ہیں، یہ تو ایک لطیفہ تھا، مگر مجھے علماء کی شکایت ہے کہ ہم لوگ اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں، عوام کو سلام کرنے سے ہم کو عار آتی ہے، بلکہ اس کے منتظر رہتے ہیں کہ پہلے دوسرے ہم کو سلام کریں، ہم عوام کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، حالانکہ مناسب یہ تھا، کہ ہم ان

لہ سبحان اللہ! کیا بلیغ عنوان ہے، جس میں علماء اور عوام دونوں کو متنبہ کیا گیا ہے ۱۲ جامع

کے ساتھ شفقت کا معاملہ کرتے، بتلائیے اگر ایک تندرست آدمی بیمار کو دیکھے تو اس کو مریض کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہئیے، ظاہر ہے کہ اس کو دیکھ کر رحم آتا ہے ایسے ہی مناسب یہ تھا کہ علماء عوام پر رحم کرتے اور ان سے شفقت برتتے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہی ہے۔

شفقتِ نبویؐ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کا اندازہ اس آیت سے ہوتا ہے:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا۔

ترجمہ: شاید آپ غم کی وجہ سے اپنے کو ہلاک کر ڈالیں گے، کہ وہ لوگ اس قرآن پر ایمان نہیں لاتے۔

کیا ٹھکانا ہے شفقت کا کہ حق تعالیٰ اس کی وجہ سے آپ کی ہلاکت کا اندیشہ ظاہر فرماتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ قرآن میں مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا، تو واقعی آپ کی شفقت اس درجہ کو پہنچی ہوئی تھی، اور اس سے ہم لوگوں کو بڑی امید ہے کہ جب آپ کو دشمنوں پر یہ شفقت تھی تو اپنے خدام پر تو کیا کچھ شفقت ہوگی۔

دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ با دشمناں نظر داری

غرض سنتِ رسولؐ یہ ہے کہ مبتلائے جہل پر رحم کیا جائے، واقعات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے کفار کے ساتھ ہمیشہ شفقت کا معاملہ فرمایا ہے

چنانچہ ایک بار آپ دعوتِ اسلام کیلئے طائف تشریف لے گئے تو وہاں کے رئیسوں نے آپ کو سخت جواب دیا اور اتباع سے انکار کیا، اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ اوباش کو آپ کے پیچھے لگا دیا، جنہوں نے حضورؐ پر پتھر برسائے، یہاں تک کہ آپ کی ایڑی سے خون بہنے لگا، اس وقت غضبِ الٰہی جوش میں آیا اور حق تعالیٰ کے حکم سے جبریل علیہ السلام ملک الجبال کو ساتھ لیکر حاضر ہوئے اور فرمایا اے محمدؐ حق تعالیٰ نے آپ کی قوم کا جواب سُنا اور ان کا معاملہ آپکے ساتھ دیکھا۔ اب یہ ملک الجبال آپکے حکم کے تابع ہے آپ جو چاہیں اس کو حکم دیں، اگر آپ چاہیں تو یہ اسی وقت مکہ اور طائف کے پہاڑوں کو باہم ٹکرا کر سب آدمیوں کو پیس ڈالے گا۔ صاحبو تم دنیا کے محکموں کو کیا دیکھتے ہو، حق تعالیٰ کے یہاں ہر چیز کا محکمہ ہے، پہاڑوں کا بھی ایک محکمہ ہے، جس پر فرشتے مقرر ہیں اور پہاڑ ان کے حکم کے تابع ہیں، جب اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں فرشتے پہاڑوں کو ہلا دیتے ہیں جس سے زلزلہ آجاتا ہے، بعضے پہاڑ پھٹ جاتے ہیں، کسی سے چشمے ابلنے لگتے ہیں، اسی طرح ہوا کا ایک محکمہ ہے اس پر بھی فرشتے مقرر ہیں، پانی کا بھی ایک محکمہ ہے، پھر ایسے محکمے باطنی کائنات میں بھی ہیں، اسی کو سنائی کہتے ہیں۔

آسماں ہاست در ولایتِ جاں
کار فرمائے آسمانِ جہاں
در رہِ روح پست و بالا ہاست
کوہ ہائے بلند و صحرا ہاست

غرض جس طرح ظاہر میں ہر چیز کے محکمے ہیں اسی طرح باطن میں بھی ہیں جیسا کہ

محکمے ہیں، جن سے ہم لوگ غافل ہیں، حالانکہ یہ ظاہری محکمے تابع ہیں باطنی محکموں کے حکام ظاہری وہی کرتے ہیں جو حکام باطن حکم دیتے ہیں، ان کی حکومت قلوب پر ہے، اور حکام ظاہری کی حکومت اجسام پر۔ غرض ملک الجبال حاضر ہوا، اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میں آپ کے حکم کا تابع ہوں جو چاہے حکم دیجئے، اگر آپ چاہیں تو میں پہاڑوں کو آپس میں ٹکرا کر ان سب کافروں کو پیس ڈالوں، جنہوں نے آپ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا ہے، حضور نے فرمایا مجھے اور میری قوم کو چھوڑ دو میں جانوں اور وہ مجھے جانیں، مجھے امید ہے کہ شاید ان میں سے یا اُن کی اولاد میں سے کچھ لوگ موحد پیدا ہوں پھر خدا تعالیٰ سے عرض کیا کہ خداوند ان کی ہلاکت سے مجھے کیا نفع؟ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ ان کی آنکھیں کھول دیں تاکہ یہ مجھ کو پہچان لیں، یہ اندھے ہیں مجھے پہچانتے نہیں اس لئے ایسا برتاؤ میرے ساتھ کرتے ہیں۔

رَبِّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ

کا یہی حاصل ہے۔ حضورؐ کی شفقت تو اعداء پر اس قدر تھی اور اعداء بھی کون جو رات دن ایذائیں دیتے تھے، اور افسوس ہے کہ ہم کو احباب سے بھی اس قدر شفقت نہیں۔

عوام کی غلطی

مگر اسی کے ساتھ مجھے عوام کی بھی شکایت ہے، اگر علماء ان کے ساتھ سختی کرتے ہیں تو ان کو اس سے ناگواری کیوں ہوتی ہے آخر وہ اطباء جسم

کے نخرے بھی اٹھاتے ہیں، اور ان کی سختی کو ہر طرح برداشت کرتے ہیں کیوں
محض اس لئے کہ صحت مطلوب ہے اور مطلوب کی تحصیل کے لئے سختی اور دشواری
سب کچھ گوارا ہوا کرتی ہے، پھر کیا صحت دین آپ کو مطلوب نہیں، اگر مطلوب
ہے تو اطبار باطن کی سختی اور دشواری بھی ناگوار نہیں ہونا چاہیئے۔ صاحبو!
اگر کسی کی گنی کھو گئی ہو اور ایک آدمی کے پاس اس کا پتہ ملے اور تم اس
سے مانگنے جاؤ اور وہ زور سے اس کو تمہارے منہ پر دے مارے کہ جا لے جا تو اس سختی
کی وجہ سے اس گنی کو آپ یہ کہہ کر دوبارہ پھینک دیجئے گا کہ اس طرح دینے
سے ہم نہیں لیں گے، پھر اگر کوئی ہمیں اچھی بات بتلا دے گو سختی ہی سے کہتا
ہو اس پر کو آپ کس لئے پھینکتے ہیں اور وہاں ناک منہ کیوں چڑھاتے ہیں،
معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو گنی تو مطلوب ہے، دین نہیں مطلوب، اس لئے کہ بعض
لوگ اس تلاش میں رہتے ہیں کہ پیر ایسا ملے جو مریدوں کی خاطر کرتا ہو،
چنانچہ ایک تعلقہ دار صاحب نے لکھنؤ میں مجھ سے خود کہا کہ کوئی ایسا پیر بتلاؤ جو
مریدوں کی قدر کرتا ہو، مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب تو مریدوں کی بہت
ذلت کرتے ہیں، میں نے دل میں کہا حضرت آپ کو طلب ہی نہیں، طلب
ہوتی تو مقصود تک پہنچانے والے کی ہر سختی گوارا ہوتی، طالب کی شان
تو ایسی ہوتی ہے، جیسے وزیر حیدرآباد کا قصہ ہے کہ وہ شاہ فضل الرحمٰن صاحب
کی زیارت کو آئے تو مولانا نے فرمایا اسے نکالو! صاحبزادہ نے عرض کیا،
حضرت یہ حیدرآباد کے وزیر ہیں، فرمایا اسے تو پھر میں کیا کروں، مجھے کوئی حیدرآباد
سے تنخواہ تو نہیں ملتی جو میں وزیر صاحب سے ڈر جاؤں، وزیر ہوں گے اپنے گھر کے

پھر عرض کیا حضرت یہ بہت دور سے مشتاق ہو کر آئے ہیں ؛ بڑے امراء کے بعد فرمایا کہ اچھا رات کے دو بجے تک رہنے کی اجازت ہے، دو بجے کے بعد چلے جائیں، اس درویش کا ادب دیکھئے کہ اس کو حضرت کے ارشاد سے ذرا بھی ناگواری نہیں ہوئی اور رات کے دو بجتے ہی خانقاہ سے چلے گئے، کسی نے کہا بھی کہ حضرت تو سوئے ہیں ان کو کیا خبر ہوگی آپ صبح کو چلے جائیں کہا نہیں اب حضرت کی اجازت نہیں اور بزرگوں کے حکم کے خلاف کرنا بے ادبی ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو ایک منٹ کو بھی نہ ٹھہرتا اور ناک منہ چڑھا کر فوراً چلدیتا مگر وہ طالب تھا اس لئے جتنی دیر کی اجازت تھی اتنی دیر قیام کو غنیمت سمجھا اور وقت کے بعد چلا گیا، صاحبو! اگر آپ کسی حاکم کے پاس جائیں اور وہ بات چیت میں سختی کرے مگر فیصلہ آپ کے موافق کر دے تو تم اس کی تعریف کروگے یا شکایت، مشاہدہ ہے کہ اس صورت میں حاکم کی بہت تعریف کی جاتی ہے اور اس کی سختی میں حکمتیں بیان کی جاتی ہیں، حاکم نے ہمارے ساتھ ابتداء میں سختی کا برتاؤ اس لئے کیا تاکہ کسی کو رعایت طرفداری کا وہم نہ ہو اے اللہ! ایک دنیا دار حاکم کے افعال میں تو حکمت ہو اور خادمان دین کے افعال میں حکمت نہ ہو یہ کیسی بے انصافی ہے پس اگر کوئی پیر تمہارے ساتھ سختی کرے مگر اس کے ہاتھ سے تمہارا کام بن جائے تو ہزار بار مبارک ہو، اس کی ایسی مثال ہے جیسے باپ اپنے بچہ پر سختی کرتا ہے کہ یہاں نہ بیٹھو، فلاں فلاں آدمیوں سے نہ ملو اور یہ چیز نہ کھاؤ، وقت پر پڑھنے جاؤ، اور اگر وہ کبھی اس کے خلاف کرتا ہے تو بیٹے کو سزا دیتا ہے، مگر اس میں کوئی بھی

باپ کو ظالم نہیں کہتا بلکہ اس سختی کو بیٹے کے حق میں شفقت و رحمت سمجھتے ہیں، پھر مشائخ کی سختی کو بھی شفقت پر کیوں نہیں محمول کیا جاتا یہ تو درمیان میں عوام کی شکایت کا جواب تھا جو بطور جملہ معترضہ کے بیان ہو گیا، اس کا حاصل یہ ہے کہ علماء اگر سختی کریں تو آپ کو شکایت اور ناگواری کا حق نہیں کیونکہ تم دنیا کے واسطے اس سے بھی زیادہ سختی کو خوشی سے برداشت کرتے ہو پھر دین کے واسطے کیوں نہیں برداشت کرتے، ہاں اگر تم دنیا کے واسطے بھی کسی حاکم اور اور طبیب اور وکیل وغیرہ کی سختی کو برداشت نہ کیا کرتے تو پھر واقعی تمہاری شکایت کسی درجہ میں صحیح ہوتی۔

علماء کو تنبیہ

اب میں پھر علماء کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ آپ کو عوام کے ساتھ شفقت کا معاملہ کرنا چاہئے ان کو ذلیل و حقیر نہ سمجھنا چاہئے۔ شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ آپ وعظ فرما رہے تھے کہ اسی مجلس میں ایک شخص پر نظر پڑی جس کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچا تھا، کوئی آج کل کا مولوی ہوتا تو یا وعظ ہی میں اس کی خبر لیتا یا کچھ بھی نہ کہتا۔ مگر شاہ صاحب نے وعظ میں تو اس سے کچھ تعرض نہ کیا کیونکہ آداب وعظ میں سے یہ بات ہے کہ وعظ میں تعرض خاص نہ ہو بلکہ خطاب عام ہونا چاہئے اور امر بالمعروف کو ترک بھی نہیں کیا، بلکہ جب وعظ ہو چکا تو آپ نے ان صاحب سے فرمایا کہ تم ذرا ٹھہر جاؤ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے وہ تو سہم گیا کہ بس اب میری خبر لی جائیگی، مگر اہل اللہ کے یہاں کسی کی خبر نہیں لیجاتی،

ہاں خبر دیجاتی ہے، چنانچہ جب سب لوگ چلے گئے تو آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ بھائی میرے اندر ایک عیب ہے، جس کو میں تم پر ظاہر کرتا ہوں وہ یہ کہ میرا پاجامہ ڈھلک کر ٹخنوں سے نیچے پہنچ جاتا ہے اور اس کے متعلق حدیث میں سخت وعید آئی ہے اس کے بعد آپ نے سب وعیدیں بیان کر دیں، پھر کھڑے ہو کر فرمایا کہ ذرا دیکھنا میرا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے تو نہیں ہے، اس شخص نے شاہ صاحب کے پیر پکڑ لئے اور کہا حضرت آپ میں تو یہ عیب کیوں ہوتا یہ مرض تو مجھ نالائق میں ہے، میں آج سے توبہ کرتا ہوں، انشاء اللہ پھر ایسا نہ ہوگا۔ دیکھئے شاہ صاحب نے کس شفقت کے ساتھ نصیحت فرمائی جس کا فوراً اثر ہوا واللہ! شفقت کا اثر مخاطب پر ضرور ہوتا ہے، ہاں کوئی بہت ہی نجس ہو تو اور بات ہے، صاحبو! ہم کو عوام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرنا چاہئے جیسا کہ اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے اور اگر کسی سے کنارہ کشی اور علیحدگی ہی اختیار کی جائے تو اس میں بھی خیر خواہی کا قصد ہونا چاہئے، اور ظاہر میں تہذیب کے ساتھ تعلق قطع کرنا چاہئے۔ خدا تعالیٰ کا حکم ہے:

وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ۔

حالانکہ کفار کا چھوڑنا اور ان سے تعلق قطع کرنا فرض ہے مگر اس کے لئے بھی شائستگی اور تہذیب کی تاکید ہے۔ کہ ان سے [ف] خوبی کے ساتھ تعلق قطع کرو۔

ف۔ سبحان اللہ اسلامی تعلیم کس قدر پاکیزہ ہے اس سے اہل تحریکات کو سبق لینا چاہئے جو ایسے موقعہ میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر تہذیب سے بالکل ہی گندے ہو جاتے ہیں، جس سے کفار کو یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید ان کے مذہب نے ان کو یہی تعلیم دی ہوگی، خصوصاً جبکہ وہ اپنے طرز پر احادیث و قرآن سے استدلال بھی کرتے ہوں۔ صاحبو! اپنی حرکات سے تعلیم اسلام کو بدنام نہ کرو۔ ۱۲ جامع

افسوس ہم مسلمانوں سے بھی تہذیب و شائستگی نہیں برتتے، معلوم ہوتا ہے کہ ہمکو مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی اور شفقت کا تعلق بہت ہی کم ہے، بلکہ ہم لوگ مسلمانوں کے ساتھ تکبر کرتے اور ان کو حقیر سمجھتے ہیں، اور یہ تکبر بڑا ہی خناس ہے جبتک یہ ہمارے اندر رہے اس وقت تک ہم سے حقوق علم ادا نہیں ہو سکتے، اور یہ صرف علم حاصل کرنے سے نہیں نکل سکتا، جیسا کہ کسی کو خارش کا نسخہ یاد ہو، تو محض نسخہ یاد ہو جانے سے خارش دفع نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ نسخہ کے اجزاء جمع کرو اور اس کا استعمال شروع کرو، مضرات سے پرہیز کرو، اور جبتک طبیب مشورہ دے اسوقت تک برابر نسخہ کا استعمال اور پرہیز جاری رکھو، جبتک طبیب نبض دیکھکر یہ نہ کہدے کہ اب خارش کا مادہ زائل ہو گیا ہے اس وقت تک تدبیر کو نہ چھوڑا جائے، یہی صورت یہاں بھی ہے، محض ازالۂ کبر کی تدابیر احیاء العلوم وغیرہ سے یاد کر لینا کافی نہیں بلکہ اُن کے استعمال کی ضرورت ہے، اور استعمال بھی کسی طبیب نفس کے مشورہ سے ہونا چاہئے، کیونکہ ہر تدبیر ہر ایک کو نافع نہیں ہوتی، جیسا کہ ہر نسخہ ہر شخص کے موافق نہیں ہوتا۔

اصلاحِ نفس کی صورت

پس پہلے طبیب کو تجویز کرو، کیونکہ ہر علاج کرنے والا طبیب نہیں ہوتا بعضے عطائی حکیم بھی ہوتے ہیں، نیز طبیب وہ ہے جو خود علیل نہ ہو کیونکہ قاعدہ ہے رای العلیل علیل بیمار کی رائے بھی علیل ہوتی ہے، مگر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پر بیماری غالب ہو اور کوئی مرض اس کا لازم نہ ہو، باقی اتفاقاً کبھی کوئی

مرض تھوڑی دیر کے لئے لاحق ہو جانا طبیب ہونے کے منافی نہیں کیونکہ حقیقی صحت تو شاید ہی کسی کو حاصل ہو۔ (انبیاء علیہم السلام کے سوا معصوم کوئی نہیں) مثلاً کسی متواضع سے کبھی کوئی بات تکبر کی نکل جائے تو یہ مضر نہیں، ہاں اس کے افعال و احوال میں زیادہ غلبہ تواضع کا ہونا چاہئے جو شخص ایسا ہو وہ طبیب ہے اس کو غنیمت سمجھو، اس کا انتظار نہ کرو کہ پیر جنیدؒ بغدادی ہی ہو۔ کیونکہ اگر تم جنیدؒ کو دیکھتے تو ان میں بھی کوئی نہ کوئی نقص ضرور نکال دیتے، پس اس علامت سے طبیب کو تلاش کر کے اپنے کو اس کے سپرد کر دو اور وہ جو تصرف تمہارے اندر کرے اس پر راضی ہو کر عمل کرو کیونکہ اگر تمہارے اندر تکبر کا خناس ہوگا تو اسکا علاج تذلیل و تحقیر سے کرے گا، ایسی تدبیریں بتلائیگا جن سے نفس پامال ہو جائے جیسا سلطان نظام الدینؒ بلخی قدس سرہ نے شیخ ابو سعید گنگوہیؒ کا علاج کیا تھا، جب یہ شیخ کے پاس طلب طریق اور اصلاح نفس کے لئے حاضر ہوئے تو شیخ نے دیکھا کہ ان میں صاحبزادگی کا اثر بہت کچھ ہے آپ نے ان کا یہ علاج کیا کہ خانقاہ کا حمام جھونکنا ان کے سپرد کیا، سال بھر تک بیچارے حمام جھونکتے رہے، ایک سال کے بعد شیخ نے بھنگن کو حکم دیا کہ آج ذرا تو ابو سعیدؒ کے پاس جانا اور جو کچھ وہ تمہیں کہیں مجھے مطلع کرنا۔ بھنگن نے ایسا ہی کیا تو شیخ ابو سعیدؒ نے تیز نگاہ سے اس کو گھورا اور فرمایا گنگوہ نہ ہوا جو تجھے مزہ چکھا دیتا، بھنگن نے شیخ کو اطلاع دی کہ ابو سعیدؒ نے یوں کہا تھا، فرمایا اوہو! ابھی تک گنگوہ کی پیرزادگی کا اثر باقی ہے تو ایک سال تک اور اسی کام پر رکھا، سال بھر کے بعد بھنگن کو پھر وہی حکم دیا، اور فرمایا اب کے تھوڑا سا کوڑا بھی ان پر جھاڑ دینا اور جو کچھ کہیں اس کی مجھے خبر کرنا، اس نے

ایسا ہی کیا تو شیخ ابو سعیدؒ نے زبان سے کچھ نہیں کہا صرف غصہ سے ایک دفعہ گھور کر دیکھا، بھنگن نے شیخ کو اطلاع دی فرمایا کچھ کچھ اصلاح ہو چلی ہے مگر پوری نہیں ہوئی ابھی دماغ میں خناس موجود ہے ایک سال تک اور حمام جھکوایا پھر بھنگن کو ہی حکم دیا اور فرمایا اس مرتبہ پورا ٹوکرا ان کے اوپر ڈال دینا اس نے ایسا ہی کیا تو شیخ ابو سعیدؒ رونے لگے کہ شاید میری وجہ سے تجھے ٹھوکر لگی ہے اگر کہیں چوٹ لگی ہو تو مجھ سے بدلہ لے لے یا معاف کر دے غرض اس کی خوشامد کرنے لگے، بھنگن نے شیخ کو اطلاع دی تو فرمایا الحمد للہ نفس کی اصلاح ہو گئی، اسکے بعد پھر یہ خدمت چھڑا دی اور کچھ ذکر و شغل بتلایا اور مجلس میں حاضر ہونے کی اجازت دی، مگر بات کرنے کی اجازت نہ تھی تو یہ نفس ان طریقوں سے درست ہوتا ہے، اور یہ ذلت اول اول مرید کو بہت ناگوار ہوتی ہے اگر اس کو ہمت کے ساتھ برداشت کرنا چاہئے جیسا کہ دوائے تلخ ناک اور منہ بند کرکے پیا کرتے ہیں، حضرت شبلیؒ کا واقعہ ہے کہ ان کے ایک مرید نے شکایت کی کہ مجھے ذکر سے نفع نہیں ہوتا، شیخ نے توجہ کی تو اس کا سبب تکبر معلوم ہوا، آپ نے اس کے علاج کرنے کے لئے فرمایا کہ تو ایک ٹوکرا اخروٹوں کا فلاں محلہ میں (جہاں اس شخص کے معتقد بہت تھے) لیجا اور عام طور سے یہ اعلان کر دے کہ جو کوئی میرے ایک دھول مارے گا اسے ایک اخروٹ ملیگا، یہ سنکر مرید نے کہا اللہ اکبر میں ایسا کروں؟ شیخ نے فرمایا کمبخت یہ اللہ کا نام وہ ہے کہ اگر کافر صد سالہ اس کو کہے تو مسلمان ہو کر جنتی ہو جائے، مگر تو نے جس موقعہ پر یہ نام لیا ہے اس سے تو کافر ہو گیا، کیونکہ اس وقت تو نے اللہ اکبر خدا کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے نہیں کہا بلکہ

اپنی عظمت ظاہر کرنے کے لئے کہا ہے، جا اپنے ایمان کی تجدید کر۔ سو پہلے پہل یہ ذلت کے کام نفس کو بہت ناگوار ہوتے ہیں مگر بدون ذلت کے کام بھی نہیں بنتا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ اور بندہ کے درمیان بھی خودی حائل ہے اگر یہ نکل جائے تو بس واصل ہے اور جب تک یہ باقی ہے اس وقت تک وصول نہیں ہو سکتا۔

عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

میانِ عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست

تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا تھا، عرض کیا:

یَا رَبِّ دُلَّنِیْ عَلٰی اَقْرَبِ الطَّرِیْقِ اِلَیْکَ ۔۔

یعنی خداوندا مجھے اپنے تک پہنچنے کا نزدیک رستہ بتا دیجئے

جواب ارشاد ہوا:

یَا بَایَزِیْدُ دَعْ نَفْسَکَ وَتَعَالَ

یعنی اپنے آپ کو چھوڑ دو اور آ جاؤ۔

مولانا اسی کو فرماتے ہیں:

قرب نزدیکی بہ بالا رفتن ست

قرب حق از قید ہستی رستن ست

"از قید ہستی رستن ست" کے معنی یہ نہیں کہ سنکھیا کھا کر مر جاؤ، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے اوپر نظر نہ کرو، اپنی ذات کے مطالعہ میں مشغول نہ ہو،

اپنے ارادہ و اختیار کو فنا کر دو، دعوے اور پندار کو مٹا دو، اپنے علوم پر نظر کرنا یہ بھی اشتغال بنفسہ ہے، جس میں علماء کی جماعت زیادہ مبتلا ہے،

حجاب انانیت

محققین کا قول ہے کہ حجاب علم حجاب جہل سے اشد ہے یعنی معنی ہیں اس قول کے۔

اَلْعِلْمُ هُوَ الْحِجَابُ الْاَكْبَرُ

سو اس میں ایک قید ہے، جس کو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا۔ حضرت کا ارشاد ہے:

اَلْعِلْمُ بِغَيْرِ اللهِ هُوَ الْحِجَابُ الْاَكْبَرُ

یعنی جس علم میں غیر اللہ کی طرف التفات و اشتغال ہو وہ حجاب اکبر ہے۔

اس سے علوم وہبیہ اور واردات قلبیہ خارج ہو گئے کہ وہ حجاب نہیں، کیونکہ ان سے غیر کی طرف التفات نہیں ہوتا بلکہ ان سے عظمت حق کا انکشاف ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو علوم ظاہرہ سے التفات الی الغیر نہ رہے وہ بھی حجابیت سے خارج ہو جائیگا، اور اگر کسی کو علوم وہبیہ واردات قلبیہ سے بھی عجب ہونے لگے اس کے لئے یہ بھی حجاب ہو جائیں گے مگر ایسا کم ہوتا ہے، بخلاف علوم ظاہرہ کے کہ ان میں اکثر لوگوں کے لئے غوائل نفس زیادہ محتمل ہیں غرض ہم لوگ رات دن اپنے نفس کے ساتھ مشغول ہیں بلکہ کسی دوسرے کیساتھ بھی

جو مشغول ہوتے ہیں وہ بھی اپنے ہی لئے، کسی سے عشق بھی ہوتا ہے وہ بھی اپنے ہی واسطے ہوتا ہے، اگر کسی مدرسہ کی ترقی کی فکر ہے وہ بھی اپنی ہی غرض کے لئے، اگر وعظ و درس کا مشغلہ ہے تو وہ بھی اس لئے کہ ہم واعظ یا مدرس مشہور ہوں گے چار آدمی ہماری تعظیم کریں گے، یہ ہی ہے اصل حجاب، اسی کے قطع کرنے کا حکم ہے ہیں حق تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ:

دَعْ نَفْسَكَ وَتَعَالْ

یہ انانیت بڑا حجاب ہے اور اس کا علاج بدوں ذلت نفس کے نہیں ہو سکتا کیونکہ اطباء کا اس پر اتفاق ہے:

اَلْعِلَاجُ بِالضِّد

یعنی حرارت کا علاج برودت سے ہوتا ہے، برودت کا علاج حرارت سے شاید اس پر کوئی یہ کہے کہ میں اہل ہند کا قول لیتا ہوں۔

اَلْعِلَاجُ بِالْمِثْلِ

یعنی حرارت کا علاج حرارت سے اور برودت کا علاج برودت سے، اس لئے میں تکبر کا علاج تکبر ہی سے کرتا ہوں، تو میں کہوں گا کہ تم نے اطباء ہند کے قول کا مطلب ہی نہیں سمجھا، ان کا یہ مطلب نہیں کہ مزاج کی حرارت کا علاج خود مزاج کی حرارت سے کیا جاتا ہے، بلکہ حرارت مزاج کا علاج حرارت دوا سے ہوتا ہے، دونوں حرارتوں کا محل الگ الگ ہے، پس تکبر کا علاج اگر تکبر سے ہو تو وہ اپنا تکبر نہیں بلکہ حضرت حق کی شان کبریائی کا استحضار ہونا چاہئے یہ ہے علاج الکبر بالکبر۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ اپنے سے بڑے کے سامنے اپنی بڑائی جاتی رہتی ہے

جیسے ایک دہقان زادہ اپنے باپ کے ساتھ جا رہا تھا وہ سمجھتا تھا کہ میرا باپ گاؤں کا چودھری ہے اس سے اور بڑا کون ہوگا۔ اتفاق سے راستہ میں کسی بادشاہ کا کیمپ پڑا ہوا تھا، جس کو شیخ نقل کرتے ہیں ؎

نیس رہے با پسر در دہے
گذشتند بر قلب شاہنشہے

اس کو دیکھ کر دہقان کانپنے لگا، ساری چودھراہٹ دھری رہ گئی۔ دہقان زادہ حیران ہوگیا کہ یہ کون شخص ہے جس سے میرا باپ کانپنے لگا، بعد میں پوچھا کہ ابا جان کیا آپ سے بھی بڑا کوئی چودھری ہے جس سے آپ ڈر گئے، کہا بیٹا بادشاہ کے سامنے میں کیا چیز ہوں کچھ بھی نہیں۔

اسی پر شیخ تفریع فرماتے ہیں ؎

تو اے غافل از حق چناں در دہی
کہ بر خویشتن منصبے می نہی

صاحبو! میں بقسم کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ کی عظمت دل میں آجائے، تو کسی کی زبان سے اپنی نسبت مولانا صاحب وغیرہ تعظیمی الفاظ سننے سے شرم آنے لگے، جیسا کہ سررشتہ دار کو کلکٹر کے سامنے اپنی تعظیم ہونے سے شرم آتی ہے۔ ایک بزرگ صاحب حال کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ کسی نے ان کو پنکھا جھلنا چاہا تو نہایت سختی سے منع فرمایا، پھر تھوڑی دیر کے بعد اجازت دے دی، بعض لوگ تو اس کو جنون سمجھیں گے مگر واللہ! یہ جنون نہیں، اور اگر کوئی ان کو مجنون ہی کہے تو وہ اس کی پروا نہیں کرتے اور یوں کہتے ہیں کہ ؎

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم
مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

اور جسکو یہ جنون نہ ہو وہ خود دیوانہ ہے ؎

او ست دیوانہ کہ دیوانہ نشد
مر عسس را دید و در خانہ نشد

کسی نے ان بزرگ سے دریافت کیا کہ حضرت اس کی کیا وجہ تھی کہ آپ نے اول تو پنکھا جھلنے سے منع فرمایا اور بعد میں اجازت دے دی، فرمایا اسوقت مجھ پر عظمت حق کا غلبہ ہو رہا تھا، اس وقت مجھے کسی کا پنکھا جھلنا سخت ناگوار ہوا، یوں معلوم ہوتا تھا کہ میرے ساتھ مذاق کر رہا ہے، جب وہ غلبہ کم ہو گیا تو میں نے اجازت دے دی۔ صاحبو! اس کا انکار نہ کرو، یہ سب باتیں پیش آتی ہیں، غرض ہمارے اندر تکبر اسی وقت تک ہے، جب تک کہ خدا تعالیٰ کی عظمت دل میں نہیں آئی۔ اور اگر عظمت حق دل میں آ جائے تو پھر یہ حال ہو گا ؎

چو سلطان عزت علم بر کشد
جہاں سر بجیب عدم در کشد

پھر یہ سارے دعوے نیست و نابود ہو جائیں گے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اپنے مراتب و مناقب بیان فرمائے وہ محض حق تعالیٰ کے حکم سے بیان فرمائے ہیں (جیسے اولیاء میں بھی ایسے ہوئے ہیں، جنہوں نے حق تعالیٰ کے حکم سے قَدَمِی ھٰذِہٖ عَلٰی رَقَبَۃِ کُلِّ اَوْلِیَاءِ اللّٰہِ کہا ہے) پھر باوجود یکہ جو کچھ آپ نے فرمایا حق سے فرمایا

مگر حضورؐ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان مراتب کو بیان فرماتے ہوئے شرماتے تھے، چنانچہ اسی لئے بار بار

وَلَا فَخْرَ وَلَا فَخْرَ

بھی فرماتے جاتے ہیں، آپنے ہماری اصلاح ایمان کے لئے اپنے واقعی فضائل بیان فرما دیئے، تاکہ مسلمان جوشِ محبت میں اپنی طرف سے مبالغہ کرکے ایسے فضائل نہ تراشیں جن سے دوسرے انبیاء کی تنقیص ہو جائے، چنانچہ اس سے بچانے کے لئے آپنے یہ بھی فرمایا ہے:

لَا تُفَضِّلُوْنِیْ عَلٰی یُوْنُسَ بْنِ مَتّٰی

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری اصلاح کے لئے اور وہ بھی حکم حق سے بہت شرماتے ہوئے اپنے کچھ فضائل بیان فرمائے ہیں اور یہ شرم و حیاء عظمتِ حق کی وجہ سے تھی، کیونکہ عظمتِ حق کا علم تمام مخلوق سے زیادہ آپ کو تھا، چنانچہ فرماتے ہیں:

اَنَا اَعْلَمُکُمْ بِاللّٰہِ وَاَخْشَاکُمْ لِلّٰہِ

آپ کے کمالِ علم و معرفت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ باوجودیکہ حق تعالیٰ کے محامد جیسے حضورؐ نے بیان فرمائے ہیں ایسے کسی نے بیان نہیں کئے، مگر اس پر بھی یہ آپ کی شان واضح دیکھئے کہ باوجود اتنے بے نظیر محامد بیان فرمانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ۔

اور اس کی وجہ یہی تھی یعنی انکشاف عظمت حق جس سے تواضع وعبدیت پیدا ہوتی ہے، اس مضمون کے قریب حضرت مرزا مظہر جانجاناں کی حمد و نعت بھی ہے، گویا اسی حدیث کا ترجمہ فرماتے ہیں ؎

خدا در انتظار حمد ما نیست
محمد چشم بر راہ ثنا نیست
خدا مدح آفریں مصطفےٰ بس
محمد حامد حمد خدا بس
مناجات اگر خواہی بیاں کرد
بہ بیتے ہم قناعت می تواں کرد
محمد از تو مے خواہم خدا را
الٰہی از تو حب مصطفےٰ را

اے اللہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو باوجود اتنے کمالات کے تواضع اختیار کریں اور ہم ذرا سے علم پر نازاں ہوں، یاد رکھو یہ ناز کرنا ہی اس کی دلیل ہے کہ تم کمال سے عاری ہو ورنہ اہل کمال ناز نہیں کیا کرتے کیونکہ انکو کمال کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے، جس سے اپنے کو عاجز پاکر وہ کبھی ناز نہیں کر سکتے۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ آپ نے وعظ کہا تو بعد وعظ کے کسی نے تعریف کی، فرمایا میں کیا چیز ہوں، اس نے کہا یہ آپ تواضعاً فرماتے ہیں، آپ نے فرمایا یہ تواضع کا کلمہ نہیں تکبر کا کلمہ ہے یہ کلمہ وہی کہہ سکتا ہے، جس کو کمال کی پوری حقیقت معلوم ہو وہ اس پر نظر کر کے

کہتا ہے میں کچھ نہیں، غرض جسکو کمال کی حقیقت معلوم ہوگی وہ کبھی کمال کا دعویٰ نہ کرے گا، مگر آج کل ہم لوگوں نے محض چند الفاظ یاد کر لینے کو کمال سمجھ لیا ہے ہم ناز کرتے ہیں کہ ہم کو عربی لکھنا اور بولنا آتی ہے مگر اس سے کیا ہوتا ہے، صاحبو! اگر ایک شخص جاہل ہو مگر خدا سے اس کو تعلق ہو اور ایک شخص عربی داں ہو مگر خدا سے علاقہ نہ ہو تو بتلایئے ان دونوں میں کون افضل ہوگا، یقیناً وہ جاہل افضل ہے جس کو خدا تعالیٰ سے علاقہ ہو اور محض عربی دانی کس کام کی جس میں خدا سے بے تعلق ہو۔

طلباء کو نصیحت

اسی لئے میں طلبہ کو نصیحت کرتا ہوں کہ زیادہ توجہ فقہ و حدیث و تفسیر پر کریں کہ یہی علوم مقصودہ ہیں، انہی سے خدا تعالیٰ اور رسول صلعم کی عظمت کا علم ہوتا ہے اور معقول و ادب میں بقدر ضرورت توجہ کریں، کیونکہ عربی داں ہونا کچھ کمال نہیں خدا داں ہونا چاہئے، اگر عربی دانی کوئی چیز ہوتی تو ابوجہل حضرت بلال رضؓ سے افضل ہوتا کیونکہ وہ قریشی فصیح ہے اور حضرت بلال رضؓ حبشی ہیں جو ابوجہل کے برابر ہرگز فصیح و بلیغ نہ تھے مگر دیکھ لیجئے کہ عربی دانی اس کے کیا کام آئی کچھ بھی نہیں بلکہ وہ ابوجہل ہی رہا اور حضرت بلال رضؓ وہ ہیں جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت میں اپنے آگے آگے چلتا دیکھا تھا، اسی کو ایک بزرگ کہتے ہیں ؎

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم
ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست

یہاں سے معلوم ہوا کہ محض عربی دانی کوئی چیز نہیں ورنہ ایسا شخص عالم ہے بلکہ ابوجہل کی طرح جاہل ہے، اصل علم وہ ہے جس کو حق تعالیٰ اس آیت میں فرماتے ہیں:

كُونُوا رَبَّانِيِّينَ

یعنی اللہ والے ہو جاؤ خدا تعالیٰ سے علاقہ پیدا کرو:

بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُونَ

یعنی تم کتاب پڑھاتے اور پڑھتے ہو، اس میں ایک مقتضی کا ذکر ہے۔ کہ تمہارا یہ فعل خود اس کو مقتضی ہے کہ تم کو اللہ والا بننا چاہیے اور

كُونُوا رَبَّانِيِّينَ

کے بعد اس مقتضی کا بیان فرمانا ہم کو شرم دلانے کے لئے ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر تم ہمارے کہنے سے "ربانی" نہیں بنتے تو اپنے کئے ہی کی شرم کرو، اور اسی سے ربانی بن جاؤ، یہ طرز ایسا ہے جیسا کوئی شخص حریص لالچی ہو اور کسی وقت بیٹوں کا باپ بن جائے تو اس سے کہا کرتے ہیں کہ میاں اب تم باپ بن گئے ہو اب تو بچپن کی سی حرص کو جانے دو۔ غرض جب مخاطب میں کسی امر کا مقتضی موجود ہو اور پھر بھی وہ اس کو اختیار نہ کرے تو اس مقتضی کو بیان کرکے زیادہ عار دلایا کرتے ہیں، اسی طرح یہاں حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ تمہاری درس و تدریس ہے خود مقتضی اتم ہے ربانی بننے کی پھر حیرت ہے اگر باوجود مقتضی کے تم ربانی نہ ہو کہ اس وقت تمہارا ربانی نہ بننا اور عمل کا اہتمام نہ کرنا بڑا ظلم ہوگا اور میں نے مقتضی کے ساتھ اتم کی قید اس لئے بڑھائی تاکہ عوام اس سے خوش نہ ہوں کہ ہم تو سستے چھوٹے، ہمارے اندر عمل کا مقتضی ہی نہیں، اس لئے ہم کو

کو نوا رہتا ہے نہ یہ کہ خطاب کے مخاطب نہیں، سو وہ سن لیں کہ مقتضی ان کے پاس بھی ہے اور وہ خوش نہ ہوں، اس میں ان کی عید نہیں ہے بلکہ ان کے لئے بھی وعید ہے، کیونکہ ایک مقتضی ان کے پاس بھی ہے اور وہ مقتضی کیا ہے؛ ایمان۔

ایجاب و قبول کی حقیقت

شاید اس پر کوئی یہ کہے کہ ایمان تو

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

سے ہو جاتا ہے، جس میں صرف توحید و رسالت کا اقرار ہے، نماز، روزہ اور حج و زکوٰۃ کا کہاں اقرار ہے سو آپ گھبرائیں نہیں میں ابھی ثابت کرتا ہوں کہ اس میں سب باتوں کا اقرار ہے، جس کو میں ایک مثال سے واضح کرنا چاہتا ہوں جو نہایت لذیذ مثال ہے وہ یہ کہ نکاح آپ کے نزدیک کس چیز کا نام ہے ظاہر ہے کہ ایجاب و قبول کا نام ہے، اب بتلائیے اگر کوئی شخص نکاح کے بعد بیوی کے نان و نفقہ سے انکار کرے اور کہے کہ میں نے تو صرف بیوی کو قبول کیا تھا یہ جھگڑے میں نے کب قبول کئے تھے یہ میرے ذمہ نہیں ہیں۔ تو آپ کیا فتوے دیں گے، ظاہر ہے ہر شخص اسے احمق بتائیگا اور کہیگا میاں بیوی کو قبول کرنا ہی سب جھگڑوں کا قبول کرنا تھا، یہ نکاح تو شیخ سعدیؒ کا گالا ہے کہ دنیا بھر کی گالیاں اس میں آ گئی تھیں۔ ایک دفعہ شیخ سعدیؒ کسی سرائے میں گئے، بھٹیاری سے کھانا پکوانا چاہتے تھے، مگر وہاں جا کر دیکھا کہ بھٹیاری کسی

دوسری عورت سے لڑ رہی ہے، شیخ سعدیؒ نے کچھ دیر تو صبر کیا کہ شاید لڑائی ختم ہو جائے مگر یہ سلسلہ ختم ہی نہ ہوا تو آخر بھٹیاری سے کہا کہ بی! تو میرے واسطے کھانا تیار کر دے، وہ بولی جاؤ میاں مجھے لڑائی سے فرصت نہیں، آپ نے فرمایا کہ تو میرا کام کر دے میں تیرا کام کر لوں گا یعنی اس عورت سے لڑائی میں کر لوں گا وہ اس پر راضی ہو گئی، اور دوسری عورت سے کہا کہ میں نے اس مسافر کو اپنا قائم مقام کیا اس سے لڑتی رہ میں بھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں، اس نے شیخ سعدیؒ کو گالیاں دینا شروع کیں آپ بیٹھے سنتے رہے، جب وہ سب کچھ کہہ چکی تو آپ نے کہا دیکھو اب ہماری باری ہے اب ہم گالیاں دیں گے اور یہ شرط ہے کہ فریقین میں سے کوئی مکرر گالی نہ دے، بلکہ جو گالی ہو گئی ہو وہ اس پر راضی ہو گئی تو آپ بولے جتنی گالیاں اب تک ہو چکی ہیں اور جتنی آئندہ کو ہو سکتی ہیں میں نے سب کا ایک گالا بنا کر تیرے وہاں دے دیا اور یہ کہہ کر چپ ہو گئے، اس نے کوئی گالی دی فرمایا کہ یہ تو اسی گالے کی ہے اس لئے مکرر ہو گئی، پھر تو جو کچھ وہ کہتی آپ فرما دیتے یہ تو اسی گالے میں کی ہے کوئی نئی بات کہو، بالآخر وہ جھک مار کر چپ ہو گئی، تو ایسے ہی بیوی کا قبول کرنا سعدیؒ کا گالا ہے اس میں ساری ذمہ داریاں آ گئیں، جب آپ یہ نکاح کی مثال سمجھ گئے تو اب سنئے۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

بھی ایجاب و قبول ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ و رسول ﷺ جو کچھ حکم دیں گے ہم سر آنکھوں سے قبول کریں گے۔ تو اب جتنے اعمال کا شریعت نے حکم دیا ہے

سب کی ذمہ داری آپ نے لے لی، اس سے علماء غالباً

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا آمِنُوْا

کے معنے بھی سمجھ گئے ہوں گے، اس میں بظاہر اشکال ہوتا ہے کہ اہلِ ایمان کو امر بالایمان کیسا؟ اس کے مختلف جواب دیئے گئے ہیں، ایک توجیہ اس کی یہ بھی عمدہ ہے، جس کی طرف میں نے اس وقت اشارہ کیا ہے یعنی اول "آمَنُوْا" تو خطاب قولی ہے جو ایمان اجمالی سے حاصل ہو جاتا ہے، کیونکہ ایمان اجمالی سے آدمی جماعت مومنین میں داخل ہو جاتا ہے پھر دوسری دفعہ "آمِنُوْا" فرما کر ان کو ایمان تفصیلی کا حکم ہے کہ جن احکام کو تم نے ایمان اجمالی میں قبول کیا ہے ان کی تفصیل معلوم کر کے عمل کا اہتمام کرو، غرض ایمان لانے کے وقت چاہے تفصیل احکام کی کچھ بھی خبر نہ ہو مگر ایمان لانے کے بعد سب احکام کو ماننا پڑے گا، جیسا کسی کا یہ مان لینا کہ میں بادشاہ کی رعایا بنتا ہوں بادشاہ کے تمام احکام کے ماننے کو مستلزم ہے تو ایمان لانا ہی ان سب کے ماننے کا عہد ہے پس مقتضی کُوْنُوْا رَبَّانِیِّیْنَ پر عمل کرنے کا سب کے اندر موجود ہے اور مقتضی بھی تام، اسلئے عوام یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم تو اہلِ علم و تدریس نہیں اس لئے ہم عمل سے چھوٹ گئے، ہرگز نہیں بلکہ ان پر دو جرم قائم ہیں ایک ترک علم کا ایک ترک عمل کا۔ پس غیر علماء کے پاس بھی کوئی عذر نہیں، ان کے پاس اگر مقتضی اتم نہیں تو مقتضی تام تو موجود ہے، اس تقریر سے شبہ تو رفع ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ

بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتَابَ وَبِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ

میں مقتضی مطلق کا ذکر نہیں بلکہ مقتضی اتم کا بیان ہے اسی لئے میں نے اتم کی قید

بڑھائی تھی، اسی بناء پر ان سے کہا جاتا ہے کہ تم کتاب پڑھاتے ہو اور پڑھتے بھی ہو
تو تمہارا ربانی نہ ہونا ظلم و غضب ہے۔

علماء کو مشورہ

یہاں ایک نکتہ پر بھی تنبیہ کئے دیتا ہوں وہ یہ کہ اس جگہ تُعَلِّمُوْنَ کو مقدم
کیا گیا ہے اور تَدْرُسُوْنَ کو مؤخر، حالانکہ وقوع مقتضی عکس کو ہے، کیونکہ
ترتیب واقعی یہ ہے کہ اول درس یعنی قرأت کا (کما فی قولہ تعالیٰ وَدَرَسُوْا
مَا فِیْہِ) وقوع ہوتا ہے، پھر تعلیم یعنی اقرار کا (والتعلیم فی ہذا المعنی ظاہر)
مگر خدا تعالیٰ کے کلام میں عجیب اسرار ہیں، یہاں تُعَلِّمُوْنَ کو اس لئے مقدم
کیا گیا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اس جگہ مقتضی کا بیان شرم دلانے کے لئے ہے
اور واقعہ یہ ہے کہ دوسروں کو تعلیم و نصیحت کرنا عدم عمل کی حالت میں زیادہ
باعث شرم ہوتا ہے، محض جان لینا اور پڑھ لینا اس قدر موجب شرم نہیں ہوتا
کیونکہ تعلیم میں گویا ختم کا دعوے ہوتا ہے تو معلم و ناصح ہو کر خود عمل نہ کرنا بہت ہی
شرم کی جگہ ہے۔ اگر ذرا بھی طبیعت سلیم ہو تو معلم و ناصح ہو کر انسان سب سے پہلے
خود اپنی تعلیم پر عمل کرتا ہے، یہاں سے ایک اور شبہ رفع ہو جائیگا جو نادر شیدہ ہے
جس کی طرف شاید کسی کا ذہن بھی نہ گیا ہوگا، وہ یہ کہ بعض دفعہ مشائخ نااہلوں
کو مجاز کر دیتے ہیں، اس پر لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ نے نااہل
کو خلافت دیدی، اسکے جوابات چند ہیں، ایک تو یہ کہ ممکن ہے اجازت کے
وقت اہل ہو پھر نااہل ہو گیا ہو اور ایسا ہونا مستبعد نہیں، اسی لئے عقاید کی

کی کتابوں میں مذکور ہوا ہے ایک تو یہی کہ

اَلسَّعِیۡدُ قَدۡ یَشۡقٰی

نیک آدمی کبھی شقی بھی ہو جاتا ہے

اور یہ اہل سنت کے عقاید میں داخل ہے اور میرے نزدیک

اَمَّا الَّذِیۡنَ سُعِدُوۡا فَفِی الۡجَنَّۃِ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا

مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ

کی یہی تفسیر اولی ہے، بعض مفسرین نے "الا ماشاء ربک" کو خالدین کی طرف راجع کیا ہے۔ اسی طرح؛

اَمَّا الَّذِیۡنَ شَقُوۡا فَفِی النَّارِ لَہُمۡ فِیۡہَا زَفِیۡرٌ وَّ شَہِیۡقٌ خٰلِدِیۡنَ

فِیۡہَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ

کو خالدین کی طرف راجع کیا ہے پھر اس پر اشکال واقع ہوا ہے کہ کیا کسی وقت خلود مشیت الہی سے منقطع ہو جائیگا۔ پھر اس کا جواب دیا گیا ہے۔ جس میں سب سے اچھا جواب وہ ہے جس کی طرف شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ فرمایا کہ:

"مَا شَآءَ رَبُّکَ"

بڑھانے سے مقصود اس بات کا بتلانا ہے کہ یہ خلود اہل جنت و نار مثل بقاء واجب کے لازم ذات نہیں بلکہ مشیت و قدرت الٰہیہ کے تحت میں داخل ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ اس آیت میں لفظ "مَا" اگر بمعنی "مَنۡ" لیا جائے اور مطلب یہ ہو کہ جو لوگ سعید ہیں وہ سب جنت میں ہمیشہ رہیں گے مگر ان

میں سے جنکو خدا تعالیٰ چاہیں وہ مستثنیٰ ہیں تو یہ آیت مسئلہ مشہورہ :

اَلسَّعِیْدُ قَدْ یَشْقٰی والشقی قد یسعد

کی طرف مشیر ہوگی اور اس صورت میں :

اَلَّذِیْنَ سُعِدُوْا اور اَلَّذِیْنَ شَقُوْا

سے مراد وہ ہیں جو لوگوں کے نزدیک ظاہر میں سعید و شقی ہیں تو اولاً ان کے لیے خلود جنت و خلود نار کو بیان فرما کر بعد میں ان لوگوں کو مستثنیٰ کیا گیا جو ظاہر میں سعید تھے مگر مشیت حق میں شقی تھے یا ظاہر میں شقی تھے اور مشیت حق میں سعید تھے، پس معنی یہ ہوں گے کہ اہل سعادت میں سے جو شقی ہو گئے، یا اہل شقاوت میں سے جو سعید ہو گئے وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، اس صورت میں استثنیٰ سے انقطاع خلود کا وہم نہ ہوگا، یہ تو درمیان میں ایک علمی نکتہ بیان ہو گیا، میں اس سے پہلے یہ کہہ رہا تھا کہ مشائخ جن لوگوں کو مجاز کرتے ہیں اور بعد میں ان میں سے کسی کی نااہلیت ثابت ہوتی ہے تو یہ امر موجب اعتراض نہیں، کیونکہ ممکن ہے اجازت کے وقت وہ اہل ہی ہوں اور بعد میں وہ شقی ہو گئے ہوں۔ اور یہ الواصل لایرد کے خلاف نہیں، کیونکہ اس مسئلہ میں واصل فی الواقع مراد ہے نہ فی زعم الشیخ باقی الواصل لایرد کا قاعدہ واقع کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے، حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے، بخاری کی ایک حدیث میں ہرقل کا ایک قول مذکور ہے :

وَکَذٰلِکَ الْاِیْمَانُ اِذَا خَالَطَ بَشَاشَۃَ الْقُلُوْبِ

کہ ایمان کی حلاوت جب قلب میں رچ بس جاتی ہے تو ارتداد ممکن نہیں، اس قول کو حضرات صحابہؓ نے بلانکیر نقل فرمایا ہے، کسی نے اس پہ کلام نہیں کیا پس تقریر صحابہؓ سے یہ مسئلہ ثابت ہوگیا، دوسرا جواب اس اعتراض کا اور ہے، جو لطیف بات ہے اور اس مقام پر اسی کو ذکر کرنا مقصود ہے وہ یہ کہ مشائخ بعض دفعہ کسی نااہل میں حیاء وشرم کا مادہ دیکھ کر اسے اس امید پہ مجاز کر دیتے ہیں کہ جب وہ دوسروں کی تربیت کریگا تو اسی کی لاج اور شرم سے اپنی بھی اصلاح کرتا رہیگا، یہاں تک کہ ایک دن کامل ہو جائیگا۔ پھر بعضے نااہل ہی ان کی اس امید کو غلط کر دیتے ہیں، اور اپنی حرکات سے اپنی نااہلیت ظاہر کر دیتے ہیں، مگر ایسے کم نکلتے ہیں غالب حالت یہی ہے کہ جس میں حیاء وشرم کا مادہ ہوتا ہے وہ دوسروں کی تربیت کرتے ہوئے اپنی اصلاح بھی ضروری کر لیتے ہیں اسی لئے علماء سے بطور مشورہ کے میری گذارش ہے کہ جو لوگ فارغین عن العلوم باحیاء ہوں ان کو ابھی سے وعظ کہنے کی اجازت دیدی جائے اصلاح کامل کا انتظار نہ کریں، کیونکہ وعظ کہکر وہ بہت جلد اپنی اصلاح کر لیگا۔

دعوی اور دعوت کا فرق

اس میں ایک بات ہے وہ یہ کہ واعظ جس امر پہ خود عامل نہیں ہوتا اس کے متعلق اگر وہ وعظ کہتا ہے تو الفاظ میں شوکت وصولت نہیں ہوتی، اندر سے دل بھینچنے لگتا ہے، چنانچہ ایک مقدمہ یہ ہے ایک بزرگ کے پاس ایک بڑھیا اپنے بچہ کو لے گئی اور کہا حضرت یہ گڑ بہت کھاتا ہے،

ذرا آپ اس کو نصیحت کر دیجئے، انہوں نے کہا کل آنا کل سمجھا دوں گا۔ و
اگلے دن بچہ کو لیکر آئی اور آپ نے نصیحت کر دی وہ اس سے رک گیا، کسی
خادم نے کہا حضرت یہ کون سا باریک مسئلہ تھا جس کے لئے آپ نے ایک دن
کی مہلت مانگی تھی، فرمایا بات یہ ہے کہ کل تک میں خود اس مرض میں مبتلا تھا
اس وقت میری نصیحت کا اثر نہ ہوتا کیونکہ زبان ہی نہ اٹھتی، اس لئے میں نے
ایک دن کی مہلت مانگی تاکہ پہلے اپنی اصلاح کر لوں، چنانچہ کل سے میں نے
بھی گڑ کھانا چھوڑ دیا اور اس کا عزم کر لیا کہ آئندہ بھی نہ کھاؤں گا، تو آج میرے
بیان میں اثر تھا الفاظ میں زور تھا۔ سو واقعی غیر عامل کے وعظ میں شوکت و
صولت نہیں ہوتی، پھر اگر اس میں حیا ہے تو اس کو انقباض کا احساس
ہوگا، یہ دوسرا مقدمہ ہوا، پس وہ جلد اپنی اصلاح کرے گا، اس لئے باحیا
کو وعظ سے نہ روکنا چاہئے، اس لئے پیش نظر طبعاً ہر وقت

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ،

اور:

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ

کا مضمون ہوگا، مگر ان دونوں آیتوں میں ایک بات قابل فہم علماء ہے.
وہ یہ کہ اکثر لوگ ان آیات سے غیر عامل کے وعظ کا عدم جواز سمجھتے ہیں
یہ صحیح نہیں، ہاں اتنی بات تو صحیح ہے کہ

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ

یہ آیت واعظ غیر عامل کے بارہ میں ہے، لیکن اس میں انکار صرف جزو اخیر

ہے، یعنی نسیانِ نفس پہ ہے ہر چیز پر انکار نہیں، پس آیت میں واعظ کے غیر کامل ہونے پر انکار ہے، غیر عامل کے واعظ ہونے پر انکار نہیں، جس کا حاصل یہ ہے واعظ کو مبتلائے معصیت ہونا حرام ہے اور مبتلائے معصیت کو وعظ کہنا حرام نہیں، خوب سمجھ لو اور دوسری آیت کو تو وعظ پر عمل کرنا ہی صحیح نہیں، کیونکہ "لِمَ تَقُوْلُوْنَ" سے قول انشائی مراد نہیں بلکہ قول خبری مراد ہے، یعنی دعوے مراد ہے دعوت مراد نہیں، کیونکہ جس معاملہ کے متعلق اس کا نزول ہوا ہے اس میں یہی چھوٹے دعوے ہوئے تھے، کہ اگر ہم کو احب الاعمال کا علم ہو جائے تو ایسا ایسا مجاہدہ کریں، جب ایک واقعہ میں ترغیب کی گئی، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں کہ ایسے دعوے کیوں کرتے ہو جنکو پورا نہیں کرسکتے تو یہاں دراصل وجہ دعوے سے ممانعت ہے اور وعظ میں دعویٰ نہیں ہوتا، بلکہ وہ تو کلام انشائی ہے، جسمیں مخاطبین کو احکام اسلامیہ پر عمل کرنیکا حکم کیا جاتا ہے اور نواہی سے منع کیا جاتا ہے جس کا حاصل دعوت ہے یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اس لئے وعظ گوئی اس آیت میں داخل نہیں، مگر چونکہ کبھی کلام انشائی بھی متضمن خبر ہو جاتا ہے، جیسے منافقین کا:

نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ،

کہنا واقع میں تو انشاء ہے کہ ہم آپ کی رسالت کی تصدیق کرتے ہیں مگر ضمناً، اس میں یہ دعوے بھی ہے کہ ہم سچے اور مخلص مسلمان ہیں، منافق نہیں ہیں اسی لئے حق تعالیٰ نے آگے فرمایا:

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝

جس میں ان کو اس کلام میں کاذب فرمایا گیا اور یہ مسئلہ مسلمہ ہے کہ کلام انشائی کے قائل کو صادق کاذب نہیں کہہ سکتے، تو یہاں ان کو کاذب کیسے کہا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کلام انشائی ایک کلام خبری کو متضمن ہے اس متضمن کے اعتبار سے انکو کاذب کہا گیا ہے۔ اسی طرح ہر چند کہ وعظ کلام انشائی ہے، یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر لیکن صورۃً اس میں ایک قسم کا دعوے بھی ہے کہ ہم خود بھی اس پر عامل ہیں، اس دعوے ضمنی کے اعتبار سے با حیا آدمی کو وعظ کہتے ہوئے طبعاً:

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ

پیش نظر رہیگا، گو اصل میں یہ آیت وعظ کے متعلق نہیں مگر وہ تضمن خبر کیوجہ سے اچھے کو اس کا مصداق سمجھ کر شرماتا ہے اور جلد اصلاح کر لیتا ہے، اسی سے بعض لوگوں کا طرز عمل دیکھا گیا ہے کہ جس کام کی ان کو ہمت نہیں ہوتی اس کے بارہ میں ایک دو دفعہ وعظ کہہ دیتے جس سے شرما کر بہت جلد ہی خود بھی عامل ہو گئے

مشیت ایزدی

دوسری بات اس میں اور بھی ہے جو ابھی ذہن میں آئی ہے کہ وعظ سے ہمت عمل ہو جانے کا سبب ایک تو حیا جیسی ہے جیسا کہ مذکور ہوا، دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ وعظ کے ذریعے سے جب اس نے اہل اسلام کی خدمت کی، ان کو احکام کی تبلیغ کی، جنمیں اہل اللہ بھی ہوتے ہیں تو یہ اہل اللہ اس سے خوش ہو کر دعا دیتے ہیں، اس کی برکت سے حق تعالیٰ اس کی بھی اصلاح کر دیتے ہیں،

کیونکہ ہر جلسۂ وعظ میں کوئی نہ کوئی ایسا ہوتا ہے جو اللہ کے نزدیک مقبول ہوتا ہے واعظ اس گھمنڈ میں نہ رہے کہ علوم و معارف جو میں بیان کرتا ہوں یہ میرا کمال ہے، صاحبو! نہ معلوم یہ کس اللہ کے بندہ کی برکت سے بیان ہوتے ہیں، ایک بزرگ کا واقعہ ہے، کہ وہ کسی عالم کے وعظ میں بیٹھے ہوئے تھے اور واعظ کی طرف متوجہ تھے، ان کی توجہ کی برکت سے وہ عجیب عجیب علوم بیان کرتے رہے، درمیان وعظ میں عالم صاحب کو عجب پیدا ہوا اور وہ اپنے علوم پر دل ہی دل میں فخر کرنے لگے تو بزرگ نے اپنی توجہ دوسری طرف متوجہ کر دی بس ان کی توجہ کا بند ہونا تھا کہ عالم صاحب کو مضامین کی آمد بند ہو گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ علوم کسی دوسرے کی توجہ سے آ رہے تھے۔ ہمارے حاجی صاحب کا ارشاد ہے کہ بعض سامعین مثل طفل کے ہوتے ہیں، جس طرح بچہ کی کوشش سے ماں کی پستانوں میں دودھ اترتا ہے اور اگر وہ دودھ پینا چھوڑ دے تو چند روز میں چھاتیاں اکڑ کر رہ جاتی ہیں اور دودھ کی آمد بند ہو جاتی ہے، اسی طرح بعض سامعین کی طلب و کشش سے واعظ کے قلب میں علوم القا ہوتے ہیں اگر یہ طلب نہ ہو تو شیخ صاحب کورے کے کورے رہ جائیں۔

مولانا فرماتے ہیں:

تا نگرید طفل کے جوشد لبن

تا نگرید ابر کے خندد چمن

خود میرا واقعہ ہے کہ ایک بار میں گڑھی خام میں گیا جو ہمارے قصبہ سے قریب ایک بستی ہے، وہاں لوگوں نے وعظ کی درخواست کی، میں نے وعظ کا

وعدہ کر لیا۔ اور اس وقت قلب پر یہ وسوسہ ہوا کہ بحمد اللہ! مجھے وعظ پر قدرت حاصل ہے؛ اس کے بعد جو وعظ کہنے بیٹھے تو خطبہ اور آیت پڑھ کر رہ گیا، مضمون ہی کچھ نہ آیا، ہر چند زور لگایا مگر چل ہی نہ سکا، پھر خیال ہوا کہ میں نے اتنے وعظ کہے ہیں لاؤ ان ہی میں سے کسی کا اعادہ کر دوں، مگر پہلے مواعظ کا مضمون بھی کچھ یاد نہ آیا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ یہ میرے اس وسوسہ کا جواب ہے جو حق تعالیٰ نے دکھلا دیا کہ تم خود بھی نہیں بیان کر سکتے بلکہ ہم ہی کہلوانا چاہتے ہیں، تو سب کچھ کہہ سکتے ہو، سچ ہے ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

اور اس روز اس آیت کی تفسیر منکشف ہوئی:

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ ثُمَّ
لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا۔

حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہیں کہ:

اگر ہم چاہیں تو جتنی وحی آپ کی طرف بھیجی ہے سب کو سلب کر لیں، پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کسی کو اپنا کارساز و مددگار نہ پائیں گے۔

اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے، کیونکہ ایسی شوکت و جلالت سوائے کلام الٰہی کے کسی کلام میں نہیں ہو سکتی کہ ایسی معظم ہستی کو کس طرح بے دھڑک خطاب ہے، اب سوچئے کہ حضور کے دل پر اس کو سن کر کیا کچھ گزری ہوگی، کیونکہ

وہاں شرطیات کا وہ اثر نہ تھا جو ہم پر ہے، ہم تو قضایا شرطیہ کو یہ کہکر ٹال دیتے ہیں کہ صدق شرطیہ کیلئے وقوع مقدم ضروری نہیں، مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر عظمت حق منکشف تھی، آپ جانتے تھے کہ حق تعالیٰ کے چاہنے ہی میں کیا دیر لگ سکتی ہے، کچھ بھی نہیں، اس لئے آپ تو نہ معلوم یہ سنکر کیا کچھ نہ سہم گئے ہوں گے۔ مگر آگے فوراً تسلی دی گئی، کہ ہم کو اس پر قدرت ہے مگر اس کا وقوع نہ ہوگا۔

اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا

کیونکہ آپ پر خدا کا فضل بہت بڑا ہے، ایک جگہ اسی طرح اپنی عظمت و قدرت ظاہر کرنے کے لئے فرماتے ہیں۔

فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ ؕ

اللہ اللہ! کتنا سخت کلمہ ہے، مگر آج کل لوگ اس فکر میں ہیں کہ نعوذ باللہ حضورؐ کو خدا بنا دیں، میں کہتا ہوں کہ تم حضورؐ کی تنقیص کرتے ہو، کیونکہ ہم آپ کو عبداللہ کہتے ہیں، اور عبد بھی کیسا عبد کامل، صاحبو! معلوم

اِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ

سُنکر حضورؐ کے دل پر کیا گذری ہوگی، اس کو اہل نسبت خوب سمجھ سکتے ہیں کیونکہ ان پر یہ حالت خوب گذرتی ہے، ان کو رات دن ایسے چرکے لگتے رہتے ہیں، جن سے ان کی اصلاح و تنبیہ مقصود ہوتی ہے، پھر جو ان پر گذرتی ہے اس کو وہی جانتے ہیں ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود
گر ز باغ دل خلالے کم بود

دل میں بھی ایک باغ ہے، جسکے سامنے دنیا کے باغات کی کچھ بھی ہستی نہیں ہے

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن درآ

جس کو اس باغ کی خبر لگ گئی ہے اور کسی تماشے کی ضرورت نہیں وہ اسی کی سیر میں ہر دم مست رہتا ہے

خلوت گزیدہ را بہ تماشا چہ حاجت است
چوں کوئے دوست ہست بصحرا چہ حاجت است

پھر اگر کبھی اس باغ میں خزاں کا اثر آنے لگے اور وہ پژمردہ ہونے لگے مثلاً وساوس و خطرات کا ہجوم ہو جائے تو سالک سے زیادہ پریشان بھی کوئی نہیں ہوتا، اس وقت بعضوں نے تو خودکشی کر لی ہے گویہ ان کے محقق نہ ہونے کی دلیل ہے۔ محقق ان باتوں سے زیادہ پریشان نہیں ہوتا، گو طبعی پریشانی ہوتی ہے مگر عقلی پریشانی نہیں ہوتی، محقق وساوس سے بھی اپنا کام نکال لیتا ہے اور ان کو بھی مطالعہ جمال محبوب کا مرآۃ بنا لیتا ہے۔ حضرت حاجی صاحب کا ارشاد ہے کہ وساوس کو آئینۂ مطالعہ حق اس طرح بنا لینا چاہئے کہ یوں کہیں کہ اللہ اکبر خدا تعالیٰ کی کیا قدرت ہے کہ میرے دل میں خیالات کا ایک دریا پیدا کر دیا کہ دفعۃً چاروں طرف سے آکر مجھے محیط ہو گئے۔ اس کے بعد شیطان کی تدبیر کمزور ہو جائے گی، کیونکہ جب وہ دیکھے گا کہ یہ شخص تو وساوس سے پریشان نہیں ہوتا بلکہ اس سے بھی قدرت حق کا مطالعہ کرتا ہے، تو وہ

اپنا سا منہ لے کر رہ جائیگا اور وساوس ڈالنا بند کر دے گا۔ یہ ہیں وہ حضرات جو فقیہ احد اشد علی الشیطان من الف عابد کا مصداق ہیں اور ان کی تعلیم پر عمل کر کے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کی یہ چالیں نہایت بودی ہیں ــــ

ان کید الشیطان کان ضعیفا

اس تصرف حق کے مشاہدہ کے بعد مولانا کے اس قول کی حقیقت معلوم ہو جائے گی ــــ

گر بعلم آئیم ما ایوان اوست
در بجہل آئیم ما زندان اوست
گر بخواب آئیم مستان اویم
در بہ بیداری بدستان اویم

اور اگر کبھی ایسی حالت پیش آتی ہے کہ نہ وساوس کا ہجوم ہے نہ واردات کا ورود ہے بس ایک حیرت سی قلب پر طاری ہوتی ہے سالک پریشان ہوتا ہے کہ یہ حالت کیسی ہے۔ مولانا اس کی حقیقت کو بتلاتے ہیں کہ اس سے بھی نہ گھبراؤ ــــ

در تردد ہر کہ او آشفتہ است
حق بگوشش او معما گفتہ است

بگوشش او کا لفظ عجیب ہے کہ تمہارے کان میں حق تعالیٰ نے چپکے سے ایک معما کہدیا ہے، اس کے نہ سمجھنے سے یہ حیرت ہے، پھر بعدہ

اس حالت میں بعض روتے ہیں اور بعض ہنستے ہیں اسی کو کہتے ہیں ؎

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خندان است

بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالان ست

ڈاروِن کا نظریہ

قرآن میں بھی حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَاَنَّہٗ ھُوَ اَضْحَکَ وَاَبْکٰی

اس کی حقیقت سالکین ہی خوب سمجھتے ہیں کہ واقعی رُلانا اور ہنسانا، حق تعالیٰ ہی کا کام ہے، کبھی وہ روتوں کو ہنسا دیتے ہیں اور کبھی ہنستوں کو رُلا دیتے ہیں، اہل ظاہر تو بس اتنا جانتے ہیں کہ "اَضْحَکَ" باب افعال سے ہے اور "اَبْکٰی" اصل میں "اَبْکَیَ" تھا، یا کو الف کر لیا گیا، اس پر مجھے ایک عرب کا مقولہ یاد آیا کہ اس کے سامنے کوئی صرفی کہہ رہا تھا کہ قال اصل میں قَوَلَ تھا۔ واؤ کو فتح ماقبل کی وجہ سے الف کیا گیا۔ اس پر وہ عرب بولا، کس بادشاہ کے زمانہ میں یہ قَوَلَ تھا، ہم نے ہمیشہ قال ہی سُنا ہے، قَوَلَ کبھی نہیں سنا۔ اس کے نزدیک صرفیوں کا یہ کہنا کہ قال اصل میں قَوَلَ تھا، بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ ڈارون کا یہ کہنا کہ انسان پہلے بندر تھا پھر ترقی کرکے آدمی ہو گیا، مگر غضب ہے، کہ آج کل تو تعلیم یافتہ طبقہ خدا کی باتوں پر تو یقین نہیں کرتا اور بار بار نظیر کا مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اس کی نظیر دکھلاؤ بدوں مشاہدہ کے ہم نہ مانیں گے اور ڈارون کے قول کو بدوں دیکھے ان لوگوں نے مان لیا،

حالانکہ اس کا مشاہدہ یہ لوگ تو خاک کرتے خود ڈارون نے بھی نہیں کیا۔ اس نے بھی محض تخمین وگمان ہی سے یہ بات ہانکدی ہی اور اس تخمین کی بالکل وہی مثال ہے، جیسے تین شخص ایک منارہ پر گذرے جو بہت بلند تھا، تینوں کو حیرت ہوئی کہ اتنا اونچا منارہ کس طرح بنایا گیا ہوگا۔ ایک بولا کہ پہلے زمانہ کے آدمی بہت لمبے ہوتے ہوں گے، دوسرا بولا نہیں اس کو زمین پر رکھ کر بنایا گیا ہوگا، پھر سیدھا کر دیا گیا۔ تیسرا بولا نہیں یہ پہلے کنواں تھا پھر زمین کا تختہ لوٹ کر منارہ ہو گیا ۔ع

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

اسی طرح ڈارون کی یہ تخمین ہے مگر ہمارے بھائی ہیں کہ اس کو وحی سمجھے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک صاحب نے یہ بھی لکھ مارا کہ نعوذ باللہ آدم علیہ السلام سب سے پہلے وہ آدمی ہیں جو بندر سے انسان ہوئے، گویا اپنے نزدیک اس نے تعلیم اسلام کو ڈارون کے قول پر منطبق کرنا چاہا، مگر افسوس اس میں نبی کی شان میں جو گستاخی ہے وہ تو ہے ہی، اس کے علاوہ خود یہ ڈارون کے قول کے بھی خلاف ہے، اصولاً بھی، فرداً فرداً بھی۔ اصولاً تو اسی طرح کہ ڈارون کو تو اس قول کی طرف اس امر نے مجبور کیا کہ وہ خدا تعالیٰ کو خالق نہیں مانتا بلکہ طبیعت کو فاعل مانتا ہے اور طبیعت غیر ذی شعوری ہے اسکی تاثیر تدریجی ہے، اس لئے اس کو طبعی قاعدہ سے یہ کہنا پڑا کہ تمام عالم اصل میں جماد محض تھا۔ پھر مادہ جماد نے ترقی کی تو وہ نبات ہو گیا، پھر مادہ نبات نے ترقی کی وہ حیوان ہو گیا، اور اسی طرح حیوان ترقی کر کے انسان بن گیا

مگر جو شخص مسلمان ہے جو خدا تعالیٰ کو خالق مانتا ہے، اسے اس تدریج کے قائل ہونے کی کیا ضرورت ہے وہ تو بے تکلف کہہ سکتا ہے کہ حق تعالیٰ نے جب چاہا جس چیز سے چاہا انسان بنا دیا اور جس چیز سے چاہا حیوان بنا دئے حاصل یہ کہ جو اصل ڈارون کے لئے اس قول کی داعی ہوئی یعنی انکار صانع تم اس اصل ہی میں اس کے مخالف ہو، پھر تمہارا یہ کہنا کہ سب سے پہلے بندر جو انسان بنا وہ نعوذ باللہ آدم علیہ السلام ہیں، شرعاً تو غلط ہے ہی، کیونکہ قرآن میں خلقت آدم کا واقعہ مفصل مذکور ہے، حدیث نبوی میں اس کی تشریح موجود ہے یہ بیہودہ گمان اس کے بالکل خلاف ہے مگر خیر سے یہ قول ڈارون کے بھی خلاف ہے اور فرداً اس طرح کہ اس کا قول تو یہ ہے کہ جب بندر کی نوع رفتہ رفتہ ترقی کرتے کرتے ایک زمانہ میں اس نوع کے بہت سے افراد دفعۃً انسان بن گئے وہ صرف کسی ایک بندر کو تمام انسانوں کا باپ نہیں کہتا جیسا کہ تم کہتے ہو۔

امثال عبرت

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ اہل ظاہر قرآن کا بوجہ اہل حال نہ ہونے کے مشاہدہ نہیں کر سکتے، یہ تو صرف الفاظ کی خدمت کرتے ہیں، قرآن کا مشاہدہ صحیح طور پر عارفین ہی کرتے ہیں، جو اس کی حقائق سے واقف ہیں اور یہ علوم ہی ان کی اصلی کرامات ہیں، جن سے وہ شیطان کی چالوں کو اس طرح توڑ دیتے ہیں کہ تار عنکبوت سے زیادہ اس کی وقعت باقی نہیں رہتی، شیخ کامل کی کرامات اور لوگ تو دوسری باتوں میں دیکھتے ہیں اور طالب صادق خود اپنے اندر اس کی

زندہ کرامات ہر وقت دیکھتا ہے، جبکہ وہ روز بروز اپنے کو ظلمت سے نور کی طرف چلتا ہوا دیکھتا ہے۔ اسی طرح عارفین ہستی حق کی دلیل خود اپنی ذات میں دیکھتے ہیں، کیونکہ ان کا حال یہ ہے ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر ست

وہ کبھی بسط میں ہیں اور کبھی قبض میں، کبھی تجلی جمال کا غلبہ ہے کبھی تجلی جلال کا یہی لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر۔

اِنْ یَّشَاءِ اللّٰہُ یَخْتِمْ عَلٰی قَلْبِکَ

کا کیا اثر ہوا ہوگا، کیونکہ یہ حالات ان کے اوپر خود بھی گذرتے رہتے ہیں۔ اتنا فرق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تو یہ خطابات حق تعالیٰ اپنی عظمت و ربوبیت ظاہر کرنے کے لئے فرماتے ہیں اور اولیاء سے یہ معاملات ان کی اصلاح کے لئے کئے جاتے ہیں، نیز حضور ﷺ کے ساتھ تو یہ شرطیات قضایا شرطیہ ہی کے درجہ میں رہتے ہیں جن کے مقدم کا کبھی وقوع نہیں ہوتا اور دوسروں کے ساتھ کبھی ان شرطیات کے مقدم کا وقوع بھی ہو جاتا ہے۔ حضرت جنیدؒ کا واقعہ ہے کہ ایک بار وہ کہیں جا رہے تھے ایک مرید ساتھ تھا، راستہ میں ایک نصرانی لڑکا نظر پڑا، جو نہایت حسین تھا، تو مرید نے اس کو دیکھ کر حضرت جنیدؒ سے سوال کیا۔

اَیُعَذِّبُ اللّٰہُ ھٰذِہِ الصُّوْرَۃَ فِی النَّارِ؟

کیا خدا تعالیٰ ایسی ایسی صورتوں کو بھی جہنم میں ڈالیں گے؟

حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ تو نے اس کو گھورا ہے۔

سَتَرٰی غِبَّ ذٰلِکَ

عنقریب اس کی سزا بھگتو گے، چنانچہ کچھ دنوں کے بعد قرآن بھول گئے کچھ بھی یاد نہ رہا۔ اللہ اللہ! اس بچارہ کا اسوقت کیا حال ہوا ہوگا۔ خدا تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ اس نے جب اس گناہ سے توبہ کی ہوگی تو قرآن پھر عود کر آیا ہوگا۔ اس امت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے بہت ہی رحمت کاملہ ہے ؎

طُوبٰی لَنَا مَعْشَرَ الْاِسْلَامِ اِنَّ لَنَا

مِنَ الْعِنَایَۃِ رُکْنًا غَیْرَ مُنْھَدِمٖ

بنی اسرائیل کا قصہ ہے کہ ان میں کسی ظالم نے ایک غریب کی مچھلی چھین لی تھی، غریب نے بددعا کی کہ اے اللہ! اس کو ظلم کا بدلہ ابھی دکھا دے تو مچھلی نے فوراً اس ظالم کا ہاتھ منہ میں پکڑ لیا، حالانکہ مچھلی مردہ تھی، مگر خدا تعالیٰ کے سامنے ہر چیز زندہ ہے ؎

آب و باد و خاک و آتش بندہ اند

با من و تو مردہ با حق زندہ اند

اس حیات جمادات پر مولانا کے کلام میں ایک ظالم یہودی بادشاہ کی حکایت یاد آگئی کہ اس نے مسلمانوں کو مرتد کرنا چاہا تھا اور آگ سے خندقیں بھر کر ایک بت وہاں رکھا تھا، مسلمانوں کو کہتا تھا کہ اس بت کو سجدہ کرو ورنہ آگ میں ڈال دئے جاؤ گے، مسلمان بچارے انکار کرتے، اور آگ میں ڈال دئے جاتے تھے۔ اسی اثنا میں ایک عورت مسلمان لائی گئی

اس سے بھی سجدہ بت کو کہا گیا، اس نے انکار کیا تو ظالموں نے اس کے بچہ کو گود سے لیکر آگ میں ڈالدیا۔ اس وقت گھبراہٹ اور بچہ کی محبت میں ماں کو لغزش ہونے کو تھی کہ دفعۃً بچہ آگ سے چلایا، کہ اے ماں تو بھی آجا یہ آگ نہیں یہ تو گلزار ہے، یہ سنکر ماں خود بخود آگ میں کود پڑی اور اس نے مسلمانوں کو آواز دی کہ ڈرو نہیں اس آگ کا اندیشہ نہ کرو یہاں تو عجیب راحت ہے، اب کیا تھا مسلمان جوق در جوق آگ میں کودنے لگے، اب یہ حال ہوا کہ کفار ان کو روکتے تھے اور مسلمان زور کر کے آگ میں گرا چاہتے تھے، یہ دیکھ کر یہودی بادشاہ نے آگ سے کہا اے آگ تجھے کیا ہوا تو ان کو جلاتی کیوں نہیں تو اس نے جواب دیا ؎

گفت آتش من ہمانم آتشم
اندر آ تا تو ببینی تابشم

آگ نے کہا میں تو وہی آگ ہوں جس کی خاصیت احراق ہے اگر تجھے شبہ ہو تو ذرا تو میرے پاس آ اس وقت تجھے میری تابش معلوم ہوگی، باقی مسلمانوں کو جو میں نہیں جلاتی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ؎

طبع من دیگر نہ گشت و عنصرم
تیغ حقم ہم بدستوری برم

کہ میری خاصیت اور طبیعت بدلی نہیں بلکہ میں حکم خداوندی کے تابع ہوں بدوں ان کے حکم کے میں کچھ نہیں کر سکتی۔

اس پر مولانا فرماتے ہیں ؎

آب و باد و خاک و آتش بندہ اند
با من و تو مردہ با حق زندہ اند

چنانچہ اس مردہ مچھلی نے ظالم کا ہاتھ منہ میں لے لیا جو بڑی دقت سے کئی آدمیوں نے چھڑایا، مگر اس گرفت کا زہر ایسا چڑھا کہ تمام اطبار علاج سے عاجز آگئے اور سب کی رائے یہ ہوئی کہ ہاتھ کاٹ ڈالا جائے ورنہ تمام بدن میں زہر پھیل جائیگا، چنانچہ ہاتھ کاٹ ڈالا گیا، اس وقت اس کو اپنے ظلم پر ندامت ہوئی اور سمجھا کہ یہ میرے ظلم کا نتیجہ تھا تو معافی چاہنے کے لئے اس غریب کے پاس گیا اور اس سے ظلم کی معافی چاہی، اس کا معاف کرنا تھا کہ ہاتھ بالکل صحیح سالم ہو گیا، اسی طرح امید ہے کہ توبہ کے بعد حضرت جنیدؒ کے مرید کو بھی قرآن یاد ہو گیا ہو گا۔ اس قصہ کو سنکر کوئی حافظ صاحب خوش نہ ہوں کہ ہم تو رات دن شرارتیں کرتے رہتے ہیں اور کبھی قرآن نہیں بھولتے، کیونکہ وہ شخص سالک تھا، حق تعالیٰ نے اس کو جلدی سزا دیکر متنبہ فرما دیا تھا کہ غلطی کی اصلاح کرے اور دوسروں کے واسطے یہ قاعدہ ہے۔

وَاُمْلِیْ لَہُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ۔

حق تعالیٰ ڈھیل دیتے رہتے ہیں تاکہ دفعۃً پکڑ لیں۔ کسی کو اپنے حفظ یا علم پر ناز نہ کرنا چاہئے۔ حق تعالیٰ اگر چاہیں تو ایک سکنڈ میں سب چھین لیں پھر کورے کے کورے رہ جاؤ، چنانچہ ان عالم صاحب کو وعظ میں عجب و ناز پیدا ہوا تھا، ان بزرگ نے فوراً اپنی توجہ ہٹالی، ان کا توجہ ہٹانا تھا کہ سب علوم بند ہو گئے، تو بعض دفعہ وعظ میں کوئی بزرگ ہوتے ہیں اور وعظ سنکر

ان کا جی خوش ہوتا ہے، حق تعالیٰ ان کی خوشی کی برکت سے واعظ کو بھی نواز دیتے ہیں، اسی خیال سے بعض دفعہ غیر کامل کو مشائخ اجازت دے دیتے ہیں کہ شاید کسی طالب مخلص کی برکت سے اس کی بھی اصلاح ہو جائے، کیونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی پیر نااہل ہے اور اس کا مرید کوئی مخلص ہے تو طالب صادق کو تو حق تعالیٰ اس کے صدق وخلوص کی برکت سے نواز ہی دیں گے جب وہ کامل ہو جائے گا تو پھر حق تعالیٰ پیر کو بھی کامل کر دیں گے کیونکہ یہ اس کی تکمیل کا ذریعہ بنا تھا۔

ایک چور کی حکایت ہے کہ جوانی میں تو وہ مال کی چوری کیا کرتا تھا۔ بڑھاپے میں جب اس کام کا نہ رہا اور اس نے دین کی رہزنی اختیار کی، پیر بن کر لوگوں کو مونڈنے لگا، اتفاق سے کوئی مخلص بھی اس کے پاس آ پھنسا، اس نے ذکر وشغل پوچھا، یہ بیچارہ کیا بتا دے، اس نے اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے یہ خدمت اس کو بتلائی کہ ایک درخت آم کا خشک تھا، اس کو کہا اس کو پانی دیتے رہو جب ہرا ہو کر پھلنے لگے پھر آ جانا اور کچھ بتا دیں گے یوں سمجھا کہ اس کی نوبت ہی نہ آوے گی پیچھا چھوٹ جاوے گا، اس نے پانی دینا شروع کیا یہاں تک کہ اس کو آم لگا، جب وہ پختہ ہوا پیر کے پاس لایا، اس کو تراش کر چور نے آدھا خود کھایا آدھا اس کو دیا، پیٹ میں پہنچنا تھا دونوں صاحب نسبت ہو گئے، یہاں سے ایک اور بات بھی ثابت ہو گئی، کہ کبھی پیر کو بھی مرید سے نفع ہو جاتا ہے، اسی لئے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ہم تو بیعت اس نیت سے کرتے ہیں کہ حشر میں یا ہم اس کو جنت کی طرف کھینچ لیں گے یا یہ ہم کو

کھینچ لے گا۔ خوب کہا ہے ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف
گر بکشم زہے طرب ور بکشد زہے شرف

یعنی چاہے وہ کھینچ لے یا ہم کھینچ لیں مدعا ہر صورت میں حاصل ہے۔ غرض یہ نکتہ ہے غیر کامل کی اجازت میں کہ وہ باحیا ہو گا تو اس سے شرما کر جلد اپنی اصلاح کرلے گا۔

انبیاؑ کا طریق تعلیم

اس مقدمہ کے بعد واضح ہو گیا ہو گا کہ تعلیم بہ نسبت تعلم کے ۔

كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ

کو زیادہ مقتضی ہے، اس لئے تُعَلِّمُوْنَ کو تدرسون پر مقدم کیا گیا۔ نیز یہ بھی نقطہ ہو سکتا ہے کہ تعلم سے مقصود تعلیم ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ
لِّيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا
رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ○

اور مقصود گو حسًّا مؤخر ہو مگر قصداً مقدم ہوتا ہے، اس لئے تعلمون کو مقدم فرمایا کہ وہ غایت ہے تدرسون کی، اس سے علماء بہت خوش ہوئے ہوں گے کہ اس غایت پر تو ہمارا پورا عمل ہے کہ پڑھنے کے بعد ہم پڑھانے میں مشغول ہیں۔ حضرات! آپ خوش نہ ہوں کیونکہ حق تعالیٰ نے یہاں

بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ الْعُلُوْمَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ

نہیں فرمایا بلکہ "بما کنتم تعلمون" فرمایا ہے اور آپ درس کے بعد تدریس میں مشغول ہیں تعلیم میں مشغول نہیں ہیں، تعلیم کی حقیقت وہ ہے جس کو دوسری آیت میں حق تعالیٰ نے تذکر سے تعبیر کیا ہے۔

وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ

اور وہ اصل میں وعظ کا کام ہے جو میں اس وقت آپ کے سامنے کر رہا ہوں، جس سے آج کل کے علماء متنفر ہیں، اور اس کے اصل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ دیکھ لیا جائے، کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا کیا طرز تھا۔ کیا وہ کتابیں پڑھا کرتے تھے، ہرگز نہیں، ان کی تعلیم کا طریقہ یہی وعظ تھا اور اصل مقصود یہی ہے، مگر وعظ کہنے کے لئے ہم جیسوں کو ضبط علوم کی ضرورت ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی تعلیم تو علوم وہبی تھے، انکو نہ کتاب پڑھنے کی ضرورت تھی نہ وہ اس کے محتاج تھے کہ کتاب سامنے رکھ کر دوسروں کو پڑھائیں کیونکہ وہ حقائق کو بدون اصطلاحات کی مدد کے سمجھانے پر قادر تھے۔ وہ معقول کو محسوس بنا دیتے تھے، اس لئے ان کو کتابیں پڑھنے اور پڑھانے کی ضرورت نہ تھی۔ پھر بعد میں صحابہؓ بھی حضرات انبیاء علیہم السلام کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہ تھے وہ بھی اس کے محتاج نہ تھے۔ بعد جب حفظ میں کمی آئی، علوم اور وہبیہ کی استعداد کم ہو گئی تو علوم کو کتابوں میں مدون کیا گیا اور اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کتابیں پڑھی اور پڑھائی جائیں۔ مگر اس کی ضرورت اسی بات کے واسطے ہوئی کہ کتابوں سے علوم حاصل کر کے عوام کو صحیح علوم کی تبلیغ کریں غلط سلط باتیں

نہ بنائیں۔

علماء کا قصور

اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ کتابیں پڑھانے ہی کو مقصود سمجھ لو اور تبلیغ وانذار کو چھوڑ کر بیٹھ جاؤ۔ واقعی مسلمانوں کو اس بات نے بہت تباہ کیا ہے کہ وعظ کہنے والے زیادہ تر جاہل ہیں اور علماء وعظ نہیں کہتے، اگر علماء واعظ ہوتے تو مسلمانوں کی حالت تباہ و برباد نہ ہوتی۔ بعض علماء اس کے متعلق یہ عذر کرتے ہیں کہ ہم کو وعظ کہنا نہیں آتا۔ میں کہتا ہوں آپ کو عربی پڑھنا ہی کب آتا تھا، یہ بھی تو محنت کرنے سے ہی آیا ہے، اسی طرح وعظ کہنے کا ارادہ کیجئے اور کچھ دنوں محنت کیجئے، یہ کام بھی آجائے گا۔ جس کی سہل تدبیر یہ ہے، کہ اول اول طلبہ کے سامنے مشکوٰۃ وغیرہ لیکر بیٹھ جاؤ، اور کتاب دیکھ کر بیان کرو، پھر کچھ دنوں میں بدون کتاب کے بیان کرنا شروع کرو، اسی طرح ایک دن خوب بیان کرنے لگو گے حیرت کی بات ہے کہ جہلاء کو تو وعظ کی جرأت ہو اور علماء کو اس کی ہمت نہ ہو، جس کا نتیجہ یہ ہوا ——— کہ اب جہلاء علماء کے سامنے بھی غلط باتیں بیان کرنے سے نہیں ڈرتے چنانچہ مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ دیوبند میں ایک شخص نے میرے سامنے طلبہ کے مجمع میں

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَوٰةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ

لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ؕ

کا ترجمہ کیا کہ جب جمعہ کی اذان ہوا کرے تو گھروں اور دوکانوں کے تالے موند کر نماز کو آجایا کرو۔ یہ اس نے تعلمون کا ترجمہ کیا تھا کہ تالے موند کر آجایا کرو۔ اس نے تعلمون کی عین کو تو الف سے بدلا اور لام کی فتح کو دراز کیا، تالا ہو گیا، آگے رہ گیا مون اس کو موند کا مخفف بنایا جسکے معنی ہیں، "بند کرنا" اس طرح سے یہ معنی حاصل ہو گئے۔ اسی طرح ایک جاہل نے

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ

کا ترجمہ کیا تھا۔

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپکو دی ہے مثل کوثر کے)

اس احمق نے "اَعْطَيْنٰكَ" میں کاف تشبیہ بتلایا اور ضمیر مفعول کو فعل سے الگ کر دیا۔ ایسے ہی کانپور کے ایک جاہل نے

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ

کی تفسیر یہ کی کہ وسواس تو شیطان کا نام ہے اور خناس اس کا بیٹا ہے، پھر اس پر ایک حکایت گھڑی اور دیر تک بیان کرتا رہا۔ اس کا سارا الزام علماء پر ہے۔ جہلاء کو وعظ کی جرأت اسی لئے ہوئی ہے کہ علماء نے یہ کام چھوڑ دیا ہے۔ اگر علماء یہ کام کرنے لگیں تو جہلاء کا حوصلہ پست ہو جاتے، اور یہ بھی نہ ہو تو کم از کم عوام مسلمین ان کا بیان سننا چھوڑ دیں۔ کیونکہ ان کو محقق اور جاہل کے بیان میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ پس علماء خوش نہ ہوں کہ ہم تو تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ پر عامل ہیں۔

صاحبو! عمل کہاں ہے؟ جب آپ نے طریق وعظ کو بالکل چھوڑ رکھا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ خواص کے ضمن میں عام بھی ہوا کرتا ہے اور تعلیم عام ہے اور تدریس خاص ہے تو تدریس کے ضمن میں تعلیم بھی پائی گئی یہ منطقی سوال ہے۔ مگر میں حقیقت واضح کرکے ابھی اس کا جواب دئے دیتا ہوں۔ سنئے یہ جو قاعدہ ہے کہ خواص کے ضمن میں عام ہوا کرتا ہے، یا بعنوان دیگر خاص مستلزم ہے عام کو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خاص اس عام کو مستلزم ہوتا ہے جو اس خاص کا جزو ہے، باقی اس عام کے جو دوسرے افراد ہیں، جو اس خاص کے قسیم ہیں ان کو یہ خاص مستلزم نہیں ہوتا۔ پس اسی طرح تدریس بھی اس تعلیم کو مستلزم ہے جو تدریس کے ضمن میں متحقق ہے، دوسرے افراد تعلیم کو مثلاً وعظ کو مستلزم نہیں تو وعظ کی ضرورت تو بھی رہی ——

تدریس اس سے مستغنی نہ ہوئی، اور میں اوپر بتلا چکا ہوں کہ یہاں تعلیم سے زیادہ تر انذار و وعظ مراد ہے، جس کی دلیل دوسری آیات ہیں۔ اور انبیاء علیہم السلام کا طرز تعلیم یہی ہے، اور اگر آپ ہی کا قول مان لیا جائے کہ تعلیم عام ہے اور تدریس کے ضمن میں اس کا بھی تحقق ہو رہا ہے تو بہت سے بہت آپ یہ کہہ سکتے ہیں، کہ ہم تعلیم سے بالکل کورے نہیں مگر یہ تو نہیں کہہ سکتے

تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ

پر ہمارا عمل کامل ہے کیونکہ جب تعلیم عام ہے اور اس کے افراد چند ہیں اور سب مطلوب ہیں بلکہ تمہاری فرد معمول سے زیادہ تمہاری فرد متروک مقصود ہے اور آپ نے صرف ایک فرد کو لے رکھا ہے تو کمال کہاں ہوا، یقیناً آپ

اس کو نقص تسلیم کریں گے تو خیر اپنے آپ کو ناقص ہی مان لیجئے عاری عن التعلیم نہ ملنے پھر کیا نقص کا رفع کرنا ضروری نہیں، یقیناً ضروری ہے، غرض تعلیم عام ہے، اپنے سب افراد کو جو سب مطلوب ہیں اب ان افراد کو سمجھئے۔

علماء کے کرنے کے کام

سو اس وقت اس کے چند افراد میرے ذہن میں ہیں انکو عرض کرتا ہوں، اور استقراءً چار ہیں، وعظ، تدریس، امر بالمعروف بخطاب خاص تصنیف علماء کو ان چاروں شعبوں کو اختیار کرنا چاہئے، اس طرح کہ طلباء کے سامنے تو مدرس بن کر بیٹھیں اور عوام کے سامنے واعظ ہوں اور خاص مواقع میں امر بالمعروف کریں، اور خاص مواقع سے مراد یہ ہے کہ جہاں اپنا اثر ہو وہاں خطاب خاص سے نصیحت کریں، کیونکہ ہر جگہ امر بالمعروف مفید نہیں ہوتا اور بعض دفعہ عام لوگوں کو امر بالمعروف کرنے کی وجہ سے مخالفت بڑھ جاتی ہے، جسکا تحمل ہر ایک سے نہیں ہوتا، اور اگر کسی سے تحمل ہو سکے تو سبحان اللہ، وہ امر بالمعروف کریں، مگر یہ ضرور ہے کہ اپنی طرف سے سختی اور درشتی کا اظہار نہ کریں، بلکہ نرمی اور شفقت سے امر بالمعروف کرے اس پر بھی مخالفت ہو تو تحمل کرے اور اگر تحمل کی طاقت نہ ہو تو خطاب خاص نہ کرے محض خطاب عام پر اکتفاء کرے، میں نے ایک دوست کو یہی مشورہ دیا تھا، کہ ہر شخص کو امر بالمعروف جب کرو جبکہ اس کے نتائج کا تحمل ہو، ورنہ صرف ان لوگوں کو خطاب خاص کرو جن پر اپنا اثر ہے، ان کو تقوے کا شوق ہوا، ایک طرف سے سب کو نصیحت کرنے لگے

پھر جب لوگ مخالف ہوئے تو میرے پاس شکایت لکھی، میں نے جواب میں سرمدؒ کی یہ رباعی لکھدی ؎

سرمد گلہ اختصار می باید کرد

یک کار ازیں دو کار می باید کرد

یا تن برضائے دوست می باید کرد

یا قطع نظر زیار می باید کرد

غرض امر بالمعروف وہیں کرے جہاں قدرت ہو اور یہ آج کل بالکل ہی متروک ہو گیا ہے، باپ بیٹے کو، استاد شاگرد کو، پیر مرید کو آقا نوکر کو اور خاوند بیوی کو بھی تو امر بالمعروف نہیں کرتا حالانکہ یہ ایسے رشتے ہیں، جن میں انسان کا پورا اثر ہوتا ہے تو یہ بہت بڑی کوتاہی ہے، جس کام سے سوال ہو گا تین کام تو یہ ہیں، چوتھا کام تصنیف کا ہے، علماء کو ضرورت کے موقعہ پر تصنیف بھی کرنا چاہیے، اس کے یہ معنی نہیں کہ سب کے سب مصنف اور واعظ ہو جائیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ بقدر ضرورت علماء میں کچھ لوگ مصنف اور واعظ بھی ہونا چاہئیں، کیونکہ یہ امور فروض کفایہ ہیں، ہر کام کے کرنے والے ضرورت کے مطابق کافی مقدار میں ہونا چاہئیں (علامہ بیہقی نے حدیث لایزال طائفۃ من امتی علی الحق منصورین کی شرح میں لکھا ہے، کہ اس سے کوئی خاص جماعت مراد نہیں بلکہ دین کی خدمتیں بہت سی ہیں، ہر شخص ان میں سے جو خدمت بجا لا رہا ہے وہ اس میں داخل ہے خواہ واعظ ہو یا مصنف یا فقیہہ ہو یا محدث ۱۲ جامع) اگر ایک قصبہ میں مثلاً بقدر ضرورت واعظ موجود ہوں، تو دوسرے

علماء پر وعظ کہنا واجب نہیں، ان کو درس وتدریس میں مشغول رہنا جائز ہے، اور اگر واعظ کوئی نہ ہو تو مولوی صاحب کو اجازت نہیں کہ وہ صرف مدرس ہی بن کر رہیں، بلکہ ضرورت کے موقعہ پر ان کو وعظ بھی کہنا چاہئے۔

وعظ کی اہمیت

وعظ میں خاص اثر ہے، جس سے عوام کی اصلاح زیادہ ہوتی ہے، نیز عوام کو اس سے وحشت بھی نہیں ہوتی بلکہ دلچسپی ہوتی ہے اور اس کا جلدی اثر ہوتا ہے، تصنیف میں بھی وعظ کے برابر اثر نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں کو علماء پر یہ بھی اعتراض ہے کہ ان کی تصانیف دشوار ہوتی ہیں، یہ اعتراض تو محض لغو ہے، کیونکہ احکام جو کہ مقصود ہیں، ان کے متعلق تو تصانیف علماء کی سہل ہی ہوتی ہیں، بلکہ ایسی سہل ہوتی ہیں کہ بچے اور عورتیں بھی سمجھ لیتی ہیں، باقی رہے دلائل اور علوم دقیقہ سو وہ مقصود ہی نہیں، اور اگر باوجود غیر مقصود ہونے کے کسی کو مرغوب ہوں اور اس لئے ان کی تسہیل کا مشورہ دیا جاوے سو وہ کسی عبارت سے سہل نہیں ہو سکتے، بلکہ وہ اصل میں درس تدریس سے اور بعضے مضامین صحبت علماء میں رہنے سے اور بعضے ان سے دریافت کرنے سے حل ہو سکتے ہیں تو یہ اعتراض تو محض فضول ہے، مگر اتنا ضرور ہے کہ تصنیف کا نفع بھی عام نہیں اور درس کا نفع تو بہت ہی خاص ہے کہ ایک خاص جماعت تک محدود ہے۔ سب سے زیادہ عام نفع وعظ کا ہے کہ ایک گھنٹہ میں پانچ چھ ہزار کو نفع ہو جاتا ہے

تو وعظ کا نفع اتم و اہم و اسہل ہے، اس لئے اس کو ضرور اختیار کرنا چاہئے
دوسرے وعظ کو اسلئے بھی اختیار کرنا چاہئے، کہ جس چیز کو آپ آج کل مقصود
سمجھے ہوئے ہیں یعنی درس و تدریس خود اس کے لئے بھی یہ بہت معین و مفید
ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ علماء کو آجکل مدارس کی طرف بہت توجہ ہے
اور ہونا بھی چاہئے کیونکہ علوم اسلامیہ کے بقاء کی صورت یہی ہے اور اسکے
لئے وہ چندے وغیرہ کرتے ہیں اور امراء پر نظر کرتے ہیں اور یہ سمجھ رکھا ہے
کہ بدوں امراء کے ملے مدارس نہیں چل سکتے، خیر یہ تو اپنا اپنا خیال ہے
مجھے تو یقین کامل ہے کہ اگر علماء امراء سے بالکل نہ ملیں جب بھی کسی بات
میں کمی نہ آئے گی، کیونکہ جس خدا نے ابتداء اسلام میں بدوں امراء کی
امداد کے محض چند غریبوں کے ہاتھوں اپنے دین کو پھیلایا تھا وہ خدا
اب بھی موجود ہے اور وہ اب بھی اپنے دین کا محافظ ہے ؎

ہنوز آں ابر رحمت درفشان ست
خم و خمخانہ با مہر و نشان ست

اور بحمد اللہ اب بھی بعضے مدارس ایسے موجود ہیں جو محض توکل پر
چل رہے ہیں، جن میں کسی سے سوال نہیں کیا جاتا، مگر خیر اگر کسی کو توکل کی
ہمت نہ ہو تو میں ان کو چندہ کرنے سے منع نہیں کرتا، شرعاً اس کی بھی اجازت
ہے بشرطیکہ چند امور کا لحاظ رکھا جائے، ایک یہ کہ کسی پر دباؤ نہ ہو، دوسرے
یہ کہ اس طرح سوال نہ کیا جائے جس سے دین کی تحقیر ہو اس کے بعد نفس چندہ
میں کوئی قباحت نہیں، عام طور پر قومی کام اسی طرح چلا کرتے ہیں۔ آجکل

نو تعلیم یافتہ طبقہ علماء پر یہ اعتراض بھی کرتا ہے کہ یہ لوگ چندہ کرتے پھرتے ہیں، ان لوگوں کو اس اعتراض کا کیا منہ ہے، کیونکہ یہ خود اس میں مبتلا ہیں، یہ بھی خوب چندے کرتے ہیں بلکہ علماء سے زیادہ کرتے ہیں۔ علماء کے تو بہت سے مواعظ چندہ کے ذکر سے خالی بھی ہوتے ہیں اور ان کا تو کوئی لکچر بھی اس سے خالی نہیں ہوتا۔ اس کے متعلق سید اکبر حسین صاحب کا شعر خوب ہے

در پس ہر لکچر آخر چندہ ایست

ہر دو آخر ہیں مبارک بندہ ایست

میں نے آخر کو بضم خاء بنا دیا ہے جو کہ مقصود ہے چندہ سے، غرض مدارس کا زیادہ تر مدار چندہ پر ہے اور چندہ دینے والے زیادہ تر عوام ہیں۔ تو علماء کو چاہئے کہ عوام کو اپنی طرف مائل کریں، اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ہر مدرسہ میں ایک واعظ محض وعظ و تبلیغ کے لئے رکھا جائے، جس کا کام صرف یہ ہو کہ احکام کی تبلیغ کریں اور انکو ہدایا لینے سے قطعاً منع کر دیا جائے۔ اور استحساناً یہ بھی کہہ دیا جائے کہ مدرسہ کے لئے بھی چندہ نہ کرے۔ بلکہ اگر کوئی خود بھی دے تو قبول نہ کرے بلکہ مدرسہ کا پتہ بتلا دے کہ اگر تم کو بھیجنا ہو تو اس پتہ پر بھیج دو۔ واعظ کو محصل چندہ نہ ہونا چاہئے۔ محصل چندہ اور لوگ ہوں، واعظ کا کام صرف وعظ کہنا ہو۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اسکے وعظ میں جب چندہ کا ذکر نہ ہوگا تو بے غرض وعظ ہوگا، اس کا مخاطب پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ پھر عوام کو مدرسہ سے تعلق ہوگا کہ اس مدرسہ سے ہم کو دین کا نفع پہنچ رہا ہے، اس کی امداد کرنا چاہئے، اور اب تو عوام کو یہ بڑا

اعتراض ہے کہ صاحب ہم کو مدرسہ سے کیا نفع بس عربی پڑھنے والوں
ہی کو کچھ نفع ہو گا، اور واقعی ایک حد تک یہ اعتراض بھی صحیح ہے۔ اس لئے
جن عوام سے آپ چندہ لینا چاہتے ہیں ان کو بھی تو کچھ نفع پہنچانا چاہئے
جس کی صورت میں نے بتلا دی کہ ہر مدرسہ میں ایک واعظ محض وعظ کے
لئے ہونا چاہئے، اگر ہر مدرسہ میں ایک ایک واعظ ہو جائے۔ تو پھر دیکھئے عوام
کو مدرسے سے کیسا تعلق ہوتا ہے اور چندہ کی بھی کیسی کثرت ہوتی ہے۔ یہ
چلتے ہوئے نسخے ہیں، اگر شبہ ہو تو تجربہ کر کے اس کے نفع کا مشاہدہ کر
لیجئے۔ میں اہل مدارس سے کہتا ہوں کہ امتحان کے طور پر کچھ عرصہ کے لئے
اس پر عمل کر کے دیکھ لو۔ اگر تمہارے مدرسہ کو اس سے نفع نہ ہو تو اس کام
کو بند کر دینا ہر وقت اختیار میں ہے۔ ایک کام تو یہ کرو اور دوسرے اس
کی کوشش کرو کہ تمہارے مدرسے اہل دنیا کی نظر میں باوقعت ہو جائیں
جس سے قلوب میں طلباء کی وقعت ہو گی تو اہل دنیا اپنی اولاد کو عالم بنائیں گے
کیونکہ وہ عزت کے بڑے بھوکے ہیں جن کے کام میں عزت و جاہ دیکھتے
ہیں اس کی طرف جلدی مائل ہوتے ہیں۔ میر باقر داماد کا قصہ ہے کہ ان سے
بادشاہ نے اپنی بیٹی بیاہ دی تھی، بس علم کی یہ عزت دیکھ کر امراء نے اپنی
اولاد کو تحصیل علم میں مشغول کر دیا تھا، اور وہ کوشش یہ ہے کہ علماء کی عزت
استغناء سے ہوتی ہے، عبا و قبا سے نہیں ہوتی، پس اول تو یہ چاہئے کہ
علماء چندہ کا کام ہی نہ کریں اور اگر ایسا نہ کر سکیں تو کم از کم چندہ میں استغناء
ہی کا طریقہ اختیار کریں، کسی کی خوشامد اور لگو پتو نہ کیا کریں۔ نیز آج کل

طلباء کو کھانا لانے کے لئے امراء کے گھروں پر بھیجنا مناسب نہیں۔ اس سے طلباء عوام کی نظروں میں حقیر ہوتے ہیں، اور طلباء کی حقارت سے علم دین عوام کی نظروں میں حقیر ہو جاتا ہے، یہ تقریر وعظ کی ضرورت پر چلی تھی۔ اور میں نے واعظ کو محض چندہ دینے سے انکار کیا تھا اس پر اتنا طول ہو گیا مگر کچھ حرج نہیں، اس میں بھی بہت سی مفید باتیں بیان ہو گئیں۔

بہر حال تعلیم کے چار شعبے ہیں، ان سب کا حق ادا کیجئے، اس وقت یہ کہنا صحیح ہو گا کہ تعلم سے جو مقصود تھا وہ آپ نے پورا کر دیا، پس تعلمون کے مقدم کرنے کی یہ بھی وجہ ہے کہ تعلیم مقصود ہے اور تعلم ذریعہ مقصود ہے اور مقصود ذہناً مقدم ہوتا ہے، اس لئے لفظاً بھی مقدم کیا گیا۔

ربّانی بننے کی شرائط

اب آیت کا مطلب سمجھئے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ چونکہ تم پڑھاتے ہو اور پڑھتے ہو، اس لئے ربّانی (اللہ والے) بن جاؤ، اس سے معلوم ہوا، کہ تعلیم و تعلم ہی پر کام ختم نہیں ہو گیا، بلکہ ابھی ایک بڑا کام باقی ہے، وہ کیا، ربّانی ہونا، اللہ والا بننا، کیونکہ بدون اس کے تعلیم و تعلم کا کچھ نتیجہ حاصل نہیں ہوتا، سب سے مقصود یہی ہے کہ آدمی خدا کا ہو جاوے، مگر آج کل اہل علم نے صرف تعلیم و تعلم ہی کو مقصود سمجھ لیا ہے، عمل کا اہتمام نہیں کرتے محض الفاظ پر اکتفاء کرتے ہیں، ان کو قلب تک نہیں پہنچاتے، اسی کو ایک حکیم کہتے ہیں ؎

ہندوستانی لائبریری
گارڈن ریچ روڈ۔ مٹیا برج۔ کلکتہ

أَيُّهَا الْقَوْمُ الَّذِي فِي الْمَدْرَسَة
كُلُّ مَا حَصَّلْتُمُوْهُ وَسْوَسَة
علم نبود غیر علم عاشقی
ما بقی تلبیس ابلیس شقی
علم رسمی سر بسر قیل است و قال
نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال
علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت
زنگ گمراہی ز دل بزدایدت
ایں ہوسہا از سرت بیروں کند
خوف و خشیت در دلت افزوں کند
تو ندانی جز یجوز و لا یجوز — خود ندانی تو کہ حوری یا عجوز
علم چوں بر دل زنی یارے شود — علم چوں بر تن زنی مارے شود

مگر اس سے علم رسمی کو فضول و بیکار اور حقیر نہ سمجھا جائے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ علم رسمی کافی نہیں، بلکہ یہ ایسا ہے جیسے نماز کے لئے وضو کہ تنہا وضو بغیر نماز کے کافی نہیں ہے، مگر کافی نہ ہونے سے غیر ضروری ہونا لازم نہیں آتا بلکہ نماز کے لئے وضو شرط ہے، اس کے بغیر نماز ہی نہ ہوگی۔ اسطرح علم رسمی علم حالی کے لئے شرط ہے، بدوں علم بقدر ضرورت کے علم حالی بھی حاصل نہیں ہو سکتا، وہ لوگ جاہل ہیں جو علم درسی کو غیر ضروری سمجھتے ہیں، اس کی بہت ضرورت ہے، اور ساتھ ہی اس کی بھی ضرورت ہے،

براہ کرم ورق نہ موڑیں

علم رسمی کو عربی ہی کے ساتھ مخصوص نہ کیا جائے، بلکہ تعلیم دین کو عام
کیا جائے، جسکا ایک طریقہ تو وہ ہے جو میں نے بیان کیا ہے کہ عوام کو
وعظ کے ذریعہ سے احکام سے مطلع کیا جائے، دوسرا طریقہ یہ ہے،
کہ اردو رسائل میں احکام کا ترجمہ لکھا جائے اور مردوں سے گذر کر
عورتوں میں بھی تعلیم کو رائج کرنا چاہیئے، جسکا طریقہ یہ ہے، کہ مرد وعظ
سنکر عورتوں کو احکام سے مطلع کریں، اور جو رسائل اردو میں عورتوں
کے واسطے لکھے گئے ہیں وہ ان کو پڑھائے جائیں، مگر اس کا یہ مطلب
نہیں کہ ان کو جغرافیہ اور حساب پڑھایا کرو، آج کل تعلیم نسواں کا
مطلب لوگ یہی سمجھتے ہیں، مگر تجربہ ہے کہ علم دین کے سوا اور علوم
عورتوں کو پڑھانا مضر ہیں، مثلاً جغرافیہ پڑھانا گھر سے بھاگنے میں مدد
دیتا ہے، چنانچہ آجکل میرے پاس ایک عورت کی تصنیف کردہ کتاب
تقریظ کے لئے آئی ہے، اس میں ترقی کی کوشش کی تعلیم کے سلسلہ میں
لکھا ہے کہ مسلمانوں سے اور تو کچھ ہوتا نہیں، بس اٹھے اور اللہ میاں
سے دعا مانگ لی۔ اللہ میاں بھی کہتے ہیں (نعوذ باللہ) کہ مجھ کو اور بھی
کام ہیں، تمہارے کام بنانے کی مجھکو کہاں فرصت تم بھی تو کچھ کرو۔
الہی توبہ اس نئی تعلیم سے تو عورتیں مردوں سے آگے بڑھ گئیں کہ مرد
تو علماء پر مشق کرتے تھے۔ انہوں نے اللہ میاں پر مشق شروع کر دی۔
غرض علم رسمی کو فضول نہ سمجھا جائے، بلکہ اس کو تو عام کرنے کی ضرورت
ہے۔ باقی ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ تم محض اس پر کفایت نہ کرو،

کہ ہم عالم ہو گئے۔ بلکہ اس کی غرض و غایت پر بھی نظر کرو وہ یہ ہے کہ اللہ والے بن جاؤ کیونکہ پڑھانا اسی کے لئے ہے اور یاد رکھو کہ:

بِمَا كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ، كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ۔

کیونکہ مقتضی شرط نہیں ہے یہاں تک کہ شبہ ہو، جہاں شرط نہیں وہاں مشروط بھی لازم نہ ہوگا تو عوام پر ربانی ہونا واجب نہ ہوگا اور مقتضی ہونے پر جو شبہ ہوا تھا، اس کا جواب میں پہلے دے چکا ہوں کہ مراد مقتضی اتم ہے اور نفس مقتضی ہر مسلمان میں موجود ہے، یہ علماء ہی کے ساتھ خاص نہیں یعنی ایمان اب بعد رفع اشکالات کے میں کہتا ہوں کہ علم سے فارغ ہو کر یہ نہ سمجھو کہ تم بالکل فارغ ہو گئے، بلکہ ابھی آپ کو دوسری منزل طے کرنے کے لئے اس سوال کا موقع باقی ہے ؎

از مدرسہ بکعبہ روم یا بمیکدہ
اے پیر رہ بگو کہ طریق صواب چیست

اس میں کعبہ سے مراد طریقہ سلوک و کثرت عبادت ہے اور میکدہ سے طریق جذب و محبت، اس کا یہ مطلب نہیں کہ طریق محبت میں عبادت نہیں ہوتی، یہ خیال تو الحاد و زندقہ ہے بلکہ مطلب یہ ہے مثلاً نوافل کی تکثیر نہیں غرض سلوک اور جذب دو طریقے ہیں وصول الی اللہ کے۔ اس وقت ان کی تفصیل کا موقع نہیں، مگر میں نے اجمالاً اس پر اس لئے متنبہ کر دیا ہے تاکہ سامعین ان الفاظ سے پریشان نہ ہوں۔

رموزِ تصوّف

حافظ کے کلام میں ایسے کنایات بہت ہوتے ہیں، چنانچہ اس وقت ایک شعر اور یاد آیا جسکا مطلب شاید بہت لوگ نہ سمجھے ہوں گے، کیونکہ وہ انکی اصطلاحات کو نہیں جانتے اسی لئے خواہ مخواہ اعتراض کر دیتے ہیں، فرماتے ہیں ؎

دوش از مسجد سُوئے میخانہ آمد پیرِ ما
چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما

اس میں تو سوال ہے، اگلے شعر میں خود ہی اس کا جواب دیتے ہیں ؎

در خراباتِ مغاں ما نیز ہم منزل شویم
کایں چنیں رفت است در عہدِ ازل تقدیرِ ما

اس سے اہلِ ظاہر تو یہ سمجھے کہ پیر اگر مسجد کو چھوڑ کر شراب خانہ میں جا پڑے، تو مرید کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے یہ بالکل غلط ہے، جس کا منشاء وہی جہل عن الاصطلاح ہے، بلکہ یہاں بھی مسجد سے مراد طریقۂ سلوک ہی ہے اور میخانہ سے مراد طریقۂ جذب ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا! دوسرا مقدمہ یہ سمجھئے کہ کبھی کامل پر بھی جذب کا غلبہ ہو جاتا ہے گو مبتدی جیسا نہ ہو مگر ہو جاتا ہے۔ تیسرا مقدمہ یہ سمجھئے کہ جب تک شیخ اپنے حال میں مشغول ہو جاتا ہے اور غلبہ حال کے لئے یہ بات ضروری ہے تو اس حالت میں وہ دوسروں کو نفع نہیں پہنچا سکتا ان مقدمات کے بعد سنئے کہ سوال کا حاصل تو یہ ہے کہ ہمارے شیخ پر چند دنوں سے جذب کا غلبہ ہے تو اب ہم کو کیا کرنا چاہئے کیونکہ اس حالت میں ہم کو نفع نہیں

پہنچا سکتا تو کیا ہم کو دوسرا شیخ تلاش کرنا چاہیئے، اگلے شعر میں جواب ہے کہ نہیں ہمکو اس حالت میں بھی شیخ ہی کا ساتھ دینا چاہیئے، کیونکہ جسکو ایک دفعہ شیخ بنا لیا ہے اور طبیعت کو اس سے کامل مناسبت ہو گئی ہے، ازل سے وہی ہمارے واسطے مقدر ہو چکا ہے تو ہم کو دوسرے سے نفع نہیں ہو سکتا اور اس حالت میں افادہ نہ کر سکنے کا جواب یہ ہے کہ کاملین کا جذب ہمیشہ برپا نہیں ہوتا، بلکہ عارضی ہوتا ہے، غرض آپ کو تحصیل علم کے بعد طریق سلوک یا جذب کو حسب تجویز شیخ اختیار کر کے اصلاح نفس کا کام کرنا چاہیئے، بس ابھی آپ پورے فارغ نہیں ہوئے، درسیات کے بعد یہ کام باقی ہے، مگر میں یہ رائے نہ دونگا کہ سند درسیات حاصل کرتے ہی فوراً ذکر و شغل شروع کر دیجئے، بلکہ پہلے اپنے پڑھے کو پختہ کر لو، کیونکہ جذب و سلوک میں مشغول ہو کر اس علم سے قطع نظر کرنا پڑے گی، بلکہ اس کو بھلا دینا پڑے گا، اور جو شخص بیوی کو طلاق دینا چاہے اس کو چاہیئے کہ پہلے اپنے جیسے ایک دو جنوا لے پھر طلاق دے، ایسے ہی آپ علم حاصل کر کے اول تعلیم میں مشغول ہوں اور اپنے جیسے دو چار عالم بنا دیجئے پھر اس کو بھلایئے گا اور پڑھتے ہی فوراً بھلا دو گے تو ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔ اور یہ مناسب نہیں اور اصلاح نفس کے لئے علم رسمی سے قطع تعلق کرنے کی ضرورت اسلئے ہے کہ سلوک و جذب کے لئے یکسوئی اور خلوت کی ضرورت ہے، اشتغال علمی کے ساتھ اس کا جمع ہونا دشوار ہے، بلکہ اس کے لئے تو اس کی ضرورت ہے ؎

قصر چہ بگزید ہر کہ عاقل ست — زانکہ در خلوت صفاہائے دل ست

مگر خلوت کو جلوت پر مطلقاً فضیلت نہ دینی چاہیئے۔ مولانا نے ایک مقام پر اسکی عجیب وجہ لکھی ہے فرماتے ہیں کہ تم جو خلوت کے فضائل بیان کرتے ہو، یہ بھی تو جلوت ہی کی بدولت حاصل ہوئے، سبحان اللہ کیا عجیب و غریب بات ہے، واقعی خلوت کے برکات و فضائل بھی تو کسی کی صحبت ہی میں رہکر معلوم ہو سکتے ہیں، دوسرے یہ کہ خلوت وغیرہ کا از خود اپنے لئے تجویز کر لینا مفید نہیں، بلکہ اس وقت مفید ہے جب کوئی شیخ محقق تمہارے لئے اس کو تجویز کرے ورنہ خلوت بھی غوائل سے خالی نہ ہوگی، پس اصلاح نفس کی تدبیر یہ ہے کہ اپنے کو کسی کے سپرد کردے، جو وہ کہے اس پر عمل کرے، مگر یہ ایسے کو کرے جسکی یہ شان ہو ؎

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

کیونکہ محقق ایسا ہی شخص ہوگا جو شریعت و طریقت دونوں کا جامع ہو، بدون کسی محقق کے اتباع کے اصلاح نفس نہیں ہو سکتی، بعض لوگ اس خبط میں ہیں، کہ کتاب میں نسخے دیکھ کر اپنا علاج خود کر لیں گے، مگر یہ خیال ایسا ہی ہے جیسے کوئی مریض کتاب میں نسخے دیکھکر اپنا علاج خود کرنا چاہے کہ اسکا انجام بجز ہلاکت کے کچھ نہیں۔ حضرت اگر کبھی طبیب بھی بیمار ہوتا ہے تو وہ اپنا علاج خود نہیں کر سکتا بلکہ دوسرے طبیب کا محتاج ہوتا ہے، پھر جو بیمار طبیب بھی نہ ہو اس کو اپنے علاج سے صحت کیونکر ہو سکتی ہے، باقی اس کے لئے بیعت ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ کسی کو متبوع بنانے کی ضرورت ہے، اور جو پیر بدون

بیعت کے تعلیم نہ کرے اس کو چھوڑ دو وہ محقق نہیں ہے۔

مصلحین کو ہدایت

پھر جب کسی شیخ کی تعلیم و صحبت کی برکت سے تمہاری اصلاح ہو جائے تو اس کے بعد دوسروں کی بھی اصلاح کرنی چاہیئے۔ ربانی بھی بنو اور رباعی گر بھی بنو۔ مگر اس میں ایک بات قابل تنبیہ ہے، وہ یہ کہ کام شروع کرنے سے پہلے تو ربانی گر بننے کی نیت کر لو تاکہ نیت افادہ کا ثواب ملتا رہے۔ مگر کام میں لگنے کے بعد اس نیت کی طرف التفات نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ کام شروع کرنے کے بعد ساری توجہ کام پر مبذول کرنا چاہیئے۔ اس وقت ثمرات پر نظر کرنا مضر ہے، اس کی ایسی مثال ہے، جیسے ایک شخص جامع مسجد جانا چاہتا ہے، تو اس کو چاہیئے کہ ابتداء میں جامع مسجد کا قصد کرے اور چلنا شروع کرے، اب اگر وہ قدم قدم پر یہ سوچے گا کہ میں نے کتنا راستہ طے کیا اور جامع مسجد کتنی دور رہی ہے تو بجائے آدھ گھنٹہ کے ایک گھنٹہ میں پہنچے گا۔ اسی طرح اگر کوئی سرکاری ملازمت تنخواہ کے واسطے کرتا ہے، اگر وہ ہر وقت کام کرتے ہوئے یہی سوچا کرے کہ آج میں نے اتنے دن کام کر لیا ہے میری تنخواہ اتنی لازم ہو گئی اور اتنی کا استحقاق فلاں تاریخ کو ہو جائے گا تو یقیناً وہ کام کو خراب کرے گا، کیونکہ ایک کام کے ساتھ دوسری باتوں پر نظر کرنا موجب تشتت ہے کام جبھی ہوتا ہے، جب اس میں ایسا لگے کہ اس وقت اس کے سوا کسی پر نظر نہ ہو ایسے ہی یہاں سمجھئے کہ اصلاح نفس میں مشغول ہو کر یہ خیال کرنا کہ ہم ایک دن

مصلح بنیں گے سدِ راہ ہے، اسی سے ایک شبہ حل ہو گیا جو اس واقعہ سے پیدا ہوتا ہے، جو ایک بزرگ کی نسبت سُنا گیا ہے کہ ان کے ایک مرید کو ذکر و شغل سے نفع نہیں ہوتا تھا۔ شیخ نے بہت کچھ تدبیریں کیں مگر کچھ نفع نہ ہوا۔ آخر ایک دن پوچھا کہ میاں یہ تو بتلاؤ کہ ذکر و شغل سے تمہاری نیت کیا ہے، اس نے کہا حضور میری نیت یہ ہے کہ میری اصلاح ہو جائے تو پھر میں دوسروں کی اصلاح کردوں گا۔ فرمایا اس خیال سے توبہ کرو۔ اس کو دل سے نکال دو یہ تو شرک ہے یعنی شرک طریقت۔ ابھی سے بڑا بننے کی فکر ہے، اس نے اس خیال سے توبہ کی بس دو ہی روز نفع ہونا شروع ہوا۔ اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ نیت تو شرعاً محمود تھی کیونکہ نفع متعدی کی نیت تھی، اور نفع متعدی کی نیت نفع لازم سے اولیٰ ہے، جواب اس کا یہ ہے کہ اس نیت کا کام شروع کرنے سے پہلے کر لینا مضر تھا۔ اس شخص نے کام شروع کرنے کے بعد یہ نیت کی۔ اسلئے اس کو ضرر ہوا۔ کام شروع کرنے کے بعد تو یہ حال ہو جاتا ہے ؎

عاشقی چیست بگو بندہ جاناں بودن
دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن
سوئے زلفش نظرے کردن و رویش دیدن
گاہ کافر شدن و گاہ مسلماں بودن

یہاں کافر و مسلماں الفاظ اصطلاحیہ ہیں، مطلب یہ ہے کہ طالب کے بندہ بنکر رہنا چاہئے کالمیت فی ید الغسال ثمرات پر نظر نہ کرنا چاہئے کہ یوں ہوگا اور اس طرح ہوگا۔ یہی مطلب ہے حضرت شاہ علیہ الرحمۃ

یہ اس قول کا کہ مقصود طلب ہے وصول مطلوب نہیں یعنی طلب کے وقت مقصود طلب ہے، طلب کے وقت وصول پر نظر نہ کرنا چاہیئے کہ مجھے وصول ہوگا یا نہیں، بلکہ اس وقت تو یہ مذہب ہونا چاہیئے ؎

دست از طلب ندارم تا کام من برآید
یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

یعنی طلب ہی کو اپنا فرض سمجھے۔ حضرت حاجی صاحب سے جب کوئی ذاکر عدم نفع کی شکایت کرتا اسوقت حضرت یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

یابم اورا یا نہ یابم جستجوئے می کنم
حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

اس کا بھی وہی مطلب ہے کہ جستجو اور آرزو مطلوب ہے اس ہی میں لگنا چاہیئے وصول و حصول پر نظر نہ کرنا چاہیئے۔ جامی اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں ؎

ہمینم بس کہ داند ماہ رویم
کہ من نیز از خریداران اویم

کہ بس ہمیں اتنا ہی کافی ہے کہ ان کو خبر ہو جاوے کہ فلاں ہمارا خریدار ہے یہ بڑی بات ہے تھوڑی بات نہیں، جب انہیں خبر ہو جاوے گی، تو وہ اپنے خریدار کو محروم نہیں رکھا کرتے ؎

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نکرد
اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

مگر تم تفویض بھی اس نیت سے کرو کہ تفویض کی وجہ سے ہمارا کام ہو جائیگا

بلکہ ان کا حق سمجھ کر تفویض کرو۔ الغرض وصول اور ایصال کا قصد کرنا زمانۂ طلب میں غلطی ہے کیونکہ قصد اس شے کا ہو سکتا ہے جس میں قصد اختیار کو دخل ہو اور وصول اور صلاحیت ایصال دونوں تمہارے اختیار سے باہر ہیں۔ پس ؎

کار خود کن کار بیگانہ مکن

کام کے وقت مقصود پر نظر نہ کرو۔ بلکہ کام پر نظر کرو یعنی طلب پیدا کرو۔

؎ آب کم جو تشنگی آور بدست
تا بجوشد آبت از بالا و پست
تشنگان گر آب جویند از جہاں
آب ہم جوید بعالم تشنگاں

اسی طرح ایک دن انشاء اللہ مقصود تک بھی پہنچ جاؤ گے، پھر جب تانی بن جاؤ اور دوسروں کی تربیت کرنے لگو تو اس کا لحاظ رکھو کہ ہر شخص کو اس کی استعداد کے موافق تعلیم کرو۔ سب کو ایک ہی لکڑی نہ ہانکنا کیونکہ عبد اللہ بن عباس نے ربانی کی تفسیر میں فرمایا ہے:

الرَّبَّانِیُّ الَّذِیْ یُعَلِّمُ صِغَارَ الْعُلُوْمِ قَبْلَ کِبَارِھَا

ربانی وہ ہے جو چھوٹے علوم اول تعلیم کرے اور بڑے علوم بعد کو سکھائے یعنی طالب کو بتدریج ترقی کی طرف لیتا جائے۔ اب میں ختم کرنا چاہتا ہوں، گو میں اس وقت ربانی کی تفسیر زیادہ نہ کرونگا۔ مگر تمہید میں جو مضمون مذکور ہوا ہے، باشارۃ النص اسکی تفصیل کر سکتا ہے۔ خلاصہ بیان کا یہ ہے،

کہ حق تعالیٰ نے دو مرتبے تو آپ کو عطا فرمائے ہیں، تعلیم، تعلم اور تیسرے امر کا مطالبہ کیا ہے کہ ربّانی بن جاؤ، اب حق تعالیٰ دیکھتے ہیں کہ آپ اس تیسرے درجے کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے ہیں، اس پر عمل کرتے ہیں یا نہیں۔ اب دعا کیجیے کہ حق تعالیٰ سب کو اور ساتھ میں مجھے بھی عمل کی توفیق عطا فرمادیں آمین !!

وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ الہٖ واصحابہٖ اجمعین وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین۔

منبر سے اترتے ہوئے فرمایا کہ اس وعظ کا نام "العبد الربانی" رکھا جائے اور وجہ تسمیہ کی بابت فرمایا کہ آیت میں پہلے یہ الفاظ مذکور ہیں:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔

اس کے بعد ارشاد ہے:

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ

پس یہاں ربانیین کے معنی یہی ہیں کہ عبد الرب بننا چاہیے اس لئے العبد الربانی نام مناسب ہے، جس میں بطیف اشارہ محل بیان کی طرف بھی ہے۔ کیونکہ مدرسہ کا نام مدرسہ عبد الرب ہے۔ فقط۔

عُلُوُّ العِبَاد

مِنْ

عُلُومُ الرَّشَاد

•

آداب مجالس اور فضیلت علم و عمل کے متعلق یہ وعظ
مدرسہ عبدالرب دہلی میں ۱۹ شعبان ۱۳۳۵ھ کو قریباً
پندرہ سو کے مجمع میں کھڑے ہو کر فرمایا، جو تقریباً تین
گھنٹوں میں ختم ہوا، اسے مولوی اشفاق الرحمٰن صاحب
کاندھلوی نے قلمبند کیا۔

•

ہماری حالت ایسی نکمّی اور ردی ہو گئی ہے کہ قابلِ بیان نہیں، نہ ہمارے عقاید کامل ہیں، نہ اعمال و عبادات، نہ معاملات، نہ معاشرات، نہ اخلاق، نہ اقوال و احوال، غرض ہر چیز ناقص و کمزور ہے، اگر صحابہؓ زندہ ہو کر ہمیں دیکھیں، تو ہمیں حضورؐ کی امت میں خیال کرنا ان کو دشوار ہو جائے۔

HINDUSTANI LIBRARY
Estd. 1939
ہندستانی لائبریری
Garden Reach, Calcutta.

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ
ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات
اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہٗ ونشہد ان*
سیدنا ومولانا محمدًا عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللہ علیہ
وعلی آلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ
باللہ من الشیطٰن الرجیم ۝ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝
یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا
فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰہُ لَکُمْ وَاِذَا قِیْلَ
انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَ
وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۔

ہندستانی لائبریری
گارڈن ریچ روڈ، مٹیا برج، کلکتہ

* ومن یضلل فلا ھادی لہ ونشہد ان لا الٰہ الا اللہ

تمہید و ضرورت

یہ سورۂ مجادلہ کی آیت ہے، حق سبحانہٗ و تعالیٰ اس آیت میں بعض آدابِ مجالس کے بیان فرماتے ہیں۔ ہر چند آیت[1] کا شانِ نزول خاص ہے، مجلس جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ۔ لیکن چونکہ الفاظ عام ہیں، اسلئے خصوص مورد کا اعتبار نہ ہوگا۔ بلکہ عموم الفاظ کے اعتبار سے حکم عام ہوگا۔ پس خاص حضورؐ ہی کی مجلس کے ساتھ یہ حکم مخصوص نہیں، بلکہ یہ حکم تمام مجالس کو عام ہے اور حق تعالیٰ شانہٗ نے اس جگہ اس حکم کے جو کہ دو حکموں پر مشتمل ہے امتثال پر اس کے ثمرہ کا بھی وعدہ فرمایا ہے، چنانچہ پہلے حکم اور اس کے ثمرہ کے لئے ارشاد ہے:

اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰہُ لَکُمْ۔

یہ تو پہلا حکم اور اس کا ثمرہ ہے، آگے بذریعہ عطف دوسرا حکم اور اس کا ثمرہ ارشاد فرماتے ہیں:

---

[1]: اس آیت کے شانِ نزول کی تفصیل گذشتہ خطبہ میں گزر چکی ہے۔

وَاِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا

یہ تو حکم ہے اور اس کا ثمرہ ارشاد فرماتے ہیں:

یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ

اور اس ثمرہ اور اس کے وعدہ میں اول تعمیم فرمائی، اس کے بعد تخصیص کے طور پر بعض لوگوں کے واسطے یعنی اہل علم کے لئے ثمرہ جداگانہ بیان فرمایا۔ اور تخصیص بعد تعمیم بقواعد علم بلاغۃ اہتمام کو مقتضی ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل علم کو چاہئے کہ اس کو بہم بالشان سمجھکر اس کا خاص طور پر اہتمام کریں۔ اور اس وقت اس کو بیان کے لئے اسواسطے اختیار کیا گیا کہ یہ امر بظاہر شعائر وارکان دین سے نہیں، بلکہ ایک معمولی سی عادت ہے، جسکی ہر جلسہ میں ضرورت پڑتی ہے۔ مگر عام طور پر لوگ اس کو ضروریات سے خیال نہیں کرتے، اس لئے اس کو بیان کے لئے ـــــ اختیار کیا گیا۔

آدابِ مجلس

اس اجمال کی تفصیل اس کے ترجمہ سے واضح ہو جائیگی اور ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اے مسلمانو! جب تم سے کہا جاوے کہ مجلس میں فراخی کر دو، تو فراخی کر دیا کرو۔ جب تم سے کہا جاوے اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ جایا کرو (یعنی اگر اس جگہ سے اٹھنے کا امر ہو تو اس جگہ سے اٹھ جایا کرو، پھر خواہ تم کو دوسری جگہ بیٹھنے کا حکم ہو جاوے خواہ چل دینے کا امر ہو اسی پر عمل کیا کرو اور تنگیا ور انکار نہ کیا کرو) اور ظاہر ہے کہ یہ امر عقاید میں سے نہیں، اعمال و کیفیہ میں سے

نہیں، مالی حقوق میں سے نہیں، اسلئے ظاہراً معمولی کی بات معلوم ہوتی ہے، مگر چونکہ واقع میں قابل اہتمام اور ضروری امر ہے اس لئے اس کو نہایت اہتمام کے ساتھ بیان فرمایا چنانچہ اول تو

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا

سے خطاب ہے، باوجودیکہ قرائن سے مومنین ہی مخاطب ہیں اور اکثر قرآن میں مسلمانوں ہی سے خطاب ہوتا ہے پھر اس صریح خطاب سے کیا فائدہ ہے تو خوب سمجھ لو کہ اس سے مقصود رغبت دلانا ہے کہ یہ امر ہر چند شعائر دین سے نہیں اسلئے عام طور سے ممکن ہے کہ لوگوں کو اسکا اہتمام نہ ہو۔ مگر ہمارے مخاطب وہ ہیں، جو ہم پر اعتقاد رکھتے ہیں وہ ضرور اسکو قبول کریں گے۔ اس طرز کلام سے اس مضمون کی سامعین کو رغبت دلائی اور دوسرا اہتمام اذا قیل بصیغہ مجہول سے ظاہر فرمایا، باوجودیکہ واقعہ خاصہ میں اس قول کے قائل خاص حضور اقدس ہیں، پھر بھی عنوان عدم تعیین قائل سے تعبیر فرمایا (یعنی قیل مجہول کے صیغہ کیساتھ بیان فرمایا بجائے صیغہ معلوم قال بکم کے) اور یہ عدول اس وجہ سے فرمایا کہ اس مسئلہ میں حضور کے ارشاد کی تخصیص نہیں اس لئے حکم عام ہے ہر صدر مجلس کے قول کو۔ تیسرا اہتمام یہ کہ امر کے صیغہ کے ساتھ بیان فرمایا ہے یعنی فَافْسَحُوا اور فَانْشُزُوا اور ظاہر ہے کہ امر حقیقۃً وجوب کیلئے ہوتا ہے، جب تک کوئی قرینہ صارفہ عن الحقیقۃ نہ ہو۔ گو واجبات کے درجات مختلف ہوتے ہیں، کہیں وجوب لعینہ ہوتا ہے کہیں وجوب لغیرہ مگر نفس وجوب میں شرکت ضرور ہوتی ہے۔ چوتھا اہتمام یہ ہے کہ تفسحوا کا امر اور اس کا ثمرہ جدا بیان فرمایا

اور اُنْشُزُوْا اور اس کا ثمرہ جدا بیان فرمایا۔ ورنہ اگر اختصار کے ساتھ مجلس میں حکمِ صدر کی اتباع کا مشترک امر فرما دیتے تو اس درجہ اہتمام نہ ہوتا جیسا کہ جدا جدا بیان کرنے میں ہوا۔ پانچواں اہتمام یہ ہے کہ لفظ فی المجالس بصیغہ جمع فرمایا، باوجودیکہ فی المجلس بھی کافی تھا وہ بھی جنس کی وجہ سے عام ہوتا مگر چونکہ اس میں یہ احتمال باقی تھا کہ اس عام کو خاص پر حمل کر لیا جاتا اور مجلس سے خاص مجلس مراد لے لی جاتی (یعنی حضورؐ کی مجلس) اس لئے فی المجالس فرما کر اس کا احتمال بھی قطع فرما دیا، کہ اب احتمال تخصیص کا ہو ہی نہیں سکتا لہٰذا حکم عام ہوگا تخصیص کا احتمال ہی نہیں۔ چھٹا اہتمام یہ ہے کہ جس ثمرہ کو مرتب فرمایا اس کا بڑا ہونا ظاہر فرما دیا کیونکہ مقتضا علم بلاغت کا یہ ہے کہ عادۃً چھوٹے ثمرہ کو ذکر نہیں کیا کرتے اور یہاں ثمرہ کا ذکر موجود ہے اور قرآن کا فصیح و بلیغ ہونا مسلم ہے پس قرآن میں کسی ثمرہ کا ذکر ہونا اس کو مقتضی ہے کہ یہ ثمرہ بہت بڑا ہے، اور جب ثمرہ بڑا ہوتا ہے تو عمل کا بڑا ہونا بھی ضروری ہے، جس پر اس قدر بڑا ثمرہ مرتب ہوا ہے تو اس سے عمل مذکور کی یعنی توسع اور قیام کی اہمیت و عظمت بھی معلوم ہوئی۔ ساتواں اہتمام خاص اہل علم کی فضیلت ظاہر کرنے کے لئے یہ کیا گیا کہ ثمرہ

یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ

میں ایمان والوں کو اولاً وعموماً اور اہل علم کو ثانیاً وخصوصاً بیان فرمایا، تاکہ اہل علم کی بالتخصیص فضیلت معلوم ہو جاوے، پھر اس سب کے بعد خلاف پر وعید ہے۔ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ؁

اس سے اور زیادہ اہتمام بڑھ گیا۔ یعنی اگر تم اس پر عمل نہ کروگے تو حق تعالیٰ
اس سے خبردار ہیں، اس لئے تمہیں مخالفت سنبھل کر کرنی چاہیے۔ پس

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۔

ظاہراً وعید ہے، اور یہ بھی احتمال کہ یہ وعدہ ہو کہ اس عمل کے کرنے پر ثمرہ کا
ترتب ضرور ہوگا، کیونکہ تمہارے اعمال کی حق تعالیٰ کو خبر ہے اس لئے اسی
عمل کے کرنے پر ثمرہ کا ترتب فرمادیں یا اعمال مذکورہ کے معتد بہ ہونے کی شرائط
کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی

تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجَالِسِ

یا انشزوا مطلقاً معتبر و معتد بہ نہیں، بلکہ اس میں خلوص بھی شرط ہے یعنی صرف
صورۃ عمل پر ثمرہ مذکورہ مرتب ہوگا۔ بلکہ اخلاص بھی ضروری ہوگا اور اخلاص
امر باطنی ہے، اسلئے اپنے خبیر یعنی عالم بباطن الامور ہونے پر تنبیہ فرمادی،
غرض ان سب اہتماموں سے معلوم ہوا کہ یہ عمل نہایت مہتم بالشان ہے، یہ
تو آیت کا حل اجمالی ہے، جس سے میرا مقصود علم و عمل کا اہتمام ثابت کرنا ہے

مہتم بالشان عمل

عمل کا اہتمام تو ظاہر ہے کہ ایک معمولی عمل کے لئے یہاں اتنا اہتمام فرمایا
گیا ہے، پھر جو عمل ذاتاً بھی عظیم ہو اس کا اہتمام تو بدرجہ اولیٰ ضروری ہوگا۔
اس سے تمام اعمال کا مہتم بالشان ہونا ظاہر ہو گیا اور علم کا اہتمام اس طرح
ہوا کہ ثمرہ میں اہل علم کو تمام مومنین سے جدا بیان کیا، اور تخصیص بعد تعمیم کے

مفید اہتمام کم ہوتی ہے۔ اب میں اس مضمون کے بعض اجزاء اور متعلقات کی تفصیل مختصراً عرض کرتا ہوں اور اس سے پہلے ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے وہ شبہ یہ ہے کہ آداب مجالس تو ایک معمولی اور چھوٹا سا عمل ہے اس کو اس قدر اہتمام سے کیوں بیان فرمایا، کیونکہ یہ کوئی درجہ عقائد سے نہیں، فرائض سے نہیں، ارکان و واجبات سے نہیں، اس درجہ کا اہتمام تو ان امور کا ہونا چاہیے جو ذاتاً بڑے ہوں، اور جو امر ذاتاً بڑا نہ ہو اس کے لیے اہتمام کی کیا ضرورت ہے؟ اور آداب مجالس کوئی ایسا امر نہیں جسکے اہتمام کی اسقدر ضرورت ہو۔ یہ شبہ بہت سے لوگوں کے ذہن میں آیا ہوگا، جسکی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر لوگوں نے اس عمل کو معمولی سمجھ رکھا ہے اور اسی وجہ سے عام طور پر اسکا اہتمام نہیں کرتے۔ تو منشاء شبہ کا صرف یہ بات ہے کہ یہ ایک معمولی اور چھوٹا سا عمل ہے اور معمولی شئے قابل اہتمام نہیں ہوتی، حالانکہ اول تو یہی مقدمہ غلط ہے کہ معمولی اور چھوٹی شئے قابل اہتمام نہیں ہوتی، کیونکہ چھوٹا اور معمولی ہونے کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ قابل اہتمام اور قابل وقعت نہ ہو۔ دیکھو سب سے چھوٹا آسمان، سماء دنیا ہے، عرش کرسی وغیرہ سے بہت چھوٹا ہے، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ سماء دنیا کوئی چیز نہیں یا سماء دنیا قابل وقعت نہیں، بلکہ باوجودیکہ عرش وغیرہ سے وہ بہت چھوٹا ہے مگر پھر بھی اپنی ذات میں اسی طرح بہت سی اور چیزوں کے مقابلہ میں قابل وقعت ضرور ہے۔ عرش و کرسی سے چھوٹا ہوا تو کیا، لیکن ٹیلوں کے مقابلہ میں تو بہت بڑا ہے ؎

آسماں نسبت بہ عرش آمد فرود ۔۔۔ لیک بس عالی است پیش خاک تود

اور نظیر دیکھو آسمان کے سامنے ستارے کتنے چھوٹے ہیں مگر ان میں بعضے بعضے زمین سے بھی بہت بڑے ہیں تو ستاروں کا چھوٹا ہونا اس کو مقتضی نہیں کہ ستارے قابلِ وقعت نہ ہو، یہ تو محسوسات میں گفتگو تھی، اب اعمال میں دیکھو کہ ارکان بھی آپس میں متفاوت ہیں، مثلاً نماز میں قیام، سجدہ، جلسہ مختلف ارکان ہیں مگر سب ایک درجے کے نہیں، کیونکہ ان کے فضائل مختلف ہیں اور آپس میں چھوٹے بڑے ہیں، کوئی چھوٹا کوئی بڑا، کیونکہ صغر و کبر امور اضافیہ میں سے ہے مگر ایک رکن کا دوسرے کے اعتبار سے چھوٹا ہونا اس کو ہرگز مقتضی نہیں کہ وہ رکن قابلِ وقعت نہیں، ورنہ اس کی رکنیت ہی محل کلام ہو جائے گی۔ پس یہ مقدمہ ہی غلط ہے کہ جو چیز کسی سے چھوٹی ہو وہ قابلِ اہتمام ہی نہ ہو، مگر اس غلطی میں آج کل بہت لوگ مبتلا ہیں

ذکر اللہ

بعض جہلا صوفیا نے

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ

کے بعد

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ

کو دیکھ کر نماز ہی چھوڑ دی۔ کیونکہ ان لوگوں نے اس آیت کی تفسیر یوں کی ہے کہ نماز تو صرف فحشاء اور منکر ہی سے بچاتی ہے اس میں صرف یہ عارضی فضیلت ہے، اور ذکر اللہ اپنی ذات میں بڑی چیز ہے تو جو لوگ ذکر اللہ

میں مشغول ہوں ان کو نماز کی حاجت نہیں، مگر اس شبہ کا منشاء صرف تفسیر کا بدنما ہے، ذرا صحیح تفسیر کیجئے تو یہ شبہ جاتا رہتا ہے، اس کی تقریر یہ ہے کہ حق تعالیٰ اس آیت میں نماز کی فضیلت بیان فرماتے ہیں کہ نماز کی پابندی کردیکیونکہ نماز فحشاء اور منکر سے روکتی ہے، اور نماز فحشاء و منکر سے اسلئے روکتی ہے کہ وہ ذکر اللہ پر مشتمل ہے اور ذکر اللہ بڑی چیز ہے، اسمیں ایسی ہی برکت اور خاصیت ہے، اب اس تقریر کے بعد جواب لیجئے، سو دراصل

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ

دلیل ہے

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ

کی کہ نماز فحشاء وغیرہ سے اسلئے روکتی ہے کہ وہ مشتمل ہے ذکر اللہ پر اور ذکر اللہ بہت بڑی چیز ہے، اس کی یہی خاصیت ہے تو اب بتلاؤ کہ اس تقریر سے نماز کا بڑا ہونا لازم آیا یا چھوٹا ہونا۔ جب نماز بھی بڑی چیز ہے تو وہ قابل ترک کیسے ہوئی۔ دوسرے ہمکو یہ بھی مسلم نہیں کہ چھوٹی چیز قابل ترک ہوا کرتی ہے، مثال کے طور پر غور کیجئے، ہم سوال کرتے ہیں کہ اگر کسی کے دو لڑکے ہوں ایک چھوٹا ایک بڑا۔ کیا چھوٹے کو قتل کردیں گے، ہرگز نہیں پس یہ قاعدہ مسلم نہیں کہ چھوٹی چیز قابل ترک ہوا کرتی ہے۔ اگر ذکر اللہ نماز سے بڑا بھی ہو تو نماز کو اس کے مقابلہ میں ترک نہیں کرسکتے۔ چہ جائیکہ وہ ذکر اللہ کو بھی مشتمل ہے۔

چھوٹی چیزوں کی اہمیت

یہ تفاوت تو دنیا میں بھی ہوتا ہے

کہ کوئی چیز بڑی ہے کوئی چیز چھوٹی۔ مگر دنیا میں سینکڑوں مثالیں ایسی ہیں کہ بڑی شئے کے موجود ہوتے ہوئے بھی چھوٹی شئے کی حاجت رہتی ہے اور چھوٹی شئے قابل ترک نہیں ہوتی۔ دیکھئے بادشاہ اپنے سب ماتحتوں اور چھوٹوں کو معزول نہیں کر سکتا اور اگر معزول کر دے تو کام نہیں چل سکتا اور دیکھئے انگلیوں میں آپس میں کس قدر تفاوت ہے مگر سب کی حاجت ہے صرف بڑی پر اکتفا نہیں ہو سکتا چھوٹی کی بھی حاجت ہے۔ بلکہ بڑے کی بڑائی چھوٹے کے وجود پر موقوف ہے، اگر چھوٹے نہ ہوتے تو بڑے کا وجود بے قدر تھا۔ اس بنا پر چھوٹے کا وجود بھی مہتم بالشان ہے، چنانچہ بادشاہ کو رعایا کی سخت حاجت ہے۔ بلکہ بادشاہ کی بادشاہی رعایا پر موقوف ہے، اگر رعایا نہ ہو تو بادشاہی ہی معرض خطرہ میں ہو جاوے، اس مضمون کو شاعرانہ مضمون نہ خیال کیا جاوے بلکہ یہ بات واقعی ہے اور سچ یہ ہے کہ بڑے اعمال میں نورانیت چھوٹے ہی اعمال سے ہوتی ہے، چنانچہ فرائض کی تکمیل نوافل سے ہوتی ہے، اگر کوئی نوافل ادا نہ کرے اور بالکل ترک کرے تو اس کا فرض بھی غیر کامل ہوگا۔ گو بمعنی ناقص نہیں، مگر بمعنی غیر اکمل ہوگا اور اگر مع نوافل ادا کرے تو وہ فعل اکمل ہوگا، تو دیکھئے تکمیل فرائض کی نوافل سے ہوتی، تو امثلہ سابقہ میں جیسے چھوٹوں سے بڑوں کی تکمیل دنیا میں ہوتی ہے ایسی ہی آخرت میں بھی نوافل سے تکمیل فرائض کی ہوگی۔ یعنی فرائض میں جسقدر کمی ہوگی نوافل سے اس کی بھرتی کی جاوے گی، اور یہ تکمیل فرائض کی نوافل سے

کبھی تو ایک جنس کے اعمال میں ہوتی ہے (یعنی فرائض جس جنس کے ہیں وہ نوافل مکملہ بھی اسی جنس کے ہوں) اور کبھی یہ تکمیل فرائض کی نوافل غیر جنس سے ہوتی ہے۔ مثلاً نماز سے پہلے آپ کے پاس کوئی شخص آیا، جو پراگندہ حال اور بدصورت وغیرہ تھا، جسکی تعظیم کو جی نہ چاہتا تھا، اٹھنے کو دل گوارا نہ کرتا تھا، مگر آپ نے نفس کی مخالفت کرکے اور نفس کو مجبور کرکے اس کی تعظیم کی اور تواضع اختیار کی، پھر اس کے بعد نماز پڑھی، تو اس نماز میں اس تواضع کی برکت سے نورانیت بڑھ جاوے گی جسکا اہل باطن کو شب و روز مشاہدہ ہوتا ہے۔

اعمال کی نورانیت

راز اس کا یہ ہے کہ اعمال میں سب میں باہم مناسبت ہے، نیک اعمال کو نیک سے اور بد کو بد سے، خواہ جنس میں اتحاد ہو یا نہ ہو۔ تو ہر عمل خیر دوسرے عمل خیر کا مؤید و مقوی ہوتا ہے۔ مثلاً آپ کا ایک نوکر او ر بارو رچی ہے، آپ نے اس کو آواز دی، آپ کے پکارنے سے فوراً حاضر ہو گیا، سو ایک تو اس کا حاضر ہونا اسوقت ہے اور ایک اُسوقت ہے کہ وہ کسی سے لڑ بیٹھا۔ اتفاقاً اسی حالت میں آپ نے اسے پکارا تو وہ حاضر تو ضرور ہو گا مگر اس حاضری اور پہلی حاضری میں فرق ضرور ہو گا، باوجودیکہ نوکر کی آقا سے لڑائی نہیں ہوئی، بلکہ دوسرے شخص سے ہوئی تھی، مگر اس عمل منکر کا یہ اثر ہوگا، کہ لہجہ کلام میں ادب و نیاز مندی کی وہ شان نہ ہو گی جو پہلے تھی۔ اسی طرح

اگر نماز سے پہلے کوئی عمل نورانی کا کیا تو اس کا نماز میں یہ اثر ہوگا۔ کہ نماز میں نورانیت بڑھ جاوے گی۔ اور اگر نماز سے پہلے کسی کے ساتھ تکبر کا معاملہ کیا تھا، اگرچہ تکبر جنس صلوٰۃ سے نہیں، مگر تکبر کا ظلمانی اثر نماز میں ضرور رہوگا، اور نماز سے پیشتر وہ تکبر کرنا مانع نورانیت صلوٰۃ ضرور رہوگا۔ یہی مطلب اور مقصود ہے اس حدیث کا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اَلْحَسَدُ یَاْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ

حسد نیکیوں کو اس طرح کھالیتا ہے جیسے لکڑی کو آگ

اگرچہ اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ باوجود حسد کے یہ حسنات باقی رہتی ہیں مگر معنی یہ ہیں کہ اعمال میں نورانیت نہیں رہتی۔ اسی طرح صوم کے بارہ میں ارشاد ہے۔

اِذَا کَانَ یَوْمُ صَوْمِ اَحَدِکُمْ فَلَا یَرْفُثْ وَلَا یَصْخَبْ فَاِنْ سَابَّہٗ اَحَدٌ اَوْ قَاتَلَہٗ فَلْیَقُلْ اِنِّیْ امْرَءٌ صَائِمٌ ۲

۱؂ :- رواہ البخاری عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی حدیث طویل المخز الیعفار رواہ البخاری عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الصوم جنۃ فلا یرفث ولا یجہل فان امرؤ قاتلہ او شاتمہ فلیقل انی صائم رصٓ ۲۵۴، صٓ ۲۵۵ ترجمہ حدیث اور جب تم میں سے کسی کا روزہ کا دن ہو پس نہ فحش باتیں کہے اور نہ لڑے، تو کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں ۱۲

تو اس حدیث میں مقصود یہی ہے کہ عمل صوم میں ان افعال کے ارتکاب سے نورانیت نہیں رہتی گو روزہ باطل نہیں ہوتا۔ پس ثابت ہو گیا کہ جو اعمال ہم جنس نہیں وہ بھی باہم ایک دوسرے کے مکمل ہیں، لہذا چھوٹی شئے کو بے وقعت نہ سمجھنا چاہیئے، چھوٹی اشیاء بڑوں کی حفاظت کیلئے ہوتی ہیں۔

حسن معاشرت

یہ گفتگو تو اس بات کے تسلیم کرلینے پر تھی کہ یہاں اس آیت میں جو تعلیم دی گئی ہے وہ چھوٹی اور معمولی بات ہے اور دوسرا جواب تحقیقی یہ ہے، کہ یہ تعلیم درحقیقت معمولی نہیں بلکہ بہت بڑی ضروری تعلیم ہے، آپ نے اس کی ظاہری صورت پر نظر کی ہے حقیقت پر نظر نہیں کی۔ حقیقت میں یہاں حق تعالیٰ نے ہمکو تواضع کی اور ترک تکبر کی تعلیم دی ہے، اور میں عنقریب واضح کردونگا کہ تکبر کتنی سخت چیز ہے مگر افسوس ہے کہ ہم لوگوں کو اسکا احساس نہیں، بہرحال اس زمانہ میں یہ عام غلطی ہے کہ جو دیندار بھی ہیں وہ عقائد اور نماز روزہ اور وضع لباس کا تو ضرور اہتمام کرتے ہیں، مگر اخلاق و معاشرت اکثر کی نہایت گندی ہے، بعضے آدمی تو اخلاق و معاشرت کی طرح معاملات کو بھی دین سے خارج سمجھتے ہیں، مگر خیر متقی لوگوں نے معاملات کا تو خیال کیا مگر معاشرت اخلاق کو تقریباً سب نے ہی بالکل بالائے طاق رکھدیا، حالانکہ حسن معاشرت کا معاملات سے بھی زیادہ خیال رکھنا لازمی ہے۔

اسوجہ سے کہ معاملات کا اثر تو اکثر مال پر ہوتا ہے اور معاشرت کا اثر قلب پر ہوتا ہے اور قلب پر جو اثر ہو مال کے اثر سے زیادہ گراں اور موجب بعد تر ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص آپ کے پاس آیا اور آپ نے اس کی طرف التفات نہ فرمایا، اس کی بات کا جواب نہ دیا اس سے اس کا دل دکھا تو اس اخلال معاشرت کا اثر اس کے قلب تک پہنچایا، ماں باپ کی نافرمانی کی اُن کا دل دکھایا تو یہ آثار موذیہ اخلال معاشرت سے اور اس کو ضروری نہ سمجھنے سے پیدا ہوئے۔ پس ثابت ہوا کہ حسن معاشرت حسن معاملہ سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ عارف شیرازی کا قول ہے ؎

مباش در پئے آزار ہر چہ خواہی کن
کہ در طریقت ما غیر ازیں گناہ نیست

یعنی برابر ایں گناہ نیست' اور اس شعر میں جو ہر چہ خواہی کن کہا گیا ہے یہ یا تو مبالغہ پر محمول ہے یا اس کو عموم نہ لیا جائے یا اس کو خاص کہا جاوے غیر معاصی کے ساتھ اور مباش در پئے آزار کو تمام معاصی کے لئے عام لے لیا جاوے تو تقریر مقصود کی یہ ہوگی کہ جس طرح اخلاق معاشرت سے دوسروں کو آزار ہوتا ہے، اسی طرح جمیع معاصی سے مثلاً نماز نہ پڑھنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بوجہ شفقت کے آزار ہوتا اور تکلیف پہنچتی ہے، چنانچہ ایک آیت کریمہ سے یہ بات صاف ظاہر ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ
يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا۔

یعنی شاید آپ ان کے پیچھے اگر یہ لوگ اس مضمون قرآنی پر ایمان نہ لائے،
غم سے اپنی جان دے دیں گے، یعنی اتنا غم نہ کیجیے کہ قریب بہ ہلاکت ہو
جائیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضورؐ کو بوجہ شفقت کے مخلوق کی بدحالی پر
بے حد رنج ہوتا تھا۔ دیکھیے مدرس کو جب شفقت زیادہ ہوتی ہے اور مقصود
مدرس کا یہ ہو کہ کسی صورت سے یہ پڑھنے والے کتاب سمجھ جاویں تو اس کو ان کے
نہ سمجھنے سے تکلیف ہوتی ہے، اسی لئے وہ تقریر کے بعد سوال کیا کرتا ہے۔
کہ سمجھ بھی گئے اور اس کا منشاء محض شفقت ہے۔ اسی طرح جناب رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد تبلیغ کے صحابہؓ سے فرمایا:

اَلَاهَلْ بَلَّغْتُ اَلَاهَلْ بَلَّغْتُ

صحابہؓ فرماتے ہیں:

ہندستانی لائبریری
گارڈن ریچ روڈ۔ مٹیابرج۔ کلکتہ

قُلْنَا نَعَمْ

آپ نے فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ (رواہ البخاری)

حضورؐ کی شفقت کی یہ شان ہے کہ آپ نے تئیس برس میں اس قدر تبلیغ کی
اور اس قدر جانفشانی برداشت کی کہ کوئی نہیں کر سکتا، کلیات کی علیحدہ
تبلیغ فرمائی اور جزئیات کی علیحدہ، پھر جزئیات میں ایک ایک جزئی کی تبلیغ
فرمائی یہ تو تبلیغ قولی تھی، پھر اس پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ تبلیغ عملی بھی فرما یہ
سب حضورؐ کی شفقت ہے، نیز صحابہؓ کا خلوص بھی قابل نظر ہے، کیونکہ اگر
صحابہؓ کی طلب کامل نہ ہوتی اور ان میں خلوص نہ ہوتا تو وہ علوم محفوظ نہ رہتے،

مگر بحمد اللہ آج حضورؐ کے تمام علوم محفوظ ہیں، جنکو دیکھکر حیرت ہوتی ہے، کہ آپنے اس قلیل عرصہ میں اس قدر علوم کیونکر بیان فرما دئے۔ خصوص جبکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ محض تعلیم ہی کے کام کے لئے فارغ نہ تھے، بلکہ اس کے ساتھ انتظام ملکی اور تدابیر غزوات کا کام بھی آپ کو بہت زیادہ کرنا پڑتا تھا۔

حضورؐ کی اس شفقت کا خیال تو کیجئے کہ باوجود اسقدر مشاغل کثیرہ کے آپنے کس قدر اور کس درجہ ہم کو معاشرت سکھلائی اور کس درجہ آداب مجالس سکھلائے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی ہمکو ایک دوسرے کو اذیت دینے بچایا، ایک دو نمونہ بتلاتا ہوں۔ غور کیجئے کہ حضورؐ فرماتے ہیں کہ جب کسی مجمع میں تین آدمی ہوں تو دو آدمی علیحدہ سرگوشی نکریں جب تک کہ چوتھا آدمی نہ ہو، دیکھئے آداب مجالس کی کسقدر رعایت فرمائی۔ سلفؒ صالحین کا معمول تھا کہ جب کسی مجلس میں چوتھا آدمی نہ ہوتا اور دوسرے آدمی سے تنہائی میں بات کرنی منظور ہوتی تو چوتھے آدمی کے آنے کا انتظار کرتے تاکہ وہ اس سے ہمکلام رہے اور اس کو توحش نہ ہو نہ تفرد سے اور نہ اس خیال سے کہ مجھسے ہی اخفاء راز مقصود ہے اور دیکھئے حضورؐ فرماتے ہیں کہ اگر کھانا کھاتے ہوئے لقمہ گر پڑے تو اسوقت یہ خلاف ادب ہے، کہ اس کو چھوڑ دے بلکہ:

فَلْيُمِطْ عَنْهُ الأَذَى

اس کو صاف کرکے کھالیوے، دیکھئے کیسے چھوٹے چھوٹے اور دقیق دقیق امور پر آپ کی نظر تھی، کسی بات کو چھوڑا نہیں۔ اس تعلیم میں آپنے

کھانیکا کسقدر ادب تعلیم فرمایا ہے ، جسکی نظیر نہیں مل سکتی ۔

عملی تعلیم اور اُس اثر

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ۔ ایک مرتبہ مجھے سفر کا اتفاق ہوا ریل میں ایک صاحب رئیس ہمراہ تھے انہوں نے کھانا جو کھایا اتفاق سے ایک بوٹی گر پڑی ، انہوں نے جوتا سے تختہ کے نیچے سرکا دی ، چونکہ میں قولاً ان سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا اس لئے میں نے عملاً حکم شرعی بتلانا چاہا تاکہ انہیں معلوم ہو جائے اس لئے میں نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ اس بوٹی کو دھوکر مجھے دیدو میں کھاؤں گا ، انہوں نے کہا اگر میں کھاؤں میں نے کہا یہ آپ کی ہمت ہے ، چنانچہ انہوں نے کھالی ۔ میرے اس طرز عمل کا اُن پر بیحد اثر پڑا اور دوسروں سے کہنے لگے کہ واقعی میری سمجھ میں آگیا ۔ اگر دس برس تک بھی اس کے متعلق نصیحت کی جاتی تو دل میں نہ گھستی اور اس طریق سے ایک مرتبہ کا عمل عمر کے لئے کارگر ہو گیا ۔ صوفیہ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ عمل بالمعروف نہیں کرتے حالانکہ یہ اعتراض بالکل لغو ہے ، ان کے برابر کوئی بھی امر بالمعروف نہیں کرسکتا ، وہ تو امر بالمعروف ایسا کرتے ہیں کہ لپیٹے اور پر پھیلتے ہیں ، یعنی وہ قولاً امر بالمعروف کم کرتے ہیں زیادہ تر عملی تعلیم کرتے ہیں کیونکہ عملی تعلیم قولی تعلیم سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے ۔

اعمال کی پختگی

اسی طرح حضورؐ نے بہت چھوٹے چھوٹے اعمال کا اہتمام

کیا، اور کوئی امر چھوڑا نہیں، بلکہ ہر حکم کو عملاً دکھلا دیا تاکہ سامع پر زیادہ اثر ہو، تو اس قدر اہتمام محض شفقت پر مبنی ہے، مگر ہماری ایسی بُری حالت ہے، اگر صحابہؓ زندہ ہو کر ہمیں دیکھیں تو ہمیں حضورؐ کی امت میں خیال کرنا انکو دشوار ہو جاوے، ہماری حالت تو اس قدر ردی اور ردی ہو چکی ہے کہ قابل بیان نہیں، نہ ہمارے عقائد کامل ہیں نہ اعمال و عبادات، نہ معاملات نہ معاشرات نہ اخلاق نہ اقوال و احوال، غرض ہر چیز ناقص اور کمزور ہے، اور عوام نے تو ادب خداوندی تک کو بھی بالائے طاق رکھدیا۔ حتیٰ کہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کی جناب میں گستاخی کرنا شروع کردی، چنانچہ امسال بارش بکثرت ہونے کے باعث ایک صاحب نے کسی گاؤں والے سے کہا، کہ بھائی توبہ استغفار کرو، ہمارے گناہوں کی شامت ہے جو اس قدر بارش ہے تو اس نے جواب دیا کہ ہمارے گھر میں تو اناج ہے، جسکے گھر میں اناج نہ ہو وہ توبہ کرے۔! افسوس آج کل یہ مسلمان ہیں، اگر حضورؐ کے سامنے ہمارے یہ اعمال پیش ہوں تو حضورؐ کو کسقدر اذیت ہو اور اگر کیا معنی بلکہ یقیناً پیش ہوتے ہیں کیونکہ حدیث میں تصریح ہے کہ اعمال امت کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ ہائے پھر آپ کو ہماری اس بدحالی پر کتنا رنج ہوتا ہوگا۔ پس ے

مباش درپے آزار و ہرچہ خواہی کن الخ

اگر مبالغہ پر بھی محمول نہ کیا جائے تب بھی یہ کلام درست ہے، اور اس سے کسی گناہ کی اجازت مفہوم نہیں ہو سکتی، کیونکہ گناہوں سے اگر اور کسی کو بھی

ایذا نہ ہو تو حضور کو تو ایذا ہوتی ہے اور حضور سے زیادہ مسلمانوں کیلئے کون ہے جسکا دل خوش کرنا مطلوب ہو، اس پر مجھے مرزا بیدل کی ایک حکایت یاد آگئی

آجکل کا تصوف

مرزا بیدل کا کلام صوفیہ کے طرز پر ہوتا تھا، ایک ایرانی ان کا کلام دیکھکر اور بزرگ سمجھ کر ان سے ملنے کے لیئے دہلی آیا۔ یہ اسوقت ڈاڑھی ترشوا رہے تھے۔ اس شخص نے یہ منظر دیکھکر کہا آغا ریش میتراشی۔ انہوں نے متعارف صوفیانہ جواب دیا کیونکہ تصوف تو بڑی سستی چیز ہو گئی ہے، بس ایک دو نکتے یاد کر لئے اور صوفی بن گئے، آج کل تصوف محض نکتوں کا نام رہ گیا ہے گو وہ نکتے جاہلانہ ہی ہوں جیسے ایک صاحب نے

وَالضُّحٰی وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی

کا ترجمہ کیا تھا "اے نفس تیری ہی سجا دسترا" ہمارے ماموں صاحب سے کسی صوفی جاہل نے دریافت کیا تھا کہ بتا رزق بڑا ہے یا محمد ؐ۔ ماموں صاحب نے کہا کہ اول تو اس کی کوئی جزئی تعلیم نہیں دی گئی مگر پھر بھی قواعد کلیہ سے حضور ؐ ہی کا رتبہ بڑا معلوم ہوتا ہے۔ کہنے لگا تو بے پیرا معلوم ہوتا ہے دیکھ

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ

میں پہلے اَنّ (رزق) کا نام آیا ہے پیچھے حضور کا۔ معلوم ہوا کہ اَنّ بڑا ہے۔ کیا واہیات ہے بھلا کلمہ کے اندر اَنَّ حرف مشبہ بفعل ہے

یا مہدی کا اڈہ ہے۔ اسی طرح مولوی فیض الحسن صاحب سے کسی فقیر نے دریافت کیا کہ بتلا چار میم کون سے ہیں، ظاہر ہے کہ مولوی صاحب اس مہمل سوال کا جواب کیا دیتے، تو وہ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ دیکھو مکہ، مدینہ، مولا محمدؐ۔ کانپور میں ایک صوفی صاحب آئے، بتلاؤ آسمان پر کیا چیز نہیں زمین پر کیا چیز نہیں، قرآن میں کیا چیز نہیں۔ پھر خود ہی بولے، آسمان پر قبر نہیں، زمین پر ستارہ نہیں اور قرآن میں جھوٹ نہیں۔ یہ تصوف رہ گیا ہے، آج کل۔ سو مرزا بیدل نے بھی ایسا ہی ایک نکتہ ہانکا کہ بلے ریش ایتراشم دے دل کسے نمی تراشم۔ یعنی

ع مباش درپئے آزار ہرچہ خواہی کن

یہ میرا عمل ہے۔ ایرانی سچا طالب تھا اس نے ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ مرزا بیدل ہونٹ چاٹتے رہ گئے۔ ایرانی نے کہا بلے دل رسول اللہ مے خراشی۔ یہ سن کر تو مرزا بیدل کی آنکھیں کھل گئیں اور ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور بزبان حال یہ شعر پڑھنے لگے ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی
مرا با جانِ جاں ہمراز کردی

حقوق العباد کی اہمیت

اب وہ شبہ جاتا رہا کہ نماز روزہ کے چھوڑنے میں کسی کو تکلیف نہیں پہنچتی، اسلئے نماز و روزہ کے ترک میں مضائقہ نہیں، صاحبو! اس سے تو

اس ذات کو تکلیف پہنچتی ہے جس سے بڑھ کر مسلمان کو کوئی چیز بھی محبوب نہیں۔ غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ معاملات سے زیادہ معاشرات کا اہتمام ضروری ہے کیونکہ معاملات کی اصلاح میں تو زیادہ تر لوگوں کے مال کی حفاظت ہے اور حسن معاشرت میں مسلمانوں کے قلب کی حفاظت ہے، اور ظاہر ہے کہ مال سے دل کا رتبہ بڑھا ہوا ہے اور نیز معاشرت کی اصلاح میں علاوہ قلوب کے لوگوں کی آبرو کی بھی حفاظت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ آبرو کی حفاظت بعد ایمان کے ہر چیز سے زیادہ ضروری ہے، عرفاً بھی شریف آدمی مال بلکہ جان سے بھی زیادہ آبرو کو سمجھتا ہے، چنانچہ جان بچانے کے لئے تو شریف آدمی مال کو خرچ کرتا ہے اور آبرو بچانے کے لئے تو شریف آدمی ——————

—————— جان و مال دونوں کو قربان کر دیتا ہے۔ اور حدیث حقوق میں بھی تینوں کی حفاظت مامور بہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اَلَا وَاِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی حَرَّمَ عَلَیْکُمْ دِمَائَکُمْ وَاَمْوَالَکُمْ وَاَعْرَاضَکُمْ کَحُرْمَۃِ یَوْمِکُمْ فِیْ شَہْرِکُمْ ھٰذَا فِیْ بَلَدِکُمْ ھٰذَا۔

حضورؐ نے حجۃ الوداع میں یہ ارشاد فرمایا کہ خون یعنی جان اور مال اور آبرو باہم ایک دوسرے پر قیامت تک ویسے ہی حرام ہیں جیسے آج کے محترم دن میں محترم مہینے میں اور محترم بلد میں حرام ہیں، پس مسلمانوں کے مال کی بھی حفاظت کرو جان کی بھی حفاظت کرو ابرو کی بھی حفاظت کرو، اس لئے کہ حقوق العباد میں یہ سب داخل ہیں، صرف مالی حقوق کا نام حقوق العباد نہیں اور یہ معاشرت بعض حیثیات سے نماز روزہ وغیرہ سے بھی قابل اہتمام ہے، کیونکہ عبادات کے

اختلال سے صرف اپنا ضرر ہے اور معاشرت کے اختلال سے دوسروں کا ضرر، اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرت کا بہت اہتمام فرمایا ہے ایک ایک کر کے تمام فرما دی، چنانچہ ارشاد ہے:

إِذَا جَاءَكُمْ كَرِيمُ قَوْمٍ فَأَكْرِمُوهُ

کہ جب تمہارے پاس کسی قوم کا سردار آوے اس کی تعظیم کرو تذلیل نہ کرو۔ خصومت نہ کرو۔ حضورؐ کے اصحاب پڑوسی یہودی تک کو ہدیہ دیا کرتے تھے اور بیماری میں اس کی عیادت کرتے۔ اسی طرح ایک یہودی کا قرضہ حضورؐ پر چاہتا تھا، اس نے مسجد میں آکر مانگا، اسوقت آپ کے پاس موجود نہ تھا۔ آپ نے فرمایا پھر لے لینا۔ یہودی نے کہا میں تو لے کر جاؤں گا۔ اللہ اکبر! کس درجہ حسن معاشرت تھی کہ رعیت کا ادنیٰ آدمی بھی جو چاہے کہے اور آپ باوجود ہر طرح اختیار و قدرت کے انتقام نہیں لیتے، صحابہ نے کچھ کہنا بھی چاہا حضورؐ نے روکدیا اور فرمایا کہ

إِنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالًا۔

کہ صاحب حق کو تقاضے کا حق ہے، چنانچہ وہ بیٹھا رہا اور رات کو حضورؐ کو گھر بھی نہ جانے دیا تو آپ مسجد میں ہی رہے، صبح کی نماز پڑھی۔ یہ حال دیکھکر بعد نماز اس یہودی نے کہا، میں نے تورات میں پڑھا تھا کہ نبی آخر الزماں کے یہ صفات ہیں۔ میں نے اور تو سب صفات دیکھ لی تھیں، صرف صفت حلم کا امتحان باقی تھا، سو آج اس کا بھی امتحان ہو گیا۔ واقعی آپ سچے نبی ہیں۔

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ۔

مسلمان ہو گیا۔ صاحبو! حضورؐ نے جب غیر مسلم کی اس قدر رعایت کی ہے
تو مسلم کی تو کس درجہ رعایت فرماتے ہوں گے۔

جانوروں کے حقوق

پھر غیر مسلم آدمی تو ہے حضورؐ نے جانوروں پر بھی رحم کا حکم فرمایا ہے
اور ان کے بھی حقوق بیان فرمائے ہیں چنانچہ حکم ہے کہ جانوروں کو زیادہ
نہ مارو، بھوکا نہ رکھو، تحمل سے زیادہ کام نہ لو زیادہ بوجھ نہ لادو، مجھے
یاد آیا کہ ایک صاحب نے مجھے خط میں لکھا تھا کہ جانوروں کے حقوق میں اب تک
کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، تو واقعی اسوقت تک کوئی کتاب مستقل نہیں لکھی
گئی تھی اور ضرورت تھی اس لئے میں نے

"ارشاد الہائم فی حقوق البہائم"

کتاب لکھی ہے، جانور رکھنے والوں کو اس کتاب کے رکھنے کی ضرورت ہے اس سے
معلوم ہوگا کہ شریعت میں جانوروں کے کس درجہ کے حقوق ہیں۔ حدیث شریف
میں بنی اسرائیل کی ایک عورت کا قصہ مذکور ہے، کہ اس نے ایک بلی کو باندھ
رکھا تھا، نہ تو چھوڑتی تھی، نہ کچھ کھانے کو دیتی تھی، پھر حضورؐ نے دوزخ میں اس
کا عذاب دیا جانا دیکھا۔ دیکھئے ایک بلی کے ستانے پر اسے عذاب ہوا اور جانور
کی تکلیف پہنچانے پر وہ معذب تھی، ہماری حالت یہ ہے کہ عام انسان اور عام
مسلمان کا تو کیا خیال کرتے ہم تو حقیقی بھائی کو تکلیف پہنچانے پر کمر بستہ ہیں جائیداد
دبانے کو تیار ہیں، بلکہ ہم لوگوں کی معاشرت اعزہ واقارب کے ساتھ زیادہ خراب ہے

حالانکہ ہم جانوروں پر تک بھی رحم کرنے کے لئے مامور ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ان افعال پر ضرور ہم سے سوال ہوگا۔ حاصل یہ ہے کہ شریعت نے معاشرت کے بارہ میں بھی بہت زیادہ اہتمام کیا ہے۔ اسلام بڑی چیز ہے، اسلام نے ہمیں تمام ضروری امور سکھلائے ہیں تاکہ اسلام پر بالکل دھبہ نہ رہے کہ اس میں فلاں بات کی کمی ہے فلاں پہلو کی رعایت نہیں۔ سو بحمد اللہ اسلام کامل مکمل شریعت ہے اور کیوں نہ ہو خدا کا بھیجا ہوا دین ہے اور حق تعالیٰ تو ماں باپ سے بھی زیادہ شفیق ہیں اور شفیق اپنے علم میں کسی ضروری بات کو نہیں چھوڑتا۔ اسلئے حق تعالیٰ نے کسی ضروری بات کو اسلام میں نہیں چھوڑا اور حق تعالیٰ کا علم کامل ہے اس لئے واقع میں بھی کوئی ضروری بات نہیں رہی، بلکہ ادنیٰ سے ادنیٰ بات کی بھی تعلیم رسول ؐ کے واسطہ سے کر دی ہے۔

شفقت پر گرانی

گو ہم کو بعض پابندیاں گراں ہوتی ہیں، مگر شفقت کا یہی مقتضیٰ ہے کہ باوجود گرانیٔ مخاطب کے پھر بھی اس کو نفع پہنچایا جائے چنانچہ میرا ہی واقعہ ہے، کہ بچپن میں مجھے کنکوے کا شوق تھا، جہاں چھٹی ملی کنکوا لیکر باہر چلدیا اور سر پہ بال بھی رکھے ہوئے تھے، اتفاق سے میرے بالوں میں جوئیں پڑ گئیں میری والدہ صاحبہ کا تو انتقال ہو گیا تھا، ایک تائی صاحبہ کی پرورش میں تھا۔ ان کو شفقت و محبت زیادہ تھی، انہوں نے کئی بار سر دھونے کے لئے مجھے کہا، مگر میں حسب معمول کنکوا لیکر چلدیتا، ایک روز انہوں نے پہلے سے کھلی گھول کر رکھ لی

تھی میرے آتے ہی موقع پاکر سر میں لپیٹ دی بس اب میں مجبور ہو گیا، بدوں دُھلائے کہاں جا سکتا تھا۔ دیکھئے اسوقت ان کا یہ فعل ناگوار تھا مجھ کو خبر ہی نہ تھی کہ میرے لئے کیا مفید ہے امریض کو کیا خبر کہ میرے لئے کیا نافع ہے مگر ان کی یہ عنایت اور شفقت تھی کہ مجھے مجبور کر کے راحت پہنچاتی رہیں۔ یہی برتاؤ حق تعالیٰ کا ہمارے ساتھ ہے کہ ہم بعض دفعہ احکام سے تنگ ہوتے ہیں مگر حق تعالیٰ مجبور کرتے ہیں کہ تمکو ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ شفقت کا ایک واقعہ اور یاد آیا۔ ایک شخص ہمارے یہاں آنکھ بناتے تھے، ایک شخص آنکھ بنوانے آیا، انہوں نے کام شروع کیا تو وہ تکلیف کے خوف سے انکو برا بھلا کہہ رہا تھا مگر وہ ہنس رہے تھے اور آنکھ بنا رہے تھے، اگر شفقت نہ ہوتی تو بیچ ہی میں کام چھوڑ دیتے، مگر انہوں نے مریض کی ناگواری پر اصلاً نظر نہیں کی بلکہ غایت شفقت سے نشتر لگاتے رہے۔ ہمارے یہاں کے ایک رئیس نے جو اسوقت موجود تھے ان سے کہا بھی کہ دیکھئے یہ کیا بکتا ہے، مگر انہوں نے جواب دیا کہ تھوڑی دیر میں دیکھنا جب نظر آنے لگے گا تو کیسی دعائیں دیتا ہے۔ اسی طرح حق جل شانہٗ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر عمل کرنے کا نتیجہ آخرت میں ہم پر روشن وظاہر ہو جائیگا گو اس وقت ہم کو گرانی ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ

غرض حضورؐ نے عقائد و اعمال، معاملات معاشرت تمام امور ہمکو سکھلائے، تاکہ ہم اپنی اصلاح کر لیں۔

اسلام پر اعتراض کی وجہ

مگر اب ہماری حالت ایسی خراب ہے کہ دیگر اقوام کے لوگ ہماری حالت دیکھکر

اسلام پر اعتراض کرتے ہیں، افسوس ہے کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ اہلِ اسلام کے کارناموں کو دیکھ کر لوگ مسلمان ہوتے تھے، آج مسلمانوں کی حالت دیکھکر لوگ اسلام سے منحرف ہوتے جاتے ہیں۔ چنانچہ مدراس کا قصہ سنا ہے کہ ایک انگریز اسلام کی خوبیاں دیکھکر مسلمان ہو گیا تھا، اتفاقاً مسجد میں آیا تو مسجد میں دیکھا کہ نالی میں تھوک وغیرہ بہت پڑا ہے اور مسجد بھی صاف نہیں، اس نے صفائی کی نسبت لوگوں سے کہا، سب لوگ اس کے پیچھے پڑ گئے کہ یہ تو ابھی تک عیسائی ہے کہ صفائی صفائی پکار رہا ہے اور اس کو مسجد سے نکال دیا، بعض ذی فہم مسلمانوں کو اطلاع ہوئی، انہوں نے ان صاحب سے معذرت کی کہ یہ لوگ ناواقف تھے آپ کچھ خیال نہ کریں، اس نومسلم نے جواب دیا کہ میں اسلام کے محاسن اور کارنامے دیکھکر مسلمان ہوا ہوں میں جانتا ہوں کہ محمد صاحب صلی اللہ علیہ وسلم صفائی کا بہت اہتمام فرماتے تھے۔ صاحبو! صفائی تو دراصل ہمارے ہاں کی چیز ہے جو آجکل عیسائیوں نے لے لی ہے اور مسلمانوں نے ایسی چھوڑ دی ہے کہ اگر کوئی صفائی برتے تو عیسائی کے نام سے موسوم ہوتا ہے، صفائی کے باب میں حدیث میں ہے:

إِنَّ اللّٰهَ نَظِيفٌ يُحِبُّ النَّظَافَةَ

اور دوسری حدیث میں ہے:

نَظِّفُوْا اَفْنِيَتَكُمْ

اسلام کے برابر تو طہارت ونظافت کسی مذہب میں بھی نہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ استری اور کلف کا اہتمام کرو اور ہر وقت بنے ٹھنے رہو، کیونکہ اس کا نام نظافت نہیں بلکہ یہ تصنع اور تکلف ہے، اور تن آرائی ہے، اس کے متعلق تو

حدیث میں ہے:

اَلْبَذَاذَۃُ مِنَ الْاِیْمَانِ

کہ سادگی ایمان کا جزو ہے۔ بذاذت کے معنی میلا کچیلا رہنے کے نہیں بلکہ سادگی سے رہنے کے ہیں، پس نظافت اور طہارت کی حقیقت یہ ہے کہ کپڑے اور بدن کو صاف پاک رکھو اور میلا ہو جائے تو دھو ڈالو صاف ہو جاؤ اور پاک ہو جاؤ اور پاک بن جاؤ۔ شریعت اسلامیہ میں طہارت کی تو بہت ہی زیادہ تاکید ہے، کہ بدون طہارت کے نماز نہیں ہوتی اور گو بدون نظافت کے ہو جاتی ہے، مگر بدہیئت سے نماز پڑھنا مکروہ ہے، یہ بھی حکم ہے، کہ جس شخص کے کپڑوں میں سے پسینہ کی سخت بدبو آ رہی ہے اس کو جماعت میں شریک ہونا مکروہ و ممنوع ہے، مگر آج کل ہماری وہ حالت ہے، کہ مولانا نے مثنوی میں حکایت لکھی ہے کہ ایک کافر لڑکی اسلام کی طرف راغب تھی، اتفاق سے اس کے گھر کے قریب مسجد میں ایک مؤذن بدآواز آ گیا، اس نے جو اذان دی تو لڑکی نے باپ سے دریافت کیا کہ ابا یہ کیا ہو رہا ہے، باپ نے جواب دیا بیٹی تو جس مذہب کی طرف راغب ہے یہ اس کی اذان ہے، لڑکی کا یہ سنکر اسلام سے دل پھر گیا، تو اس کا باپ اس خوشی میں کچھ ہدیہ لیکر اس مؤذن صاحب کے پاس آیا کہ اس شخص کے سبب مجھکو یہ خوشی نصیب ہوئی۔ مؤذن صاحب سمجھے یہ مجھ سے بہت راضی اور خوش ہے اس لئے ہدیہ لایا ہے مگر جب واقعہ معلوم ہوا، تب حقیقت حال منکشف ہوئی یہی ہماری حالت آج کل ہے کہ ہم کو دیکھکر کفار اسلام سے ہٹنے لگے ہیں، حالانکہ فی نفسہٖ اسلام کی یہ حالت ہے۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

حقانیتِ اسلام

صاحبو! مسلمانوں کی تو یہ حالت تھی کہ حضرت علیؓ کی زرہ چوری ہو گئی تھی، آپ نے اس کو ایک یہودی کے پاس دیکھا اس سے مطالبہ کیا، اس نے نہ دی اور یہ کہا کہ یہ تو میری ہے، آپ باوجود اس کے کہ خلیفہ تھے، مگر اس کو لیکر مدعی بنکر حضرت شریح (قاضی) کے یہاں پہنچے، قاضی نے گواہوں کو طلب کیا، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے اپنے صاحبزادہ اور ایک آزاد شدہ غلام کو گواہی میں پیش کیا حضرت علیؓ کے نزدیک لڑکے عادل کی گواہی باپ کے موافق جائز تھی، مگر قاضی شریح کے نزدیک جائز نہ تھی، اسلئے قاضی صاحب نے صاحبزادے کی گواہی رد کر دی، اور ایک گواہ اثبات دعوے کے لئے ناکافی تھا اس لئے زرہ یہودی کو دیدی، اللہ اکبر ایک بادشاہ وقت کی چیز چوری جائے اور بادشاہ اس کو پہچان لے، اور ایک ذمی آدمی رعیت کا جو کہ مسلمان بھی نہ ہو بے تکلف اپنی ظاہر کرے، پھر بادشاہ اپنے ہی ماتحت قاضی کے یہاں محاکمہ کے لئے جاویں اور صاحبزادہ کو گواہی میں پیش کریں جو کہ اہل جنت کے سردار ہیں اور قاضی صاحب ان کی گواہی قبول نہ کریں اور زرہ یہودی کو دلوا دیں اور خلیفہ اس کو قبول کر لیں۔ آخر یہ حقانیت ان کو بجز تعلیم اسلام کے کس نے دی ہے، پس اسلام یقیناً حق ہے، یہودی یہ حالت دیکھکر فوراً مسلمان ہو گیا اور حضرت علیؓ سے بیعت ہو گیا اور جنگ صفین میں شہید ہوا۔

اصلاحِ اخلاق

مسلمانوں کے یہ اخلاق تھے، مگر اب ہمارے اخلاق دیکھکر مسلمانوں کو بھی دین سے

نفرت ہو جاتی ہے، غرض ہمیں نماز روزہ کا تو خیال ہے، مگر اخلاق کا بالکل خیال نہیں، ظاہر میں اخلاق چھوٹی چیز ہے مگر واقع میں یہ بہت بڑی چیز ہے، کیونکہ تمام اعمال کی جڑ اخلاق ہی ہے، حقیقت اس کی یہ ہے کہ ایک درجہ منشاء کا ہوتا ہے اور ایک ناشی کا۔ یعنی ایک تو افعال ہوتے ہیں اور ایک ملکات، اور ملکات اصل ہیں اور افعال فرع ملکات ہی سے اعمال ناشی ہوتے ہیں جیسے جیسے اخلاق ہوتے ہیں ویسے ہی اس سے افعال سرزد ہوتے ہیں، مثلاً آپ نے کسی پر ظلم کیا یا سخت کلامی کی کہ اس کا منشاء تکبر ہے، اگر آپ میں تکبر نہ ہوتا تو یہ عمل سرزد نہ ہوتا۔ اور یقیناً ظلم بری چیز ہے۔ اور اس کی اصلاح واجب ہے۔ تو پھر تکبر کی اصلاح کیوں نہ واجب ہوگی جو کہ ظلم کا منشاء ہے اور جسکی اصلاح کے بغیر ظلم کی اصلاح ہو ہی نہیں سکتی۔ مگر ہماری غلطی یہ ہے کہ افعال پر تو ہم کو نظر ہے ملکات پر نہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ملکات کی اصلاح نفس کو گوارا ہے اعمال اس درجہ گراں نہیں، اسلئے اخلاق کو بالکل چھوڑ دیا ہے، جسکا منشاء یہ ہے کہ ہم کو اس کی ضرورت ہی کا احساس نہیں، اگر ان کو ضروری سمجھتے تو پھر گرانی کا خیال ہرگز نہ کرتے، جیسے پھل توڑنے میں کانٹوں کا لگنا ناگوار نہیں ہوتا چونکہ پھل توڑنا ضروری چیز ہے اس لئے کانٹوں کا خیال نہ کیا جاوے گا۔ اسی طرح اگر اخلاق کی ضرورت کا احساس ہو جاوے تو پھر ان کی اصلاح میں کتنی ہی مشقت ہو سب گوارا ہو جاوے۔ اس لئے اعمال سے پہلے ان کی جڑ یعنی اخلاق کی اصلاح کرو۔

اخلاق اور تکبر کا اثر

سو ایک فرق تو اعمال و اخلاق میں منشاء اور ناشی ہونے کا ہے، اور

ایک فرق یہ ہے کہ ترک اخلاق کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایسے شخص سے عام نفرت
ہو جاتی ہے برخلاف نماز روزہ کے کہ اس کے تارک سے نفرت نہیں ہوتی۔ شاید
کوئی یہ کہے کہ صاحب متکبروں سے نفرت کہاں ہے اُن کی تو تعظیم کی جاتی
ہے سو یاد رکھو کہ لوگ متکبر کی تعظیم خوف کی وجہ سے کرتے ہیں محبت سے نہیں کرتے
اور وہ تعظیم ایسی ہے جیسے اس مجلس میں اگر بھیڑیا آجاوے اور اس کی وجہ سے
آدمی کھڑے ہو جاویں تو آپ خود انصاف کرلیں کہ یہ کھڑا ہونا کیسا ہوگا۔
کیا تعظیم کے لئے ہوگا یا وحشت کے سبب ہوگا۔ اسی طرح متکبر کی تعظیم کو سمجھو
کہ دل سے نہیں بلکہ اس پر چونکہ قدرت نہیں اسلئے صورۃً اس کی تعظیم کی جاتی ہے،
چنانچہ ظالم اگر معزول ہوکر کسی مقدمہ میں گرفتار ہوکر جیلخانہ میں چلا جاوے تب
دیکھیں اس کی کیسی تعظیم ہوتی ہے، جبکہ وہاں تو موقع اور قدرت ملنے کی وجہ سے
ہر شخص بدلہ لینے پر تیار ہو جاتا ہے، اور اس کے مقابل ایک اللہ والا ہے اگر اس پر
اتفاقاً صورتاً تکلیف بھی ہو جائے تو اس کی تکلیف کا سب آدمی تذکرہ کرتے
اور افسوس کرتے ہیں اور حتی الوسع اسکو آرام پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں،
چنانچہ ہمارے ایک بزرگ زمانہ غدر میں ماخوذ ہوکر جیلخانہ میں لے جائے جارہے
تھے، اتفاق سے نماز کا وقت آگیا، ان بزرگ نے پولیس کے افسر سے جو کہ ہندو
سکھ تھا اجازت چاہی، داروغہ نے کانسٹبلوں سے کہا کہ بھائی انہیں چھوڑ دو۔
اور بیڑیاں کھول دو۔ یہ ایماندار آدمی معلوم ہوتے ہیں یقین ہے کہ یہ دھوکہ نہ دیں گے
صاحبو! یہ اثر ہے اللہ والوں کے اخلاق کا اور متکبر کا یہ اثر ہے کہ اس کے مرتکب سے
نفرت ہوتی ہے تو جسکے یہ آثار ہوں، آپ ہی انصاف کیجئے کہ وہ چھوٹی سی چیز

کیسے ہو سکتی ہے اور اخروی اثر یہ ہے کہ حدیث میں ہے کہ متکبر جنت میں نہ جائیگا۔ اب اس حدیث کے چاہے بھی معنی ہوں مگر ہر اعتبار سے یہ تھوڑی وعید ہے، سو اگر اب بھی تکبر چھوٹی اور خفیف شئے ہے تو اس کی وہی مثال ہو گی جیسے ایک طبیب ناواقف نے کسی کو مسہل دیا تھا اس سے دست آنے شروع ہوئے، طبیب صاحب سے ظاہر کیا گیا دست بکثرت آرہے ہیں فرمایا آنے دو، مادہ خارج ہو رہا ہے، چند بار اسی صورت سے شکایت کی گئی مگر طبیب نے ہر بار وہی کہا کہ آنے دو مادہ نکل رہا ہے۔ غرض اس قدر دست آئے کہ مریض مرگیا، اعزہ نے پھر اطلاع کی کہ صاحب وہ تو مر گیا، فرمانے لگے اللہ اکبر کس درجہ مادہ سخت تھا کہ خروج کے بعد بھی مار دیا، اگر یہ مادہ باقی رہتا تو نہ معلوم کیا حالت ہوتی۔ جاہل! اس سے زیادہ اور کیا ہوتا۔ سو جسطرح دستوں کا آنا اس جاہل کیلئے معمولی اور خفیف بات تھی، اسی طرح اگر تکبر بھی جسکا انجام دوزخ میں جانا ہے خفیف اور معمولی بات ہے، تو جناب ہی فرمادیں کہ اس سے بڑی بات اور کیا ہے، اس سخت مرض کے علاج میں جو میں خاص اہتمام کرتا ہوں اس کی بدولت بدنام ہوں کہ بہت تیز مزاج ہے، اس کے یہاں ذرا ذرا سی بات پر گرفت ہوتی ہے اور بعض لوگ اس تیزی کو جو کہ تکبر کا علاج ہے تکبر پر محمول کرتے ہیں، مگر میں دعوے سے نہیں کہتا، خدا کی نعمت بیان کرتا ہوں کہ الحمد للہ میرے اندر تکبر نہیں ہے، مگر لوگوں کو تکبر کی حقیقت کا علم نہیں، اسلئے بدگمانی ہے۔

عجب کا علاج

طبیب شفقت کی بنا پر لوگوں کے امراض کا اظہار کرے اور مریض اسے

سختی سمجھیں، تو آپ ہی بتلائیے کہ علاج کی کیا سبیل ہوسکتی ہے اور امراض باطنہ کا
علاج کس صورت سے ہوسکتا ہے، افسوس اصلاح کے متعلق ہم لوگوں کی تو یہ حالت
ہے، کہ اس معاملہ میں طبیب روحانی کی ذرا سی تدبیر کو بھی سختی سمجھتے ہیں، اور
سلف صالحین کی یہ حالت تھی کہ تکبر و عجب وغیرہ کی اصلاح میں مریدوں سے
بڑے بڑے مجاہدے کراتے تھے اور سختی نہیں سمجھی جاتی تھی، چنانچہ ذوالنون
مصری رح کی حکایت ہے، کہ ایک مرید نے ایک دفعہ آکر شیخ سے عرض کی کہ حضرت
فلاں مرید نے شراب پی رکھی ہے اور شراب کے نشہ میں شراب خانہ کے دروازہ پر
پڑا ہے، حضرت نے فرمایا کہ تم شراب خانہ سے اسکو اٹھا کر لاؤ۔ شیخ کا حکم تھا، ہرچند
کہ نفس پر ثقیل اور شاق گذرا مگر مجبوراً شراب خانہ کی طرف چلے اور اس کو کمر پر
لاد کر واپس ہوئے، لوگوں نے دیکھ کر دونوں کو برا بھلا کہنا شروع کیا کہ
میاں دونوں شرابی ہیں، مگر ایک پر نشہ کا اثر ہوگیا ہے اور دوسرے پر ابھی
نہیں ہوا۔ افسوس یہ مقطع صورت اور تصوف کا دعوےٰ اور یہ افعال، استغفراللہ
یہ صاحب سمجھ گئے کہ میں نے جو حضرت اس شخص کی شکایت کی تھی اور اپنے
کو اس شرابی سے اچھا سمجھا تھا اسلئے حضرت نے میرے نفس کو سزا دی ہے کہ مجھے
بھی ساتھ میں بدنام کرایا، تو پہلے بزرگ ان طریقوں سے تکبر و عجب کی اصلاح
کرتے تھے، کیونکہ جب تک یہ خناس دماغ سے نہیں نکلتا، اسوقت تک
وصول میسر نہیں ہوتا، اسی طرح حضرت شبلی رح کا واقعہ ہے کہ ان کے پاس ایک
مرید آیا اور ثمرات کے عدم ترتب کی شکایت کی، شیخ نے جب طریق تزکیہ
بدل کر دیکھا کہ کسی طریق سے نفع مرتب نہیں ہوتا تو سمجھ گئے کہ اس کے اندر

عجب و کبر کا مرض ہے وہی نفع سے مانع ہے تو شیخ نے ایک ٹوکرا اخروٹ کا بھرا ہوا دیکر کہا فلاں محلہ میں جہاں ان کے معتقدین زیادہ تھے جا بیٹھو اور اعلان کردو کہ ایک دھول کے بدلے ایک اخروٹ دوں گا، ایک دھول مارو اور ایک اخروٹ لیجاؤ، اسی طرح یہ ٹوکرا ختم کر دو، یہ حالت تھی معالجہ کی، مگر ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اگر ذرا سی بھی سختی ہوتی ہے تو ناگوار ہوتی ہے کہ ہم پر یہ سختی کیوں ہوتی ہے۔ لا الٰہ الا اللہ طلب کا دعوے اور بات بات پر ناگواری، صاحبو! طلب کا نام بھی کیوں بدنام کرتے ہو، مولانا فرماتے ہیں ؎

در بہر زخمے تو پر کینہ شوی
پس کجا بے صیقل آئینہ شوی
تو بیک زخمے گریزانی ز عشق
تو بجز نامے چہ میدانی ز عشق

طالب کا تو یہ مذاق ہوتا ہے کہ فرماتے ہیں ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من
دل فدائے یار دل رنجان من
پس زبون وسوسہ باشی دلا
گر ہوس را باز داری از بلا

ہماری یہ حالت ہے کہ ہم سے شیخ کی سختیاں تو کیا برداشت ہوتیں اور ہم شیخ کے تو کیا ہوتے بعضے تو اللہ کے بھی نہیں، چنانچہ ایک شخص نے روزہ رکھا تھا، اتفاق سے اسی دن اس کی بھینس مر گئی، تو کمبخت نے فوراً

منہ سے لوٹا لگا کر پانی پی لیا اور روزہ توڑ کر آسمان کی طرف منہ کر کے خدا تعالیٰ سے کیا کہتا ہے کہ لے روزہ رکھوا لے، نعوذ باللہ! خدا کے ساتھ یہ معاملہ، اور اس شخص پر تعجب نہ کرنا، ایسے لوگ آج کل بھی بکثرت ہیں، مگر اتنا فرق ہے کہ جاہل زبان سے بھی کہہ دیتا ہے اور مہذب زبان سے تو نہیں کہتا مگر دل میں حق تعالیٰ کے افعال پر اعتراض وہ بھی کرتا ہے، پھر ایسے لوگوں کے ساتھ بھائیجین اگر اس قسم کے معاملات میں ظاہری سختی کرتے ہیں تو بدنام ہوتے ہیں کہ بد اخلاق ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اہل حقیقت منشاء کو دیکھتے ہیں مثلاً تکبر کو کفر کا باپ سمجھتے ہیں، کیونکہ کفار کو حق خوب معلوم تھا اور حضورؐ کی نبوت کو خوب پہچانتے تھے، چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔

اور ـــــ

اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ۔

اور ـــــ

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا

مگر باوجود پہچاننے کے اتباع سے عار کرتے تھے تو ان کے کفر کا منشاء یہی تکبر تھا کیا اب بھی کسی کو شبہ ہے اخلاق کے اہتمام بالشان ہونے میں، کیا آج کل ایسے لوگ موجود نہیں ہیں جو کہ باوجود جاننے کے حکم الٰہی سے عار کرتے ہیں۔ تو کیا ان کا علاج نہ کیا جاوے۔

خوب یاد رکھنا چاہئے کہ یہ معمولی چیز نہیں اکثر گناہوں کی جڑ یہی ہے حتیٰ کہ کفر بھی اکثر تکبری سے پیدا ہوتا ہے اسی طرح اکثر معاصی بھی، چنانچہ بہت لوگ بے دھڑک داڑھی منڈواتے اور زر شولتے ہیں، اور جب نصیحت کی جاتی ہے، تو نہایت بیباکی سے کہتے ہیں کہ میاں تمام عمر تو اس وجہ سے ہے اب کیا توبہ کریں گے اور یہ شعر زبان زد ہوتا ہے ۔

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

بھائی تم آخری ہی وقت میں توبہ کرلو خدا تعالیٰ معاف کر دیں گے، مگر تکبر قلب کو ایسا مسخ کر دیتا ہے کہ آخری وقت میں بھی توبہ کی توفیق نہیں ہوتی۔ حضور کے زمانہ میں کفار حضورؐ کا پیغمبر ہونا جانتے تھے مگر تکبر کی وجہ سے قلوب مسخ ہو رہے تھے، جیسا ابھی قریب بیان ہوا۔

ہندستانی لائبریری
گارڈن ریچ روڈ۔ مٹیا برج۔ کلکتہ

تکبر کی نشانیاں

بعض اہل سیر نے ذکر کیا ہے کہ فرعون نے مسلمان ہونا چاہا تھا، مگر کچھ تو اس کا تکبر اور کچھ ہامان نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اتباع سے روکا، کیونکہ ہامان بھی متکبر تھا۔ غرض یہ تکبر بڑی بلا ہے معلوم کہاں جاکر دھکا دے گا، چنانچہ مجلس میں کسی کو جگہ نہ دینا اور کسی کے کہنے سے نہ اٹھنا، اسی طرح گرا ہوا کھانا نہ اٹھانا اور جھکنے سے عار کرنا اور کھانا جھک کر نہ کھاتا، جیسا کہ آج کل میز کرسیوں پر کھانا کھایا جاتا ہے کہ جھکنے سے عار آتی ہے، مسجد میں نہ جانا۔ ان سب کا

سبب بھی تکبر ہے، ایک صاحب میرے پاس مسجد میں تشریف لائے، مگر کوٹ، پتلون، بوٹ جوتہ زیب تن تھا آکر فرش سے باہر کھڑے ہو گئے وہ اس کے منتظر رہے کہ میں اٹھکر ان کے پاس آکر ان سے گفتگو کروں، دیکھئے یہ کون سی تہذیب ہے کہ جاویں تو خود ملنے کے لئے اور اس کے منتظر رہیں کہ یہ خود اٹھکر ہمارے پاس آئے، یہ بھی اسی تکبر کی فرع تھی، پھر لطف یہ کہ اگر کوئی شخص اس قسم کے مواقع میں ان کے لئے نہ اٹھے تو بد دماغ کہلائے اور ان خرد ماغوں کو کوئی کچھ نہیں کہتا۔

ایک اور صاحب میرے پاس مدرسہ میں تشریف لائے جنکا تمام جسم متصل واحد تھا۔ لکڑی کی طرح پتلونوں میں کھنچا ہوا تھا، وہ بھی تھوڑی دیر تو کھڑے رہے، شاید کرسی کے منتظر ہوں گے، مگر وہاں کرسی کہاں، آخر مجبور ہو کر بیٹھنا چاہا تو دھم سے زمین پر گر پڑے اور اٹھنا اور بھی دشوار ہوا، اس فرعونی وضع کا، جسمیں کوئی راحت بھی نہیں، سبب یہی تکبر ہی ہے کہ جہاں جائیں وہاں ان کے لئے کرسی منگائی جائے اور تاکہ ہر وقت بالکل فرعون کہلاتے رہیں، جھکنے کی بھی توفیق نہ ہو حتی کہ کھانے کے وقت بھی جھکنا نہ پڑے، اسی واسطے میز کرسی پر کھانا کھاتے ہیں، حالانکہ حضور اپنی ذات مقدس کے باب میں فرماتے ہیں، کہ میں تو غلاموں کی طرح کھانا کھاتا ہوں، میں اس کے متعلق آپ لوگوں سے سوال کرتا ہوں، کہ اگر جارج پنجم آپ کو ایک امرود دیکر اپنے سامنے کھانے کا حکم دیں تو میں دریافت کرتا ہوں کہ اس کے تناول کے لئے آپ میز کرسی اور کانٹے چھری کے منتظر ہوں گے، ہرگز نہیں، اور اگر جارج کے اس دیئے ہوئے امرود کی ایک قاش آپ کے ہاتھ سے گر جاوے تو کیا اس کو زمین ہی پر پڑا

رہنے دیں گے اور بوٹ جوتہ سے آگے کو سرکا دیں گے یا فوراً اٹھا کر کھالیں گے
شاید صاف بھی نہ کریں ابتلائیے اسوقت کس طرح عملدرآمد کریں گے یقینی امر
ہے کہ آپ فوراً اٹھا کر کھالیں گے تو یہاں بھی اس طریق سے عمل کیوں نہیں کیا
جاتا، کیا نعوذ باللہ حق تعالیٰ کی عظمت، جائج، جج سے کم ہے کہ ان کی دی ہوئی
نعمت کے ساتھ اتنا بھی معاملہ نہیں کرتے، اور ایک سوال اس کے متعلق یہ ہے
کہ اگر آپ کو جائج یا جج اپنے سامنے اس امرود کے کھانیکا امر کریں جلیسا اوپر مذکور
ہوا تو بتلائیں آپ اس کو رغبت کی صورت سے کھاویں گے یا بلا رغبت کھاوینگے
بالکل ظاہر ہے کہ غایت درجہ کی رغبت کا اظہار کرکے کھائیں گے اور رغبت
اور پسندیدگی کے اظہار کے لیئے اس کو اور جلدی جلدی اور عجلت کے ساتھ کھاینگے
بس یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں آیا ہے

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَأْکُلُ اَکْلًا ذَرِیْعًا

اگر کوئی جاہل کہے کہ یہ عجلت متانت کے خلاف ہے تو ہو مگر عشق کے خلاف تو
نہیں، حضورؐ کو حق تعالیٰ کا مشاہدہ تھا، اسلئے ایسی صورت سے کھاتے تھے کہ بے رغبتی
کی صورت ظاہر نہ ہو، حاصل یہ کہ بڑے کے مشاہدہ کے وقت تکبر نہیں رہتا
اسلئے ایسے افعال ہی پیدا نہیں ہوتے جو تکبر پر دال ہوں، چاہے کھانا کھانے میں
ہو یا مجلس میں جگہ دینے میں، بعض آدمیوں میں تکبر ایسا نماق ہوتا ہے کہ ذرا سی
بات بھی کسی کی نہیں سن سکتے، چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ میں تو بالغ تھا نابالغ
نہیں اور مجھے نماز پڑھانے کا اتفاق ہوا تو داہنی طرف آدمی کم تھے۔ میں نے ایک
صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ داہنی طرف آدمی کم ہیں آپ اس طرف آجائیں،

تو وہ صاحب بائیں طرف اخیر میں کھڑے تھے اسی طرح کھڑے رہے، میں نے ان کے پاس والے سے کہا کہ بھائی ان کی تو شان گھٹتی ہے تم ہی اس طرف آجاؤ یہ سن کر وہ بےحد غصہ ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم کبھی اس مسجد میں نہ آویں گے ہماری بےحرمتی ہوتی ہے (اس وقت میرا بچپن کا زمانہ تھا اور بچپنے میں تیزی ہوتی ہی ہے، اسلئے یہ تیز جملہ منہ سے نکل گیا، اب اس وقت تو ایسی بات کبھی نہ کہوں) میں نے کہا مسجد بھی آپ کی محتاج نہیں، چنانچہ وہ حضرت فوراً جوتے اٹھا اور چلتے ہوئے، تو بعضے لوگوں کی یہاں تک حالت ہے کہ غصہ تو کبھر اور انکار وتکبر مسجد میں آنے سے اور بعضے دعا میں تکبر کرتے ہیں، چنانچہ ہمارے یہاں کا واقعہ ہے کہ ہمارے یہاں ایک لڑکا ہے بہت نیک نماز روزہ کا پابند، مگر اس کے اقارب کو شریعت کی طرف توجہ نہیں، چنانچہ ایک مرتبہ اسی کا چچا کہتا ہے، کہ یہ لڑکا جو نماز پڑھ پڑھ کر ہاتھ پھیلا کر دعا مانگتا ہے، اسکے گھر میں کیا گی نہ ہے جو خدا تعالیٰ سے مانگتا ہے۔ نعوذ باللہ عجیب بات ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ تو جگہ جگہ عبادت کا امر فرمادیں اور ہم لوگ عبادت کرنے سے تمہیں دعا بھی بڑی فرد ہے عار اور تکبر کریں، غرض یہ تکبر بڑا مرض ہے جو ہمارے اندر گھسا ہوا ہے۔

تکبر کا علاج

اس آیت میں اس کا بھی علاج کیا گیا ہے اور اس کی بھی اصلاح کی گئی ہے، اب تو آپ کا وہ شبہ زائل ہو گیا کہ یہ مضمون تو معمولی ہے، نہ ارکان میں سے

ہے نہ فرائض میں سے پھر اس کا اتنا اہتمام کیوں کیا گیا ہے، پس اب تو واضح ہو گیا کہ:

اذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس

میں ایک بڑی ضروری تعلیم ہے، لیکن بعد تامل معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خاص اہتمام سے تکبر کا علاج کیا گیا ہے جو منشا ہے آداب مجالس پر عمل نہ کرنے کا اور بڑے بڑے گناہوں کے ارتکاب کرنیکا، پھر جب اصل اور جڑ خرابی کی جاتی رہے گی یعنی تکبر کا علاج ہو جائیگا اور اس کے علاج سے گناہ متروک ہو جائیں گے تو اب اعمال کے کرنے سے ارتفاع موانع کے سبب ان کا اصلی ثمرہ ضرور مترتب ہو گا۔ یہ حقیقت ہے اس تعلیم کی اسکو معمولی نہ سمجھو، اگر کوئی صاحب یہ کہیں کہ صدر مجلس کے کہنے پر عمل کرنے کو ازالہ تکبر میں کیا دخل ہے ہمنے تو ایک بار لیا کیا مگر کچھ بھی اثر نہ ہوا تو اس کا جواب یہ ہے کہ گو ایک بار عمل کرنا بھی بیکار نہیں مگر ایک بار میں معتد بہ اثر کا ظہور نہیں ہوتا، لیکن اگر بار بار اس پر عمل کریں گے تو خود ہی اثر معلوم ہو جائیگا۔ دیکھو ایک جگہ پانی کا قطرہ ٹپکتا ہے، تو اس وقت تو اس سے کچھ اثر محسوس نہیں ہوتا، لیکن اگر اسی طرح ٹپکتا رہے، تو دس برس میں اس پانی کے قطرہ ہی سے غار ہو جائیگا اور ظاہر ہے کہ اس اثر میں جسطرح مجموعہ من حیث المجموع کو دخل ہے اسی طرح ہر ہر قطرہ کا بھی دخل ہے، اسی طرح ہر عمل شرعی پر ایک مرتبہ بھی عمل کرنا بھی ضرور تصفیہ باطن میں اثر رکھتا ہے، گو کمال اثر کی علت تامہ نہ سہی، اس کے لئے ضرورت ہے تکرار ودوام کی یہاں تک ایک جزو کا بیان تمام ہو گیا جو آداب مجالس کے بارہ میں ہے

اور اس جزو کے واسطے رسالہ آداب المعاشرت کا مطالعہ کافی نافع ہے، اب میں بقیہ اجزاء کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔

آرام کا مدار

یہ تمہید میں مذکور ہے کہ آیت میں دو عمل اور دو ثمرے بیان کئے گئے ہیں عمل اول تفسح فی المجالس اور اس کا ثمرہ:

يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ

اور یہ عمل مع ثمرہ کے بیان ہو چکا اور عمل ثانی:

اُنْشُزُوْا

جس پر ثمرہ رفع درجات کو مرتب فرمایا ہے اور انشوز کا امتثال چونکہ واقع میں تفسح فی المجالس سے ارفع ہے کیونکہ اس میں انقیاد کا زیادہ اظہار ہے، جو نفس کو زیادہ شاق ہے، اس لئے اس پر ثمرہ بھی ارفع یعنی رفع درجات کا مرتب فرمایا، غالباً یہ امر بیان سے رہ گیا کہ فافسحوا اور فانشزوا عام ہے خواہ جوارح سے ہو یا قلب سے یعنی جس وقت مجلس میں تفسح کا حکم ہو کشادگی کر دے اور جب مجلس سے اٹھایا جائے اٹھ جائے، اور جب تک اس حکم کی نوبت نہ آوے تو اس کے لئے دل سے آمادہ رہے، اس آمادگی سے قلب میں زیادہ وسعت ہوگی اصلاح اخلاق کے لئے، کیونکہ حالت قلب کی زیادہ قابلِ اعتبار ہے۔

مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

صورت رفعت بود افلاک را
معنی رفعت رواں پاک را

اور حکیم سنائی فرماتے ہیں ؎

آسمانہاست در ولایت جاں
کار فرمائے آسمانِ جہاں
در رہِ روح پست و بالاہاست
کوہ ہائے بلند و صحراہاست

صوفیہ کرام نے روح ہی کا زیادہ اعتبار کیا ہے اور یہ احکام حسیہ میں بھی ہے، دیکھئے ایک شخص تو دو آنہ یومیہ کا مزدور ہے، اور ایک شخص رئیس ہے مگر اس پر پھانسی کا مقدمہ قائم ہو گیا، اس وقت اگر پوچھا جائے کہ ان دونوں سے کون آرام سے ہے تو کوئی نہ کہے گا کہ یہ غنی اس مزدور سے زیادہ آرام سے ہے بلکہ وہ غنی تمنا کرے گا کہ کاش یہ مزدور میں ہوتا تو اچھا ہوتا، اب سوال یہ ہے کہ اس آرام کا مدار روح پر ہے یا کہ جسم پر، اگر جسم کی راحت کو راحت کہتے تو غنی سے مفلس کسی حال میں اچھا نہ ہوتا، پس یقیناً یہی امر منتج ہوا کہ آرام اور راحت روح کی معتبر ہے نہ کہ جسم کی۔ اس حکمت کے لئے حق سبحانہ تعالیٰ شانہ کا یہ ارشاد:

یَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ اور فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ۔

ظاہر و باطن سب کے لئے شامل رکھا گیا ہے۔

اعمالِ عوام اور علماء کا فرق

اب اس مضمون ضمنی کے بعد

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا

کا بیان کرتا ہوں کہ یہاں پر حکم رفع درجات اولاً عام مومنین کیلئے ثابت فرمایا۔ پھر تخصیصاً اہل علم کے لیے اس کا حکم کیا اور صرف:

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ

پر اکتفاء نہیں فرمایا، گو وہ اہل علم کو بھی شامل ہو جاتا، سو ایسا کرنے سے مقصود اہل علم کی فضیلت کا ثابت کرنا ہے اور راز اس کا یہ ہے کہ ایک عمل عوام کا ہے کہ بوجہ بہت سے حقائق نہ جاننے کے وہ اس عمل کے پورے حقوق ادا نہیں کر سکتے اور ایک عمل اہل علم کا ہے وہ اس کے زیادہ حقوق ادا کر سکتے ہیں۔ پس اس عارض کی وجہ سے ان دونوں عمل میں ضرور فرق ہو گا۔ ضعیف و قوی ہونیکا اور کامل و ناقص ہونے کا، جب دونوں کے اعمال میں فرق ہوا اور اہل علم کا عمل قوی اور کامل ہوا تو اہل علم کو غیر اہل علم پر ضرور فضیلت ہو گی۔ اسی وجہ سے اہل علم کو جدا کر کے بیان کیا اور ظاہر ہے کہ اہل علم اور عوام میں جو یہ فرق ہوا، اس کا مدار بجز علم کے اور کوئی شے نہیں، لہٰذا علم ہی ایسی چیز ہوئی جس سے اہل علم کو فضیلت ہوئی، پھر جب علم مقبول و محبوب ہوا، تو اہل علم بھی ضرور محبوب اور مقبول ہونگے اور قاعدہ ہے کہ محبوب کو غیر محبوب سے زیادہ دیتے ہیں، اس لئے اہل علم کو زیادہ اجر ملے گا۔ اب میں اس راز کو بھی رمز بتلاتا ہوں وہ یہ کہ ایک ثمرہ تو نفس عمل پر مرتب ہوتا ہے اور ایک اس کی خصوصیت پر، مثلاً دو شخصوں سے ایک مضمون لکھوائیے، ایک تو محض مضمون لکھدے اور ایک منشی ذی فہم ہو کہ اس کو سمجھے بھی اور خوشنویسی سے زیب و زینت کے ساتھ لکھے بھی۔ ظاہر ہے کہ جو ثمرہ

لکھائی کا اس منشی کو دے گا وہ ہرگز پہلے شخص کو نہیں ملے گا، تو یہ زیادتی نفس عمل پر نہیں ہوئی بلکہ اس کے تحسین و تکمیل پر، اس پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک معمار تھا وہ تعمیر کرتے ہوئے نقش و نگار اور نزاکت و صفائی ستھرائی میں مستغرق تھا، اس پر ہمارے ماموں صاحب نے کہا کہ میاں کیوں وقت ضائع کر رہے ہو، بس چنائی کر دو، وہ معمار بولا منشی جی جب آپ لکھتے ہیں اس حالت پر قیاس کر لیں، کہ اس وقت آپ کیسے مرکز اور باریک اور موٹے خطوط کے تناسب اور ہر حرف کی اور ہر شد و مد کی مقدار کا اہتمام کرتے ہیں، آخر آپ اس میں کیوں وقت ضائع کرتے ہیں نفس کتابت پر کیوں نہیں اکتفا کرتے۔ ماموں صاحب لاجواب ہو گئے۔ تو جب محسوسات میں یہ بات ظاہر ہے کہ تکمیل کے بعد جو قدر ہوتی ہے وہ قبل تکمیل نہیں ہوتی، اور تکمیل ہوتی ہے اس کے فن دانی سے۔ کیونکہ بدون فن دانی کے کام کی تکمیل ہو ہی نہیں سکتی۔ پس تکمیل موقوف ہوئی علم پر۔ اور جب کسی عمل میں تکمیل ہو گی تو وہ عمل افضل ہو گا، اور اس عمل کے ثمرات بھی افضل ہوں گے۔ پس اس وجہ سے اہل علم کے عمل پر ثمرات بھی عوام کے ثمرات سے زیادہ مرتب ہوں گے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ کہ عارف کی نماز غیر عارف کی لاکھ نمازوں سے افضل ہے اس پر کہ تکمیل موقوف ہے۔ علم پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ حضرت حاجی صاحب کے ایک خلیفہ تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے قصداً اہتمام کر کے نہایت خضوع و خشوع سے نماز پڑھی اور نماز پڑھ کر مراقب ہو گئے عالم مثال کی طرف اس کی صورت دیکھنے کے لئے متوجہ ہوئے تو دیکھا کہ نہایت حسین و جمیل صورت ہے جو سر سے پیر تک زیوروں میں لدی ہوئی تھی، مگر آنکھوں سے اندھی ہے

یہ واقعہ حضرت حاجی صاحب سے بیان کیا حضرت نے معاً سنتے ہی فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے آنکھیں بند کر کے نماز پڑھی ہوگی، عرض کیا جی ہاں حضرت نے فرمایا یہی وجہ ہے کہ اندھی نظر پڑی، حضرت کا فہم عجیب و غریب تھا، فرمانے لگے کہ آنکھ کا بند کرنا خطرات سے بچنے کے لئے گو جائز ہے لیکن یہ زیادہ اچھا ہے کہ آنکھیں کھلی رہیں، گو لاکھوں خطرات آتے رہیں، کیونکہ نماز میں آنکھیں کشادہ رہنا موافق سنت کے ہے اور بند کرنا خلافِ سنت ہے، یہ فرق ہے عارف اور غیر عارف میں اور غیر عارف جسکا مدار وہی علم کا ہونا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عارف کی ایک رکعت غیر عارف کی لاکھ رکعت سے افضل ہے اب تو معلوم ہو گیا کہ یہ وجہ ہے علم کی رفعت کی۔ دوسری ایک وجہ یہ ہے کہ اعمال کا ثمرہ علم ہی کی وجہ سے ملتا ہے کیونکہ وہ موقوف ہیں علم پر تو موقوف پر جو ثمرہ ملتا ہے وہ بلحاظ موقوف علیہ کے ملتا ہے کیونکہ اس کے بدون موقوف کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔ پس عمل کا اجر بھی موقوف پر ہوا۔ پس عقلاً بھی علم کی فضیلت ثابت ہو گئی اور اسی سے علماء کے لئے زیادت اجر کا ملنا عقلاً معلوم ہو گیا۔

شریعت اور سائنس

اب میں نو تعلیمیافتہ جماعت کی ایک غلطی پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ شریعت میں جو علم کی فضیلت وارد ہے اس میں علم سائنس وعلم معاشیات وغیرہ داخل نہیں بلکہ علوم احکام مراد ہیں جو قرآن وحدیث وفقہ میں منحصر ہے، بعض احادیث ونصوص میں جو علم کا لفظ مطلق وارد ہوا ہے تو اس مطلق

یہ تعلیم ہی مراد ہے، اس سے ایسا عموم سمجھنا جسمیں سائنس وغیرہ سب داخل ہو جاییں ایسا ہے جیسا کوئی شخص کہے کہ تعلیم حاصل کرو، اس کا مطلب بیان کیا جائے، کہ پاخانہ کمانا بھی سیکھو، ہر چند کہ پاخانہ اٹھانا بھی واقعہ میں تعلیم کا ایک شعبہ ہے مگر عرفاً تعلیم حاصل کرنے سے ہرگز ہرگز کوئی شخص یہ نہ سمجھیگا کہ پاخانہ اٹھانے کی بھی تعلیم مراد ہے، پس اسی طرح قرآن و حدیث میں جو علم کی فضیلت مذکور ہوئی ہے اس علم میں سائنس وغیرہ ہرگز داخل نہیں، بلکہ یہ علم کو بمقابلہ علم احکام کے بحکم جہل ہے، دیکھئے قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے یہود کے متعلق اول تو لَقَدْ عَلِمُوْا ! فرمایا۔ اس سے انکا اہل علم ہونا ظاہر فرمایا ہے اور اس کے بعد لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ فرمایا، جسمیں انہیں سے علم کی نفی فرماتے ہیں، تو یہاں نفی علم سے مراد علم مع العمل کی نفی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ شریعت میں جہاں علم کی فضیلت کا ذکر ہے وہاں علم سے وہ علم مراد ہے جسکو عمل میں بھی دخل ہو بلکہ اس کے ساتھ عمل موجود بھی ہو، پس بتلائیے کہ سائنس کو عمل شرعی میں کیا دخل ہے ؟ جو اس کو اطلاق شرع میں داخل کیا جائے، اس دعوے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حدیث میں ہے:

اِنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَارًا وَّلَا دِرْهَمًا وَلٰكِنْ وَرَّثُوا الْعِلْمَ ـ

پس اس سے روز روشن کی طرح ظاہر اور واضح ہو گیا کہ شریعت میں علم سے مراد علم دینار اور درہم نہیں۔ حالانکہ حق تعالیٰ نے بعض انبیاء علیہم السلام کو علوم ذرائع کسب بھی عطا فرمائے تھے، مگر حضور نے نہ ان کو علم سے تعبیر فرمایا، اور نہ ان میں وراثت جاری ہوئی، کہ جو کسب ایک نبی کو عطا فرمایا تھا وہ وراثۃً ان کی

اولاد در اولاد چلا ہو، جب یہ امر منقح اور طے ہو گیا کہ علم سے مراد ایسے ذرائع و طرق کسب بھی نہیں جو بعض انبیاء کو عطا فرمائے گئے تھے، جیسا داؤد علیہ السلام کو زرہ بنانا سکھلایا اور ان کے ہاتھوں میں لوہے کو موم بنا دیا گیا :

والنا له الحدید

ع در کفِ داؤد آہن موم شد

اور اس قسم کے کسب انبیاء علیہم السلام کو بھی عطا فرمائے گئے تھے، چنانچہ زکریا علیہ السلام نجار تھے، نیز بعض انبیاءؑ کے لئے ہوا کو مسخر فرما دیا. مگر ان سب امور میں سے انبیاء کسی امر کے لئے مبعوث نہیں ہوئے اور نہ انبیاءؑ کی وراثت بجز علم شرعی کے کسی اور چیز میں جاری ہوئی۔ سو جب یہ مفید علوم بھی نصوص فضیلت میں داخل نہیں تو پھر سائنس اور جغرافیہ جو طرق کسب میں سے بھی نہیں علوم انبیاءؑ میں کیونکر داخل ہو سکتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ انبیاءؑ کے کلام میں علم سے مراد علم نبوت ہے نہ کہ علم کسب اور نہ علم طبعیات وغیرہ۔ الغرض اس فی فضیلت علم سے دین کا علم مراد ہے اور اہل علم کی فضیلت اسی علم کی وجہ سے ہے۔

حال و قال

اب ان فضائل کے بعد چونکہ یہاں علماء کے ناز کا موقع تھا کہ ہم اہل علم ہیں اور ہمارا عمل عوام سے بڑھا ہوا ہے تو ان لوگوں کی تنبیہ کے لئے فرماتے ہیں :

وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ

اے علیم بواطن الامور یعنی خدا تعالیٰ کو عمل کے ساتھ باطن کی بھی خبر ہے، وہ

سب کے باطن کو بھی دیکھ رہے ہیں کہ کس میں اخلاص ہے اور کس میں نہیں، محض علم پر ناز نہ کرنا کیونکہ یہ علم تو شیطان اور بلعم باعور کو بھی حاصل تھا۔ شیطان بقول مشہور معلم ملائکہ بھی تھا اور بلعم باعور اپنی قوم کا واعظ بھی تھا اور دونوں شخص علم کے ساتھ عمل ظاہری کے بھی جامع تھے، بڑے عابد اور جفاکش مجاہدہ کرنے والے تھے، مگر ان کے باطن میں اخلاص اور خدا تعالیٰ کی محبت و معرفت پوری نہ تھی، اس لئے یہ علم و عمل سب بیکار ہو گیا، پس عمل کے ساتھ سب بیکار ہو گیا۔ پس عمل کیساتھ ایک اور چیز کی بھی ضرورت ہوئی جس کا نام حالِ باطنی ہے، بدون حال کے علم و عمل قابلِ اعتبار نہیں اور یہ حال کتب بینی سے حاصل نہیں ہوتا، یہ کسی صاحبِ حال کی جوتیاں سیدھی کرنے سے نصیب ہوتا ہے۔ غرض اس جگہ آیت میں با ختلاف وجوہ دلالت تین چیزیں مذکور ہوئیں۔ علم و عمل و حال، اور ان تینوں کی تحصیل ضروری ٹھہری اور محض علم و عمل حاصل ہو گیا، مگر حال نہ ہو تو اس کی نسبت ارشاد ہوتا ہے۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ

جیسا قریب ہی مذکور ہوا یعنی خدا باطن کو بھی دیکھتے ہیں، نرے ظاہری علم و عمل کو نہیں دیکھتے، عارف رومیؒ فرماتے ہیں:

ما بروں را ننگریم و قال را
ما دروں را بنگریم و حال را

اور فرماتے ہیں

ناظرِ قلبیم اگر خاشع بود
گرچہ گفتِ لفظ نا خاضع بود

حق سبحانہٗ تعالیٰ زیادہ دل کو دیکھتے ہیں، ہم لوگ ظاہر میں پارسا اور مقدس بنے ہوئے ہیں مگر باطن میں یہ حالت ہے ؎

از بروں چوں گورِ کافر پر حلل
واندروں قہرِ خدائے عزّ و جل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید
وز درونت ننگ میدارد یزید

اور بعض علم کے ناکافی ہونے کو ایک دوسرے حکیم بیان فرماتے ہیں ؎

علم رسمی سر بسر قیل ست و قال
نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال

یعنی اگر اسپر اکتفا کیا تو سوائے قیل و قال کے کچھ نہیں، محض اس سے حال حاصل نہیں ہوتا، ہاں اگر اس کے بعد کسی صاحبِ حال کو لپٹ جائے تو پھر یہ علم رسمی بہت کار آمد ہے، جاہل صوفی سے عالم صوفی افضل ہوتا ہے، آگے علم حقیقی کو بتلاتے ہیں ؎

علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت
زنگ گمراہی ز دل بزدایدت
ایں ہوسہا از سرت بیروں کند
خوف و خشیت در دلت افزوں کند
تو ندانی جز یجوز و لایجوز
خود ندانی کہ تو حوری یا عجوز

اسی مضمون پر مولانا نے مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ :
ایک نحوی کو دریا کا سفر پیش آیا، علم نحو سے زیادہ دلچسپی تھی۔ جاہلوں کو حقیر سمجھتے تھے، جب کشتی میں بیٹھے، مطمئن ہو کر ملاح سے دریافت فرماتے ہیں، کہ میاں تم نے نحو بھی پڑھی ہے، اس نے کہا نہیں صاحب میں نے نحو نہیں پڑھی فرمانے لگے کہ تم نے اپنی آدھی عمر یونہی کھوئی، وہ بیچارہ یہ سنکر غمزدہ ہو کر خاموش ہو گیا، اتفاق سے کشتی بھنور میں پڑ گئی، اب اس ملاح کا موقع آیا، دریافت کیا کہ مولوی صاحب! آپ نے تیرنا بھی سیکھا ہے فرمانے لگے نہیں، تو ملاح نے جواب دیا کہ جناب نے اپنی ساری عمر کھوئی، کیونکہ یہ کشتی اس بھنور میں ڈوبتی ہے ؎

محوی باید نہ نحو اینجا بداں
گر تو محوی بے خطر در آب راں

افسوس کہ ہم نے قال ہی پر کفایت کی حال نہ حاصل کیا۔ صاحبو! اگر ہم مرنے لگیں تو کیا یہی جی چاہیگا کہ اسی قال پر خاتمہ ہو جائے جسپر ہم اس وقت ہیں، ہرگز نہیں مگر پھر بھی یہ حالت ہے کہ اگر آج کل کسی کے میر زاہد اور حدیث کے اسباق میں تعارض ہو جاوے تو حدیث کے سبق کو چھوڑ دیں گے مگر میر زاہد نہ چھوڑے گا، لیکن مرتے ہوئے اس میر زاہد کی حقیقت معلوم ہوگی، اسوقت بزبانِ حال یوں کہیں گے ؎

اَیُّهَا الْقَوْمُ الَّذِیْ فِی الْمَدْرَسَۃْ
کُلُّ مَا حَصَّلْتُمُوْهُ وَسْوَسَۃْ

علم نبود غیر علم عاشقی
مابقی تلبیس ابلیس شقی

میں دریافت کرتا ہوں کہ کیا آپ کا یہی دل چاہتا ہے کہ موت کے وقت صدرا کی شناخت یا شکریہ کی تقریر زبان سے نکلے ہرگز نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ یہ علم ضروری نہیں بلکہ زائد از ضرورت ہے، لہذا قاعدہ مسلمہ الضروری یتقدر بقدر الضرورۃ پر عمل فرما کر غیر مقصود میں اس قدر غلو نہ کیجئے۔ یہ مسلم کہ پاخانہ ایک ضروری شئے ہے مگر آدمی بقدر ضرورت ہی پاخانہ میں رہتا ہے، یہ نہیں کہ پاخانہ کے ساتھ دل بستگی اور شیفتگی ہو جائے، اسی طرح جب فلسفہ وغیرہ محض آلات ہیں اور علوم دینیہ کے لئے مقدمات کے درجہ میں ان کی ضرورت ہے نہ کہ مقصودیت کے درجہ میں تو بقدر ضرورت ہی ان کا اکتساب اور شغل کیجئے البتہ منطق بہت ضروری اور مفید ہے مگر رفع ضرورت کے لئے منطق میں قطبی ہی تک سمجھ کر پڑھ لو تو بہت ہے ملا حسن اور حمد اللہ کی بھی کیا ضرورت، ایک رسالہ بھی منطق کے لئے کافی ہے، جعل بسیط و مرکب منطق کا مسئلہ نہیں بلکہ فلسفہ کا مسئلہ ہے، مگر اس کی بحث خواہ مخواہ علم منطق میں اور کتب منطقیہ میں موجود ہے، اسی طرح اور بہت سے مسائل فلسفہ کے کتب منطقیہ میں ٹھونس رکھے ہیں، انہی کے لئے مدرسین اور طلبہ بہت سے رسالے پڑھتے پڑھاتے ہیں حالانکہ فلسفہ ضرورت سے زیادہ ہے، آج کل اکثر طلبہ کے خطوط میرے پاس منطق و فلسفہ کے عدم فہم کی شکایت کے آتے ہیں، میں لکھ دیتا ہوں کہ چھوڑ دو، قرآن و حدیث پڑھو، مگر اس زمانہ میں حدیث و قرآن سے بہت ہی کم تعلق ہے، معقولات سے دلچسپی زیادہ ہے اسلئے وہ درسیات سے فارغ ہو کر

ایسے مولوی بنتے ہیں کہ ؎

مولوی گشتی و آگہ نیستی
خود کجا و از کجا و کیستی

مستیٔ حال کی ضرورت

غرض مکلفین میں تین قسم کے لوگ تھے، حق تعالیٰ نے ہر ایک کو اس کی حالت کے مطابق اس آیت میں نصیحت فرمائی ہے، ہر ایک کو اس کی حالت کے مطابق ضروری امر کی رغبت دلائی، جاہلوں کو علم کی رغبت دلائی ہے اور اہل علم کو عمل کی اور عالم باعمل کو حال کی، جیسا کہ توضیح اس کی واضح ہو چکا ہے اور حال وہ چیز ہے کہ بدون اس کے کوئی عمل کامل نہیں ہو سکتا۔ بدون حال کے عمل کی ایسی مثال ہے، جیسے ریل گاڑی کو آدمی ٹھیلتے ہوں، آخر کب تک ٹھیلیں گے اور کیا اس طرح منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں، بہت مشکل ہے اور ہر وقت خطرہ ہے کہ بیچ میں ہی تھک کر چھوڑ دیں ہم نے بہت لوگوں کو دیکھا ہے، جو اعمال کے بہت پابند تھے مگر حال سے خالی تھے، انہوں نے مرض الموت میں نماز چھوڑ دی جسکا سبب یہی تھا کہ حال سے محروم تھے اور حال کے ساتھ عمل کی ایسی مثال ہے جیسے انجن میں اسٹیم بھرا ہوا ہو کہ وہ بہت جلد گاڑی کو منزل پر پہونچا دیتا ہے اور اسمیں یہ خطرہ نادر ہے کہ بیچ ہی میں گاڑیوں کو چھوڑ دے، اسی کو کہتے ہیں کہ ؎

تسبیح و خرقہ لذت مستی نہ بخشدت
ہمت دریں عمل طلب از مے فروش کن

صاحبو! اصل کی ہمت مستی حال سے ہی پیدا ہوتی ہے اس کو حاصل کرو۔ بحمد اللہ اب بھی ایسے ساقی موجود ہیں جن کے یہاں شراب محبت فروخت ہوتی ہے جسکی قیمت صرف طلب ہے۔ طلب کی پونجی سے جاؤ اور جتنی چاہو شراب خرید لو۔ مگر طلب کے یہ معنی ہیں کہ تم اپنے کو اس کے سپرد کردو کہ وہ جو چاہے تمہارے اندر تصرف کرے اور جس طرح چاہے آزمائے کیونکہ اس شراب کے پینے کے لئے کچھ شرائط ہیں تم ان شرائط کے بعد ہی پلائی جاتی ہے۔ بغیر ان کے ایک قطرہ بھی نہیں مل سکتا اور بدون شراب محبت پیئے ہوئے حال پیدا نہیں ہو سکتا۔

کامیابی کا طریق

بعض لوگ یوں چاہتے ہیں کہ ہمیں کچھ نہ کرنا پڑے بس ایک چھو سے مستی پیدا ہو جائے یہ غلط خیال ہے۔ اگر کوئی شخص شراب خانہ میں جا کر خمار سے یوں کہے کہ ایک پھونک مار کر اور چھو کرکے مجھے اس طرح کی شراب دیدے جس سے بدون پیئے ہی مجھے مستی پیدا ہو جائے اور کسی قسم کی تلخی بھی نہ معلوم ہو، یقین ہے کہ ساقی بھی یہی جواب دیگا کہ مستی پیدا کرنے کی صورت تو یہی ہے کہ دام خرچ کرو، اور شراب پیو اور میری چھو یہی ہے کہ لے کے پی جاؤ، پھر حیرت ہے کہ ظاہری مستی تو جو کہ ایک معمولی چیز ہے بدون کچھ خرچ کئے اور بغیر پئے حاصل نہ ہو سکے اور باطنی مستی جسکے سامنے ہفت اقلیم کی سلطنت بھی گرد ہے ایک چھو سے حاصل ہو جاوے اور ہمیں کچھ نہ کرنا پڑے، آج کل بعض لوگ شیوخ کاملین کے پاس جاتے ہیں اور ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہم کو کسی قسم کی محنت اور مشقت برداشت نہ کرنا پڑے

بلا محنت و کلفت کے مقصود حاصل ہو جائے، ایسے لوگوں کو طلب کا نام لینے ہی کی کیا ضرورت ہے جب وہ تلخی شراب کا بھی تحمل نہیں کر سکتے ؂

چون نداری طاقت سوزن زدن

از چنین شیر ژیان پس دم مزن

مثنوی میں ایک حکایت پر مولانا نے یہ شعر فرمایا ہے کہ ایک شخص اپنا بدن گدوانے چلا اور گودنے والے سے جا کر کہا کہ میرے شانہ پر شیر کی تصویر بنا دے تاکہ لڑائیوں میں بہادر رہوں اور شجاعت کا مجھ میں اثر رہے۔ اس نے اس کے کہنے کے مطابق ایک مقام پر سوئی چبھوئی تو آپ سے سوئی کی تکلیف برداشت نہ ہو سکی شور و غل مچانا شروع کیا اور اس سے سوال کیا کہ میاں کیا عضو بنا رہے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ دم بنا رہا ہوں، فرمانے لگے کہنے دم کا بھی شیر ہے، دم کو چھوڑ دو یہ دم کٹا ہی سہی اس نے دوسری جگہ سے گودنا شروع کیا۔ اس دفعہ آپ نے پہلی مرتبہ سے زیادہ شور مچایا اور پوچھا کہ اب کونسا عضو بنتا ہے تو اس نے جواب دیا کہ کان تو آپ فرمانے لگے کہ کانوں کو بھی جانے دو یہ بوچا ہی سہی، کیونکہ شیر کا وجود کانوں پر موقوف نہیں۔ اس نے وہ جگہ چھوڑ کر تیسری جگہ سوئی لگائی آپ نے دستور سابق دریافت کیا کہ اب کیا بنا رہا ہے اس نے کہا کہ پیٹ آپ فرماتے ہیں کہ تصویر کو پیٹ کی کیا حاجت ہے اسے کوئی کھانا پینا تو نہیں ہے، اس نے جھلا کر سوئی زمین پر پٹخ دی اور کہنے لگا کہ ؂

شیر بے گوش و سر و اشکم کہ دید

این چنین شیرے خدا ہم نافرید

کہ ایسا شیر تو خدا نے بھی پیدا نہیں کیا، میں کس طرح بناؤں، پھر مولانا فرماتے ہیں ؎

چوں نداری طاقت سوزن زدن
از چنیں شیرے ژیاں پس دم مزن

حافظؒ فرماتے ہیں ؎

یا مکن با پیل باناں دوستی
یا بنا کن خانہ بر انداز پیل
یا مکش بر چہرہ نیل عاشقی
یا فرو شو جامہ تقوےٰ بہ نیل

میاں جس جماعت میں شامل ہونا چاہو پہلے اپنے کو اس جماعت جیسا بنا لو پھر شرکت کا نام لینا کیونکہ ہر جماعت کی شان جدا ہے، مسخروں کی جماعت دھول دھپے کے لیے ہے اس میں شریک ہونا چاہو تو دھول کھانے کو تیار ہو جاؤ، اور مولویوں کی جماعت میں مسائل کی تحقیق ہوتی ہے، اس میں شریک ہونا چاہو تو علمی باتوں کی قابلیت پیدا کر لو اور اہل حال کی جماعت حالات اور واردات کے لیے ہے، اس میں داخل ہونا چاہو تو نفس کو پامال کرنے کے لیے آمادہ رہو ؎

در ہر زخمے تو بر کینہ شوی
پس کجا بے صیقل آئینہ شوی

غرض اگر ایسے لوگوں کی مجالس میں جانے کا قصد ہو تو پہلے اپنے ارادہ کو

بالکل چھوڑ دیجئے اور کالمیت فی ید الغسال ہو کر ان کی خدمات میں جائیے، وہ لوگ طبیب ہیں اور طبیب کبھی مسہل بھی دیتا ہے، گو تلخ ضرور ہوتا ہے، مگر چونکہ وہ مواد فاسد کو دور کر دے گا، اسلئے اس کا پینا عقلاً ثقیل اور دشوار نہیں معلوم ہوتا، ایسے ہی یہ لوگ بھی طبیب روحانی ہیں، جو شخص واقعی طالب صحت ہو، ان کے پاس جائیگا، وہ کبھی مسہل سے ناک منہ نہ چڑھائیگا، خیال تو کرو، اگر ایک شخص نے ایک مٹکے میں ڈھیلا گوبر لگا ہوا پھینکدے یا تو اب اس میں یہی کرنا پڑے گا کہ گوبر مع پانی کے .... نکال دیا جائیگا اور صاف کر کے پھر نیا پانی بھرا جائے گا، اسی طرح اگر کوئی شخص رذائل نفس سے ملوث ہو کر شیوخ کے پاس جائیگا، تو وہ بھی اس کو دھوئیں گے مانجیں گے اور اچھی طرح صاف کریں گے پھر اس کے بعد نیا پانی بھریں گے، مگر آج کل ناپاک پانی کے صاف کرنے کا تو لوگوں کو خیال نہیں اور پہلے ہی دن نیا پانی بھرنا چاہتے ہیں، پس تسبیح و زہد وغیرہ پر نظر ہے، حالانکہ نیا پانی اسی وقت صاف اور ستھرا رہیگا جبکہ گندا اور میلا پانی پہلے صاف کر دیا جاوے لہٰذا اخلاق ردیہ کو بیشتر صاف کرنے کی حاجت ہوگی، اور اس کے ساتھ ہی ان مضر علوم کو بھی رخصت کرنا پڑیگا جو آپ کے دماغ میں مکدر پانی کی طرح بھر رہے ہیں، اس کے بعد پھر صاف اور عمدہ پانی آوے گا۔ یہ ہے طریقہ کامیابی کا۔ اس مجموعہ کے متعلق یہ ارشادات ہیں ؎

قال را بگذار مرد حال شو
پیش مرد کاملے پامال شو

تسبیح و خرقہ لذت مستی نہ بخشدت
ہمت دریں عمل طلب مے فروش کن
فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست
کفر است دریں مذہب خود بینی و خود رائی

مگر ان سب تدبیروں کے بعد بڑی شرط یہ ہے کہ طالب ہو اور عاشق ہو، اور اس طرح بے چین ہو کہ طلب میں اس کا یہ ورد ہو ؎

اے بادشہ خوباں داد از غم تنہائی!
دل بے تو بجاں آمد وقت است کہ باز آئی
اے درد توام درماں در بستر ناکامی
اے یاد توام مونس در گوشہ تنہائی

جب طلب میں اس قدر پریشانی ہو گی، اس وقت مربی روحانی اور طبیب باطن یہ کہے گا کہ ؎

من غمم تو مے خورم تو غم مخور
بر تو من مشفق ترم از صد پدر

اسی طرح اشارہ کیا گیا ہے:

وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ

سے یعنی جب تمہاری یہ حالت ہو گی ہم کو بھی خبر ہو گی اور تم پر لطف فرمادیں گے غرض آیت مذکورۃ الصدر میں جیساکہ تقریر کی گئی علم و عمل و حال تینوں کی طرف اشارہ ہے اور بقدر ضرورت بحمد اللہ تینوں کا بیان بھی ہو گیا، جو عمل کے لئے

کافی وافی ہے، اور چونکہ میرے مواعظ اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں، اس لئے مواعظ کے نام بھی رکھے جاتے ہیں تو اس وعظ کا نام بھی رکھنا مناسب ہے، چنانچہ میں اس بیان کا نام "علو العباد من علوم الرشاد" رکھتا ہوں، جس میں نام مبارک استاذی جناب مولانا عبد العلی صاحب کی طرف بھی اشارہ ہے، جو اصل آمر ہیں اس بیان کے اور نیز اس میں مضمون آیت کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ اس آیت میں بیان ہے علو درجات عباد کا۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہمکو علم و عمل کی توفیق عطا فرمائیں اور قال کیساتھ حال بھی نصیب ہو۔ آمین!

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

ہندوستانی لائبریری
گارڈن ریچ روڈ۔ مٹیا برج۔ کلکتہ

التہذیب

HINDUSTANI LIBRARY
Estd.
ہندستانی لائبریری
Garden Reach, Calcutta

تراویح اور قرآن کے حقوق کے متعلق یہ وعظ جامع مسجد تھانہ بھون میں ۱۴ رمضان المبارک ۱۳۳۲ھ کو بیٹھ کر فرمایا جو تین گھنٹے ۲۵ منٹ میں ختم ہوا، قریبا ۵۰۰ کی حاضری تھی، مولوی محمد عبد اللہ گنگوہی نے قلمبند کیا

جو عمل ہاتھ پاؤں سے ناجائز ہے
وہ قلب سے بھی ناجائز ہے،
بعض لوگ تسخیر کے لئے عمل کیا
کرتے ہیں، یہ بھی حرام ہے، تسخیر کا
عمل تو تہذیب الاخلاق ہے، اس
سے بڑھکر کوئی تسخیر نہیں۔

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونؤمن بہ ونتوکل
علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیّات
اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن
یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ
الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا
ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ وصلی اللہ تعالیٰ
علیہ وعلی اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اَمّا بعد
فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ، بسم اللہ الرحمٰن
الرحیم۔ لَیْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اُمَّۃٌ
قَآئِمَۃٌ یَّتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰہِ اٰنَآءَ الَّیْلِ
وَھُمْ یَسْجُدُوْنَ ○

تمہید

آج سے دو جمعہ قبل ایک مبسوط تقریر میں بیان کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے خاص خاص حکمتوں کے واسطے دو قسم کی عبادتیں مشروع فرمائی ہیں ایک روزہ اور دوسرے تراویح جس میں قرآن مجید پڑھا جاتا ہے اور یہ بھی بیان کیا گیا تھا، کہ وہ مصلحتیں اور حکمتیں جب مرتب ہوتی ہیں جبکہ ان دونوں عبادتوں کے حقوق ادا کیے جاویں، اور ہر ایک کے جدا جدا حقوق ہیں۔ روزہ کے حقوق ادا کرنے سے اس کی برکات خاصہ مرتب ہوتی ہیں، اور کچھ حقوق تراویح کے ہیں، اور چونکہ اس میں قرآن مجید خواہ پورا ختم یا اس کے بعض اجزاء پڑھے جاتے ہیں، اس قرآن خوانی کے اعتبار سے بھی اس تراویح کے کچھ حقوق ہیں، اور اس کے منافع جب ہی مرتب ہوں گے کہ وہ حقوق ادا کیے جائیں۔ یہ مضمون تو دو جمعہ پہلے بیان کیا گیا تھا اور اس سے پہلے جمعہ میں مضمون سابق کی تتمیم اور تکمیل کے لئے روزہ کے منکرات کو بیان کیا تھا، آج وہ حقوق بیان کرنا ہے جو متعلق نماز یعنی تراویح کے ہیں اور روزہ کی طرح ان منکرات کا ذکر بھی ضروری ہوگا کہ جو لوگوں نے اپنی طرف سے اس میں شامل کر لئے ہیں۔ اس میں بعض منکرات و حقوق وہ ہوں گے، جن کا تعلق مطلق نماز سے ہے اور بعض وہ ہوں گے جو تراویح کے ساتھ خصوصیت رکھتے ہیں۔

غرض بعض مضامین وہ ہوں گے جو خاص رمضان المبارک کے متعلق ہیں، اور بعض عام، اسی طرح تراویح کے ضمن میں جو قرآن مجید کے متعلق حقوق و منکرات بیان کئے جاویں گے بعض ان میں مطلقاً قرآن پڑھنے کے متعلق ہوں گے اور بعض وہ مضامین ہوں گے جو رمضان المبارک سے علاقہ رکھتے ہوں گے، یہ حاصل ہوگا آج کے بیان کا۔

مقامِ مومن

یہ بات بھی اول ہی سمجھ لینے کے قابل ہے کہ اگرچہ دونوں قسم کے حقوق بیان کئے جائیں گے، تراویح کے بھی اور قرآن کے بھی، لیکن یہ سمجھنا چاہئے کہ مقصود اعظم ان دونوں میں کیا ہے، اس لئے کہ شریعت کا فرق مراتب معلوم کرنا اور اس کا لحاظ ہر شے میں رکھنا بھی ضروری قرار دیا گیا ہے، یعنی جیسے عمل مقصود ہے اسی طرح بعض علوم بھی مقصود ہیں، پھر ان کی مقصودیت دو طرح سے ہے بعض علوم تو عمل کے لئے مطلوب ہیں اور بعض علوم وہ ہیں جو باعتبار علم ہی کے مقصود ہوتے ہیں، پس سمجھنا چاہئے کہ قرآن مجید کے اندر دو حیثیتیں ہیں، ایک تو نفس قرأت کہ جس کے بدوں نماز نہیں ہوتی، اس کے اعتبار سے جو حقوق ہوں گے وہ تو حقوق صلوٰۃ ہیں مندرج ہو جاویں گے۔ اعتبار سے فرق بیان کرنا مقصودیت نماز نہ مقصودیت قرآن ہیں مقصود نہیں ہے، دوسرے رمضان کی تراویح کے اندر جو قرآن ختم کیا جاتا ہے، جس کے بدوں نماز ہو جاتی ہے، اس کے اعتبار سے فرق مذکور بیان کرنا منظور ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید جو نماز تراویح میں ختم کیا

جانتا ہے اس میں مقصود کیا ہے۔ تراویح مقصود ہے یا قرآن مجید، اور وجہ اس فرق بیان کرنے کی یہ ہے، کہ اس کا اثر عمل پر پڑتا ہے، چنانچہ اکثر لوگوں کا گمان یہ ہے کہ مقصود ختم قرآن ہے، اسی واسطے رمضان المبارک میں نماز کی بری گت بنتی ہے، حتیٰ کہ اس کا اثر فرض پر بھی پڑتا ہے، کہ وقت سے پہلے یا مستحب وقت سے پہلے فرض عشاء کے ہوتے ہیں، اس لئے کہ اہتمام اس کا ہوتا ہے کہ جلدی ختم ہو جائے تو جلدی مسجد سے بھاگو، صاحبو! مسجد میں جی نہ لگنا بری علامت ہے سلف صالحین میں سے کسی کا قول ہے۔

المؤمن فی المسجد کالسمک فی الماء

یعنی مومن مسجد میں ایسا ہے جیسے مچھلی پانی میں۔ جیسے مچھلی کو پانی سے الگ کرنے میں تکلیف ہوتی ہے اور پانی میں رہنے سے اس کی حیات ہے، ایسے ہی مومن کا حال مسجد کے ساتھ ہے۔ اور:

المنافق فی المسجد کالطیر فی القفس

یعنی منافق مسجد میں ایسا ہے جیسے پرندہ پنجرے میں پھڑپھڑاتا ہے اور چاہتا ہے، کہ جلدی نکل جاؤں، ایسے ہی منافق کا بھی دل مسجد سے اکتاتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی طرح جلدی خلاصی ہو اور بہانہ یہ ہوتا ہے کہ جلدی سوئیں گے، لیکن یہاں سے جا کر گھنٹوں حقے پیتے ہیں، اور ایسے لوگوں نے ایک لطیفہ یاد کر رکھا ہے، کہ کسی بزرگ نے کسی سے یہ پوچھا تھا کہ نماز میں نیند کیوں آتی ہے اور ناچ میں کیوں نہیں آتی، فرمایا کہ بچھونوں پر نیند آیا کرتی ہے اور کانٹوں پر نہیں آتی۔ نماز میں روح کو راحت ہوتی ہے، اسلئے نیند آجاتی ہے، اور ناچ چونکہ خلاف شریعت ہے

اس لئے اس میں اگر کسی جگہ ابتلاء ہو جائے تو روح کو کلفت ہوتی ہے، اس لئے نیند نہیں آتی، گویا ان حضرت کا مطلب یہ ہے، کہ ہم بھی اس قابل ہیں کہ نماز میں ان کو راحت ہوتی ہے۔ یہ لطیفہ کسی صاحب حال کے معالجہ کے اعتبار سے ٹھیک ہوگا، لیکن ہم سے اللہ والوں کے حق میں تو درست نہیں، ہم لوگوں کے اندر اس کی وجہ اور ہے۔ وہ یہ ہے کہ جس شئے کے اندر ہمارا جی لگا کرتا ہے، تو اس میں ہم سرتاپا مشغول ہو جاتے ہیں اور تمام حواس بھی اسی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اس لئے نیند اڑ جاتی ہے، اور نماز میں تمام حواس اس طرف متوجہ نہیں ہوتے اور نیند بھی اڑانیوالی توجہ ہی تھی اور کوئی اور کام بھی اسوقت نہیں ہوتا اس لئے نیند آجاتی ہے

استغراق اور اسکے آداب

باقی ان بزرگ نے کسی خاص شخص کی حالت کے اعتبار سے فرمایا ہے اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ سالکین کو ذکر میں یکسوئی ہوتی ہے، اور بعض مرتبہ وہ یکسوئی اسقدر بڑھتی ہے کہ وہ نیند تو نہیں ہوتی، مگر مشابہ نیند کے اس بات میں ہوتی ہے کہ جیسے نائم کو اس عالم سے غیبت ہو جاتی ہے ایسے ہی اس ذاکر کو بھی ہو جاتی ہے، اس حالت کا نام استغراق ہے، چنانچہ اس کے نیند کے مشابہ ہونے پر مجھے حکایت یاد آئی کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تھانہ بھون میں رہکر ذکر و شغل فرمایا کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت اپنے حجرہ میں مراقب بیٹھے تھے، حضرت حاجی صاحب نے ایک سوار فوجی کو جو مہمان آئے تھے ارشاد فرمایا کہ جاؤ مولانا کو بلا لاؤ۔

انہوں نے آکر دیکھا تو حضرت کی گردن جھکی ہوئی تھی اور آنکھیں بند۔ بیچارہ فوج کا آدمی اس کو کیا خبر یہ کیا کر رہے ہیں۔ جا کر عرض کیا کہ حضرت وہ تو سوتے ہیں۔ حضرت حاجی صاحب سمجھ گئے کہ مشغول ہیں، پھر نہ بلایا، اور حضرت کا مولانا کو نہ بلانے کا راز ایک بزرگ کے ایک ملفوظ سے معلوم ہوا ۔ وہ یہ ہے، کہ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ جو شخص مشغول مع اللہ کو اپنی طرف مشغول کرے اور کہ الملتفت فی الوقت، یعنی اس کو اسی وقت اللہ تعالیٰ کی ناراضگی لاحق ہوتی ہے۔ بڑی زیادتی اور بے احتیاطی کرتے ہیں وہ لوگ جو کہ مشغول باللہ کو اپنی طرف متوجہ کریں، اکثر لوگ بزرگوں کے پاس جاتے ہیں اور ان کو مشغول پاتے ہیں تو یہ چاہتے ہیں کہ ان کو اپنی طرف متوجہ کریں تو ایسی حرکتیں کرتے ہیں، جس سے دل ہٹ جائے، کیا کرتے ہیں، بعضے تو السلام علیکم پکار کر کرتے ہیں۔ یاد رکھو جو شخص قرآن مجید پڑھتا ہو یا ذکر و شغل میں مشغول ہو، اس کو سلام مت کرو، جا کر دیکھو کہ وہ کس حالت میں ہیں، اگر سلام کا موقعہ ہو تو سلام کرو ورنہ چپکے سے ایسے طور سے بیٹھ جاؤ کہ ان کو تمہارے آنے کی بھی خبر نہ ہو، جب میں جلسہ دیوبند میں گیا تو علیل تھا، بلکہ ارادہ بھی جانے کا نہ تھا۔ ایک بار نماز کے وقت باجازت امام نماز پڑھانے کے لئے مصلیٰ پر جانے لگا، راہ میں وہاں مصافحوں کا جو ہجوم ہوا مصافحے کرتا کرتا حیران ہو گیا خیر جوں توں کرکے مصلے کے قریب پہنچ گیا، تو دوسری صف میں سے ایک شخص نے نکل کر ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا اور مصافحہ کرکے چھوڑ دیا۔ ایک بار وطن میں بعد نماز کے کچھ اوراد مصلے پر بیٹھا پڑھ رہا تھا، ایک شخص سپاہی سا آکر کھڑا ہو گیا اور بآواز بلند

پشت کیطرف کہا، مصافحہ۔ میں نے کہا ــــ وظیفہ، اور بعض کیا کام کرتے ہیں، حلق سے کام لیتے ہیں، یعنی کھانستے ہیں، مطلب یہ ہے کہ ہم آئے ہیں وظیفہ چھوڑ کر ہم سے باتیں کرو، بعض ہاتھوں کی آہٹ سے کام لیتے ہیں، بعضے پاؤں کو زمین پر مارتے ہیں، جو شخص کہ مشغول ہو، اس کو جب معلوم ہوتا ہے کہ کوئی میرا منتظر ہے، اس کا دل بٹ جاتا ہے اور دل پہ بوجھ ہوتا ہے اور بعضے جو ادب سے کام لیتے ہیں وہ چپکے سے ایک جگہ بیٹھ جاتے ہیں، مگر بیٹھتے ہیں ایسی جگہ کہ اس مشغول شخص کی نظر بار بار پڑے، یاد رکھو اگر انتظار کرنا ہو تو ایسی جگہ بیٹھو جہاں اسکو خبر بھی نہ ہو، جب دیکھو کہ اب فارغ ہو گئے ہیں، اسوقت ملو۔ ہاں خدانخواستہ اگر کوئی مرتا ہو یا کنوئیں میں گرتا ہو تو اس وقت وظیفہ تو الگ رہا فرض نماز کا توڑ دینا واجب ہے، مگر غضب تو یہ ہے کہ معمولی بات کیلئے آکر حرج کراتے ہیں، ایک شخص میرے پاس آیا، میں کچھ پڑھ رہا تھا، میں اٹھ کر گیا، کہ کیا ہے کہو، کہنے لگا تیج (تعویذ) چاہیے، پوچھا کاہے کا۔ کہا بجھار آوے (بخار آتا ہے)، لیجئے ایک تعویذ کے واسطے اس بندۂ خدا نے میرا حرج کیا۔ میں صبح کو اپنی مصلحت سے جنگل چلا جاتا ہوں، بعض حضرات وہاں بھی پہنچتے ہیں، بعض حضرات ایک اور حرکت کرتے ہیں، نہ وہ ہیں جو ذرا بزرگ ہیں، وہ یہ کرتے ہیں کہ بیٹھ تو جاتے ہیں الگ ہی، لیکن قلب سے اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، یاد رکھو کہ اگر کسی کا شیخ صاحب کشف نہ ہو تو اس کا کچھ حرج نہیں، اور اگر وہ صاحب کشف ہے تو اس کو ادراک ہوگا کہ کوئی شخص میری طرف متوجہ ہے اسکو تکلیف ہوگی، ایک شخص ہمارے حضرت حاجی صاحب کے یہاں آئے

اس وقت حضرت بالاخانے پر تشریف رکھتے تھے، وہ شخص حضرت کا خیال کر کے بیٹھ گئے، تھوڑی دیر میں کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت آرہے ہیں، اس طرف نظر اہل تحقیق کی پہنچتی ہے، وہ اس سے بچتے ہیں، حضرت حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ ایک شخص یہاں آئے اور آکر ٹٹولنے لگے یعنی مراقب ہوئے کہ دیکھیں، حضرت کی نسبت کس درجہ کی ہے، حضرت سیدھے ہو بیٹھے اور یہ آیت تلاوت فرمائی:

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا۔ (الآیۃ)

اور فرمایا، قال اللہ تعالیٰ: لَا تَجَسَّسُوْا اور فرمایا کہ یہ بھی تجسس حرام کے اندر داخل ہے، یہ چوروں کی طرح گھسنا کہاں جائز ہے اور فرمایا کہ میاں، جو چھپانے والے ہوتے ہیں، ہزار ٹکریں مار کر، وہ پتہ بھی نہیں دیتے، انہوں نے فوراً پاؤں پکڑ لئے۔

تصرف کی حرمت

اسی طرح تصرف سے کسی سے کچھ وصول کرنا یہ بھی حرام ہے، بعض اہل تصرف اس کو بزرگی سمجھتے ہیں کہ کسی کی طرف متوجہ ہو گئے کہ یہ شخص ہم کو پانچ سو روپے دے گا، تصرف کے اندر یہ اثر ہے کہ اس شخص کا قلب مغلوب ہو کر متاثر ہو جاتا ہے اور وہ وہی کام کرتا ہے، یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حلال ہے حالانکہ حرام ہے[1]

---

[1] ۲۳۱ نقلی روایت بھی اس میں اگر کوئی مل جائے تو بہتر ہے ورنہ بظاہر فتوے (بقیہ)

اور ایسا ہی حرام ہے جیسے کسی کو مار کر کچھ چھین لیا جائے اور ایسے دئیے ہوئے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بعد میں آدمی پچھتاتا ہے۔ ایک فقیر صاحب تصرف تھا، وہ کچھ پڑھکر پیشانی پر مٹی لگا لیتا تھا، ایک مرتبہ وہ ایک انگریز کے پاس گیا، اس

(بقیہ حاشیہ) کی رو سے جائز معلوم ہوتا ہے، گو تقوے کے خلاف ہو۔ اور اگر ناجائز ہو تو کسی صاحب باطنت کو دیکھ کر ایک بے انتہا کشش اسکی طرف ہوتی ہے اگرچہ وہ صاحب باطنت تصرف نہ کرے اور اس کشش کے غلبہ سے وہ کچھ ان کی خدمت کرے اور جب وہ اثر نہ رہے تو پچھتائے اس لئے اس کی محبت تو قلب میں راسخ نہیں ہے تو چاہئے یہ بھی ناجائز ہو، ورنہ مابہ الفرق کیا ہے ۱۲ جامع۔ الجواب:۔ فقہی روایت اسکی موید وہ ہے جو کتاب الحظر والاباحۃ میں کتب فتاوی میں لکھی ہے کہ زوجہ کو تعوید حب کا زوج کے لئے حرام ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کے اثر سے زوج کو ایسے امر کے لئے مغلوب کرنا ہے جو اس پر واجب نہیں، یہی علت یہاں بھی ہے، پس اشتراک علت سے حکم مشترک ہوگا، اور صاحب شبہ کے مقیس علیہ میں اور اس میں فرق ظاہر ہے کہ اس مقیس علیہ میں اس صاحب باطنت نے نہ اس کا قصد کیا نہ اسکو اس کا علم اور بدار تکلیف یہی دو امر ہیں اور مقیس میں خود قصد کیا ہے جو مسبوق بالعلم ہوتا ہے اور اگر مقیس علیہ میں بعد میں یہ علم ہو جاوے کہ شے کے بعد پچھتایا ہے تب بھی واپس کرنا واجب نہیں، کیونکہ شرط علت طیب قلب وقت الاعطاء ہے، بعد میں اس کا بقا ضروری نہیں، البتہ مروت وہمت اسی میں ہے کہ واپس کردے، چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کسی اعرابی نے ہدیہ دیا، آپنے اسکا بہت بدلہ دیا مگر وہ راضی نہ ہوا، مگر آپ سے یہ منقول نہیں کہ واپس فرمایا ہو، اس سے تو عدم وجوب واپسی کا ثابت ہوا، اور آپ چونکہ بدلہ دے چکے تھے جو حکم مبدل ہے اس سے واپسی کا اقرب الی الہمت ہونا معلوم ہوا۔ ۱۲ اشرف

انگریز نے اس کی صورت دیکھتے ہی خانساماں کو حکم دیا کہ اس کو سو روپیہ دیدو، جب وہ چلا گیا تو بہت پچھتایا کہ میں نے کیا کیا، فوراً خانساماں سے کہا کہ اس کو پکڑ دو، جب وہ آیا، صورت دیکھتے ہی کہا، کہ اس کو وہ سو روپے دیدو کچھ نہ کہو، پھر وہ چلا گیا تو نادم ہوا۔ پھر خانساماں سے کہا کہ اس کو پکڑ دو۔ جب وہ سامنے آیا پھر یہی کہا۔ تیسری بار میں خانساماں نے کہا کہ آپ تو دق کرتے ہیں آپ لکھدیجئے، چنانچہ سو روپیہ دینا اس سے لکھوالیا، اس وقت وہ نادم تو ہوا، لیکن چونکہ لکھ چکا تھا اس لئے کچھ نہ بولا، پس اس طرح کسی کا مال لینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے لٹھ مار کر لینا۔ ہمارے حافظ صاحب حافظ محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ شہید کے صاحبزادہ حافظ محمد یوسف صاحب مرحوم بھی صاحب نسبت تھے اور بھوپال میں تحصیلدار تھے، ایک صاحب تصرف فقیر یہ سمجھ کر کہ یہ تو ایک تحصیلدار ہیں ان کی طرف متوجہ ہو کر کھڑا ہو گیا، ان کو معلوم ہو گیا، فوراً یہ شعر پڑھا ؎

سنبھل کے رکھنا قدم دشت خار میں مجنوں

کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

حافظ صاحب کا یہ شعر پڑھنا تھا کہ وہ تڑپ کے گر پڑا اور کہا کہ حضور میں تو آپ کا ہی شغال رنگین ہوں، حافظ صاحب نے اس کو نصیحت فرمائی اور فرمایا کہ توبہ کرو کس خرافات میں مبتلا ہو۔ اتباع سنت کرو۔ بڑی شے اتباع سنت ہے، تصرف کوئی شے نہیں ہے، اور یاد رکھو جو عمل ہاتھ پاؤں سے ناجائز ہے وہ قلب سے بھی ناجائز ہے،

راز محبوبیت

بعض لوگ تسخیر کے لئے عمل کیا کرتے ہیں یہ بھی حرام ہے، اور اگر کسی

بزرگ کو دیکھا ہو، کہ وہ میاں بیوی میں محبت ہونے کیلئے عمل کرتے ہوں، تو وہ اس درجہ کا عمل کرتے ہیں جس سے میاں حقوق واجبہ ادا کرنے لگے۔ یہ نہیں کہ وہ مغلوب الحواس ہو جائے۔ بزرگوں کے پاس تسخیر کا عمل تو تہذیب اخلاق ہے، اس سے بڑھکر کوئی تسخیر نہیں، جس کی نسبت کسی نے کہا ہے ؎

اخلاق سے کرنا تسخیر ہے تو یہ ہے
خاک آپ کو سمجھنا اکسیر ہے تو یہ ہے

جو خدا کا مطیع ہوتا ہے وہ سب کا محبوب ہو جاتا ہے، اور اگر وہ غصہ بھی کرتا ہے تو اس کی سب سہتے ہیں، حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مرادآبادی علیہ الرحمۃ مزاج کے تیز تھے اور جذب بھی تھا، وزیر حیدرآباد آئے، حکم دے دیا کہ نکالو، کسی نے عرض کیا کہ حضرت وزیر ہیں، فرمایا ہیں کیا کوئی جو وزیر ہے۔ جب بہت اصرار کیا تو یہ فرمایا، کہ اچھا دو بجے رات تک رہنے کی اجازت ہے، حیدرآباد کے امراء بھی اللہ اکبر بزرگوں کے بہت ہی معتقد ہوتے ہیں، اس شخص نے باوجود وزیر ہونے کے برا نہیں مانا اور دو بجے رات کو چل دیا۔ اور یہ کہا کہ بھائی اب مولانا کا حکم نہیں ہے، تو یہ کیا بات تھی ان کے کہنے سے کیوں برا نہ مانتے تھے، بات یہ ہے کہ ان حضرات کا جو کام ہے اللہ کے واسطے ہے، نفس کے واسطے نہیں ہوتا۔ نرمی کریں جب اور سختی کریں تب جو بات ہے وہ سب اللہ ہی کے واسطے ہے اور حق تعالیٰ سب کے محبوب حقیقی ہی ہیں۔ آپ نے کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ معشوق اگر گالی دے یا گھونسہ مارے تو عاشق نے برا مانا ہو، بلکہ

گھونسے کھانے میں بھی مزہ آتا ہے اور عاشق یہ کہتا ہے ؎

نشود نصیب دشمناں کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اس لئے یہ بھی سب کے محبوب ہیں اس لئے ان کی سب حرکات بھی محبوب ہیں اور اسی واسطے جسقدر اہل کمال ہیں ان کے کمالات کے تذکرہ کرنے میں تو لذت آتی ہے مگر اہل اللہ کے ہنسنے اور رونے اور بیٹھنے اور سونے کے تذکرہ میں بھی مزہ آتا ہے، ان کی سب حرکات میں محبوبیت کی شان نظر آتی ہے، جسکا راز اصلی یہ ہے کہ یہ حق تعالیٰ کے محب اور محبوب ہوتے ہیں، پس اصل تحیر تو یہ ہے اور تحیر کے عمل کو وہ حرام جانتے ہیں، بہرحال جو شخص مشغول ہو اس کی طرف قلب کو بھی متوجہ نہ ہونا چاہئے، یہ وجہ تھی اور یہ راز تھا کہ حضرت حاجی صاحب نے حضرت مولانا کو پھر نہیں جگایا۔ پس وہ حالت مشابہ نیند کے ہوتی ہے اور یہ سالکین شاغلین کو پیش آتی ہے، پس ایسی حالت والوں کے اعتبار سے وہ نکتہ چل سکتا ہے، باقی ہم لوگوں کو نیند آنیکی یہ وجہ نہیں، نیند تو آتی ہے اسباب طبعیہ کی وجہ سے۔ فرق اتنا ہے کہ نماز میں تو کوئی شئے دافع نوم موجود نہیں ہے اور ناچ رنگ میں موجود ہے۔

اوقات نماز

حاصل یہ ہے کہ لوگوں کا نماز میں جی نہیں لگتا اور یہ کچھ تراویح کے ساتھ خاص نہیں۔ بعض لوگ جامع مسجد میں سب سے پہلے آتے ہیں، لیکن بیٹھتے ہیں دالان میں ہوا کے واسطے یہ اتباع ہوا ہے جس کی نسبت داؤد علیہ السلام جیسے پیغمبر کو

یہ ارشاد ہے:

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

بعض لوگ اس مصلحت سے بھی باہر بیٹھتے ہیں کہ جلدی سے بھاگ جاویں، اسلئے کہ شاید ہمارے پیچھے کوئی ایسا شخص نیت باندھے کہ قرلطینہ ہی ہوجائے۔ اس لئے بس امام نے سلام پھیرا اور چل دئے۔ ایک آغا صاحب اپنے نوکر کے ساتھ شرط باندھکر نماز پڑھا کرتے تھے کہ دیکھیں پہلے کون فارغ ہو، ایک ظریف صاحب نے دیکھکر کہا تھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اذکار اور قرارت تو تم گھر پڑھ لیتے ہو یہاں خالی اٹھا بیٹھنا رہ جاتا ہے اور تراویح میں تو خصوصیت سے اہتمام کرتے ہیں کہ جلدی فراغت ہو، اسی واسطے بہت جلدی کھڑے ہوتے ہیں، اور اس جلدی کھڑے ہونے میں تین حالتیں ہیں۔ بعض جگہ تو اذان بھی وقت پر ہوتی ہے اور فرض و تراویح بھی وقت پر ہوتے ہیں، خیر اتنی جلدی تو قابل شکایت نہیں گو دلیل بے رغبتی کی ہے، اور بعض جگہ اذان ہوتی ہے وقت سے پہلے اور فرض و تراویح وقت پر ہوتے ہیں۔ اور بعض جگہ نہ اذان وقت پر ہو اور نہ فرض وقت پر۔ یہ لوگ، اپنے نزدیک جب دیکھ لیتے ہیں کہ سرخی غائب ہوگئی بس اذان کہہ دیتے ہیں حالانکہ امام صاحب کا مذہب یہ ہے کہ سرخی کے بعد جو سفیدی ہوتی ہے، جب وہ غائب ہوجائے، اس وقت عشاء کا وقت آتا ہے۔ اور ریاضی کے قاعدہ سے بھی امام صاحب کا مذہب قوی معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ دیکھنا اس بات کا ہے کہ شفق کی حقیقت کیا ہے۔ سو شفق واقع میں اثر ہے قرب آفتاب کا۔ افق سے یہ نور اس کی شعاعوں کا ہے، اور شفق اس وقت ہوتی ہے جب آفتاب افق سے

اٹھارہ درجہ پر ہو۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسری بات یہ ہے کہ شفق دو وقت ہوتی ہے، طلوع سے پہلے اور غروب کے بعد۔ صبح میں سب کا اتفاق ہے کہ سفیدی کے بعد صبح ہو جاتی ہے، اور رات ختم ہو جاتی ہے۔ پس وہ سفیدی دلیل نہار کی ہے۔ پس اسی طرح غروب کے بعد بھی سفیدی تک نہار کا اثر ہے۔ اور تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ ہر موسم میں تقریباً برعایۃ الاحتیاط غروب کے ڈیڑھ گھنٹہ بعد کم از کم عشاء کی اذان ہونا چاہیئے، اور نیز اذان اور نماز میں کچھ فصل بھی ہونا چاہیئے کم از کم آدھ گھنٹہ کافی ہے۔ پس غروب کے پورے دو گھنٹہ بعد عشاء کے فرض ہونا چاہیئے اور اس سے پہلے کھڑے ہونا تعجیل غیر مناسب ہے۔

آج کل کے مجتہدین

بعضے پڑھے جن ہوتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ نیک کام میں جلدی کرنا چاہیئے۔ اجی حضرت نیک کام میں سرعت آئی ہے۔ جس کی نسبت:

یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرَاتِ

آیا ہے۔ سرعت اور شے ہے اور تعجیل اور شے۔ سرعت کہتے ہیں:

التقدم فیما یجوز التقدم فیہ

کو اور تعجیل کے معنی ہیں:

التقدم فیما لا یجوز التقدم فیہ

اس کی نسبت:

اَلْعُجْلَةُ مِنَ الشَّیْطَانِ

آیا ہے۔ آجکل مجتہد بہت پیدا ہوئے ہیں۔ ایسے ہی مجتہدوں نے دین کو خراب کیا ہے۔ اور ایسے ایسے مجتہد ہزاروں ہیں اور ان کے القاب بھی عجیب عجیب ہیں۔ کوئی لیڈر ہے کوئی ریفارمر کہلاتے ہیں۔ ایسوں ہی کی نسبت، جو کہ شرائع میں تحریف کرتے ہیں کسی نے کہا ہے ؎

گربہ میر و سگ وزیر و موش را دیواں کنند
ایں چنیں ارکانِ دولت ملک را ویراں کنند

ناس کر دیا ان خیر خواہوں نے اسلام کا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اپنا ناس کر لیا ہے اسلام کو یہ کیا ضرر پہنچا سکتے ہیں۔ اسلام کی تو وہ کیفیت ہے

یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ۔ الخ

چراغے را کہ ایزد بر فروزد
ہر آنکس تف زند ریشش بسوزد
اگر گیتی سراسر باد گیرد
چراغ مقبلاں ہرگز نہ میرد

لیکن انہوں نے تو اس شمع کو بے نور کرنے کا ارادہ کر لیا ہے، گو وہ شمع روشن ہے۔ اسلام کی تو وہ حالت ہے ؎

ہنوز آں ابر رحمت درفشان ست
خم و خمخانہ با مہر و نشان است

ف: لیکن تعجیل کے یہ معنی حدیث لا یزال امتی بخیر ما عجلوا الافطار ما اخروا السحور کے اندر نہیں بنتے ۱۲ جامع

الجواب:۔ یہاں بالمعنی الاعم استعمال کیا گیا ہے۔ پس یہ مجادلہ ہو گا یا اسہل یہ ہے کہ تعجیل کی دو قسم ہوں۔ محمود اور مذموم ۱۲ اشرف ۵

واللہ اسلام میں ذرہ برابر بھی ان کرتوتوں سے فرق نہیں آیا۔ اور وجہ اصلی اس کی یہ ہے کہ سرکاری وعدہ ہے:

وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ

کہ ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اور ظاہری صورت اس کی یہ ہے کہ خادمان دین ہزاروں کی تعداد میں حق تعالیٰ نے پیدا فرما دیئے ہیں جو منصورین من الحق ہیں اور ایک جماعت کی جماعت اس کام کے لئے پیدا کر دی ہے کہ وہ ہمیشہ دین کے اندر اجزاء مختلفہ کو جدا کرتے رہتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ دین اس قدر ہے اور اتنی بات اس میں بد دینی کی ہے، اس لئے کسی کی کچھ نہیں چلتی۔ ورنہ ان اہل اراء کا اثر تو واقعی بہت زبردست تھا، جس کی نسبت ارشاد ہے:

وَاِنْ کَانَ مَکْرُھُمْ لِتَزُوْلَ مِنْہُ الْجِبَالُ

گویا ان کے مکروں کو دیکھ کر اسلام بزبان حال کہتا ہے ؎

قتل ایں خستہ بہ شمشیر تو تقدیر نہ بود

ورنہ ہیچ از دل بے رحم تو تقصیر نہ بود

لیکن خدا تعالیٰ کی حفاظت ہے اور قیامت تک حسب وعدہ مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام برابر رہے گی۔ باقی ان لوگوں نے اپنے اجتہاد سے پورا کام لے لیا ہے۔ یاد رکھو قرآن مجید کی تفسیر کرنا آسان کام نہیں اسکے لئے چودہ علم میں مہارت کاملہ ہونے کی شرط ہے، جیسا صاحب کشاف نے لکھا ہے، پس آپ کسی آیت کی تفسیر نہیں سمجھ سکتے۔ پس اب وہ شبہ یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرَاتِ سے ہوا تھا دفع ہو گیا۔

امام اور مقتدیوں کی حالت

بعض لوگ تراویح سے جلدی فارغ ہونے کے لئے اس قدر عجلت کرتے ہیں کہ سبحانک اللھم بھی نہیں پڑھتے، اور التحیات کے بعد درود شریف تو شاید کوئی اللہ کا بندہ پڑھتا ہوگا اور التحیات بھی بہت تیز پڑھتے ہیں۔ ان سب امور سے معلوم ہوتا ہے کہ مقصود صرف قرآن خوانی کو سمجھتے ہیں، نماز کو مقصود نہیں جانتے ورنہ اس کے اجزا میں یہ کتر بیونت نہ کرتے، اور قرآن بھی اس قدر تیز پڑھتے ہیں کہ بجز غفورا اور شکورا کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا پڑھا۔ غرض یہ چاہتے ہیں کہ جلدی سے خلاصی ہو۔ جیسے ایک سررشتہ دار ایک ان کے نائب دونوں ایک کچہری میں تھے۔ انگریز ان کو نماز کے وقت اجازت دے دیتا تھا کہ تم نماز پڑھ آؤ۔ تو سررشتہ دار صاحب تو نمازی تھے، وہ تو بہت دیر میں نماز خشوع و خضوع سے پڑھکر آتے تھے، اور نائب صاحب بے نمازی تھے وہ تھوڑی دیر میں واپس آجاتے۔ صاحب نے ایک دن پوچھا کہ تم بہت جلدی آجاتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ تم نماز نہیں پڑھتا۔ کہا حضور سررشتہ دار صاحب نئے نمازی ہیں نماز ان کو آتی نہیں وہ سوچ سوچ کر پڑھتے ہیں اور مجھ کو نماز کی مشق ہے۔ نماز میری گھٹی میں ہے، پرانا نمازی ہوں بالکل خوب یاد ہے، اس لئے جلدی پڑھکر آتا ہوں۔ مولانا محمد یعقوب صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ہماری نماز کی مثال ایسی ہے جیسے گھڑی، کہ اس کو کوکنے کی تو ضرورت ہوتی ہے، مگر ایک مرتبہ جب کوک دی تو پورے چوبیس گھنٹہ کے بعد وہ بند ہوگی، اسی طرح ہماری نماز ہے

کہ شروع کرنے کی دیر ہے، جب شروع کر دی بس پھر تو مشین کی طرح آپ سے آپ تمام ارکان ادا ہو رہے ہیں۔ السلام علیکم ہی پر جاکر خبر ہوتی ہے۔ خصوصاً تراویح کا تو بہت ہی ناس کرتے ہیں، حالانکہ نماز کی ہیئت اور اس کے تمام احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورِ قلب کی بہت ہی رعایت رکھی گئی۔ چنانچہ تراویح میں ہر چار رکعت پڑھنے سے جو تکان ہو گیا ہے اس سے سکون ہو جائے اور نشاط عود کر آوے گا۔ طبیعت تازہ ہو جاوے گی، آئندہ چار رکعت اطمینان سے ادا ہوں گی۔ اب بعض حفاظ تو بالکل بیٹھتے ہی نہیں۔ اور بعض جو بیٹھتے ہیں تو بالا سا چھوا دیتے ہیں، یہاں تک امام صاحب کی زیادتیوں کا بیان تھا، اب مقتدیوں کی سنئے، انہوں نے ایک عجیب ترکیب نکالی ہے، وہ یہ کرتے ہیں کہ لیٹے رہتے ہیں یا بیٹھے سویا کرتے ہیں۔ جب دیکھا کہ امام اب رکوع میں جائیگا تو فوراً نیت باندھ کر کھڑے ہو گئے اور بعضے جو اول سے شامل بھی ہوتے ہیں تو محض سستی کی وجہ سے قیام چھوڑ دیتے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے پڑھتے ہیں اور پڑھتے کیا ہیں، بعضے تو اچھی خاصی طرح سوتے ہیں۔ غرض امام اور مقتدی سب نے ملکر تراویح کی یہ گت بنائی ہے۔ پس یہ ساری خرابی اس کی ہے کہ نماز کو مقصود ہی نہیں سمجھا۔ زیادہ تر ختم قرآن ان کا پیش نظر ہے، اس لئے ضروری ہوا کہ ان دونوں کا فرق بیان کیا جاوے۔

مقصودِ اعظم

سو یاد رکھو کہ ان دونوں عبادتوں میں مقصودِ اعظم نماز ہے، ختم قرآن

تابع ہے اور یہ فرق میں نے اپنی طرف سے نہیں گھڑا، اسلئے کہ ہم تعیین کرنے والے کون ہوتے ہیں، فقہاء نے تراویح سنت موکدہ لکھا ہے۔ اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ہم پلہ ہیں۔ لیکن آگے چل کر ایک جزئیہ لکھا ہے، اس سے میرے قول کی تصدیق ہے، وہ لکھتے ہیں، کہ اگر کسی قوم پر کسل غالب ہو اور گمان غالب ہو کہ اگر یہاں قرآنِ پاک پڑھا جائیگا تو لوگ نہ سنیں گے تو ایسی جگہ پورا قرآنِ شریف نہ پڑھا جاوے اور بیس رکعت تراویح الم ترکیف سے پڑھ لیں۔ یہ نہیں فرمایا کہ رکعتوں میں اختصار کر دیں مثلاً بیس کی جگہ آٹھ ہی پڑھ لیں یا یہ نماز ہی قرآن ختم کر لیں۔ فقہاء نے لوگوں کی حالت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ اگر قرآن ختم کیا جائے گا۔ تو لوگ تراویح ہی چھوڑ دیں گے، چنانچہ اسی بناء پر وہ فرماتے ہیں:

من لم یعرف اہل زمانہ فہو جاہل

غرض اس جزئیہ سے معلوم ہوا کہ مقصود اعظم نماز ہے اور ختم قرآن تابع ہے۔ جب فقہاء کے قول سے تائید ہو گئی، اب ہم کو گنجائش ہے کہ ہم دوسری جگہ سے تائید اس کی بیان کریں۔ وہ یہ ہے کہ نماز اور قرآن کی وضع کے اندر جو غور کیا جاتا ہے اور دیکھا جاتا ہے تو اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ قراءۃ قرآن تابع ہے اور صلوٰۃ متبوع۔ اسلئے قراءۃ صلوٰۃ کا جزو بنایا گیا ہے اس لئے کہ صلوٰۃ نام ہے قیام قراءۃ رکوع سجدہ قومہ جلسہ مجموعہ کا اور قرآن اس کا جزو ہے؛ اور قاعدہ عقلی ہے کہ

والکل اشرف من الجزء

اس لئے کہ جو فضیلت قرآن مجید کی ہے نماز میں وہ بھی حاصل ہو گی اور دوسرے ارکان کی فضیلت اور شامل حال ہو جائے گی۔ باقی اس پر ایک شبہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن جو موقوف علیہ اور تابع نماز کا ہے اسی درجہ میں توقف ہو اور موقوف علیہ صرف تین آیتیں ہر رکعت میں ہیں۔ یہ طویل مقدار موقوف علیہ نہیں ہے۔ پس ختم قرآن کا تابع ہونا کیسے مقصود ہوا اور گفتگو اسی میں تھی۔ پس ممکن ہے کہ تین آیت کی قدر تو قرآن تابع ہو اور اس سے زیادہ تابع نہ ہو، اس کا جواب دیتا ہوں وہ یہ ہے کہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اس قدر قرأۃ فرض اور اس قدر واجب اور اس قدر مستحب ہے، اس کے معنی ہیں کہ اتنی مقدار پر کفایت کرنا فرض و واجب ہے، اور زیادہ پڑھنا مستحب ہے، پس یہ نفس فرض یا مستحب ہو گا۔ باقی قرأۃ جو اس قدر پڑھی جائے گی سب کو یوں ہی کہیں گے کہ یہ سب فرض ہی واقع ہو گا پس اب تمام قرآن جزو صلوٰۃ بنکر تبعیت ثابت ہو گئی۔ غرض اس تقریر سے ثابت ہو گیا کہ مقصود اعظم نماز ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تراویح جس میں قرآن پڑھا جاتا ہے اس کے حقوق مطلق تلاوت قرآن سے زیادہ ہوں گے۔ اس لئے کہ جس قدر حقوق مطلق کے ہوں گے وہ سب بھی اس نماز کے ہوں گے۔ بجز یہ اور نماز کے حقوق علیحدہ ثابت ہوں گے۔ پس اس کا بہت زیادہ اہتمام اور رعایتیں کرنا چاہئے۔

توسط کی رعایت

منجملہ ان حقوق اور رعایات کے کہ جس میں فروگذاشت ہو رہی ہے

تعدیل ارکان ہے اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ ارکان اطمینان کے ساتھ ادا ہوں، دوسرے یہ کہ قرآن اس قدر پڑھا جائے کہ جو مقتدیوں کو گراں نہ ہو، اور اگر مقتدیوں کو گراں ہو تو ان کو منافقین سے مشابہت ہو جاوے گی، جنکی نسبت ارشاد ہے:

اِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى

جس کا سبب یہ امام تھا۔ عبادت مستحبہ وہی بہتر ہے جو نشاط کے ساتھ ہو حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہفتہ میں ایک مرتبہ وعظ فرمایا کرتے تھے، لوگوں نے عرض کیا حضرت ہفتہ میں دوبار فرمایا کیجیے فرمایا کہ:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَخَوَّلُنَا بِالْمَوْعِظَةِ

یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم گاہ گاہ وعظ سے ہماری خبرگیری فرمایا کرتے تھے اور اس لئے ایسا فرماتے تھے کہ لوگوں کو ملال عارض نہ ہو۔ اور جا گئیں نہیں۔ آج کل لوگ دو طرح سے ظلم کرتے ہیں، بعضے تو یہ کرتے ہیں کہ تین تین چار چار پارے پڑھتے ہیں اور بعضے پڑھتے تو ہیں سوا ہی پارہ مگر بہت ہی آہستہ پڑھتے ہیں، رمضان میں ان حفاظ کی عملداری ہوتی ہے۔ جسطرح چاہتے ہیں بیچارے مقتدیوں کو دق کرتے ہیں، توسط کی رعایت ہر حال میں ہونا چاہیے۔ نہ تو اتنی تطویل ہو کہ گرانی ہو اور نہ اس قدر تعجیل ہو کہ حقوق نماز اور قرآن کے فوت ہوں۔

کلامِ الٰہی کا کمال

بہرحال مقصود یہ ہے کہ اس ماہ میں وہ عبادتیں مشروع کی گئی ہیں ان آیتوں میں دونوں کا ذکر ہے۔ اوپر سے اہلِ کتاب کا ذکر ہے اور اس کے اوپر سے امتِ محمدیہ کا ذکر ہے۔ اس کے بعد اس تقریب سے اہلِ کتاب کی نسبت ارشاد ہے۔

وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ

یعنی اگر اہلِ کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لئے بہت بہتر ہوتا۔ آگے ان پر عتاب اور غضب کا مضمون ہے۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ؕ سے يَعْتَدُوْنَ

تک برابر یہی مضمون چلا گیا۔ لیکن بعض اہلِ کتاب ایمان بھی لے آئے تھے، اسلئے لَيْسُوْا سَوَآءً سے ان کا ذکر ہے۔ کیا عجیب کلام ہے۔ واقعی بات یہ ہے کہ ایسا کلام بشر کا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے، کہ ہم کو جب کسی فریق پر غصہ آوے گا اور غصہ کا ہم اظہار کریں گے، کہ تم ہم کو اس طرح ستاتے ہو اور تم لوگوں نے یہ کیا وہ کیا تو انمیں جو مطیعین ہیں وہ بالکل نظر انداز ہو جائیں گے اور ایک ہی جانب کلام کا رخ ہو کر انتہائی طاقت اس میں صرف کر دیں گے۔ بلکہ اگر کوئی شخص ان مطیعین میں سے بھی اس وقت آجاوے اور اگر سلام کرے تو اس پر بھی برسنے لگیں گے، کہ تم کو سلام بھی اسی وقت سوجھا تھا۔ تو اس کی وجہ کیا ہے کہ ہم ممکن اور حادث اور متاثر ہیں۔ ہمارے اندر انفعالات رکھے گئے۔ جب ایک

اثر سے طبیعت منفعل ہوتی ہے اور بعینہٖ اسوقت دوسری طرف ہماری توجہ منصرف نہیں ہو سکتی۔ حق تعالیٰ انفعال اور تاثر سے پاک ہیں۔ ابھی غضب کا اظہار ہو رہا ہے کہ،

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ الخ

اور اسی وقت دوسرا پہلو بھی نظر انداز نہیں ہوا بلکہ ساتھ ساتھ وہ بھی چل رہا ہے یا تو خفگی ہو رہی تھی اور یا اب ان میں سے مومنین کے اوصاف ارشاد ہوتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

لَيْسُوْا سَوَاءً الخ

یعنی یہ اہل کتاب سب برابر نہیں ہیں۔ سب کو ایک لکڑی نہ ہانکنا۔ ان میں سے ایک جماعت ایسی ہے جو حق پر قائم و ثابت ہیں۔ یہ تو عقائد کیطرف اشارہ ہے۔ آگے:

يَتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ

یہ اعمال کیطرف اشارہ ہے یعنی پڑھتے ہیں وہ اللہ کی آیتوں کو ساعات شب میں اور وہ نماز پڑھتے ہیں۔ اس ترجمہ سے معلوم ہوا ہوگا کہ ان آیتوں میں دونوں چیزوں کا ذکر ہے، تلاوت قرآن کا اور نماز کا بھی، لیکن مفصل ذکر نہیں بلکہ اجتماعی طور سے ذکر ہے یعنی نماز میں قرآن پڑھنے کا ذکر ہے۔ اس لئے کہ اس آیت کی دو تفسیریں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ:

وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ

میں واؤ عاطفہ ہو۔ اس وقت تو قرآن پر یہ آیت نص نہ ہوگی۔ گو محتمل تو

اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ واؤ حالیہ ہو اور ذوقاً اسنخ بھی معلوم ہوتا ہے،
اس صورت میں اقتران اس کا مدلول ہو گا۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ
کی آیتیں ساعات لیل میں تلاوت کرتے ہیں، اس حالت میں کہ سجدہ کرتے ہیں
پس اس تفسیر کے موافق اس آیت کا مضمون تراویح کے نہایت مناسب ہو گیا
بہر حال اس آیت سے اس عمل کی بڑی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور نیز دوسری
وجہ فضیلت کی یہ ہے کہ شروع رکوع

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ

میں اس آیت کی خیریت کا ذکر ہے۔ پس آگے ان اعمال کا ذکر ہو گا۔ جنکو خیریت
میں دخل ہو گا۔ اور یہاں خیریت کے معنی یہ نہ سمجھنا کہ بولا کرتے ہیں کہ تمہارے
یہاں خیریت ہے، بلکہ خیریت کے معنے ہیں بہت اچھا ہونا۔ خیر صیغہ افعل التفضیل
کا ہے۔ پس حاصل یہ ہو گا کہ اگر تم یہ اعمال کرو گے تو بہت اچھے ہو جاؤ گے
حق تعالیٰ جن کو بہت اچھا کہے ان سے بڑھکر کون ہو گا۔

خواب کی باتیں

بہت اچھا کے لفظ پر ایک بات یاد آگئی کہ وہ اس احقر پر ایک نعمت ہے۔
میں اس کو تفاخراً نہیں کہتا بلکہ تحدث بالنعمۃ کے طور پر عرض کرتا ہوں۔ وہ
یہ ہے کہ ایک دوست نے خواب میں دیکھا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
کو اور یہ بھی دیکھا کہ حضورؐ اس شخص سے کچھ پوچھ رہے ہیں۔ اثنائے کلام میں اس
دوست نے یہ کہا کہ میں فلاں شخص (حضرت مولانا صاحب) سے بیعت ہوں،

حضورؒ نے سنکر فرمایا کہ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ اپنا بہت اچھا ہونا تو سمجھ میں نہ آیا کہ اپنے ظاہر پر ہے یا مُول ہے، اسلئے کہ اپنے اعمال گندے پیش نظر ہیں۔ شہوت، غضب، ریا۔ بہت سی بلائیں ہیں ان کے ہوتے ہوئے بہت اچھا کس طرح ہو جاؤں گا، ہاں یہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ایمان ہے، اور اہل اللہ سے محبت ہے۔ لیکن میں تو اس بات سے خوش ہوا کہ حضورؐ کے یہاں تذکرہ تو آیا۔ اگرچہ اس خواب کا یہاں موقع بیان کا نہ تھا۔ اس لئے کہ یہاں جن لوگوں کو بہت اچھا کہا گیا وہ بیدار تھے اور یہ خواب ہے۔ کہاں خواب، کہاں بیداری، اور اول تو بیداری ہی میں ہو تو بھی قابل ناز نہیں، پھر خواب کا معاملہ ہی جدا ہے، پھر دوسرے یہ کہ یہ لپنے مطلب کی بات ہے، اس میں احتمال ہے خیال کے مل جانے کا یعنی زیارت حضورؐ میں نہیں بلکہ کلام کے سمجھنے یا یاد رکھنے میں۔ مجھ کو اس پر ایک حکایت یاد آئی وہ یہ ہے کہ حضرت سلطان نظام الدین اولیاء قدس سرہ صاحب سماع تھے یعنی گانا سنتے تھے۔ مگر ایسا گانا نہیں جیسے آج کل لوگ سنتے ہیں، بلکہ شرائط کے ساتھ سنتے تھے۔ ان شرائط کے ساتھ آجکل کوئی بھی نہیں سنتا اور نہ ان کا ہر وقت کا شغل تھا۔ پھر خود سننے والے صاحب نسبت تھے۔ باوجود اس احتیاط کے بھی جو اس وقت علماء تھے وہ منع کرتے تھے۔ چنانچہ قاضی ضیاء الدین صاحب سنامی نے روکا اور فرمایا کہ بدعت ہے اور سنت کے خلاف ہے۔ حضرت سلطان جی خود بھی عالم تھے درسیات پڑھی تھی چنانچہ ایک بار مقامات حریری حضرت نے حفظ یاد کی تھی اور پھر اس کے کفارہ کے لئے مشارق الانوار حفظ فرمائی تھی، لیکن قاضی صاحب

سے مناظرہ نہیں کیا اور سکوت فرمایا۔ اور جب سلطان جی سنتے تھے اسی وقت قاضی رد کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سلطان جی نے فرمایا کہ اچھا اگر میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوا دوں اس وقت تو مانو گے۔ جی تو یہی تھا کہ دلائل سے میں حق پر ہوں نہ مانوں گا۔ لیکن یہ سمجھ کر کہ حضورؐ کی زیارت تو ہو گی، کہا کہ اچھا۔ سلطان جی متوجہ ہوئے اور قاضی صاحب پر ایک غنودگی سی طاری ہوئی۔ دیکھتے ہیں کہ حضورؐ تشریف لائے ہیں اور فرماتے ہیں کہ فقیر کو کیوں تنگ کرتے ہو۔ قاضی صاحب ہاں بھی نہ چوکے۔ عرض کیا۔ یا رسول اللہ آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر ہے۔ لیکن وہ جو آپ کے بیداری کے احکام ہیں مجھے ان پر اس حالت کے حکم سے زیادہ وثوق ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت میری کیا حالت ہے۔ جب اس حالت سے افاقہ ہوا تو سلطان جی نے فرمایا کہ دیکھا ہم نے کہلا بھی دیا۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ ہم نے جواب بھی دے دیا، قاضی صاحب نے حقیقت میں بہت عجیب بات کہی، محویت کہ جو نیند سے کم ہے اس کے احکام کا محققین نے اعتبار نہیں کیا۔ ایسے ہی کشف کا بھی، اگر خلاف شریعت ہو اس کا بھی اعتبار نہیں اور خواب کا تو بدرجہ اولیٰ اعتبار نہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ مصر میں ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ حضورؐ فرما رہے ہیں: اشرب الخمر۔ اسوقت سب علماء نے کہا کہ اس شخص کے سننے میں غلطی ہوئی۔ حضورؐ نے یقیناً: لا تشرب الخمر فرمایا ہے۔ تو صاحبو خواب کوئی قابل فخر نہیں ہے۔ ہاں اس بات کی خوشی ہے کہ حضورؐ نے ذکر تو فرمایا، یہ بھی بہت بڑی نعمت ہے۔

صالح کے معنی

بہرحال حق تعالیٰ کا امت محمدیہ کو بہت اچھا فرمانا بہت بڑی فضیلت ہے یہ تو سیاق آیت سے فضیلت فرمائی اور آخر میں فرماتے ہیں:

اولئک من الصالحین

یہ سیاق سے فضیلت ثابت ہوئی یعنی یہ لوگ صالحین میں سے ہیں۔ صالح عربیت میں ایسے موقع میں بولتے ہیں جہاں ہماری زبان میں لفظ لائق بولا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ جسکو لائق فرمادیں اس کی فضیلت کا کیا ٹھکانا۔ پس حاصل مقام کا یہ ہوا کہ جو ان کاموں یعنی نماز میں قرآن پڑھتے ہیں وہ بہت اچھے اور لائق ہیں۔ اللہ اکبر جن کو خدا تعالیٰ بہت اچھے اور لائق فرمادیں، ان کو کیا کیا نہ ملے گا اور جو ان کو ملے گا اس کو بھی حضورؐ نے ایک حدیث قدسی میں ارشاد فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِينَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ۔

یعنی میں نے بندوں صالحین کے لئے وہ شئے طیار کی ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی، نہ کسی کان نے سنی اور نہ کسی کے دل پر ان کا گذر ہوا۔ آپ بہت سے بہت وہ نعمتیں چاہیں گے جو کچھ آپ کے دل میں آویں گی اور جن اشیاء کا وعدہ ہے وہ اس سے بھی بڑھکر ہیں کہ تمہارے ذہن میں آتی ہیں۔ اس سے زیادہ آپ کیا چاہیں گے اور ثمرات تو ان لوگوں کے لئے ہیں جو طالب ثمرات ہیں۔ ورنہ

جو محبین ہیں ان کے لئے تو محبوب کا اتنا فرما دینا کہ بہت اچھے آدمی ہیں تمام ثمرات سے بڑھکر ہے۔ اہل قلب سے اس :

كُنتُم خَيرَ اُمَّةٍ

فرمانے کی قدر پوچھو کہ وہ اس سے کیا مزہ لیتے ہیں۔ ایک صاحب حال کہتے ہیں۔ اگر یکبار گوید بندۂ من از عرش بگذرد خندہ من خوب کہاہے کسی نے ؂

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مرا
بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس ست

اور وہ تو یوں کہتے ہیں ؂

نسبت خود بسگت کردم وبس منفعلم
زانکہ نسبت بسگ کوئے توشد بے ادبی

جو اپنے کو اس لائق بھی نہ سمجھتے ہوں کہ اس کے کوچہ کے کتے کی طرف اپنے کو منسوب کر لیا تو کیا ٹھکانا رہیگا ان کی مسرت کا، لیکن ہم لوگ جو اس کی قدر نہیں کرتے تو بات کیا ہے کہ ہم کو دین مفت مل گیا۔ مولانا فرماتے ہیں ؂

اے گراں جاں خوار دیدستی مرا
زانکہ بس ارزاں خریدستی مرا
ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد
گوہرے طفلے بقرص ناں دہد

بچہ کیا جانے موتی کیا ہوتا ہے، ایک بسکٹ دیکر موتی لے سکتے ہیں، پس ایسے ہی دین ہم لوگوں کو مفت مل گیا ہے۔ مفت کی چیز کی کون قدر کرتا ہے۔ نہ شکر ہے نہ نیاز ہے نہ عاجزی ہے۔ اللہ اکبر! کس قدر سنگدلی اور ناقدردانی ہے۔ غرض وہ اعمال جن پر بشارتیں ہیں، ان میں سے دو عمل یہ ہیں۔

یَتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰہِ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَھُمْ یَسْجُدُوْنَ

یہ عمل مدار خیریت صلاحیت ہیں۔ لیکن یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اچھے اسی وقت ہوں گے جبکہ کام کو اچھی طرح ڈھنگ سے کروگے۔ اور اگر بری طرح کیا تو اچھا ہونا تو علیحدہ رہا خوف مواخذہ کا ہے

الفاظ پرستی

اسکی ایسی مثال ہے جیسے چند مزدور کام کرنے والے ہیں۔ مثلاً سٹرک کوٹنے والے ہیں۔ ان سے کہا کہ تم سٹرک کو کوٹو تم کو انعام ملے گا۔ بعض نے تو ان میں سے ایسی خراب کوٹی کہ جگہ جگہ گڑھے اور ٹیلے رہ گئے، برابر نہیں ہوئی۔ اب اس صورت میں نام تو کوٹنے کا ہوا مگر کام تو نہ ہوا اور نام سے کچھ کام نہیں چلتا۔ مولانا علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

میم واؤ میم نون تشریف نیست
لفظ مومن جزپئے تعریف نیست

یعنی لفظ مومن کوئی خلعت نہیں یہ تو محض پتہ کے واسطے ہے اور

وصف عنوانی ہے۔ ان لفظوں میں کچھ نہیں ہے جب تک کہ اس کا مدلول
تم کو حاصل نہ ہو۔ دیکھو لڈو پیڑے کا اگر کوئی وظیفہ پڑھا کرے تو اس کے
منہ میں کچھ نہ آئیگا۔ ایک احمق کی حکایت یاد آئی۔ ایک شخص نے مرنے کے
وقت بیٹے کو چند وصیتیں کیں کہ بیٹا میں تو مرتا ہوں میرے بعد لوگ تعزیت
کے لئے آئیں گے۔ جو کوئی آوے اس کی خوب مدارات کرنا، اونچی جگہ اسکو
بٹھلانا، بھاری پوشاک پہن کر اس سے ملنا، نرم اور شیریں گفتگو کرنا اور قیمتی
کھانا کھلانا۔ یہ چار وصیتیں کیں۔ ابا جان تو یہ کہہ کر مر گئے۔ بیٹے ضرورت سے
زیادہ عقلمند تھے۔ چنانچہ ایک شخص کی کمبختی آئی وہ ان کے یہاں آنکلا۔
نوکروں کو فوراً حکم دیا کہ اسے مچان پر بٹھادو۔ چنانچہ نوکروں نے اس کو لفوائے
پا بدست دگرے دست بدست دگرے چاروں طرف سے پکڑا وہ بیچارے
ہر چند ہائیں ہائیں کرتے رہے مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور فوراً ان کو ایک بلند
مچان پر بٹھلا دیا اور زینہ وہاں سے علیحدہ کر لیا۔ اب وہ بیچارہ بندر سا
وہاں چڑھا بیٹھا ہے اور حیران ہے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ اس کے بعد میاں صاحب
ملنے کے لئے تشریف لائے تو اس ہیئت سے کہ ایک بہت بڑی جاجم تو
باندھے اور ایک اوڑھے ہوئے، وہ مہمان بیچارے حیران ہوئے کہ یہ کیا
عجائب المخلوق جانور ہے۔ خیر آئے مہمان صاحب نے کلمات تعزیت فرمائے
کہ آپ کے والد ماجد صاحب کی وفات کی خبر سن کر بہت رنج ہوا تو آپ
فرماتے ہیں "گڑ"۔ اس کے بعد انہوں نے کچھ اور فرمایا تو فرماتے کہ "ردی گڑ"
غرض ایک بات کے جواب میں وہ گڑ فرماتے اور دوسری بات کے جواب میں

ہوئی۔ خیر اس پر بھی صبر کیا۔ اس کے بعد حکم دیا کہ ان کو اتار لو۔ چنانچہ اتار لئے گئے۔ کھانا آیا۔ بوٹی گوشت کی ذرا سخت تھی۔ مہمان بولے کہ گوشت گلا نہیں، کہنے لگے کہ واہ صاحب میں نے تو آپ کے لئے اپنا پچاس روپے کا گدھا ذبح کر ڈالا، آپ نے اس کی یہ قدر کی۔ مہمان نے فوراً ہاتھ کھانے سے کھینچ لیا اور کہا کہ خدا تعالیٰ تیرے یہاں کسی کو نہ لادے۔ خیر یہ تو فرمائیے کہ یہ معاملہ کیا ہے کہا کہ میرے والد ماجد صاحب نے چند وصیتیں کی تھیں، میں نے ان پر عمل کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ مہمان کو اونچی جگہ بٹھانا، تو میرے یہاں اس مچان سے زیادہ اونچی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اور یہ فرمایا تھا کہ بھاری کپڑا پہن کر ملنا تو میں نے اس جاجم سے زیادہ بھاری کپڑا کوئی نہ دیکھا اور یہ کہا تھا کہ نرم اور شیریں بات بولنا تو جناب گڑ سے زیادہ میٹھی اور روئی سے زیادہ نرم کوئی شئے نہیں۔ اور یہ وصیت فرمائی تھی کہ قیمتی کھانا کھلانا تو گدھے سے زیادہ قیمتی جانور میرے یہاں کوئی نہ تھا۔ اس مہمان نے کہا کہ خدا تم کو مجھے اور کسی بھلے مانس کو تمہارے یہاں نہ لائے، تو حضرت یہ اس بیوقوف کا مشرب تھا کہ گڑ اور روئی کے نام ہی کو بجائے ان کے مسمی کے سمجھا تھا۔ اگر آپ بھی صرف نام ہی پر کفایت کرتے ہیں تو اس شخص پر نہ ہنسئے ہمارے اندر اس زمانہ میں الفاظ پرستی بہت آگئی ہے، یہی وجہ ہے، کہ حقائق تک نہیں پہنچتے۔ ایک حکایت مجھے اس پر یاد آئی۔ اندھوں کے مجمع میں ہاتھی آگیا تھا، سب نے اس کو ٹٹولا کہ دیکھیں ہاتھی کیسا ہوتا ہے۔ کسی کا ہاتھ تو سونڈ پر پڑا، اسنے تو یہ کہا کہ ہاتھی مثل موسل کے ہوتا ہے۔ کسی کا ہاتھ کان پر پڑا

اس نے کہا کہ ہاتھی مثل چھاج کے ہوتا ہے، کسی کا دُم پر پڑا، اس نے کہا، ہاتھی مثل جھاڑو کے ہوتا ہے۔ خوب آپس میں اختلاف ہوا اور حقیقت کی ایک کو بھی خبر نہ ہوئی، اگر حقیقت تک پہنچ جاتے تو سکون ہو جاتا کوئی اختلاف نہ رہتا۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

اختلاف خلق از نام اوفتاد
چوں بمعنے رفت آرام اوفتاد

اختلاف جبھی ہوتا ہے جبتک کہ الفاظ میں مبتلا ہیں اور جب حقیقت تک پہنچ گئے تو سب اختلاف اٹھ جاتا ہے۔ مولانا نے اسی مضمون کی ایک حکایت مثنوی شریف میں لکھی ہے کہ چار آدمی جمع ہوئے، فارسی، عربی، رومی، ہندی یا ترکی۔ کسی نے ان کو ایک درہم دیا، ان کا جی چاہا کہ انگور خریدیں۔ رومی نے کہا ہم تو استافیل (ترکی میں معنی انگور ہے) خریدیں گے۔ عربی نے کہا کہ ہم عنب (انگور) لیں گے۔ فارسی نے کہا کہ ہم انگور لیں گے۔ چوتھے نے کچھ اور کہا (شاید اوزم کہا ہے) آپس میں خوب لڑائی ہوئی۔ اگر معنے تک رسائی ہوتی تو کچھ بھی اختلاف نہ تھا۔ لفظوں میں پھنسنے سے حقیقت مستور ہو جاتی ہے۔ حافظ شیرازی فرماتے ہیں ؎

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ
چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

یہی وجہ ہے کہ اہل اللہ کسی کے ساتھ نہیں جھگڑتے۔ اس لئے کہ وہ ایسے مشغول ہیں کہ ان جھگڑوں کی مہلت ہی نہیں ملتی ؎

چہ خوش گفت بہلول خندہ خو
چو بگذشت بر عارفِ جنگجو
گر ایں مدعی دوست بشناختی
بہ پیکار دشمن نہ پرداختی

دیکھو بہت موٹی بات ہے اگر ہمارا کوئی محبوب ہو اور مدتوں سے وہ نہ ملا اور دفعتہً کہیں مل جائے تو تم کو اس وقت لڑنے کی فرصت بالکل نہ ملے گی، بلکہ اسوقت اگر اس کو کوئی بُرا بھلا بھی کہیگا۔ حتیٰ کہ اگر مالی ضرر بھی پہنچائیگا تو یہ بالکل نہ بولے گا۔ اس لئے کہ وہ خیال کرے گا کہ جتنی دیر میں اس سے لڑوں گا میرا حرج ہوگا۔ خدا جانے پھر محبوب ملے نہ ملے وہ اپنے دوست کے دیکھنے میں محو رہیگا۔ جبکہ محبوب مجازی تمام جھگڑوں اور لڑائیوں کو قطع کر دیتا ہے تو جس شخص کو محبوب حقیقی کا وصل دائم اور مشاہدہ ہر وقت رہتا ہے اس کو کسی سے لڑنے کی کہاں فرصت اور اگر لڑنے جھگڑنے میں وہ لگا ہوا ہے تو وہ عارف نہیں ہے، مدعی ہے ؎

ایں مدعیاں در طلبش بے خبر انند
آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

بلکہ اگر کوئی اس محبوب کے سوا دوسرے کی بات بھی کرنا چاہے گا تو وہ اس کے جواب میں کہیگا۔

ع ما ئیم تحیر و خموشی

بس اسمی شناس اور حق شناس کی تو یہ شان ہوتی ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں

کرتم پر لفظ:

یَتْلُوْنَ اٰیَاتِ اللّٰہِ اور وَھُمْ یَسْجُدُوْنَ

صادق بھی آگئے تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ حقیقت تلاوت و سجدہ کی حاصل ہونے کی کوشش کرو اور اس کا طریق یہی ہے کہ حقوق ان دونوں عبادتوں کے ادا کرو۔

تراویح کی فضیلت

قبل اس کے کہ میں ان کے حقوق بیان کروں ایک بات اور بتلاتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اس مقام پر ایک سوال اور اشکال متوجہ ہوتا ہے وہ یہ ہے، کہ جن اعمال کی فضیلت بیان کی گئی ہے آیا یہ اعمال فرض ہیں یا نہیں۔ اگر فرض نہیں ہیں تو فرض کا ذکر بہ نسبت نفل کے اہم ہے اور ذوق لسانی اور قرائن سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مراد نفل ہے، اس لئے کہ اسلوب کلام اور الفاظ سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ مقصود کثرت تلاوت و نفل ہے تو کثرت تلاوت اور نفل دونوں فرض نہیں ہیں۔ اور اگر کہا جاوے کہ مراد صلوٰۃ تہجد ہے، تو صلوٰۃ تہجد بھی فرض نہیں ہے۔ غرض بہر صورت نفل ہے، پھر فرائض کو چھوڑ کر نفل کی فضیلت کیوں بیان فرمائی۔ اور اگر کہو کہ مراد فرض ہے تو میں عرض کر چکا ہوں کہ ذوق لسانی اور قرائن اس سے آبی ہیں۔ اس اشکال کا جواب میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ مراد تو نفل ہی ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ فرائض کی اہمیت ان کے ذکر کو مقتضی ہے یہ صحیح ہے، لیکن ذکر کے انواع مختلف ہیں،

صریح اور لازمی۔ فرائض کی اہمیت اس نفل کی فضیلت بیان کرنے سے اور
زیادہ بڑھ گئی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب وہ لوگ نفلوں میں کوتاہی نہیں کیا
کرتے تو فرائض میں تو بطریق اولیٰ کوتاہی نہ کریں گے۔ پس فرائض کا ذکر گو
عبارۃ النص سے نہیں ہے لیکن دلالۃ النص سے فرائض کی اہمیت زیادہ محفوظ
ہو گئی ہے۔ اور اس زمانہ کے لوگ ایسے نہ تھے جیسے آج کل بعض ہیں کہ نوافل
کا تو اہتمام کریں اور فرائض کی پرواہ نہ کریں۔ ایک شخص کہتے تھے کہ میں اپنے پیر
کا اس قدر اتباع کرتا ہوں کہ فرض نماز چاہے قضا ہو جائے مگر پیر کا بتلایا ہوا
وظیفہ ناغہ نہیں ہوتا۔ اگر ایسے ہی لوگ اس وقت بھی ہوتے تو واقعی فرض کی اہمیت
پر اس آیت کی دلالت ظاہرہ نہ ہوتی۔ حاصل یہ ہے کہ اس آیت میں مراد نفل
ہے۔ پس اس تفسیر کے موافق اس آیت میں قیام لیل یعنی تہجد کا ذکر ہوا اور
تراویح کا لقب ہے قیام رمضان۔ قیام لیل تو بعینہ محفوظ رہا۔ صرف اس میں
ایک مضاف الیہ اور بڑھ گیا یعنی قیام لیلۃ رمضان۔ پس جبکہ اس آیت کا مدلول
قیام لیل ہے تو قیام لیل رمضان بھی اس میں ضرور داخل ہو گا۔ پس اب میں دعویٰ کر سکتا
ہوں کہ اس آیت سے تراویح کی بھی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور وہ بھی اعلیٰ خیریت
کا ہے۔ پس ان کو ایسا پڑھیے کہ آپ کی خیریت و صلاحیت محفوظ رہے اور جو اس
میں منکرات ہیں ان سے بچیے۔

روزے کی فضیلت

اب مختصری فہرست حقوق کی بیان کرتا ہوں۔ قرآن مجید کا ایک حق یہ ہے،

کہ جی لگا کر اس کو پڑھا جاوے کہ اس پر

خَرُّوا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا

کا اثر مرتب ہو جاوے۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بکا، اور خشوع تلاوت قرآن کے وقت ہونا چاہیے یہاں پر طالب علموں کو ایک شبہ ہوگا وہ یہ کہ رونا تو اختیاری نہیں ہے، اور سالکین کو یہ شبہ ہوگا کہ جب یہ صفت ایمان والوں کی ہے اور ہم کو رونا آتا نہیں تو ہمارے اندر ایمان نہیں ہے۔ ایک دوست نے بھی مجھ کو لکھا تھا، کہ جب سے میں حج کر کے آیا ہوں رونا نہیں آتا اور پہلے رونا آیا کرتا تھا۔ میں نے ان کو جواب لکھا اور اسی سے اس شبہ مذکورہ کا بھی جواب ہو جاوے گا اور وہ جواب یہ لکھا کہ رونے سے مراد آنکھوں کا رونا نہیں اس لئے کہ وہ غیر اختیاری ہے۔ اور غیر اختیاری کی اللہ تعالیٰ تکلیف نہیں دیتے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا

بلکہ مراد دل کا رونا ہے۔ پس تم کو گو آنکھوں سے رونا نہیں آتا لیکن دل کا رونا تم کو حاصل ہے باقی اختیار سے رونے کی عورتیں مشاق ہیں۔ کسی کے یہاں تعزیت کے لئے جائیں گی اور اپنے کسی مردہ کو یاد کر کے بس رونا شروع کر دیں گی۔ اور ان کا کوئی تازہ مرا ہوا نہ ہوگا تو یہ حکمت کریں گی کہ کپڑے سے منہ چھپا لیں گی، اور جھوٹ موٹ ہوں ہوں کرنے لگیں گی، لیکن مردوں کا رونا اختیاری نہیں ہے اسی واسطے حدیث شریف میں آیا ہے کہ رونا نہ آوے تو رونے کی شکل بنا لو۔

یہاں بھی دل کا ہی رونا مقصود ہے اس لئے ظاہر کا اثر باطن پر پڑتا ہے۔ جب رونے کی کوئی شکل بنائیگا تو دل میں بھی رونا آہی جائے گا۔ پس حق تعالیٰ کے عذاب اور وعید کو دل میں حاضر کرو اور رونے کی شکل بناؤ تاکہ سختی دلی کم ہو۔

مولانا علیہ الرحمۃ اسی رونے کی فضیلت میں فرماتے ہیں :

اے خوشا چشمے کہ آں گریانِ اوست
اے خوشا آں دل کہ آں بریانِ اوست
در تضرع باش تا شاداں شوی !
گریہ کن تا بے دہاں خنداں شوی
در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست
مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

اور اگر رونا نہ آوے تو اس پر رونا چاہئے کہ رونا نہیں آتا۔ ایک بزرگ بہت رویا کرتے تھے۔ کسی نے کہا حضرت اتنا نہ روئیے، آنکھیں جاتی رہیں گی۔ انہوں نے کیا خوب فرمایا ؎

زاہدے را گفت یارے در عمل
کم گری تا چشم را ناید خلل
گفت زاہد از دو بیروں نیست حال
چشم بیند یا نہ بیند آں جمال
گر بہ بیند نورِ حق را چہ غم ست
در وصالِ حق دو دیدہ کے کم ست

ورنہ بیند نورِ حق را گو برو
ایں چنیں چشم شقی گو کور شو

دیکھئے ان بزرگ کو دونوں احتمالوں پر خواہ وصل ہو یا نہ ہو رونا ہی سوجھا۔ اگر کوئی کہے کہ وصل میں رونا کیسا۔ اس کا جواب عارف شیرازی نے دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

بلبلے برگ گلے خوش رنگ در منقار داشت
واندراں برگ و نوا خوش نالہائے زار داشت
گفتمش در عین وصل ایں نالہ و فریاد چیست
گفت مارا جلوۂ معشوق درایں کار داشت

تجلی محبوب کا مقتضی ہی یہ ہے کہ سوختہ و گداختہ رہے۔ حق تعالیٰ کے یہاں اس رونے کی بہت بڑی قدر ہے جو قطرہ آنکھ سے نکلا دوزخ کی آگ اور وہ قطرہ جمع نہ ہوگا اور نارِ جہنم کو بجھانے کے لئے کافی ہو جائے گا اور دوزخ کہے گی:

جُزْ یَا مُؤْمِنُ فَاِنَّ نُوْرَکَ اَطْفَاءَ نَارِیْ

یعنی اے مومن جلدی چل اسلئے کہ تیرے نور نے میری آگ کو بجھا دیا۔ اور یہ آنسو عام ہے خواہ آنکھ سے ہو یا دل سے ہو۔ چنانچہ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مجلس وعظ میں کچھ لوگ اپنے کپڑے پھاڑنے لگے۔ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ ان سے کہدو کہ دل کے ٹکڑے ٹکڑے کرو کپڑوں کے پھاڑنے سے کیا ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ کی نظر تو قلوب پر ہے بلکہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ جب زیادہ اثر ہوتا ہے تو وہ سب گھٹ کر قلب

ہی پر جمع ہو جاتا ہے اور آنکھ سے ایک قطرہ بھی نہیں نکلتا۔ پس جبکہ دل پر اثر ہو تو آنسو نہ نکلنا مضر نہیں۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک صوفی پر حالت طاری ہوئی۔ حضرت جنیدؒ سے لوگوں نے کہا کہ آپ پر کبھی اثر نہیں ہوتا۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا:

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ

یعنی دیکھے گا تو اے مخاطب پہاڑوں کو کہ گمان کرے گا ان کو ٹھیرے ہوئے حالانکہ وہ ابر کی طرح چلتے ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ غایت اثر سے ہمارا یہ حال ہے کہ ہم کو تم ٹھیرا ہوا جانتے ہو حالانکہ ہم بید اثر لئے ہوئے ہیں۔ ہمارے مشائخ میں سے حضرت شیخ عبد الحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بفریاد آمد۔ اینجا مردانند کہ دریاہا فرو برند و آروغ نہ زنند۔"

بات یہ ہے کہ بزرگوں کی شانیں مختلف ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک اور بزرگ رونے کے بارہ میں فرماتے ہیں ؎

یارب چہ چشمہ ایست محبت کہ من ازاں
یک قطرہ آب خوردم و دریا گریستم

ایسی اختلاف اور رنگارنگی شان و حال کی نسبت یہ شعر ہے ؎

بگوشِ گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است
بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالان است

غرض قرآن شریف پڑھنے کے وقت حق تعالیٰ کے خوف یا شوق سے

آنکھ سے یا دل سے رونا بڑی نعمت اور علامت اہلِ ایمان کی ہے۔

قرآن کے حقوق

لیکن یہ جب ہی حاصل ہوتا ہے کہ قرآن کو بتدبر پڑھا جاوے۔ اور اگر ڈاک گاڑی بلکہ اسپیشل کی طرح پڑھا تو راستہ کے باغ و بہار کی وہ کیا سیر کرے گا۔ ایک حق تو قرآن کا یہ تھا دوسرا حق وہ ہے جس کی نسبت ارشاد ہے

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا

یعنی قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو۔ دیکھو۔ آپ اگر کسی حاکم سے ہمکلام ہوں یا وہ حاکم تم سے باتیں کرے تو اول الفاظ دل میں سوچ لوگے پھر بہت ادب سے ان کو باآہستگی زبان سے ادا کروگے، بخلاف اس کے کہ تم اپنے دوستوں سے یا نوکروں سے ہمکلام ہو، اُنکے ساتھ بے تکلف جلدی جلدی بولتے ہو، تو قرآن پڑھنا درحقیقت حق تعالیٰ سے باتیں کرنا ہے اور یا یوں کہو کہ حق تعالیٰ تمہاری زبان سے باتیں کرتے ہیں۔ غرض جو کچھ بھی ہو دونوں امر ایسے ہیں کہ مقتضی ہیں غایت ادب کو۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف
گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

اگر تم باتیں کرتے ہو تو ظاہر ہے کہ ادنیٰ حاکم کے ساتھ جب وقار سے بولتے ہو تو احکم الحاکمین اور حاکم حقیقی سے تو نہایت ادب اور وقار سے باتیں کرنا چاہیئے اور شاید یہ بات تمہاری سمجھ میں اچھی طرح نہ آئی ہو۔ اسلئے

میں اس کی بقدر ضرورت شرح کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ آدمی کے تمام افعال کے خالق اللہ تعالیٰ ہیں۔ پس کلام اور چلنا پھرنا جو کچھ کہ یہ کرتا ہے خالق ان افعال کے اللہ تعالیٰ ہیں اور کاسب بندہ ہے۔ اتنا تو ظاہر ہے مگر اس میں حسب غلبت غلبۂ فنا سے عبد کی طرف نسبت مستحضر نہ رہے اس وقت استحضار نسبت مع اللہ سے گویا وہ فعل حکماً حق تعالیٰ کا ہوگا۔ پس جس وقت یہ قرآن پڑھے گا تو گویا اللہ تعالیٰ کلام فرما رہے ہیں اور اس کا ظہور اس کی زبان سے ہو رہا ہے۔ جیسے شجرہ موسےٰ سے کلام اللہ کا ظہور ہوا تھا۔ پس اس کی زبان بمنزلہ ایک باجہ کے ہوئی۔ پس باجہ بجانے والے کے ذمہ ہے کہ وہ گت ایسی لگا دے کہ وہ بج مچ گا تو بولا ہے اس کی آواز کے ساتھ ملا دے۔ پس قرآن شریف ایسا پڑھو کہ تجہ گویا حق تعالیٰ کے تکلم کے موافق ہو اور اس کے لئے ان کی خوشنودی کا سبب ہو۔ میں نے کئی دوستوں کو یہ تصور بتلایا اور یہ الہامی ہے کہ جب کلام اللہ پڑھے تو یوں سمجھے کہ حق تعالیٰ پڑھ رہے ہیں اور میرے بدن سے مثل باجہ کے آواز نکل رہی ہے۔ اپنی آواز کی طرف توجہ اس حیثیت سے کرے کہ یہ مظہر ہے کلام قدیم حق تعالیٰ کا اور جسقدر ہو سکے اس تصور کو بڑھائے۔ پھر دیکھئے قرآن شریف میں کیا لطف آتا ہے۔ چنانچہ جس جس نے اس پر یہ عمل کیا بہت کامیابی ہوئی۔ حاصل یہ ہے کہ ترتیل سے قرآن پڑھو۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ قرآن کو صحیح کر سکتے ہیں۔ لیکن نہیں کرتے۔ بریلی میں ایک طالب علم تھے وہ من الجنۃ والناس کو من الجنات والنس پڑھا کرتے تھے۔ غضب کی بات ہے کہ زواہد ثلثہ اور صدرا شمس بازغہ کا تو ایک حرف بھی نہ چھوٹے اور قرآن کی ایک سطر بھی درست

کر کے نہ پڑھیں اور عذر یہ کرتے ہیں کہ ہم کو اب کیا آوے گا۔ بڈھے طوطے بھی کہیں پڑھتے ہیں۔ صاحبو! تمہاری رائے کا اعتبار نہیں۔ قرآن کا سیکھنا فرض ہے۔ اس کا آجانا فرض نہیں۔ تم کوشش تو کرو۔ جب واقف کار قاری یہ کہہ دیں کہ تم کو نہ آوے گا تو تم فرض ادا کر چکے ہو، اس کے بعد چھوڑ دیجیو۔

چونکہ بر میخت بہ بند و بستہ باش

چوں کشاید چابک و بر جستہ باش

یعنی جب تم کو کسی کھونٹے سے وہ باندھیں ــــــ تو بندھے رہو اور جب کھولیں تو چالاک رہو اور کود و، لیکن سیکھنے سے پہلے تو ہر ایک کو چاہیئے کہ وہ سیکھے اور کوشش کرے۔ جب ایک دو ہفتہ کے بعد استاد فتوےٰ دیدے کہ تم کو نہ آوے گا پھر نہ سیکھنا۔ اس وقت نہ سیکھنے سے تم کو گناہ نہ ہو گا۔ اور صاحبو! میں تو یہ کہتا ہوں کہ یہ سب حیلے اور عذر ہیں کہ ہم کو نہ آوے گا۔ واللہ! اگر ابھی گورنمنٹ کی طرف سے حکم ہو جائے کہ سب سیکھو ورنہ سزا ہو گی یا یہ حکم ہو جائے کہ فی حرف صحیح ہونے پر پانچ روپے ملیں گے تو ابھی سب سیکھ لیں اور تمام عذر جاتے رہیں۔ محنت عجیب شے ہے جانوروں پر محنت کرتے ہیں اور سدھ جاتے ہیں، تم تو آدمی ہو تم کو نہ آنے کے کیا معنے۔

طبیب کا فقدان

اگر بالفرض اگر بعد محنت اور کوشش کے تم کو نہ آوے اور ناکامی ہو،

تو یہ ناکامی کامیابی سے بڑھکر ہے، اسلئے کہ یہ ناکامیابی حق تعالیٰ کی طرف سے ہو گی ہے

گر مرادت را مذاق شکر ہست
بے مرادی نے مراد دلبر است

سیکھنے سے پہلے کی غلطی یہ تو تمہاری غلطی ہے اور اگر سیکھ کر اور کوشش کر کے ناامید ہو جاؤ گے تو غلطی اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہو گی۔ ایسی غلطی پر ہزاروں صحت قربان ہیں، جیسے کوئی بزرگ فرماتے ہیں ؎

بر اشہد تو خندہ زند اسہد بلالؓ

بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ ان کی غلطیاں ہی پسند ہیں۔ بشرطیکہ انکے اختیار کو اس میں دخل نہ ہو۔ پس ایسے غلط خواں بہت سے صحیح خوانوں سے بھی بڑھکر ہوں گے۔ مثنوی شریف میں حکایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا ایک چرواہے پر گذر ہوا کہ وہ کہتا تھا ؎

تو کجائی تا شوم من چاکرت
چارقت دوزم کنم شانہ سرت

یعنی تو کہاں ہے تاکہ میں تیرا چاکر ہوں۔ تیری جوتیاں سیؤں تیرے سر میں کنگھی کروں ؎

جامہ ات دوزم سپشہائے کشم
شیر پیشت آورم اے محتشم

یعنی تیرا کپڑا سیؤں۔ تیری جوئیں نکالوں۔ تیرے لئے بکریوں کا دودھ لاؤں

ور ترا بیماری آید ز پیش
من ترا غمخوار باشم ہمچو خویش

اور اگر تجھ کو کوئی بیماری پیش آوے تو میں تیرا غمخوار ہوں گا اپنے کیطرح

دستکت بوسم بمالم پائکت
وقت خواب آید بروبم جائکت

تیری دست بوسی کروں گا۔ تیرے پاؤں سہلاؤں گا۔ سونے کا وقت آویگا تو تیری جگہ صاف کروں گا۔

گر بہ بینم خانہ ات را من دوام
روغن و شیرت بیارم صبح و شام

اگر میں تیرا گھر دیکھ لوں تو تیرے واسطے دودھ گھی صبح و شام ہمیشہ لاؤنگا۔

زیں نمط بیہودہ میگفت آں شباں
گفت موسیٰ باکیستت اے فلاں

اس طرز سے وہ چرواہا بیہودہ بکتا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ باتیں تو کس سے کر رہا ہے

گفت با آنکس کہ ما را آفرید
ایں زمین و چرخ ازاو آمد پدید

کہا میں اس سے کہہ رہا ہوں کہ جس نے ہم کو پیدا کیا ہے۔ یہ زمین اور فلک اس سے ظاہر ہوئے ہیں

گفت موسیٰ ہائے خیرہ سر شدی
خود مسلماں ناشدہ کافر شدی

موسے علیہ السلام نے فرمایا کہ ہائے تو تو تباہ ہو گیا مسلمان نہیں رہا کافر ہو گیا۔ اس کے بعد موسےٰ علیہ السلام نے اس کو بہت دھمکایا اور سمجھایا کہ حق تعالیٰ ان سب حاجات سے پاک ہے، اس کے بعد وہ چرواہا کہتا ہے ؎

گفت اے موسیٰؑ دہانم دوختی
وز پشیمانی تو جانم سوختی

کہا اے موسےٰ آپ نے تو میرا منہ سی دیا اور ندامت اور پشیمانی سے میری جان پھونک دی اس کے بعد کپڑے پھاڑ کر جنگل کو چل دیا۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی۔ چنانچہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

وحی آمد سوئے موسےٰ از خدا
بندۂ ما را چرا کردی جدا

یعنی موسےٰ کی طرف خدا تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی کہ ہمارے بندہ کو آپ نے جدا کیوں کر دیا ؎

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

یعنی آپ ہم سے ملانے کے لئے آئے ہیں نہ کہ جدائی ڈالنے کے لئے ؎

موسیاؑ آداب داناں دیگر اند
سوختہ جاں درد داناں دیگر اند

اے موسےٰ عارفین کے آداب اور ہیں اور سوختہ جان و دل کے آداب اور ہیں۔ دیکھئے محبانِ موسےٰؑ باوجودیکہ غلطی کر رہا تھا۔ مگر چونکہ دل محبت د

اخلاص سے لبریز لئے ہوئے تھا اس لئے وہ غلطی اور بے ادبی ہی پسند آئی، اسی طرح سے تمہاری غلطیاں مشق کرنے سے بھی نہ گئیں تو شابان ہوئے تو بن جاؤ گے۔ اور اگر غلطیاں جاتی رہیں تو وزیر ہوئے ہو گے۔ بلکہ وزیر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہو گے۔ اور یہ مت کہو کہ ہم تو گنوار ہیں، ہماری زبان موٹی ہے۔ بعضے گنوار بھی محنت سے عالم ہو گئے ہیں۔ حضرت مولانا گنگوہی کی خدمت میں ایک گوجر[1] آئے۔ ان کی زبان سے الف بھی درست نہ نکلتا تھا، الف کو اَلَف بفتحہ لام کہتے تھے۔ ایک وقت وہ آیا کہ حدیث کا درس دیتے تھے۔ ناامید نہ ہونا چاہئے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

تو مگو ما را بداں شہ بار نیست
با کریماں کارہا دشوار نیست

اور یہ یاد رکھو کہ بلا محنت و مشقت کچھ نہیں ہوتا اور شاذ و نادر کا اعتبار نہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ اَن پڑھ تھے۔ ایک روز جو صبح کو اٹھے تو اچھے خاصے عالم تھے۔ چنانچہ انہوں نے عربی میں خطبہ طویل پڑھا جسکی ابتدا یہ تھی:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَمْسَیْتُ کُرْدِیًّا وَّاَصْبَحْتُ بِفَضْلِهٖ عَرَبِیًّا

ان پر ایک شب ہی میں خدا کا فضل ہو گیا۔ لیکن ایسے قصے شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں۔ جس نے پایا ہے محنت مشقت ہی سے پایا ہے۔ اور محنت سے مل جانا یہ بھی بڑا فضل ہے۔ لیکن یہاں تو طلب ہی نہیں۔ ورنہ ؎

لہ۔ میں نے راجپوت سنا ہے۔ واللہ اعلم ۱۲

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد
اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

ہمارے اندر درحقیقت طلب نہیں ورنہ ان کے یہاں تو ناکامی بھی کامیابی ہے۔ افسوس اتنی عطا اور کوئی لینے والا نہیں۔ ایک ہفتہ بھی تو کوئی قرآن کی مشق نہیں کرلیتا۔ اگر ابھی گورنمنٹ کا حکم آدے کہ بقدر ضرورت انگریزی سیکھو ورنہ برخاست کردیئے جاؤگے تو سب ملازمین ابھی انگریزی داں بن جائیں گے۔ اگر اللہ میاں کے یہاں بھی یہی حکم ہوتا کہ قرآن صحیح کرو ورنہ روٹی بند ہوجائے گی تو ابھی سب کے قرآن صحیح ہوجاتے اور جو حیلے اور بہانے کرتے ہیں وہ سب رہ جاتے۔ لیکن حق تعالیٰ کی تو وہ شان ہے کہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور دو وقتہ روٹی دیتے ہیں ؎

خدائے راست مسلم بزرگواری و حلم
کہ جرم بیند و ناں برقرار میدارد

ہندستانی لائبریری
گارڈن ریچ روڈ۔ مٹیابرج۔ کلکتہ

تلاوت و تجارت

حاصل یہ ہے کہ قرآن کا حق یہ ہے کہ قرآن کو صحیح کرنا چاہیے۔ تیسرا حق یہ ہے کہ ایسی طرح نہ پڑھو کہ جی گھبرا دے اور لوگ اکتا جاویں یعنی بہت زیادہ نہ پڑھو اور نہ بہت کم پڑھو۔ اس سے بعض اوقات دل تنگ ہوتا ہے اور زیادہ سننے کا اشتیاق ہوتا ہے اور خوش الحانی سے پڑھو۔ چوتھا حق یہ ہے کہ قرآن کی تجارت نہ کرو۔ اس کو سنکر لوگ گھبرائے ہوں گے کہ کیا قرآن کی

تجارت بھی ناجائز ہے۔ صاحبو! مکتوب قرآن کی تجارت کو میں نہیں کہتا وہ تو جائز ہے۔ میں ملفوظ قرآن کی تجارت کو ناجائز کہتا ہوں۔ بعض حفاظ روپیہ ٹھہرا کر پڑھتے ہیں کہ دس روپیہ لیں گے تو پڑھیں گے۔ ایسے حفاظ نے قرآن کی قدر کچھ نہ سمجھی، قرآن تو وہ شے ہے اور اس کی قیمت یہ ہے ؎

ہر دو عالم قیمت خود گفتہ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

قرآن پڑھکر کچھ لینا ناجائز ہونے کے علاوہ بہت ہی کم ہمتی کی بات ہے۔ لکھنؤ میں ایک بزرگ تھے کہیں سفر میں تھے۔ چوروں نے ان کو لوٹ لیا۔ صرف ایک لنگی ان کے بدن پر رہ گئی۔ کسی مسجد میں آ گئے۔ قرآن شریف بے انتہا عجیب پڑھتے تھے۔ ایک رئیس کو خبر ہوئی کہ ایک شخص آئے ہیں، اور اس حالت میں ہیں، قرآن بہت اچھا پڑھتے ہیں۔ ان کو رحم آیا۔ جوڑے اور نقد روپیہ اور کھانا ہمراہ لائے اور ان سب کو ایک طرف رکھ دیا۔ لیکن تھے بے عقل اور تمیز نہ تھی۔ بزرگوں کے صحبت یافتہ نہ تھے۔ آ کر بیٹھے اور کہا کہ حضرت میری درخواست ہے کہ آپ مجھے کچھ قرآن سنائیے۔ انہوں نے قرآن شریف سنایا۔ اس نے قرآن سن کر وہ سامان پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا بیشک مجھکو حاجت ہے اور میں ضرور لے لیتا لیکن اس وقت تو مجھکو آیت:

لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیَاتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا

اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اگر آپ پہلے دیتے تو لے لیتا۔ اب تو میں ہرگز نہ لوں گا۔ سبحان اللہ کیسے مخلص تھے۔ ایک اور خلوص کی حکایت یاد آئی۔

مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے ایک مجمع میں وعظ فرمایا۔ وعظ فرما کر نکل رہے تھے کہ ایک شخص ملا۔ اس نے عرض کیا کہ حضرت میں نے وعظ سنا ہی نہیں۔ فرمایا اچھا پھر کہہ دوں گا۔ سنو! چنانچہ پھر اکیلے کے سامنے وہی وعظ کہہ دیا۔ اللہ اکبر کس قدر خلوص ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات جو کچھ کرتے تھے محض اللہ ہی کے واسطے کرتے تھے۔ اس میں نفس کی آمیزش نہ ہوتی تھی۔ ہم تو ایسی کہتے ہیں۔ ہم سے اگر کوئی اس طرح درخواست کرے تو ہم پھر کبھی نہ کہیں، بلکہ اگر مجمع کم ہو جب بھی دل نہیں لگتا۔ الغرض ان بزرگ نے وہ سامان باوجود اصرار کے نہ لیا۔ یہ لوگ تھے امراء اور دولتمند جن کی نظروں میں ہفت اقلیم کی سلطنت بھی گرد تھی اور گرد کیوں نہ ہو، جسکے پاس حق تعالیٰ کی دی ہوئی اتنی بڑی دولت ہو وہ سلطنت کی کیا قدر کرے۔

حفاظ کو ہدایت

بس اے حفاظ آپ اپنی قدر کیجئے اور دس دس پندرہ پندرہ روپیہ پر رال نہ ٹپکائیے۔ بڑا افسوس ہے کہ قرآن کو بیچا بھی تو کتنے میں دس روپیہ میں۔ مولوی فیض الحسن صاحب سہارنپوری بڑے ظریف تھے، ایک مرتبہ آپ شیعوں کی مجلس میں پہنچے اور فرمانے لگے اللہ تعالیٰ رحم کرے حضرت یزید پر۔ اللہ تعالیٰ بخشے حضرت شمر ذی الجوشن کو بڑے عالی ہمت تھے۔ شیعہ سن کر کہنے لگے کہ حضرت توبہ کیجئے کن کافروں کی آپ مدح کر رہے ہیں۔ کہنے لگے کچھ ہو مگر تھے بڑے عالی ہمت۔ ایمان انہوں نے بیچا تو مگر

شام کی سلطنت کے بدلے۔ اب تو کم ہمت بھی ہیں اور بے ایمان بھی کہ آدھ آدھ سیر حلوے پر ایمان بیچتے ہیں۔ شیعہ سنکر بہت کچے ہوئے۔ ایک عربی کی مثل مشہور ہے

ان سرقت فاسرق الدرة وان زنیت فازن بالحرة

امیر احمد صاحب مرحوم تھانوی جلال آباد میں امام عیدین تھے۔ ایک مرتبہ عید کی نماز کے بعد ایک خانصاحب نے پانچ روپیہ نذر پیش کئے۔ قاضی صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ آپ اپنے لائق دیتے ہیں یا میرے لائق۔ اگر آپ اپنے لائق دیتے ہیں تو آپ کی لیاقت اس سے بہت زیادہ ہے اور اگر میرے لائق دیتے ہیں تو میری لیاقت تو اتنی بھی نہیں اور واپس فرما دئے۔ غرض عوض بھی لیا تو اتنا کم کہ دس یا پندرہ روپے۔

اے حفاظ تم تو اللہ کے واسطے پڑھو اور اپنے ثواب کو برباد نہ کرو۔ ایک مسئلہ اور ہے اس میں مجھ سے غلطی ہو چکی ہے، وہ یہ ہے کہ میں سمجھتا تھا، کہ سامع کو روپیہ لینا جائز ہے، میں اس کو تعلیم پر قیاس کیا کرتا تھا، لیکن پھر سمجھ میں آیا کہ سماعت کو تعلیم میں داخل کرنا صحیح نہیں۔ اس لئے کہ تعلیم سے نماز فاسد ہو جاتی ہے اور سامع کے بتلانے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ اور نیز بھولے ہوئے کو بتلانا یہ نماز کی اصلاح ہے اور اصلاح نماز عبادت ہے اسلئے قاری کو جائز ہے اور نہ سامع کو۔ قواعد کلیہ سے یہ دونوں فتوے دئے ہیں۔ اگر اس کے خلاف کسی کو جزئیہ معلوم ہو تو میں اس سے بھی رجوع کر لوں گا۔ علاوہ عدم جواز کے میں نے یہ دیکھا ہے کہ پڑھنے پر لینے کی حرص پیدا ہو جاتی ہے

اگر جائز بھی ہوتا تو اس مرض سے بچنے کیلئے بھی اس سے پرہیز ہی بہتر تھا۔
اور تعلیم قرآن پر جو فقہاء نے فتوے دے دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اگر
اس پر لینا جائز نہ ہو تو تعلیم قرآن گم ہو جاوے اور اس کا باقی رکھنا ضروری ہے
اگر تراویح میں قرآن نہ سناویں تو کسی ضروری امر میں خلل نہیں پڑتا۔ بعض
لوگ تاویل کرتے ہیں کہ اگر روپیہ نہ دیں گے تو تراویح کا ترک لازم آویگا
یہ قیاس صحیح نہیں۔ تراویح ترک نہ ہوں گی بلکہ ختم قرآن چھوٹ جاوے گا
اور وہ ضروری نہیں۔ بعض یہ تاویل کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے واسطے پڑھینگے
تم اللہ کے واسطے دے دیجیو۔ صاحبو! یہ نرے الفاظ ہی ہیں مطلب
صاف یہی ہوتا ہے کہ پڑھنے کی وجہ سے لیتے ہیں۔ یہ نیت نہیں ہوتی کہ اللہ
کے لئے دونوں کام نہیں ہونگے۔ بلکہ یہ بس الفاظ اصطلاحی ہو گئے ہیں۔ یہ
الفاظ بول کر انکے معنے موضوع لہ مراد نہیں لیتے ہیں اور علامت اس کی
یہ ہے کہ اگر اس کہنے کے بعد حافظ جی کو یہ معلوم ہو جاوے کہ یہ لوگ کچھ نہ دینگے
تو اسی وقت بھاگ جاویں گے۔ یا اگر ختم پر کچھ نہ دیں تو پھر دیکھئے کیا مزہ آتا
ہے۔ خوب لڑائی ہو یا حافظ جی اگر کچھ مہذب ہوئے تو لڑائی تو نہ ہوگی
لیکن دل میں یہ ضرور سمجھینگے کہ ان لوگوں نے حق تلفی کی غرض کہ کچھ بھی
مت لو۔

ختمِ قرآن کی رسوم

منجملہ منکرات کے مٹھائی تقسیم کرنا ہے۔ اس کو لوگ چونکہ ضروری

سمجھنے لگے ہیں اس لئے اس کو بھی چھوڑنا چاہئے۔ اگر تم کو قرآن شریف ختم ہونے کا شکریہ ادا کرنا ہے، گھر جاکر اور مٹھائی منگا کر سب کے یہاں حصہ لگا کر بھیجدو، مسجد میں تقسیم نہ کرو، اور ایسے ہی خرچ کرنے والے ہو تو اناج تقسیم کردو، روپیہ تقسیم کردو، کوئی بکرا گائے ذبح کرکے تقسیم کردو۔ مٹھائی ہونا فرض نہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی جب سورۃ بقر ختم ہوئی تو انہوں نے ایک اونٹنی ذبح کی تھی۔ مسجد میں تقسیم کرنے سے بڑی بے لطفی اور مسجد کی بے ادبی ہوتی ہے اور بڑا شور و غل ہوتا ہے۔ لکھنؤ میں ایک ہمارے دوست تھے وہ کبھی مجلس مولد کیا کرتے تھے مگر منکرات سے خالی۔ گو ہم مفاسد عوام کے سبب اس کو بھی پسند نہیں کرتے۔ غرض وہ یہ عمل کرتے اور جس جس کو بلانا ہوتا فہرست کے ساتھ مٹھائی بھیجدیتے تھے۔ اب جس کا جی چاہے آوے اور جسکا جی چاہے نہ آوے۔ اور نیز اب جو کوئی آوے گا تو خلوص سے آویگا مٹھائی کے لالچ میں نہ آوے گا اور ختم قرآن کے موقع پر بیس پچیس روپے کے پیسے غرباء و مساکین کو تقسیم کر دیتے۔ اور پھر کچھ مٹھائی ہونا ضروری نہیں۔ ہم نے ایک مرتبہ اپنے ختم قرآن کے شکریہ میں کباب تقسیم کئے تھے اور تقسیم کا وقت بھی بدل دیا افطار کے وقت تقسیم کر دیئے۔ ایک قاری صاحب تھے وہ گوشت روٹی کی دعوت کیا کرتے تھے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان مولویوں نے سب خرچ بند کر دئے۔ صاحبو خرچ کو کون بند کرتا ہے۔ میں نے تو بہت سی صورتیں خرچ کی بتا دیں۔ مٹھائی کو جو منع کیا جاتا ہے سو منکرات کی وجہ سے روکا جاتا ہے۔ منجملہ منکرات کے یہ بھی ہے کہ اس کا التزام ہوتا ہے کہ

کوئی آدمی محروم نہ جائے ورنہ بڑی بدنامی ہوگی۔ عرب کے لوگ خوب ہیں جہاں تک شے تقسیم ہوسکتی ہے کرتے ہیں ورنہ کہہ دیتے ہیں کہ بس خلاص وہاں اس کی پروا نہیں ہے کہ بدنامی ہوگی اور اس مٹھائی کی بدولت کیا ہوتا ہے کبھی ایک صاحب امام کے پاس آتے ہیں کہ حافظ جی کچھ عرض کرنا ہے۔ آہستہ سے کہا کہ بازار آدمی گیا ہے مٹھائی کے لئے ذرا تھام تھام کر پڑھیے۔ اب حافظ صاحب ور دنوں میں تو آدھ گھنٹہ میں دو پارہ پڑھتے تھے، آج خوب کھینچ کھینچ کر اور آواز بنا بنا کر پڑھتے ہیں۔ جب دیکھا کہ آگیا پھر جلدی جلدی پڑھ کر ختم کر دیا۔ ایک سب سے بڑھکر خرابی یہ ہے کہ مٹھائی کے لئے چندہ ہوتا ہے اور یہ آدمی وصول کرنے والے ہوتے ہیں جو اپنی وجاہت کے غرباء کو دبا کر وصول کرتے ہیں۔ اگر کسی نے دو آنے دئے تو کہتے ہیں کہ میاں تم چار ہی آنہ دیتے ہو تم سے تو ایک روپیہ لینگے۔ وہ بچارا ایسا مارا جاتا ہے۔ جب اس مٹھائی کے اندر یہ خرابیاں ہیں تو بتلائیے کہاں تک صبر کیا جائے کیوں نہ رد کیا جائے ؎

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است

اگر خاموش بنشینم گناہ است

غرض یہ مٹھائی کیا ہے مجذوب کا لنگوٹا ہے، جس کی وجہ سے بہت سے منکرات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک مجذوب صاحب برہنہ رہا کرتے تھے معتقدوں نے عرض کیا کہ حضور آپ ننگے برے معلوم ہوتے ہیں کم از کم لنگوٹا باندھ لیجئے۔ کہنے سننے سے انہوں نے لنگوٹا باندھ لیا۔ اب جو کچھ کھاتے پیتے

چونکہ ہوش تو درست نہ تھے وہ لنگوٹے پر بھی گر جاتا اور وہ چکنا ہو جاتا۔ اس کو چوہے کاٹنے لگے۔ چوہوں کو دفع کرنے کے لئے ایک بلی پالی گئی اس نے یہ خرابی کی کہ جو کچھ شاہ صاحب کے لئے دودھ دہی رکھا ہوتا وہ کھا جاتی اس لئے حفاظت کے لئے ایک کتا رکھا گیا کتا بھی کچھ نقصان کرنے لگا، تو ان سب کی نگرانی کے لئے ایک آدمی رکھا گیا۔ وہ آدمی آوارہ سا تھا۔ ادھر ادھر جاتا تھا، یہ تجویز ہوا کہ اس کا نکاح کر دینا چاہئے، چنانچہ اس کا نکاح کر دیا گیا، اس کے کئی بچے ہو گئے۔ ایک روز مجذوب صاحب جو افاقہ کی حالت میں آئے تو دیکھا۔ بلی ہے کتا ہے، مرد اور عورت بہت بکھیڑا جمع ہے پوچھا کہ یہ کیا ہے، سارا قصہ سنایا۔ مجذوب صاحب نے کہا کہ آہا یہ سب اس لنگوٹ کی وجہ سے ہوا، جاؤ ہم لنگوٹا نہیں رکھتے اور یہ کہکر لنگوٹا کھولکر پھینک دیا۔ تو صاحبو! جس مٹھائی کی وجہ سے اس قدر منکرات لازم آئیں اس کو ترک کر دینا چاہئے۔ ختم کے روز ایک اور خرابی ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس حافظ جی کا مصلّیٰ کیا ہوتا ہے پنساری کی دوکان ہوتی ہے۔ کہیں اجوائن کی پڑیاں رکھی ہیں، کہیں سیاہ مرچیں۔ کوئی ان صاحبوں سے پوچھے، کہ حافظ صاحب نے قرآن تمہاری اجوائن ہی کے لئے پڑھا تھا۔ یاد رکھو کہ اجوائن پر دم کرانا یہ دنیا کا کام ہے۔ دین کے کام کی غایت دنیا کو بنانا بہت نازیبا ہے اور تعویذ و نقش لکھنا اس کے حکم میں نہیں ہے کیونکہ وہ خود دنیا ہی کا کام ہے، تو اس کی غایت دنیا ہونا مضائقہ نہیں، وہ تو ایسا ہے جیسے حکیم جی کا نسخہ لکھنا عبادت نہیں ہے، اس پر اگر اجرت بھی لے تو کچھ حرج نہیں۔

اور قرأت قرآن عبادت ہے۔ اس کی غایت اور ثمرہ صرف آخرت میں ملیگا۔ اس کی صریح دلیل یہ ہے کہ حدیث میں ہے:

اقرءوا القرآن ولا تأکلوا بہٖ

یعنی قرآن پڑھو اور اس کے عوض میں کھاؤ نہیں۔ ایک حدیث یہ ہے اور ایک دوسری حدیث شریف میں ایک اور قصہ آیا ہے وہ یہ ہے کہ کہ چند صحابہ رضی اللہ عنہم سفر میں تھے ایک گاؤں میں گذر ہوا۔ ان گاؤں والوں نے ان کو کھانا تک نہ کھلایا۔ وہاں اتفاقاً ایک شخص کے سانپ نے کاٹ لیا۔ ایک شخص ان کے پاس آیا اور پوچھا:

افیکم راق

یعنی کیا تمہارے میں کوئی منتر پڑھنے والا ہے۔ ایک صحابی تشریف لے گئے اور یہ کہا کہ ہم جب دم کریں گے جب کہ ہم کو سو بکریاں دو۔ انہوں نے وعدہ کر لیا۔ انہوں نے سورۃ فاتحہ پڑھکر دم کر دیا سبحان اللہ ان حضرات کی کیا پاکیزہ زبان تھی، فوراً شفا ہو گئی، ایسا ہو گیا جیسے رسی میں سے کھول دیتے ہیں۔ اس نے حسب وعدہ سو بکریاں دیں وہ بکریاں اپنے ساتھیوں میں آئے بعض نے کہا کہ لینا ان کا حرام ہے بعض نے کہا حلال۔ جب حضور صلعم کے یہاں حاضر ہوئے تو اس کا استفسار کیا گیا۔ فرمایا:

اِنَّ اَحَقَّ مَا اَخَذْتُمْ عَلَیْہِ کِتَابُ اللّٰہِ

یعنی جس شے پر تم اجرت لیتے ہو اس میں سب سے احق کتاب اللہ ہے اور بلا اندیشہ کھاؤ بلکہ میرا حصہ بھی لگاؤ۔ اب بظاہر اس حدیث میں اور

حدیث سابق میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔ لیکن فی الواقع کچھ بھی تعارض نہیں۔ اس قصہ میں تو قرآن کو جھاڑ پھونک کے طور پر پڑھا گیا ہے۔ اس طور سے پڑھنا عبادت نہیں ہے اس لئے اس پر معاوضہ لینا جائز ہے اور:

اِقْرَؤُا الْقُرْآنَ لَا تَاْکُلُوْا بِہٖ

میں قراءۃ قرآن سے مراد قراءۃ بطور عبادت ہے، اس لئے اس پر معاوضہ لینا حرام اور دین کو دنیا سے بدلنا ہے۔ اسی طرح اجوائن پر قرآن کو دم کرنا یہ دین کی غایت دنیا کو بنانا ہے اور بہت بے ادبی ہے اور قرآن کو اس کے مرتبہ سے گھٹانا ہے۔ میں تو یہ نہیں کہتا کہ ناجائز ہے۔ لیکن پیٹ بھر کے بے ادبی ہے۔

قرآن کی غایت

صاحبو! یہ قرآن تو وہ ہے، جس کی نسبت ارشاد ہے:

اَنْ تَخْتَلِطَ بِلَحْمِیْ وَدَمِیْ وَعَظْمِیْ ــــــ!

اے اللہ قرآن کو آپ میرے گوشت، خون، ہڈیوں میں خلط کر دیجئے۔ یعنی میرے تمام جسم کو قرآن سے متأثر کر دیجئے۔ یہ ہے قرآن کی غایت اگر کوئی کہے کہ یہ تو نیا مسئلہ ہے۔ صاحبو! یہ نیا نہیں۔ یہ پرانی بات ہے۔ اگر نئی ہے تو بتلاؤ یا کسی تاریخ میں دکھلاؤ۔ کہ صحابہؓ نے قرآن کو عبادت کے طور پر ختم کر کے اجوائن پر دم کیا ہو۔ اس کے علاوہ اور بہت سے منکرات ہیں اس وقت اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ نماز کے حقوق اول بیان ہو چکے ہیں۔

یہ قرآن کے حقوق ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان حقوق کو پوری طرح ادا کرنا چاہئے جب حقوق ادا کئے جائیں گے تو انشاء اللہ تعالیٰ وہ مصالح اور حکمتیں کہ جن کے لئے یہ عبادتیں موضوع ہوئیں ان پر مرتب ہوں گی، اور اگر حقوق ادا نہ کئے تو وہ خاصیتیں ظاہر نہ ہوں گی۔ مجھ کو بس اسی قدر بیان کرنا تھا۔ اس سے پہلے حقوق صوم بیان ہو چکے ہیں جو کہ فرض ہے اور یہ سنت کے حقوق ہو گئے۔ باقی ایک اور مضمون بیان کرنے والا تھا وہ یہ ہے کہ ایک خاصیت تو روزہ اور نماز کی ان کی صورۃ نوعیہ کے اعتبار سے ہے۔ اس میں تخصیص فرض اور سنت کی نہیں ہے دونوں کو عام ہے وہ تو بیان ہو گئی اور ایک خاصیت ان کی فرض اور سنت ہونے کے اعتبار سے ہے، یعنی نماز اور روزہ فرض کی خاصیت جدا ہے اور نماز اور روزہ سنت کی خاصیت جدا۔ اور یہ خواص قرب فرائض اور قرب نوافل اصطلاح میں کہلاتے ہیں۔ لیکن چونکہ وقت نہیں رہا اسلئے اگر کسی موقع پر یاد رہا تو کیا عجب ہے، کہ بیان ہو جائے ورنہ جس کی ضرورت تھی وہ مضمون بیان ہو گیا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ توفیق عطا فرما دیں۔ فقط۔ آمین!

خیر الارشاد لحقوق العباد

HINDUSTANI LIBRARY
Estd.
ہندستانی لائبریری
Garden Reach, Calcutta

اہتمام حقوق العباد کے متعلق یہ وعظ تحصیلدار صاحب جلال آباد ضلع مظفر نگر کے مکان پر ۲۴ رجمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ بروز شنبہ بوقت چاشت تخت پر کرسی رکھ کر، کرسی پر بیٹھ کر فرمایا جو ۲ گھنٹے پچاس منٹ میں ختم ہوا۔ ۵۰ کے قریب مرد اور عورتیں علاوہ موجود تھیں مولانا ظفر احمد صاحب نے قلمبند فرمایا۔

اگر کسی جگہ بدعت ہی لوگوں کے دین
کی حفاظت کا ذریعہ ہو جائے، تو
وہاں اس بدعت کو غنیمت سمجھنا چاہئے
جب تک کہ ان کی پوری اصلاح نہ ہو
جائے ۔!

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل
علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات
اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضلل فلا
ہادی لہ ونشہد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ
ونشہد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم
اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ
الرحمٰن الرحیم ۔ اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ
النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِکَ لَہُمْ
عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔

تمہید

یہ ایک آیت ہے شوریٰ کی، اس میں حق تعالیٰ نے حقوق العباد کے متعلق ایک ضروری مضمون ارشاد فرمایا ہے۔ گو سباق سیاق کے لحاظ سے ایک خاص حق العباد کے متعلق وارد ہے۔ مگر عموم الفاظ سے مطلقاً حقوق العباد کے متعلق بھی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ عبارۃ النص سے تو اس کی دلالت معنی مسوق لہٗ پر ہے جو کہ ایک خاص حق العبد ہے اور اشارۃ النص سے مطلق حقوق العباد پر دلالت ہے۔ یعنی مطلق حقوق العباد پر اس کی دلالت اشارۃً ہے نہ کہ قصداً۔ مگر دست خفی نہیں بلکہ صریح ہے۔ اور اس کو میں نے اس لئے اختیار کیا ہے کہ جی یوں چاہا کرتا ہے کہ ہر موقع پر خواہ موقع زمانی ہو یا مکانی مضمون

لہ۔ کیونکہ اس سے اوپر یہ آیت ہے، وَالَّذِیْنَ اِذَا اَصَابَھُمُ الْبَغْیُ ھُمْ یَنْتَصِرُوْنَ وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِہٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَیْھِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ ۝ اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ الآیۃ اور اس کے بعد یہ آیت ہے۔ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝

(باقی برحاشیہ صفحہ ۲۸۵)

ضرورت کے موافق بیان ہو ۔ اور یوں تو شریعت کے سارے مضامین ہی ضروری ہیں ، مگر ان میں سے بھی جن کی شدید ضرورت ہو اس کا بیان کیا جائے ، اور یہ شدت ہماری غفلت اور بے التفاتی سے بڑھ جاتی ہے کہ ایک حکم ضروری العمل ہو اور اس سے غفلت اور بے التفاتی برتی جا رہی ہو ۔ چنانچہ اسوقت میرے خیال میں اس جگہ حقوق العباد کے متعلق بیان کی زیادہ ضرورت ہے ۔ بلکہ جب مجھ سے کئی ہفتے پہلے بیان کے لئے کہا گیا تھا ، تو اسی وقت دل میں یہ بات آئی کہ اس جگہ حقوق العباد کے متعلق بیان کی ضرورت ہے ، مگر اس وقت باحتمال بارش کے یہاں آنیکی ہمت نہ ہوئی اور میں نے کہہ دیا تھا کہ جس دن بادل نہ ہو اس دن چلوں گا ۔ چنانچہ اس جمعہ کو جو مجھ سے تاریخ پوچھی گئی تو میں نے پیر کا دن اسی شرط کے ساتھ معین کر دیا تھا ۔ گو آج بھی بادل گھرا ہوا تھا اور ہمت آنیکی نہ ہوتی تھی ، مگر جب سواری آ گئی تو میں نے بار بار سواری کو واپس کرنا گوارا نہ کیا اور خدا کے نام پر چلا آیا (اور بحمد اللہ بادل کے وقت گئے تھے اور کھلے میں واپس آئے ۔ لوٹتے وقت بادل نہ رہا تھا ۔ ۱۲ ظ) تو اس مضمون کا خیال مجھے درخواست کے ساتھ ہی آ گیا تھا ، چنانچہ آج اس کو بیان کرنے کا موقع ملا ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۴ : اس ما قبل و ما بعد کے ملانے سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ آیۃ مذکورہ فی الوعظ میں ظلم سے مراد انتقام کے وقت ظلم کرنا ہے ۔ مگر الفاظ آیۃ خود عام ہیں ، نیز جب ظلم بوقت انتقام کی یہ حالت اور اس پر یہ وعید ہے ، تو ابتداءً ظلم تو اس سے اشد ہے ، اس پر بدرجہ اولیٰ یہ وعید ہو گی ۔

ہے ۔ اس وقت بھی جبکہ میں یہ مقام لکھ رہا ہوں اتفاق سے بادل گھرا ہوا ہے اور بارش کی ضرورت ہے حق تعالیٰ شانہٗ امن و امان و عافیت و رحمت کی بارش نازل فرمائیں ۔ ۱۲ ظ ع

تو بیان کرتا ہوں اور شروع ہی سے میں نے اطلاع بھی کردی کہ میں یہ بیان کرونگا میری عادت ہے کہ جس مضمون کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے میں اس کو پہلے ہی صاف صاف کہہ دیتا ہوں تاکہ روح بیان اور خلاصہ کے علم سے باقی مضمون سہولت سے سمجھ میں آجائے۔ نیز اس میں چونکہ تفصیل بعد الاجمال ہوتی ہے اسلئے وہ اوقع فی النفس بھی ہوتی ہے۔ بخلاف عام مقرروں کے کہ ان میں بعض دفعہ بیان کرنیوالا مقصود کو توطیہ و تمہید کے بعد ادا کرتا ہے اور اس میں بھی ایک حکمت ہے وہ یہ کہ اس میں دیر تک سامعین کو مضمون مقصود کا اشتیاق رہتا ہے اور اشتیاق کے بعد جو بات معلوم ہوتی ہے اس کی وقعت ہوتی ہے اور دوسرے یہ بھی حکمت ہے کہ اگر وہ مضمون ایسا ہو جس سے طبائع پر گرانی ہوتی ہو تو پہلے ہی سے اس مضمون کو سنکر لوگوں پر گرانی نہ ہو اور بعض سامعین اٹھ اٹھ کر نہ چل دیں۔ جیسا کہ چندہ کے متعلق بیان کرنے والے پہلے ہی سے یہ نہیں کہتے کہ آج چندہ کا بیان ہوگا۔ بلکہ اول مذہب کے حقوق اور علم کے فضائل بیان کرتے ہیں، پھر یہ کہتے ہیں کہ حفاظت اسلام کی بہتر صورت مدارس وغیرہ کا قیام ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ ان کا قیام سب مسلمانوں کی توجہ و ہمت سے ہو سکتا ہے۔ اب چندہ کی ترغیب دیتے ہیں مگر میں ایسا نہیں کرتا۔ اول تو میں چندہ کے متعلق بیان ہی نہیں کرتا اور اگر کبھی کرتا ہوں تو اول ہی کہہ دیتا ہوں کہ آج چندہ کا بیان ہوگا جسکا جی چاہے بیٹھے اور جسکا جی نہ چاہے اٹھ کر چلا جائے۔ میں چندہ کے مضمون کو توطیہ و تمہید کے بعد اسلئے نہیں کہتا کہ اس سے سننے والوں کو دھوکا ہوتا ہے، کیونکہ وہ تو یہ سمجھ کر بیٹھتے ہیں، کہ ہم سے

کچھ مانگا نہ جائے گا اور جب اخیر میں ان سے چندہ کو کہا گیا تو بعض کو ناگوار ہوتا ہے اور وہ اپنے دل میں کہتے ہیں کہ ہم کو پہلے سے یہ معلوم ہوتا کہ اخیر میں ہم سے چندہ مانگا جائیگا تو ہم اتنی دیر تک اپنا وقت ضائع نہ کرتے۔ دوسرے اس طرز سے تمہیدی مضامین کی ساری وقعت سامعین کے دل سے نکل جاتی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ بس یہ سارا زور شور اس لئے تھا کہ ہمیں چندہ دو سو میں مسلمانوں کو دھوکا دینا نہیں چاہتا اور نہ احکام علوم شرعیہ کی وقعت کھونا چاہتا ہوں۔ جس مضمون کے متعلق مجھ کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس سے بعض سامعین پر گرانی ہوگی میں پہلے ہی اس کو ظاہر کر دیتا ہوں۔ اس کے بعد جو کوئی بیٹھے گا اور مجھ پر اسکے بیٹھے رہنے کا کچھ احسان نہ ہوگا اور نہ دوسرے اجمال و ابہام کی وجہ سے بندھے گا۔ ان وجوہ سے میں ابہام کو پسند نہیں کرتا اور اگر کسی کو توطیہ و تمہید سے صرف رفع وحشت عن المضمون مقصود ہو اور کوئی نیت نہ ہو تو تمہید کے بعد مقصود کے بیان کرنے کا بھی مضائقہ نہیں کیونکہ دفع وحشت سامع بھی مطلوب ہے۔ مگر جہاں تک میں دیکھتا ہوں۔ اس پیشہ والوں کی نیت توطیہ و تمہید سے یہ نہیں ہوتی کہ سامعین کی وحشت مضمون سے دفع ہو بلکہ زیادہ تر اپنی مصلحت مد نظر رکھتے ہیں کہ کہیں لوگوں کو ہم سے وحشت نہ ہو جائے۔ اس لئے وہ چندہ کے مضمون کو ایسی رنگ آمیزی اور تمہید کے بعد زبان پر لاتے ہیں۔ کہ لوگوں کو ان حضرت واعظ سے وحشت نہ ہو۔

مخاطبین کی رعایت

مگر میں اسے خیانت سمجھتا ہوں کہ واعظ اپنے مصالح کا لحاظ کر کے وعظ کہے۔ اس کو مخاطبین کی مصلحت کا لحاظ کرنا چاہیئے۔ ان کی اصلاح کس طرز میں زیادہ ہے، چاہے اپنی مصلحت رہے یا جائے مجھ کو تو اس سے غیرت آتی ہے کہ اپنی مصالح کا لحاظ کر کے بیان کروں۔

ایک بار میں بودھیپور گیا اور مجھ سے اہل شہر نے وعظ کی درخواست کی تو ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے، کہ وعظ میں امام ابو حنیفہؒ کے فضائل زیادہ بیان کیجئے گا، کیونکہ یہاں کے لوگ آپ کو اور آپ کی جماعت کو ضعیف فی الحنفیہ سمجھتے ہیں۔ (یعنی غیر مقلدی کیطرف مائل سمجھتے ہیں ۱۲)

میں نے کہا کہ اب تو میں ہرگز یہ مضمون بیان نہیں کرونگا۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ میں لوگوں کو اپنا معتقد بنانے کے لیئے وعظ کہوں، کہ بھائیو، ہمیں حنفیت میں ضعیف نہ سمجھو، کیونکہ دیکھو ہم امام صاحب کے ایسے معتقد ہیں تو یہ تو محض اپنی مصلحت ہوئی، سامعین کی اس میں کیا مصلحت ہوئی۔

البتہ اگر سامعین میں کوئی امام صاحب کے غیر معتقد ہوتا تو اس صورت میں امام صاحب کے فضائل بیان کرنے میں بیشک مخاطبین کی مصلحت تھی، کہ ایک امام کے ساتھ بدگمانی کرنے سے لوگوں کو رکاوٹ ہو جاتی۔ مگر جب سامعین میں امام صاحب سے غیر معتقد کوئی نہیں تو اب یہ مضمون ان کی مصلحت سے نہ ہوا، بلکہ اس میں محض اپنی مصلحت رہ گئی اور مجھ کو اس سے غیرت آتی ہے

کہ لوگوں کو اپنا معتقد بنانے کے لیے کوئی مضمون بیان کروں۔ چنانچہ میں نے یہ مضمون (فضائل امام کو) نہیں بیان کیا۔ بلکہ میرے نزدیک سامعین کی اصلاح کے لئے جس مضمون کی ضرورت تھی وہ بیان کیا اور شروع میں یہ بھی کہہ دیا کہ بعض خیرخواہوں کی یہ رائے تھی کہ آج فضائل امام ابوحنیفہ بیان کیے جائیں اور اس میں مصلحت یہ بتلائی گئی کہ مجھے یہاں پر بعض لوگ ضعیف فی الحنفیہ سمجھتے ہیں تو ان کے اس خیال کی اصلاح ہو جائے۔ مگر میں اس کو گوارا نہیں کرتا کہ اپنی نصرت و مصلحت کے لئے مریضوں کی مصلحت کو فوت کروں۔ فضائل امام کے بیان سے آپ لوگوں کو کچھ نفع نہ ہوگا۔ کیونکہ آپ میں امام صاحب کے غیر معتقد کوئی نہیں، ہاں بظاہر میرا ایک نفع تھا سو میں اپنے نفع کے واسطے بیان کرنا نہیں چاہتا۔ وہ طبیب طبیب نہیں جو نسخہ لکھتے ہوئے اپنی مصالح کی رعایت رکھے (مثلاً ایسی دوائیں لکھے جو اس کے پاس بکتی ہوں ۱۲) اور مریض کی مصالح کو نظر انداز کردے —— اس لئے میں اس مضمون کو چھوڑ کر وہ مضمون اختیار کرتا ہوں جو آپ کے لئے نافع ہے اور جو کچھ بیان کروں گا قرآن و حدیث سے بیان کروں گا۔ جس پر ہر مسلمان عمل کرنے کا طالب ہے۔ اس لئے آپ مضمون پر نظر رکھیں۔ اس کو نہ دیکھیں کہ بیان کرنے والا کیسا ہے۔ میرے اندر ہزاروں عیوب سہی لیکن انشاء اللہ آپ کو وہی راستہ بتلاؤں گا جو آپ کے واسطے نافع ہے اور اس کو نافع میرے ہی کہنے سے نہ سمجھو، خالی الذہن ہو کر سن لو پھر خود غور کرو۔ جس سے عقیدت ہو اس سے تحقیق کرلو۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی غلطی ہوگی معذور ہو اس کے

بعد پھر جو بیان ہوا تو سامعین پر بہت بڑا اثر ہوا، تجربہ یہ ہے کہ جب مخاطبین کی مصلحت کا لحاظ کر کے بیان کیا جائے گا تو اس کا ضرور اثر ہوگا۔ اس لئے میں ہمیشہ مخاطبین کی مصلحت و ضرورت کا لحاظ رکھتا ہوں اور خلاف ضرورت بیان نہیں کرتا۔ اس لئے میں نے اس وقت یہ مضمون "حقوق العباد" کا اختیار کیا ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں اس مقام پر یہ سامعین کی مصلحت و ضرورت کا مضمون ہے۔ شاید کسی کو یہ خیال ہوا ہو گا کہ یہ تو پھیکا مضمون ہوگا تو صاحب بیان تو علاج ہے اور علاج و دوا میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ دوا پھیکی ہے یا میٹھی بلکہ ضرورت اور نفع کو دیکھا جاتا ہے۔ اگر کوئی دوا پھیکی ہی ہو یا اس سے بڑھ کر کڑوی ہی ہو مگر ضرورت کے موافق کہ اس سے زیادہ نافع کوئی دوا نہ ہو، تو بتلایئے اس وقت اس کو ترجیح ہوگی یا اس میٹھی دوا کو جو نہ ضرورت کے موافق ہے نہ زیادہ نافع ہے۔ اس لئے اس کو مت دیکھو کہ یہ مضمون پھیکا ہے یا چٹپٹا بلکہ اس کو دیکھئے کہ یہ آپ کی ضرورت کا بھی ہے یا نہیں۔

درستی معاملات کی ضرورت

سو ضرورت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ دیندار لوگ بھی عبادات میں تو فرائض و واجبات بلکہ مستحبات تک کا اہتمام کرتے ہیں۔ یعنی جو لوگ کام کرنے والے ہیں۔ اگرچہ بعض ایسے بھی ہیں ــــــــــ کہ سب ہی اعمال میں کوتاہی کرتے ہیں۔ مگر جو کام کرنے والے ہیں وہ عبادات میں تو فرائض و واجبات کے لئے بھی کوشش کرتے ہیں، مستحبات کی بھی پابندی کرتے ہیں۔ درود شریف

اور تسبیحات حتیٰ کہ دلائل الخیرات اور وظائف تک کا اہتمام کرتے ہیں اور گو یہ دلائل و حزب برکت کی چیزیں ہیں اور ان میں ثواب بھی ہے۔ مگر دلائل الخیرات، اور حزب البحر وغیرہ یہ جتنے وظائف آج کل معمول بہا ہیں۔ حدیث کے اوراد کے برابر ہرگز نہیں ہیں۔ غرض بعض لوگ ان زوائد کے پابند ہیں مگر حقوق العباد کا ان کو بھی خیال نہیں۔ بس آج کل لوگوں نے محض نوافل اور تسبیحات پڑھنے کو دینداری سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ اصل دینداری معاملات سے معلوم ہوتی ہے، چنانچہ سلف کے نزدیک دینداری کا معیار زیادہ تر معاملات ہی تھے۔ صرف نماز روزہ کرتے ہوئے دیکھ کر کسی کے دیندار ہونے کا حکم نہ لگاتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دربار میں ایک مقدمہ پیش ہوا۔ جس میں مدعی کے پاس دو گواہ تھے۔ ایک گواہ کی عدالت تو حضرت عمرؓ کو معلوم تھی دوسرے گواہ کی عدالت کا انہیں علم نہ تھا تو آپ نے حاضرین سے دریافت فرمایا، کہ اس گواہ کی عدالت کے متعلق تم سے کوئی گواہی دیتا ہے۔ ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ میں اس کے عادل ہونے پر گواہی دیتا ہوں حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ تجھکو اس کا عادل ہونا کیسے معلوم ہوا۔

"هل جاورته ام صحبت معه فی السفر الذی یسفر عن الحقیقة ام عاملت معه عقداً"

"کیا تو اس کے پڑوس میں کبھی رہا ہے یا سفر میں کبھی تیرا اور اس کا ساتھ ہوا ہے، جس سے انسان کی مخفی حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ یا تونے اسکے ساتھ کوئی معاملہ بیع و شراء کا کیاہے۔ اس نے کہا نہیں بھائی"

"قال فلعلك رأيته خارجاً من المسجد بعد الصلوٰۃ۔"

فرمایا تو شاید تم نے اس کو نماز پڑھکر مسجد سے نکلتا ہوا دیکھ لیا ہوگا۔ اس نے کہا "جی ہاں"۔ فرمایا

"فانت لا تعرف"

تم اس کو نہیں پہچانتے۔!

محض اتنی بات سے کسی کا دیندار اور عادل ہونا معلوم نہیں ہو سکتا۔ تو دیکھئے حضرت عمرؓ نے محض نماز اور تسبیحات کو دینداری کے لئے کافی نہیں سمجھا، بلکہ اس کے ساتھ معاملات کی درستی کو بھی ضروری سمجھا۔ مگر آج کل ہم لوگوں نے اس کو دین سے بالکل خارج سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ یہ دین کا ایسا ضروری جزو ہے کہ اس کے بدون آدمی گواہی دینے کے قابل نہیں ہوتا۔ اس سے آپ کو اس مضمون کی ضرورت معلوم ہو گئی ہو گی۔ کیونکہ جس بات سے اتنی غفلت ہو کہ باوجود ضرورت کے لوگ اس کو ضروری نہ سمجھتے ہوں وہ بہت زیادہ اہتمام کے قابل ہوگا۔ اس لئے غور سے اس مضمون کو سننا چاہئے، گو اس میں لطف نہ آئے۔

تاکد حق کا سبب

وہ مضمون یہ ہے کہ ہم لوگوں نے "حقوق العباد" کو بالکل ہی پس پشت ڈال رکھا ہے اور اس مرض کا ایک سبب ہے۔ پہلے اس کو معلوم کر لینا چاہئے اور سبب کے علم سے ایک گونہ ان لوگوں کا عذر بھی معلوم ہو جائے گا جن کی میں شکایت

کر رہا ہوں اور عذر کے بعد ان کا جرم بھی ہلکا ہو جائے گا۔ گو ان لوگوں کو اپنا عذر خود بھی معلوم نہیں مگر میں تبرعاً خود ان کا عذر بتلائے دیتا ہوں، کیونکہ عذر کا جواب دے دینے سے پھر حجت تام ہو جاتی ہے۔ اسلئے میں اتمام حجت کے لئے ان کا عذر بیان کر کے ان کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ دوسرے سبب مرض کے جاننے سے مرض کا ازالہ بھی سہل ہو جائے گا۔ کیونکہ

ع انما الاصلاح تبدیل المزاج

اصلاح کا طریقہ یہی ہے کہ مریض کے مزاج کو بدل دیا جائے۔ جس کی حقیقت یہ ہے کہ جو سبب ہے اس کے مرض کا اس کو زائل کر دیا جائے، تو سنئے۔ تاکد حق کے دو سبب ہوتے ہیں، کبھی تو عظمت حق کی وجہ سے حق کا تاکد ہوتا ہے اور کبھی حاجت کی وجہ سے۔ عظمت حق کی وجہ سے حق کا موکد ہونا تو ایسا ہے جیسے باپ کسی کام کو کہے کہ یہ کر اور پڑوسی کہے کہ مت کر۔ یہاں عقلاً اور شرعاً باپ کی اطاعت واجب ہے، کیونکہ اس کی عظمت پڑوسی کی عظمت سے زیادہ ہے اس لئے پڑوسی کی بات پر عمل نہ کیا جائے گا، بلکہ باپ کی بات پر عمل کیا جائیگا۔ خواہ اس کام میں باپ کا ذاتی نفع بھی نہ ہو، لیکن عظمت کی وجہ سے اس کی اطاعت پڑوسی کی اطاعت پر مقدم ہوگی، اور خواہ اس کا کچھ نفع ہو۔ جیسے باپ کہے کہ میرا بدن دبا اور پڑوسی کہے کہ میرا بدن دبا، تو بتلائیے اس صورت میں پڑوسی کا حق زیادہ ہوگا، یا باپ کا۔ سب عقلاء یہاں متفق ہیں کہ باپ کا حق زیادہ ہے اور حاجت کی وجہ سے تاکد کی مثال یہ ہے، جیسے ایک سائل آکر آپ سے روپیہ مانگے کہ مجھے ایک روپیہ دیدو۔ میں برف کی قلفیاں کھاؤں گا (جیسا کہ بعض بھنگڑ

رئیسوں سے ایسی فرمائش کیا کرتے ہیں اور وہ ان کو مجذوب سمجھ کر سب کچھ کھلاتے ہیں ۱۲) اور ایک سائل آکر یہ کہے کہ مجھے ایک روپیہ دیدو۔ میرے یہاں آٹھ دن کا فاقہ ہے، بچے بھوک کے تڑپ رہے ہیں، تو بتلائیے اس صورت میں کس کا حق زیادہ ہے، آیا اس شخص کا جو برف کی قلفیاں کھانے کو مانگتا ہے یا اس غریب کا جس کے یہاں آٹھ دن کا فاقہ ہے۔ یقیناً اس غریب فاقہ زدہ کا حق زیادہ ہے۔ ایسے ہی ایک رئیس کے یہاں شادی ہو۔ جس میں سو روپیہ نیوتہ دینے کے لئے آپ لے جا رہے ہوں حالانکہ اس کو آپ کے سو روپیہ کی کچھ بھی ضرورت نہیں۔ اور اس وقت ایک غریب آدمی پر جو شریف خاندان کا ہے کوئی مقدمہ قائم ہوگیا جس میں ضمانت نہ داخل کی گئی تو اس شریف آدمی کی آبرو جاتی رہیگی تو بتلائیے اس وقت نیوتہ میں امیر کو سو روپیہ دینا چاہیے جس کو کچھ بھی اس کی پرواہ نہیں یا اس غریب کی آبرو بچانی چاہیے، تو جس کو حس ہوگا وہ سمجھے گا کہ اس صورت میں روپیہ دینے سے زیادہ ضروری اس غریب کی آبرو کو بچانا ہے یہاں بھی حاجت کی وجہ سے حق کا تاکد ہوگیا۔ غرض آپ دنیا کے معاملات میں غور کرلیں تو معلوم ہوگا کہ تاکد حق کا سبب کبھی عظمت ہے، کبھی حاجت۔ مگر دین کے بارے میں اس قاعدہ پر کوئی بھی خیال نہیں کرتا۔ یہاں سب لوگوں نے تاکد حق کو صرف عظمت میں منحصر کر لیا ہے۔ جس کی عظمت قلب میں ہے اسی کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ حاجت کو تاکد حق کا سبب نہیں سمجھتے۔ اور اگر حاجت کی وجہ سے کسی کا حق ادا بھی کرتے ہیں تو وہ بھی جبکہ اپنے ملنے والوں میں سے کسی امیر کو حاجت پیش آجاوے۔

امیر و غریب کا فرق

بھائی غریب کی حاجت تو کوئی چیز نہیں، کیونکہ آج کل غریب ہونا بھی ایک جرم ہے. خصوصاً اس چودھویں صدی میں، چنانچہ ایک شخص کہتے تھے کہ آج کل غریبوں کی ایسی حقارت ہے کہ کسی امیر کی ریح صادر ہو جائے تو تبارک سلامت ہوتی ہے کہ صحت ہوئی اور غریب کی ریح صادر ہو تو کہا جاتا ہے کہ دماغ سڑا دیا، اور اس سے بڑھکر یہ کہ غریبوں کی روح کی بھی وہ قیمت نہیں جو امیروں کی ریح کی ہے. چنانچہ غریب کے مرنے کا لوگوں کو اتنا رنج نہیں ہوتا جتنا کسی امیر کی ریح بند ہو جانیکا ہوتا ہے۔

کسی شہر میں ایک بیگم صاحبہ نے اپنے محل میں سے کسی کے رونے چلانے کی آواز سنی تو ماما سے کہا دیکھنا کیا بات ہے۔ اس نے کہا محلہ میں فلاں غریب آدمی مر گیا ہے اس کے بیوی بچے رو رہے ہیں تو بیگم صاحبہ کہتی ہیں. اوئی میں تو یہ سمجھی کہ کوئی آدمی بیمار ہو گیا ہے (یعنی کوئی رئیس ۱۲) گویا ان کے نزدیک وہ غریب تو آدمی ہی نہ تھا۔ غرباء تو ان کے نزدیک گدھے ہی ہیں۔ بلکہ دیکھا جاتا ہے کہ امیروں کے بیمار ہونے سے بھی رنج ہوتا ہے اور غریبوں کے مرنے کی بھی پروا نہیں یہی وجہ ہے کہ امیروں کو زکام بھی ہو جائے تو سو آدمی ان کی عیادت کو آتے ہیں اور کوئی غریب مر جاوے تو اس کی بیوی بچوں کی تعزیت کو بھی کوئی نہیں جاتا۔ الا قلیل ۱۲) اور بعض لوگ تھوڑے سے غریبوں کی بھی کچھ ہمدردی کرتے ہیں بشرطیکہ مسلمان ہو۔ اور اگر مسلمان نہ ہو بلکہ ہندو

ہو۔ جیسے چمار بھنگی تو اس کے حقوق تو سمجھتے ہی نہیں وہ تو گویا بہائم ہیں، کہ جو چاہا انہیں کہہ دیا، اور جس طرح چاہا مار پیٹ لیا۔

ہندستانی لائبریری
گارڈن ریچ روڈ۔ مٹیا برج۔ کلکتہ

حقوق الخلق

صاحبو! اس وقت کیا ہوگا جبکہ یہ ثابت ہو جائے کہ بہائم کے بھی حقوق ہیں۔ میرا ارادہ ہوا تھا کہ اس وقت حقوق العباد کے بجائے حقوق الخلق بیان کروں، جس میں تمام مخلوق کے حقوق کا بیان ہو جائیں، کافروں کے بھی اور جانوروں کے بھی، مگر سارا قاعدہ بغدادی آج ہی کیونکر ختم کرا دوں اس لئے میں حقوق بہائم کی تفصیل کرتا نہیں چاہتا، مگر اجمالاً کہے دیتا ہوں کہ شریعت میں جانوروں کے بھی حقوق ہیں تو انسانوں کے حقوق کیوں نہ ہوں گے، جن کو آپ جانور سمجھتے ہیں، پس خوب سمجھ لو کہ غریب اگر کافر بھی ہو، اس کے بھی کچھ حقوق ہیں، ایسے ہی اگر کوئی مسلمان فاسق و فاجر ہو تو اس کے بھی حقوق ہیں، گناہ کرنے سے یا کفر کرنے سے وہ وقف نہیں ہو گیا کہ آپ جو چاہیں اس کے ساتھ معاملہ کریں۔ ایک بزرگ نے کسی شخص کو حجاج بن یوسف کی غیبت کرتے ہوئے دیکھا تھا، تو فرمایا کہ جس طرح حق تعالیٰ حجاج سے ان لوگوں کا بدلہ لیگا جن پر اس نے ظلم کیا تھا، ایسے ہی حجاج کا بدلہ ان لوگوں سے لے گا جنہوں نے اس کی غیبت وغیرہ کی ہوگی۔ حجاج خدا کی نافرمانی کر کے سب کے لئے وقف نہیں ہو گیا کہ جو بھی چاہے اس کو بُرا بھلا کہے۔ سبحان اللہ! ایسا کون قانون ہے جس میں باغیوں کے بھی

حقوق ہیں۔ یہ خدا ہی کا قانون ہے، جس میں باغیوں تک کے حقوق ہیں۔ چنانچہ بیٹے کو جائز نہیں کہ وہ جہاد میں اپنے کافر باپ کو قتل کرے، گو وہ خدا کا باغی ہے، مگر خدا تعالےٰ نے بیٹے پر اس کا یہ حق رکھا۔ غرض ہم لوگوں نے تاکد حق کا سبب محض عظمت کو سمجھ لیا ہے اور یہ مرض دیندار وں میں بھی ہے کہ وہ بھی اہل عظمت ہی کے حقوق کو زیادہ ادا کرتے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ دیوبند کے مدرسہ میں طلبہ سے کہا تھا کہ تم لوگ اساتذہ کی عظمت نہیں کرتے نہ ان کے حقوق کی رعایت کرتے ہو۔ پھر میں نے کہا۔ کہ شاید آپ اپنے دل میں کہتے ہوں کہ ہم تو حضرت مولانا محمود حسن صاحب کی بہت عظمت کرتے ہیں اور ان کی خدمت بھی کرتے ہیں تو ذرا دل میں خیال کر لو کہ مولانا کی یہ عظمت و خدمت محض استاد ہونے کی وجہ سے ہے یا ان کی شہرت و عظمت کی وجہ سے ہے، ظاہر ہے کہ محض حق استادی کی وجہ سے تم مولانا کی عظمت نہیں کرتے ورنہ اس کی کیا وجہ کہ اور استادوں کی عظمت و وقعت نہیں کی جاتی آخر وہ بھی تو استاد ہیں۔ معلوم ہوا کہ مولانا کی عظمت بوجہ شہرت کے کرتے ہو کہ وہ سب سے زیادہ بزرگی وغیرہ میں مشہور ہیں تو جب اہل علم میں بھی یہ مرض ہے کہ وہ مشاہیر اہل عظمت ہی کے حقوق ادا کرتے ہیں، پھر دوسروں کا تو کیا کہنا۔

بالذات و بالعرض کا تفاوت

غرض اس غلطی میں قریب قریب سب ہی مبتلا ہیں، کہ لوگوں نے

تاکہ حق کے مدار کو عظمت ہی میں منحصر سمجھ لیا ہے یہی وجہ ہے کہ حقوق اللہ کی تو کچھ رعایت کی بھی جاتی ہے اور حقوق العباد کی رعایت بالکل نہیں کیجاتی کیونکہ عظمت کے لحاظ سے بندہ خدا کے سامنے کچھ بھی نہیں، حق تعالیٰ کی وہ عظمت ہے، کہ اس کے سامنے بندہ من حیث ہو، بندہ کچھ عظمت نہیں رکھتا۔ بندہ چاہے کیسا ہی عظیم ہو۔ حق تعالیٰ کی عظمت کے سامنے اس کی عظمت مٹ جاتی ہے۔ جیسے آفتاب کے سامنے چاند اور ستاروں کی روشنی مٹ جاتی ہے، حالانکہ اسوقت آفتاب پر بادل بھی آرہا ہے مگر چاند ستاروں کے مٹانے کے لیئے وہ اب بھی کافی ہے ؎

چو سلطان عزت علم برکشد

جہاں سر بجیب عدم در کشد

دیکھئے جگنو رات کو تو چمکتا ہے، مگر دن کو نہیں چمکتا۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تو دن میں کہاں رہتا ہے جو نظر نہیں آتا۔ کہا میں تو دن میں اسی جگہ رہتا ہوں جہاں رات کو ہوتا ہوں، مگر دن میں آفتاب کے سامنے چمک نہیں سکتا۔ شیخ سعدیؒ اسی کو فرماتے ہیں ؎

مگر دیدہ باشی کہ در باغ و راغ

بتابد بہ شب کرمکے چوں چراغ

یکے گفتش اے کرمک شب فروز

چہ بودت کہ بیروں نیائی بروز

نہ بینی کہ آں کرمک، پاک، زاد

جواب از سرِ روشنائی چہ داد
کہ من روز و شب جز الصحرا نیم
و لے پیش خورشید پیدا نیم

اسی لئے حق تعالیٰ شانہ، ارشاد فرماتے ہیں۔

فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝

کہ عزت و عظمت بتمامہا حق تعالیٰ کے لئے ہے، اس کی عظمت کے سامنے کسی کی کچھ عظمت نہیں۔ اس پر کو یہ شبہ ہو کہ دوسری جگہ تو حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں، کہ:

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ

کہ عزت اللہ کے لئے ہے اور اس کے رسول کے لئے اور مومنین کے لئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کے لئے بھی عزت ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت میں عزت بالذات کا ذکر ہے اور دوسری جگہ عام ہے۔ بالذات اور بالواسطہ کو پس حاصل یہ ہوا، کہ عزت بالذات تو بتمامہا اللہ ہی کے لئے ہے اور عزت بالواسطہ رسول اور مومنین کے لئے بھی ہے، غرض بالذات اور بالعرض کا فرق ہے، بالذات کے درجہ میں سوائے حق تعالیٰ کے کسی کے لئے بھی عظمت نہیں، انسان چاہے کتنا ہی بڑا عظیم ہو، اس کی عزت بالذات نہیں بلکہ بالعرض ہے، جو کہ عظمت الٰہی کے سامنے سلب ہو جاتی ہے۔ یہی تو وہ بات ہے جس کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا تھا۔ جس پر آج اعتراض ہو رہے ہیں، انہوں نے بھی یہی کہا ہے،

جو فَاِنَّ الْعِزَّتَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا

سے مفہوم ہو رہا ہے، اتنا فرق ہے کہ حق تعالیٰ نے:

فَاِنَّ الْعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا

عربی میں فرمایا اور مولانا شہیدؒ نے اس مضمون کو اردو میں کہہ دیا ہے، باقی بات ایک ہی ہے، زبان بدلنے سے حکم نہیں بدل جاتا، زبان تو وہ چیز ہے کہ حق تعالیٰ کے یہاں اس کا کچھ بھی اعتبار نہیں، ان کی نظر تو حقیقت پر رہتی ہے اور یہی حال اہل اللہ کا ہے۔

بے زبانی کا اثر

ہمارے حاجی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے پاس ایک رومی شیخ آئے تھے، اس وقت حاجی صاحب مثنوی کا درس دے رہے تھے، اور حاجی صاحبؒ کی عادت تھی کہ تقریر اردو میں فرمایا کرتے تھے، گو حضرت کو فارسی پر بھی پوری قدرت تھی اور وہ شیخ فارسی سمجھ بھی لیتے مگر بے تکلف زبان اردو ہی تھی اسلئے اپنی ہی زبان میں تقریر فرما رہے تھے، مگر باینہمہ وہ رومی درس سے محظوظ ہو رہے تھے حالانکہ وہ اردو بالکل نہ سمجھتے تھے، درس کے وقت کسی خادم نے حضرت سے عرض کیا کہ اگر یہ اردو سمجھتے تو انہیں کتنا لطف آتا جو بغیر سمجھے بھی اس قدر محظوظ ہو رہے تھے۔ حاجی صاحبؒ نے فرمایا میاں ان مضامین کے لئے اس زبان کی قید نہیں، وہاں تو کوئی دوسری ہی زبان ہے، پھر مولانا کے یہ شعر پڑھے ؎

پارسی گو گرچہ تازی خوشتر است
عشق را خود صد زبان دیگر است
بوئے آں دلبر چو پرّاں می شود
ایں زبانہا جملہ حیراں می شود

بلکہ بعض اوقات بے زبانی میں وہ اثر ہوتا ہے، جو زبان دانی میں نہیں ہوتا، میں نے ابھی (وعظ سے پہلے) مجمعِ عام میں کہا تھا کہ ریل کے سفر میں ایک ڈپٹی صاحب مجھ سے ملے اور بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ میں اخلاق کے ساتھ کھلکر ان سے باتیں کر رہا تھا کہ اتنے میں مغرب کی نماز کا وقت آگیا تو میں اور خواجہ صاحب اور چند رفقاء نماز کے اہتمام میں مشغول ہو گئے۔ وہ ڈپٹی صاحب نماز نہ پڑھتے تھے ویسے ہی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ خواجہ صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ ان ڈپٹی صاحب کو نماز کے لئے کہنا چاہئے کیونکہ یہ آپ سے محبت ظاہر کرتے ہیں۔ آپ کا کہنا ان کو ناگوار بھی نہ ہوگا اور امید ہے کہ اثر بھی زیادہ ہوگا۔ اور باوجود قدرت کے امر بالمعروف کو ترک کرنا شاید نامناسب ہو، میں نے کہا امر بالمعروف اس موقع میں واجب نہیں کیونکہ ان کو نماز کا فرض ہونا معلوم ہے اور یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ چند آدمی نماز کو اٹھے ہیں، اب بھی اگر ان کو توفیق نہ ہو تو یہ ان کی کوتاہی ہے، باقی میں تو زبان سے کچھ نہ کہوں گا، کیونکہ میرے کہنے سے اگر انہوں نے نماز پڑھ بھی لی تو پڑھیں گے اپنے واسطے اور احسان ہوگا میری گردن پر، ہو مجھ کو تو اس سے غیرت آتی ہے کہ دین کے کام میں ان کا احسان اپنے سر لوں، اگر آپ کو امر بالمعروف

کا ایسا ہی جوش ہے تو آپ خود کیوں نہیں کہتے؟ باقی اتنا میں کہے دیتا ہوں کہ اس وقت نماز کے لئے کہنے کا ان پر وہ اثر نہ ہوگا جو نہ کہنے کا اثر ہوگا۔ خیر خواجہ صاحب نے بھی ان سے کچھ نہ کہا اور میں نماز پڑھکر پھر ان کے پاس آبیٹھا اور جس بشاشت سے پہلے باتیں کر رہا تھا، اسی بشاشت سے اب بھی کرنے لگا۔ میں نے ظاہری برتاؤ سے یہ بات بالکل ان پر ظاہر نہیں ہونے دی کہ مجھے آپ کے نماز نہ پڑھنے سے انقباض ہوا یا آپ کی حقارت میرے دل میں ہے، ہرگز نہیں۔ اس کے بعد دوسری نماز کا وقت آیا اور ہم اسی طرح نماز کو اٹھے اور بعد نماز کے میں پھر انہیں ڈپٹی صاحب کے پاس آبیٹھا اور اسی نشاط سے پھر باتیں کرنے لگا۔ اس کا ان کے دل پر بے حد اثر ہوا اور وہ نماز کے سخت پابند ہو گئے، اور ایک صاحب سے کہتے تھے کہ صاحب ریل کے سفر میں جب مولانا نماز کو اٹھے تو مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا میرے سر پر جوتیاں پڑ رہی ہیں اور غضب یہ کہ مولانا نے مجھ سے ایک دفعہ بھی زبان سے یہ نہ فرمایا، کہ آؤ تم بھی نماز پڑھ لو، اگر یہ فرما دیتے تو میں کچھ عذر ہی کر دیتا جس سے شرمندگی کم ہو جاتی (۱۲) اور اس وقت میں یہ خیال کرتا تھا کہ شاید اب نماز پڑھکر جو مولانا آئیں گے تو نہ میرے پاس بیٹھیں گے نہ مجھ سے بات کریں گے۔ مگر جب وہ نماز سے فارغ ہو کر بدستور میرے پاس آبیٹھے اور اسی بشاشت سے گفتگو کرنے لگے جیسے پہلے کر رہے تھے تو واللہ اس ادا نے تو مجھے ذبح ہی کر ڈالا بھائی اس روز سے میں نماز کا پورا پابند ہو گیا ہوں۔

راوی نے جب ان کا یہ قول مجھ سے نقل کیا تو میں نے لوگوں سے کہا،

بتلاؤ اس وقت امر بالمعروف کا زیادہ اثر ہوتا یا خاموش رہنے کا زیادہ اثر ہوا۔ امر بالمعروف سے اتنا ہو جاتا کہ وہ صرف اس وقت نماز پڑھ لیتے، مگر یہ جو اثر ہوا کہ وہ شرمندگی سے ذبح ہو ہو گئے اور عمر بھر کے لئے نمازی بن گئے یہ بے زبانی ہی کا اثر تھا، تو دیکھئے اس وقت ان کو کچھ نہ کہنے کا اثر وہ ہوا جو کہنے سے نہ ہوتا، یہاں بے زبانی سے زیادہ اثر ہوا اور واقعی گو میں نے ان کو زبان سے نماز کے لئے نہ کہا تھا، مگر دل میں یہی نیت تھی کہ انشاء اللہ میرے سکوت سے ان پر زیادہ اثر ہوگا۔ (چنانچہ ایسا ہی ہوا، واقعی حکیم ہر کام کا موقع خوب سمجھتا ہے، سیاست اسی کا نام ہے کہ ہر شخص کی تربیت اس کے مناسب طریق سے کیجائے، اور یہ بات حضرت اقدس میں بالکل وبتمام بحمد اللہ نمایاں ہے فللہ دره من حکیم ۱۲ جامع) غرض کبھی بے زبانی بھی زبان سے زیادہ کام دیتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ زبان پر اثر کا مدار نہیں۔ پس محض زبان کے بدلنے سے دوسرا اثر لے لینا عجیب بات ہے جو لوگوں کی کم فہمی پر دال ہے۔

ہمارے ملنے والوں میں ایک بزرگ تھے امیر شاہ خان صاحب، وہ پرانے بزرگوں کے دیکھنے والے تھے، تحریکات حاضرہ میں ان کی رائے وہی تھی جو میری رائے ہے، ان کا قیام میندھوں میں رہتا تھا، جہاں کچھ دنوں سے مولوی حبیب احمد صاحب کیرانوی بھی مدرس ہو کر پہنچ گئے ہیں، ان کی رائے بھی تحریک حاضرہ میں میرے موافق ہے (بلکہ وہ ہم سے بھی زیادہ پختہ ہیں ۱۲ جامع) مگر لوگوں کی یہ حالت تھی کہ مولوی حبیب احمد صاحب کی باتوں پر تو اعتراض کرتے تھے اور امیر شاہ خان صاحب سے خوش تھے۔ ایک دفعہ امیر شاہ خاں صاحب

نے مجھے لکھا کہ میرا مسلک بھی وہی ہے جو مولوی حبیب احمد صاحب کا ہے جو وہ کہتے ہیں وہی میں کہتا ہوں، مگر اتنا فرق ہے کہ وہ اردو میں کہتے ہیں اور میں فارسی میں کہتا ہوں اس لئے لوگ میری باتوں سے متوحش نہیں ہوتے اور ان پر اعتراض و طعن کرتے اور برا بھلا کہتے ہیں، تو حقیقت میں یہ عوام کی کم فہمی ہے، ورنہ خدا تعالیٰ کے یہاں زبان کی کچھ قید نہیں۔ اسلئے زبان کے بدلنے سے شرعاً حکم نہیں بدل جاتا، چنانچہ مولانا شہیدؒ بھی حقیقت میں وہی کہتے تھے جو حق تعالیٰ نے فرمایا:

فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ

میں فرمایا ہے، مگر انہوں نے اس کو اردو میں کہہ دیا، اس سے لوگ متوحش ہونے لگے اور بیچاروں پر فتوے لگانے لگے۔ بہر حال چونکہ حق تعالیٰ کی

لہ میں کہتا ہوں کہ حفظ الایمان کی عبارت دربارہ مسئلہ علم غیب پر جو اہل بدعت نے شور مچایا ہے اسکی بھی یہی اصل ہے کہ مضمون حفظ الایمان کا وہی ہے جو شرح مقاصد و شرح مواقف وغیرہ میں سلف نے بیان فرمایا ہے، بلکہ ان کے الفاظ سے حفظ الایمان کے الفاظ بہت کم ہیں مگر سلف نے عربی میں کہا تھا اس لئے ان پر کچھ اعتراض نہ ہوا اور حفظ الایمان میں وہی مسئلہ اردو میں ظاہر کیا گیا تو شور و شغب ہونے لگا۔ اسی طرح بہشتی زیور کا مسئلہ نسب کتب فقہ میں مصرح ہے، عالمگیری اور دُرِّ مختار ملاحظہ ہو، مگر ان پر کوئی اعتراض نہیں کرتا، کیونکہ انہوں نے عربی میں لکھا ہے اور بہشتی زیور پر بعض علماء کا جہلا نے خواہ مخواہ زبان طعن دراز کی ہے۔ خدا ان کو ہدایت دے ۱۲ جامع۔

عظمت کے سامنے بندہ کی عظمت کچھ بھی نہیں، اسلئے لوگوں کو حقوق العباد کا اہتمام نہیں کہ وہ صاحب عظمت نہیں۔

حقوق العباد کی فوقیت

مگر میں نے بتلا دیا ہے کہ تاکد حق کا سبب صرف عظمت میں منحصر نہیں، بلکہ حاجت بھی تاکد حق کا ایک سبب ہے۔ پس حقوق اللہ کا تاکد تو عظمت کی وجہ سے ہے اور حقوق العبد کا تاکد حاجت کی وجہ سے ہے۔ فقہاء نے اس کو سمجھا ہے اور واقعی فقہاء حکمائے امت ہیں، اسی طرح صوفیہ بھی اور فقہ کی تعریف تصوف کو بھی شامل ہے۔ سلف میں فقہ فقط احکام ظاہرہ کے علم کا نام نہ تھا، بلکہ مجموعہ احکام ظاہرہ و باطنہ کے علم کو فقہ کہتے تھے۔ چنانچہ امام صاحب نے فقہ کی تعریف یوں فرمائی ہے:

"معرفة النفس مالها وما عليها"

جس میں تصوف بھی داخل ہے تو فقہاء جابجا فرماتے ہیں:

"حق العبد مقدم علی حق اللہ"

کہ بندہ کا حق اللہ تعالیٰ کے حق پر مقدم ہے۔ ان کا یہ مطلب نہیں کہ نعوذباللہ عظمت کی وجہ سے ایسا ہے بلکہ احتیاج کی وجہ سے حق العبد کو حق اللہ پر مقدم کہا گیا ہے۔ کیونکہ بندہ محتاج ہے اور حق تعالیٰ احتیاج سے بری ہیں۔ مگر فقہاء کا یہ جملہ ظاہر میں ایسا دہشت ناک ہے کہ اگر کوئی صوفی ایسا کہہ دیتا تو کفر کے فتوے لگ جاتے، مگر فقہاء بے دھڑک فرماتے ہیں کہ حق العبد حق اللہ پر مقدم

ہے۔ کیونکہ وہ منتظم ہیں، ان کو حقوق کا انتظام کرنا ہے اور واقعی حقوق العباد کا
اہتمام بدوں اس طرح صاف صاف کہے نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر ان پر کوئی فتویٰ
نہیں لگاتا، لوگ ان کو قانونی سمجھتے ہیں، اس لئے ان سے ڈرتے ہیں جانتے
ہیں کہ اگر ان پر اعتراض کیا گیا تو جھاڑ کی طرح پیچھے لگ جائیں گے اور ایک مسئلہ
کے ثابت کرنے کو رسالے کے رسالے تصنیف کر دیں گے، اور صوفیہ بیچارے
غریب ہیں کسی سے بحث مباحثہ نہیں کرتے اسلئے ان کو سب دباتے ہیں، اور
ان کی بات بات پر فقرے لگائے جاتے ہیں، وہ تو ایسے غریب ہیں کہ کوئی ان کو
غریب کہہ بھی دے تب بھی برا نہیں مانتے اور ذرا اہل ظاہر کو تو غریب کہہ دو
دیکھو کیسے چڑتے ہیں۔ اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک نواب نے کسی
مصلحت سے ایک گنوار کو مجسٹریٹ بنا دیا تھا، وہ مقدمات کا فیصلہ کرنے لگا
ایک دفعہ کسی نے عرضی پیش کی تو اس میں لکھا تھا کہ غریب پرور سلامت تو آپ
بہت برہم ہوئے اور کہا نواب صاحب تو ہم کو مسفق (بسین مہملہ) مہربان کہتے
ہیں اور یہ نالائق ہم کو گریب (غریب ۱۲) لکھتا ہے، اچھا پانچ روپے جرمانہ۔
اس الو کی سمجھ میں غریب ہی آیا۔ پرور کو وہ سمجھا ہی نہیں، اور شاید یہ خیال کیا ہو، کہ
پرور بھی کوئی تحقیر کا لفظ ہے۔ جبھی تو غریب کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ غرض آجکل
غریب کہنے سے بھی لوگ چڑتے ہیں، مگر صوفیہ اس سے بھی برا نہیں مانتے، بلکہ کوئی
انہیں جاہل بھی کہدے جب بھی برا نہیں مانتے۔ کیمیاگر کو اگر کوئی یوں کہدے
کہ اسے کیمیا نہیں آتی ویسے ہی جھوٹ موٹ کیمیاگر بنا ہوا ہے تو وہ کبھی ناخوش نہ
ہوگا۔ بلکہ خوش ہوگا کہ اچھا ہے لوگ یوں ہی سمجھتے رہیں۔ تاکہ میں پولیس کی دست برد

سے بچا رہوں، اسی طرح کسی صوفی کو کوئی جاہل کہدے تو وہ خوش ہوتے ہیں کہ اچھا ہوا میں رجوع خلائق سے بچا ورنہ لوگ ہجوم کرکے خلوت مع المحبوب سے روک دیتے اور کبھی ان کو جواب کا جوش بھی ہوتا ہے تو اندر سے کوئی یوں کہتا ہے ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق مستی
بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

غرض صوفیہ حق العبد کو حق اللہ پر مقدم کہدیتے تو ان پر فتوے لگ جاتا، مگر فقہاء کو کوئی کچھ نہیں کہتا وہ صاف کہتے ہیں کہ حق العبد مقدم علی حق اللہ اور منشا اس کا صرف یہی ہے کہ بندہ محتاج ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آج سے حقوق اللہ کو ترک کرکے حقوق العبد ہی کو لے لو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جہاں دونوں میں تعارض ہو وہاں حق العبد مقدم ہے اور یہ بھی شریعت کا حکم اور حق اللہ ہی ہے اور جہاں تعارض نہ ہو وہاں ہر ایک کو اپنے اپنے موقع پر ادا کرنا چاہیے۔ دیکھو اگر باپ بیٹے سے یوں کہے کہ کھانا کھالے اور ماں کہے کہ پانی پی لے تو اس وقت ان دونوں باتوں پر عمل کیا جائے گا، کیونکہ دونوں میں تعارض کچھ نہیں دونوں کا جمع ممکن ہے، اور اگر باپ کہے کہ پہلے نمکین کھاؤ اور ماں کہے کہ پہلے میٹھا کھاؤ، تو یہاں البتہ سوال ہو گا کہ دونوں میں سے کس کا حق ادا کیا جائے۔ غرض مقدم و مؤخر کو وہیں دیکھا جاتا ہے جہاں تعارض ہو اور عدم تعارض کے وقت دونوں کو اختیار کیا جاتا ہے۔ پس اب بتلاؤ کہ نماز پڑھنے اور قرض

ادا کرنے میں کیا تعارض ہے، کچھ بھی نہیں، پس دونوں کو بجالاؤ، نماز بھی پڑھو اور قرض بھی دو۔ تعارض کی صورت یہی ہے، کہ مثلاً ایک شخص کے پاس سو روپیہ ہیں، جن پر سال بھی گذر گیا ہے تو قاعدہ سے اس میں دو روپے آٹھ آنے زکوٰۃ کے واجب ہونے چاہئیں۔ مگر اس شخص پر کسی کا دین بھی ہے، تو اس وقت حق تعالیٰ فرماتے ہیں، کہ اگر تم پر کسی کا دین بھی ہے، تو پہلے بندہ کا حق ادا کرو۔ زکوٰۃ ساقط ہے۔ یہاں فقہاء فرماتے ہیں کہ حق العبد حق اللہ پر مقدم ہے۔

حق النفس

یہ بھی حقیقت میں حق اللہ ہی ہے، کیونکہ بندوں کے حقوق ادا کرنا حق تعالیٰ ہی کے حکم کی وجہ سے تو لازم ہے۔ حق تعالیٰ نے خود حکم دیا ہے کہ بندوں کے حقوق ادا کرو، اس بناء پر یوں کہنا چاہئے کہ اس وقت ایک حق اللہ دوسرے حق اللہ پر مقدم ہو گیا، اس لئے حق اللہ و حق العبد میں تعارض بھی نہیں۔ مگر چونکہ ظاہر میں وہ حق العبد معلوم ہوتا ہے، اسلئے یہ کہا جاتا ہے کہ حق العبد حق اللہ پر مقدم ہے، مگر یہ محض ظاہری تقویم ہے، اور ایک حقیقت کی بناء پر یہ ظاہری تقویم بھی رفع ہو جاتی ہے، اور وہ حقیقت حق تعالیٰ نے میرے قلب پر وارد فرمائی ہے۔ میں نے منقول کہیں نہیں دیکھا۔ وہ یہ کہ حق اللہ سے مراد حق النفس ہے، کیونکہ جن امور کو حق اللہ کہا جاتا ہے وہ طاعات و عبادات ہیں، اور ظاہر ہے

کہ بندہ کے افعال سے حق تعالیٰ کا نہ کوئی نفع ہے نہ کوئی ضرر ہے، بلکہ نفع یا ضرر جو کچھ ہے بندہ ہی کا ہے، تو یقیناً حق اللہ میں جو اضافت ہے یہ اضافت نفع یا ضرر کی نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ حق العبد میں اضافت نفع یا ضرر کیلئے ہے۔ کہ وہ ایسا حق ہے، جسکا ادا کرنا بندہ کو نافع اور تلف کرنا بندہ کو مضر ہے۔ اس طرح یہاں نہیں کہہ سکتے کہ یہ طاعات و عبادات ایسے حق اللہ ہیں کہ ان کا ادا کرنا بندہ کو نافع اور تلف کرنا بندہ کو مضر ہے، اس طرح یہاں نہیں کہہ سکتے کہ یہ طاعات و عبادات ایسے حق اللہ ہیں کہ ان کا ادا کرنا خدا کو نافع اور تلف کرنا ان کو مضر ہے۔ (نعوذ باللہ) پس میرے نزدیک حق اللہ سے مراد حق النفس ہے اور حق العبد سے مراد حق الغیر ہے۔ اس تفسیر پر دونوں جگہ اضافت یکساں ہو گی۔ یعنی ہر جگہ اضافت نفع و ضرر ہے۔ پس حق اللہ یعنی حق النفس تو وہ ہے جس کا ادا کرنا اپنے آپ کو نافع اور ضائع کرنا اپنے آپ کو مضر ہے اور حق العبد یعنی حق الغیر وہ ہے جس کا ادا کرنا دوسروں کو نافع اور تلف کرنا دوسروں کو مضر ہے۔

پس اس تفسیر پر حق اللہ و حق العبد میں کہیں تعارض نہیں ہوا، اور جو اشکال حق العباد کو حق اللہ پر مقدم کرنے میں ہوتا تھا، وہ بھی نہ رہا، کیونکہ اس تفسیر پر جس کو حق اللہ کہا جاتا ہے وہ حقیقت میں حق النفس ہے، پس جہاں حق اللہ پر حق العبد کو مقدم کیا جاتا ہے وہاں درحقیقت حق الغیر کو حق النفس پر مقدم کیا گیا ہے۔ اور اس میں کچھ بھی اشکال نہیں، بلکہ یہ تو ایثار ہے،

جسکا ذکر اس آیت میں ہے۔

وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِہِمْ وَلَوْ کَانَ بِہِمْ خَصَاصَۃٌ۔

ایثار کے آثار

اس میں حق تعالیٰ نے بعض صحابہؓ کی (یعنی حضرت ابو طلحہؓ کی) مدح فرمائی ہے کہ اپنے نفسوں پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود بھوکے رہیں، ان کا قصہ یہ ہوا تھا کہ ایک بار یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمانوں کو اپنے گھر لے آئے تھے اور انہوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہیں ان سے کوئی چیز بچانا نہیں، انہوں نے کہا کہ ہمارے گھر تو آج اتنا ہی کھانا ہے جو صرف بچوں کو کافی ہو سکتا ہے تو حضرت ابو طلحہؓ نے فرمایا کہ پھر تم بچوں کو تو بہلا پھسلا کر سُلا دینا اور ہم دونو بھی کھائیں گے نہیں، جو کچھ کھانا تیار ہے سب مہمانوں کے سامنے رکھدینا مگر وہ مہمان ایسے ہیں کہ بدوں ہمارے کچھ کھائیں گے نہیں تو تم یہ کام کرنا کہ جس وقت مہمان گھر میں آئیں، اسی وقت چراغ گل کر دینا، پھر میں کہدونگا کہ چراغ گل ہو گیا ہے اور روشن کرنے کا سامان اسوقت دشوار ہے (کیونکہ اس زمانہ میں دیا سلائی کہاں تھی، چقماق وغیرہ سے کام کرتے تھے ۱۲) اسلئے اندھیرے ہی میں کھانا کھا لیجئے، ہم بھی ان کو دکھلانے کے لئے ساتھ بیٹھ جائیں گے اور منہ چلاتے رہیں گے تاکہ وہ سمجھیں کہ یہ بھی کھاتے ہیں، چنانچہ ایسا ہی کیا کہ دونوں میاں بی بی خود بھوکے رہے اور مہمانوں کو کھلا دیا۔ یہ

ایثار ہے، جس پر حق تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی، صوفیہ کو اس کا بہت اہتمام رہتا ہے، وہ ہمیشہ اس کا خیال رکھتے ہیں کہ اپنے نفس پر دوسروں کو مقدم کریں اور اپنے متعلقین کو بھی وہ اس کی تعلیم دیتے ہیں، مگر اس واقعہ مذکورہ پر ایک اشکال ہے، میں اس کو بھی رفع کئے دیتا ہوں، ان علماء و طلباء کی بڑی مشکل ہے، ان کو ہر جگہ شبہے پڑتے ہیں اور ہمیں صوفیہ کی بھی رعایت کرنی پڑتی ہے، کیونکہ ہم ان کو بھی مجتہد و فقیہ سمجھتے ہیں، اس لئے اس کا بھی خیال رہتا ہے کہ ان کا فعل خلاف شرع نہ ہو، چنانچہ ایثار کرنا صوفیہ کا طرز ہے اور اس لئے وہ اس آیت سے استدلال کرتے تھے، اس پر یہ اشکال آتا ہے کہ ان صحابی نے (جنکا واقعہ شان نزول میں مذکور ہوا ہے) مہمانوں کو اپنے نفس پر اور بچوں پر جو مقدم کیا تو یہ جائز کہاں تھا۔ کیونکہ اپنے نفس کے بھی تو کچھ حقوق ہیں:

إِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا۔

اس کا جواب علماء اہل ظاہری نے بہت اچھا دیا ہے کہ ان کو اس درجہ کی بھوک نہ تھی جیسی مہمانوں کو تھی (یعنی انہوں نے اپنے نفس کے حق کو ضائع نہیں کیا۔ بلکہ یوں کہو کہ اپنے کو زیادہ راحت نہیں دی کہ اس میں کچھ اشکال نہیں کہ دوسروں کی کلفت رفع کرنے کو اپنی راحت میں کچھ کمی کر دیجائے ١٢) اب یہ شبہ رہا کہ بچوں پر مہمانوں کو کیسے مقدم کیا۔ ان کی تو اجازت بھی معتبر نہ تھی، اسکا جواب دیا گیا کہ بچوں کو بھوک نہ تھی، وہ تمہارے بچوں کی طرح نہ تھے، جنکا پیٹ بھرتا ہی نہیں اور اس بات کو ماں باپ خوب سمجھ

سکتے ہیں کہ اس وقت بچہ کو بھوک ہے یا محض کھانا دیکھ کر حرص کرنے لگے ہیں تو حضرت ابو طلحہؓ کو قرائن سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ بچوں کو بھوک نہیں ہے۔ وقت پر اچھی طرح کھا چکے ہیں اور رات کو نہ کھلانے سے انہیں کلفت نہ ہو گی، اس لئے بہلا پھسلا کر سلوا دیا۔ اب اگر یہ سوال ہو کہ اس پر کیا دلیل ہے کہ حضرت طلحہؓ کے نزدیک بچے بھوکے نہ تھے محض حرص ہی کا درجہ باقی تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ معقول پڑھکر آؤ تو معلوم ہو گا، دلیل مستدل کے ذمہ ہے یا مانع کے ظاہر ہے کہ مانع کے ذمہ دلیل نہیں بلکہ منع کے لئے ابداء احتمال کافی ہے۔ اب مستدل کا فرض یہ ہے کہ اگر اس کو یہ احتمال تسلیم نہ ہو تو دلیل سے اس کو باطل کرے۔ غرض فقہاء نے جو یہ فرمایا ہے کہ:

"حق العبد مقدم علیٰ حق اللہ"

درحقیقت اس میں ایثار کی تعلیم ہے اور مطلب یہ ہے کہ اپنے نفس کے حقوق پر غیروں کے حقوق کو مقدم کرنا چاہئے۔ فقہاء اس کو اس عنوان سے تعبیر فرماتے ہیں اور صوفیہ اس کو ایثار سے تعبیر کرتے ہیں۔ حاصل دونوں کا ایک ہی ہے۔

ایثار کی حقیقت

اتنا فرق ہے کہ فقہاء نے صرف معاملات میں اس کا اہتمام کیا ہے۔ اور صوفیہ نے ہر امر میں اس کی سعی کی ہے، حتیٰ کہ عبادات میں بھی فرائض و واجبات کے اندر تو نہیں مگر مستحبات و فضائل میں وہ ایثار کرتے ہیں،

چنانچہ اگر کبھی کوئی صوفی صف اول میں کھڑا ہو جائے اس کے بعد کوئی بزرگ آجائیں استاد یا شیخ تو وہ پیچھے ہٹ کر اپنے بزرگ کو صف اول میں جگہ دے دیتے ہیں، اسی طرح یہ حضرات خاص حالات میں صف اول میں دائیں جانب کھڑا ہونے کا زیادہ اہتمام نہیں کرتے بلکہ بائیں جانب کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں، اور عام عادت یہ ہے کہ لوگ صف اول میں دائیں طرف کا بہت اہتمام کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ بائیں طرف بہت ہی کم لوگ ہوتے ہیں اور اس کو افضل سمجھتے ہیں حالانکہ یہ غلط ہے۔ دائیں طرف کو بائیں طرف سے مطلق فضیلت نہیں، بلکہ مدار قرب امام پر ہے، پس سب سے افضل تو وہ شخص ہے، جو امام کے پیچھے ہے، اس کے بعد وہ افضل ہے جو اس کے دائیں طرف ہو، پھر وہ جو اس کے بائیں طرف ہو، اسی طرح جب اس کے بعد ایک آدمی دائیں طرف اور آجائے تو اب دوسرے کو بائیں طرف کھڑا ہونا چاہیے، اس وقت اس کا بائیں طرف کھڑے ہونا دائیں طرف کھڑے ہونے سے افضل ہے۔ کیونکہ اس صورت میں بائیں طرف ہو کر یہ امام سے زیادہ قریب ہوگا اور دائیں طرف کھڑے ہونے سے بعید ہو جائے گا۔ غرض بائیں طرف کھڑا ہونے سے اگر امام کے اور اس کے درمیان میں چار آدمی کا واسطہ ہو اور بائیں طرف ہونے سے پانچ کا واسطہ ہو تو اس وقت بائیں طرف کھڑا ہونا افضل ہوگا، وعلیٰ ہذا القیاس پس صف کو اس طرح بھرنا چاہیے کہ ایک آدمی امام کے بالکل پیچھے ہو پھر ایک اس کے دائیں اور پھر ایک اس کے بائیں کھڑا ہوتا چلا جائے، مگر عوام یہ سمجھتے ہیں، کہ

پہلے دائیں جانب کو بھرنا چاہئے، جب اس طرف جگہ نہ رہے پھر بائیں طرف آنا چاہئے یہ غلط ہے، بلکہ دونوں طرف برابر آدمی ہونے چاہئیں مگر صوفیہ کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ خاص حالات میں زیادہ کوشش بائیں طرف کھڑا ہونے کی کرتے ہیں، اور دائیں طرف کے لئے دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، اسی طرح صفِ اول پر بھی مزاحمت نہیں کرتے

لہ : قلت قال العلامة الشعرانی فی العہود المحمدیة اخذ علینا العہد العام من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا رأینا میسرة المسجد قد عطلت من صلوٰة الناس فیہا ان نکرمہا بالصلوٰة فیہا جبرا لہا قال وقد روی ابن ماجہ وغیرہ عن ابن عمر قال قیل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم ان میسرة المسجد قد تعطلت فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من عمر میسرة المسجد کتب اللہ له کفلین من الاجر وفی روایة للطبرانی مرفوعًا من عمر جانب المسجد الایسر لقلة اہلہ اجران اھ (ص ٣٨)
قلت وہذا ہو السر فی اہتمام الصوفیہ بالجانب الایسر ای لقلة رغبة الناس فیہ واما اہتمامہم بالصف المؤخر مع کونہ خلافًا للحدیث خیر صفوف الرجال اولہا وشرہا آخرہا فالسر فیہ ما قالہ الشعرانی ایضا اخذ علینا العہد العام من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا صفت سرائرنا من جمیع ما یسخط اللہ عزوجل بحیث لم یبق فی سرائرنا وظواہرنا الا ما یرضی ربنا ان نواظب علی الصلوٰة فی الصف الاول عملاً بقولہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلینی منکم اولوا الاحلام والنہی ای العقل ولا یکون العبد عاقلاً الا اذا کان لہذا الوصف الذی ذکرناہ فمن کان فی ظاہرہ او باطنہ صفة یکرہہا اللہ تعالیٰ فلیس بعاقل کامل (ای ولیس اہلا للقرب من الامام ایضا بدلالة الحدیث ١٢م) ولا یتقدم للصف الاول بین یدی اللہ فی مواکب الالہیة الانبیاء والملائکة

(بقیہ برصفحہ آئندہ)

بلکہ خاص حالات میں دوسروں کو صفِ اول میں جگہ دے دیتے ہیں اور خود صفِ ثانی یا ثالث میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور جنازہ کی نماز میں بھی وُہ ایسا ہی کرتے ہیں کہ اکثر پچھلی صف میں کھڑے ہوتے ہیں، اس کی ایک وجہ تو منقول ہے وہ یہ ہے کہ صفِ آخر میں کھڑا ہونے والا مکمل صفوف ہوتا ہے، اور حدیث میں ہے کہ جس میت پر مسلمانوں کی تین صفیں نماز کی ہو جائیں، اس کی مغفرت ہو جاتی ہے، تو صفِ ثالث میں کھڑا ہونے والا علت تامہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ومن کان علی اخلاقہم واما من تخلف عن اخلاقہم فیقف فی اخریات الناس خیر لہ اھ (صفحہ ۳۵) قال فاما حدیث خیر صفوف الرجال اولہا فالمراد بالرجال الکمل اھ (صفحہ ۳۶) ای الکاملون فی الاحلام والنہی کیلا تتضاد الآثار فان حدیث لیلینی منکم اولوا الاحلام والنہی کما یفید طلب الدنو من ہولاء یفید طلب التاخر عمن لیس علی منزلتہم ایضا او یقال خیر صفوف الرجال اولہا خبر بمعنی الانشاء ای لیجعل الامام خیار الرجال فی الاول الصف واللہ اعلم فاذا رای احد غیرہ افضل منہ فتاخر لہ من الصف الاول وقدمہ فقد عمل بقولہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلینی اولوا الاحلام والنہی فای لوم علیہ اذا قدم من کان احق بالصف الاول منہ فافہم ولا تعجل بالانکار علی القوم فتندم ۱۲ جامع۔
قلت وقد علمت مما ذکرنا سابقا ان فی ذلک عملا بقولہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلینی منکم اولوا الاحلام والنہی رواہ مسلم فی صحیحہ وقال فی الدر المختار وفی حاشیۃ الاشباہ للحموی عن المضمرات عن النصاب وان سبق احد الی الصف الاول فدخل رجل اکبر منہ سنا او اہل علم ینبغی ان یتاخر ویقدمہ تعظیما لہ اھ فہذا یفید جواز الایثار بالقرب بلا کراہۃ خلافا للشافعیۃ وقال

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

کا جزو اخیر ہے جو بسبب مغفرت ہے۔ اور ایک وجہ میرے قلب میں آئی ہے، وہ یہ کہ صف اول والے بلا واسطہ میت کے لئے دعا کرتے ہیں اور صف اخیر والا اگلی صف کے مسلمانوں کو بھی واسطہ بناتا ہے اور سب کے واسطے دعا کرتا ہے، اسلئے صوفیہ پیچھے کھڑے ہوتے ہیں، تاکہ اگلوں کو واسطہ بنا کر دعا کریں، خیر جماعت جنازہ کا ذکر تو بیچ آگیا تھا، میں یہ کہہ رہا تھا کہ صوفیہ جماعت صلوٰۃ

(بقیہ صفحہ گزشتہ) وقال فی الاشباہ لم ارہ لاصحابنا ونقل علامۃ البیری فروعا تدل علی عدم الکراہۃ ویدل علیہ قولہ تعالیٰ یؤثرون علی انفسہم ولو کان بہم خصاصۃ وما فی صحیح مسلم من انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اتی بشراب فشرب منہ وعن یمینہ اصغر القوم وہو ابن عباس وعن یسارہ الاشیاخ فقال صلی اللہ علیہ وسلم للغلام اتاذن لی فی ان اعطی ہؤلاء فقال الغلام لا واللہ فاعطاہ الغلام. اذ لاریب ان مقتضا طلب الاذن مشروعیۃ ذلک بلا کراہۃ وان کان غیرہ افضل اھ (ای لو کان آثر الغلام غیرہ بحقہ کان ذلک جائزا لہ) اقول وینبغی تقیید المسئلۃ (ای مسئلۃ جواز الایثار) بما اذا عارض تلک القربۃ ما ہو افضل منہما کاحترام اہل العلم والاشیاخ کما افادہ الفرع السابق والحدیث فانہما یدلان علی انہ افضل من القیام فی الصف الاول او من اعطاء الاناء من لاحق فیکون الایثار بالقربۃ انتقالا من قربۃ الی ما ہو افضل منہا وہو الاحترام المذکور اما لو آثر علی مکانہ فی الصف مثلا من لیس کذلک یکون اعرض عن القربۃ بلا داع وہو خلاف المطلوب شرعا اھ (صفحہ ۵۹۴ ج ۱) قلت وکون الرجل لیس کذلک یختلف باختلاف الذوق فمن ذاق کونہ احسن الخلق کلہ وان کل مسلم افضل منہ فلہ تقدیم کل مسلم علی نفسہ ویکون فی ذلک عاملا بقولہ علیہ السلام لیلینی منکم الخ بتقدیم الافضل منہ عندہ فافہم واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ جامع

مفروضہ بھی صف اول میں ایثار کرتے ہیں۔ اگر کوئی ان کا بزرگ آ جائے تو اس کو مقدم کر دیتے ہیں، اس پر فقہا خشک اعتراض کرتے ہیں، کہ تم نے صف اول کے ثواب کو چھوڑ دیا، جس میں استغناعن الثواب ہے صوفیہ کہتے ہیں کہ ایک ثواب تو صف اول میں کھڑے ہونے کا ہے اور دوسرا ثواب تعظیم اہل اللہ کا جو اس سے بھی بڑھا ہوا ہے، تو ہم ظاہر میں گو ایک ثواب کے تارک ہوئے، مگر باطن میں دوہرے بڑے ثواب کے جامع ہوئے۔ تو استغنا عن الثواب کہاں ہوا، اس میں بھی تو طلب ثواب ہی ہے، پھر شرعی قاعدہ ہے۔

الدال علی الخیر کفاعلہ

اس بناء پر جس کو ہم نے صف اول میں کھڑا کیا ہے، اس کو جو فضیلت صف اول کی ہماری وجہ سے حاصل ہوگی، اس کا ثواب بھی ہم کو ملیگا تو ہم ثواب صف اول سے بھی محروم نہ ہوئے اور اس کے ساتھ دوسرے ثواب کے جامع ہو گئے ہمیں اس صورت میں دوہرا ثواب ملا۔

غرض ایثار حضرات صوفیہ کا بہت بڑا معمول ہے۔ بھلا بزرگوں کے ساتھ تو وہ کیونکر ایثار نہ کرتے۔ ان کا تو مذاق یہ ہے کہ وہ جانوروں کے ساتھ بھی ایثار کرتے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے والد ہیں، یہ بڑے بزرگ صاحب باطن ہیں اور اس کے ساتھ ہی بڑے عالم اور محدث بھی ہیں، ہندوستان میں علم حدیث یہی لائے گو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب

کی زیادہ ہے مگر اصل حدیث کے لانے والے یہاں پر یہی ہیں، یہ علامہ
ابوطاہر محدث مدنی کے شاگرد ہیں' ان کی ایک حکایت ایثار کے متعلق ہے

بزرگوں کے طریقے

مگر اس سے پہلے میں ایک دوسرا واقعہ بیان کردوں (کیونکہ دونوں
میں ارتباط ہے ۱۲) سو ایک واقعہ تو ان کا یہ ہے، کہ ایک دفعہ وہ بہت
قیمتی اور عمدہ لباس پہنے ہوئے دربار شاہی میں جارہے تھے۔ صوفیہ تا بعین
تو ہر حالت میں تقشف سے رہتے ہیں' اور یوں کہتے ہیں کہ ہم تو ظاہر میں
جیسے اپنے گھر رہا کرتے ہیں ویسے ہی بادشاہوں کے سامنے رہیں گے ہم
سلاطین کی عظمت کے لئے لباس کیوں تغیر کریں' اور ایسے صوفیوں کی
عوام کی نظر میں بہت زیادہ وقعت ہوتی ہے۔ مگر کامل کی یہ حالت ہوتی
ہے کہ ؎

گن چو کلکم درمیان اصبعین
نیستم درصف طاعت بین بین

وہ اپنے لئے کوئی خاص وضع وہیئت تجویز نہیں کرتا وہ ہر حالت
میں حکم کا تابع ہوتا ہے، اسلئے کبھی خستہ حال رہتا ہے کبھی بنا ٹھنا رہتا
ہے، یہ لوگ سلاطین کی ملاقات کے لیے قیمتی لباس بھی پہن لیتے ہیں،
کیونکہ اس میں مزور لہ کا اکرام ہے اور اکرام مزور لہ مطلوب ہے،
اس لیئے وہ ان کی خاطر اپنی وضع کو چھوڑ کر اس وقت شاہی وضع اختیار

کر لیتے ہیں، عوام ان کی اس حالت پر طعن کرتے ہیں کہ یہ بادشاہوں کی ملاقات کے لئے کیسے بنے ٹھنے جا رہے ہیں، مگر ان کو کیا خبر کہ وہ کس حالت میں ہیں، اسلئے کامل کا پہچاننا دشوار ہے، کیونکہ وہ کسی حالت و وضع کا پابند نہیں ہوتا تو عوام کو ہمیں ظاہرا دوسروں سے وہ خاص امتیاز نظر نہیں آتا ہے

در نیابد حال پختہ ہیچ خام
پس سخن کوتاہ باید والسلام

ایک بزرگ بی بی کا قصہ ہے کہ وہ رات کو بعد نماز عشاء کے خوب زینت کرتیں، عمدہ لباس پہنتیں، زیور سے آراستہ ہو کر کنگھی سرمہ لگاتیں، اور اس حالت میں شوہر کے پاس آکر ان سے دریافت کرتیں، کہ تم کو میری حاجت ہے، اگر وہ کہہ دیتے کہ ہاں تو ان کے پاس کچھ دیر بیٹ جاتیں اور اگر وہ کہتے کہ مجھے حاجت نہیں تو پھر کہتیں کہ اچھا اب مجھے اجازت دو کہ میں اپنے خدا کے ساتھ مشغول ہوں۔ چنانچہ شوہر کی اجازت کے بعد وہ اپنا لباس اور زیور وغیرہ اتار کر رکھ دیتیں، اور کمبل اور ٹاٹ کا لباس پہن کر تمام رات عبادت کرتیں، تو دیکھئے یہ بزرگ بی بی ایک وقت میں کیسی زینت کرتیں اور دوسرے وقت کمبل اور ٹاٹ میں رہتیں، اب اگر کوئی زینت کے وقت ان کو دیکھتا تو یہی کہتا کہ یہ کیسی بزرگ ہیں جو اس قدر زیب و زینت کا اہتمام کرتی ہیں، مگر کسی کو کیا خبر کہ وہ کس لئے زینت کرتی تھیں، وہ نفس کی خواہش کے لئے

ایسا نہ کرتی تھیں، بلکہ حکم شریعت کی وجہ سے زینت کرتی تھیں، کیونکہ شریعت کا حکم ہے کہ عورت کو شوہر کے لئے خوب زیب و زینت کرنا چاہئے، اس صورت میں اس کو زینت کرنے سے ثواب ملتا ہے۔ مگر آج کل عورتوں کی یہ حالت ہے کہ شوہر کے سامنے تو بھنگیوں کی طرح رہتی ہیں اور جب کہیں برادری میں جاتی ہیں تو سر سے پیر تک آراستہ ہوتی ہیں اور اگر کوئی بیچاری شوہر کی خاطر زینت کرے تو اس کو نکو بناتی ہیں، کہ ہائے اسے حیا و شرم ذرا نہیں کہ یہ اپنے میاں کے واسطے کیسے کیسے چوچلے کرتی ہے، افسوس کہ جس جگہ زینت کا حکم تھا وہاں تو اس پر طعن ہوتا ہے، اور جہاں ممانعت ہے وہاں اہتمام کیا جاتا ہے۔ تو وہ بزرگ بی بیاں ایسی نہ تھیں، وہ تو حکم کے تابع تھیں، جہاں شریعت کا حکم تھا وہاں وہ خوب زینت کرتیں، کیونکہ جب شوہر زینت کو کہے دولہن کو خراب و خستہ رہنے کا کیا حق ہے۔ مگر جب شوہر کو کچھ غرض نہ ہوتی تو وہ اپنے نفس کے لئے زینت کا اہتمام نہ کرتی تھیں بلکہ وہی کمبل اور ٹاٹ پہن لیتی تھیں، اسی طرح کاملین زینت اور ترک زینت میں حکم کے تابع ہوتے ہیں، وہ اپنے نفس کے لئے کچھ نہیں کرتے، چنانچہ شاہ عبدالرحیم صاحب دربار میں جانے کے لئے عمدہ بیش قیمت لباس پہن کر جا رہے تھے، اس حالت سے تو ظاہر بینوں کو کچھ کچھ شبہات ہوئے ہوں گے، اب دوسری حالت دیکھئے کہ راستہ میں آپ نے ایک کتے کے بچہ کو دیکھا جو نالی میں سردی کے مارے جاڑے میں سکڑ رہا تھا۔ آپ سے یہ حالت نہ دیکھ

رہ گیا۔ فوراً کھڑے ہو گئے اور خادم سے فرمایا کہ اس کو نالی سے نکال لو۔
اس نے کچھ ناک منہ چڑھایا تو آپ نے آستیں چڑھا کر اسے خود نکالا، اور
ایک حمام قریب تھا، وہاں لے جا کر گرم پانی سے اس کو غسل دیا، پھر آگ
میں تاپا، یہاں تک کہ اس کی سردی کم ہو گئی اور اچھی طرح چلنے پھرنے
لگا، پھر آپ نے اہل محلہ سے فرمایا کہ اگر تم اس کی راحت کا انتظام کر
سکو اور نگہداشت کا وعدہ کرو تو میں اس کو یہیں چھوڑ دوں ورنہ اسکو
اپنے ساتھ لے جاؤں اور میں خود اس کا انتظام کروں گا، اہل محلہ نے
وعدہ کیا تو آپ نے اس کو چھوڑ دیا اور پھر دربار میں تشریف لے گئے۔
دیکھا جو شخص فخر و تکبر کے لئے زینت کرتا ہو کیا اس سے یہ ہو سکتا ہے،
کہ ایک کتے کے بچہ کو اپنے ہاتھ سے اس طرح دھوئے اور یوں اس کو
راحت پہنچائے، ہرگز نہیں۔ مگر شاہ صاحبؒ نے بے تکلف اس کی خدمت
کی، خادم نے بھی ناک منہ چڑھایا، مگر آپ کو ذرا بھی اس سے انقباض نہ ہوا،
یہ اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اپنے نفس کے لئے زیب و زینت نہ کرتے تھے۔
یہ قصہ تمہید ہے دوسرے قصہ کی، اور وہ دوسرا قصہ جو مقصود ہے وہ یہ ہے
کہ ایک بار آپ ٹپیا پر جا رہے تھے۔ ایک موقعہ ایسا آیا کہ ٹپیا کے دونوں
طرف پانی اور کیچڑ تھا، صرف ٹپیا ہی کا راستہ سوکھا تھا۔ سامنے سے ایک
کتا بھی اسی ٹپیا پر آ گیا۔ اب یہاں اس کی ضرورت تھی کہ دونوں میں سے ایک
کیچڑ میں اترے تو دوسرا ٹپیا کے راستہ سے نکلے کیونکہ ٹپیا پتلی تھی، اور
اس میں اتنی وسعت نہ تھی کہ دونوں برابر کو نکل جائیں، چنانچہ شاہ صاحب

کھڑے ہوگئے اور وہ کتا بھی سامنے کھڑا ہو گیا، پھر اشارات میں گفتگو شروع ہوئی (بعض اہل اللہ جمادات و حیوانات سب کی گفتگو سمجھ لیتے ہیں ۱۲) چنانچہ شاہ صاحب نے کتے سے کہا، بھائی تم پانی میں اتر و، اس نے کہا کیوں مجھ میں اور آپ میں کیا فرق ہے، آپ کیوں نہیں اترتے۔ اور یہ کہا افسوس پہلے بزرگوں کا مذہب ایثار تھا اور اسوقت کے بزرگوں کا مذہب انحصار ہے۔ فرمایا نہیں تو نے بدگمانی کی۔ بلکہ میں تجھ کو اترنے کے لئے اس لئے کہتا ہوں کہ تو مکلف نہیں ہے اور میں مکلف ہوں۔ اگر تو اس پانی اور کیچڑ سے ناپاک بھی ہو جائے گا تو تھوڑی دیر میں خشک ہو کر پھر پاک ہو جائیگا۔ پھر تیرے ذمہ نہ وضو ہے نہ نماز اور میں اتروں گا تو مجھے سارے کپڑے اور بدن کا دھونا اور پاک کرنا لازم ہوگا جس میں بہت دیر لگے گی ممکن ہے نماز میں دیر ہو جائے۔ اس نے جواب دیا کہ بہت اچھا خیر تو کچھ حرج نہیں میں پانی میں اترتا ہوں، مگر یہ یاد رکھو کہ تمہارے کپڑے ناپاک ہو جائیں تو ایک دو لوٹے پانی سے پاک ہو سکتے ہیں لیکن اگر میں اسوقت پانی میں اترا اور تمہارے دل میں یہ خیال آیا کہ میں اس کتے سے افضل ہوں تو اس سے تمہارا قلب ایسا ناپاک ہو گا، جس کی ناپاکی ہفت قلزم سے بھی نہ دھل سکے گی۔ یہ سنکر شاہ صاحب پر ایک حالت طاری ہو گئی، اور فوراً پانی میں اتر کر راستہ سے ہٹ گئے اور کتا ٹیلے پر سے چلا گیا، اور آپ اس کے بڑے احسانمند ہوئے کہ اس کے ذریعہ سے ایک علم عظیم عطا ہوا۔

اب شاہ صاحب پر غیب سے الہام ہوا کہ عبدالرحیم خبر بھی ہے کہ ہم نے یہ علم عظیم کتے کے ذریعہ کیوں دیا۔ یاد کرو تم نے ایک دن ایک کتے کے بچہ پر

احسان کیا تھا، کہ اس کو پانی سے نکال کر گرم پانی سے دھویا اور آگ سے تاپا تھا۔ تم نے اس احسان کا آج بدلہ کر دیا ہے کہ آپ کی ابن النوع کے ذریعہ سے تم کو یہ علم عظیم عطا کیا، تاکہ اس کے بچے پر اپنا احسان نہ سمجھیں۔

حق العبد کی فوقیت

ان علوم کی قدر صوفیہ ہی سمجھتے ہیں۔ ان کو ان میں ایسا مزہ آتا ہے کہ واللہ جب کوئی علمِ جدید عطا ہوتا ہے تو اس سے ایسا حظ آتا ہے کہ ہفت اقلیم کی سلطنت بھی اس کے سامنے گرد ہوتی ہے۔ غرض صوفیا نے ایثار سے یہاں تک کام لیا ہے کہ جانوروں کے ساتھ بھی ایثار کیا۔ صوفیہ نے ہر مقام پر اس کی رعایت کی ہے، اور بعض مقامات پر شریعت نے بھی اس کو واجب کیا ہے۔ چنانچہ حقوقِ نفس پر حقوقِ غیر کو مقدم کیا گیا ہے۔ بشرطیکہ اپنی ہلاکت اپنے اہل بیت کی پریشانی کا اندیشہ نہ ہو، پس جہاں ایثار واجب ہے صوفیہ وہاں کیوں نہ کرتے، وہ تو جہاں واجب بھی نہیں وہاں بھی اس کا بہت لحاظ رکھتے ہیں اور اس سے ان کو علوم حاصل ہوتے ہیں، اور ان کو تو بڑا مزا ان علوم ہی میں آتا ہے۔ مگر اب لوگ چاہتے ہیں، ان سے دنیوی ترقی کرانا، بھلا یہ اس کام کے کہاں ہے

تا بدانی ہر کرا یزداں بخواند
از ہمہ کارِ جہاں بیکار ماند

صاحبو! جس کو ان علوم کا مزا حاصل ہو گیا وہ واقعی دنیا کے کام کا نہیں رہتا

ہاں جو ایسے باہمت ہوں، کہ دونوں کو جمع کر سکیں، جیسے حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما وہ البتہ دونوں میں مشغول ہوتے ہیں، اور ان کو دنیا کے مشاغل ان علوم سے مانع نہیں ہوتے، بلکہ دنیا بھی ان کے ہاتھ میں دین بن جاتی ہے، مگر ایسے بہت کم ہیں، زیادہ تو ایسے باہمت نہیں ہوتے، ان کا تو وہی حال ہوتا ہے ؎

تا بدانی ہر کرا یزداں بخواند
از ہمہ کار جہاں بے کار ماند

بہرحال لوگوں نے حقوق العباد سے بہت ہی غفلت کر رکھی ہے، حالانکہ حق العبد کا تقدم معلوم ہو گیا، اور یہ بھی معلوم ہو گیا، کہ حق اللہ پر حق العبد کا تقدم بوجہ عظمت کے نہیں ہے، بلکہ محتاج دستگیر کے حق کو کریم غنی نے اپنے حق پر مقدم کر دیا ہے کہ جب دونوں میں تعارض ہوتا ہے، تو وہ فرما دیتے ہیں کہ ہمارے حق کو چھوڑ دو۔ ہمیں کچھ ضرورت نہیں اور بندہ کے حق کو ادا کر دو وہ محتاج ہے، اگر اس کا حق ادا نہ ہوگا تو پیٹ پھاڑ کر مر رہے گا، یہ وجہ ہے تقدم کی۔ پس لوگوں کا تاکد حق کے سبب کو صرف عظمت میں منحصر کر دینا صحیح نہیں بلکہ حاجت بھی تاکد حق کا ایک سبب ہے، جب سبب مرض کا میں نے ازالہ کر دیا تو اب مرض کا علاج سہل ہو گیا۔ پس بندہ کے حقوق کو اسکی حاجت کی وجہ سے ادا کرو، اور جیسے میں نے آپ کے عذر کا جواب دے دیا تو حجت تام ہو گئی، اب کسی کے پاس حقوق العباد سے

غفلت کرنیکا کوئی عذر نہیں رہا، یہ تو اُن لوگوں کی غفلت کا علاج تھا، جو حقوق العباد کا بالکل ہی اہتمام نہیں کرتے۔

حق العبد کی اقسام

اب دوسری غلطی بعض لوگوں میں یہ ہے کہ وہ حق العبد کو صرف مال میں منحصر کرتے ہیں، کہ چوری کرنا، غصب کرنا، قرض لے کر انکار کردینا کسی کی امانت رکھ کر مکر جانا، بس یہی جرم ہے، ان کے علاوہ حق العباد میں اور کوئی جرم نہیں، حالانکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے، کہ حق العبد مال ہی میں منحصر نہیں بلکہ اور بھی حقوق ہیں اور وہ بھی حقوق مالیہ کے برابر بلکہ ان سے بھی معظم ہیں۔ چنانچہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ رضؓ سے دریافت فرمایا، کہ یہ کون سا دن ہے، صحابہؓ نے ادب کی وجہ سے عرض کیا "اللہ ورسولہ اعلم"۔ فرمایا: "الیس یوم عرفۃ"، کیا یہ عرفہ کا دن نہیں ہے، صحابہؓ نے عرض کیا: "بلیٰ"۔ "بیشک یہ عرفہ کا دن ہے۔ پھر پوچھا یہ کون سا مہینہ ہے، صحابہؓ نے ادب سے وہی جواب دیا: "اللہ ورسولہ اعلم"۔ آپؐ نے فرمایا: "الیس ذی الحجۃ"۔ کیا یہ حج کا مہینہ نہیں ہے، صحابہؓ نے عرض کیا بیشک یہ حج کا مہینہ ہے۔ پھر دریافت فرمایا یہ کون سا شہر ہے۔ اس پر بھی صحابہؓ نے ادب سے "اللہ ورسولہ اعلم" ہی کہا۔ آپؐ نے فرمایا: "الیس بالبلد الحرام"۔ کیا یہ بلد حرام نہیں ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا بیشک یہ بلد حرام ہے۔ اس

تمہید کے بعد آپ نے فرمایا:

"الا ان اموالکم ودماءکم واعراضکم علیکم حرام
کحرمۃ یومکم ہذا فی شہرکم ہذا فی بلدکم
ہذا من یومکم الی یوم القیامۃ (اوکما قال)

سن لو تمہارے اموال اور جانیں اور آبروئیں آج سے قیامت تک ویسی ہی حرام ہیں، جیسے اس یوم معظم شہر معظم اور بلد معظم میں حرام ہیں، ہمیشہ کے لئے ان کی حرمت ویسی ہی ہے جیسی آج ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حقوق العباد کی تین قسمیں ہیں۔ ایک حقوق نفس دوسرے حقوق مال، تیسرے حقوق عرض۔ جب شریعت سے تین حقوق معلوم ہوتے ہیں تو آپ کو صرف مال ہی میں حق العبد کو منحصر کرنے کا کیا حق ہے۔ صاحبو! جان کا بھی حق ہے، آبرو کا بھی حق ہے، مال کا بھی حق ہے جان کا حق تو یہ ہے، کہ کسی کو ناحق قتل نہ کرو۔ خیر قتل تو اس بادشاہت میں بکثرت کون کرسکتا ہے، اس کی طاقت تو یہاں کسی کو نہیں، گو شاذ و نادر کبھی ایسا بھی ہوجاتا ہے، مگر وہ چھپ نہیں سکتا فوراً مقدمہ قائم ہو کر پھانسی ہوجاتی ہے، اس لئے اس سے سب ڈرتے ہیں، ہاں یہ حق البتہ باقی ہے، کہ کسی غریب کے دو چار ڈنڈے لگا دئیے، گو ہمارے قصبہ میں یہ حق بھی باقی نہیں رہا۔ وہاں کسی کی مجال نہیں کہ جو کسی بھنگی کو بھی مار سکے، یا بیگار میں کام لے سکے۔ ہمارے بھائی کے ایک کارندہ ہیں حاجی جی، اب تو کارندگی سے انہوں نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ مگر جس زمانہ

میں وہ کارندہ تھے، اس زمانہ کا قصہ بیان کرتے تھے۔ ایک دن میں نے سڑک صاف کرنے والے بھنگی سے کہا، کہ جب تو سڑک پر جھاڑو دیا کرے تو ذرا ہمارے دروازہ میں بھی جھاڑو دیدیا کر، تو وہ کیا کہتا ہے۔ کہ حاجی جی! کنون[1] تو ہے نہیں، خیر تمہاری خاطر سے دے دیا کروں گا۔ تو وہاں کے بھنگی بھی قانونی ہیں۔ ہر شخص بجائے خود رئیس ہے، اور اس کا حاصل یہ ہے کہ وہاں کوئی رئیس نہیں (ہر شخص رئیس وہیں ہوتا ہے جہاں کوئی رئیس نہ ہو۔ ۱۲) میں تو اس حالت سے بڑا خوش ہوں۔ گو اپنی قوم کی حالت تنزل سے افسوس بھی ہوتا ہے، کہ ان کی وقعت بھنگیوں کے دلوں میں بھی نہیں رہی، مگر اس سے خوش ہوں کہ ان کے ہاتھ سے اب ظلم نہیں ہو سکتا، ریاست تو وہی اچھی ہے جس میں ظلم نہ ہو، اور جس ریاست کا یہ نتیجہ ہو کہ غریبوں پر ظلم کیا جائے، اس کے ہونے سے نہ ہونا اچھا۔ چنانچہ اب ہمارے قصبہ میں زوال ریاست سے یہ بات تو ہو گئی کہ کوئی کسی پر ظلم نہیں کر سکتا، اور جو کوئی کسی کو کچھ کہتا ہے، تو جواب میں دس باتیں وہ ان کو سنا لیتا ہے، بس ظالمانہ ریاست سے ان کی یہی حالت اچھی ہے۔ ان کو اگر تھوڑی سی ریاست ملتی ہے تو چوگنا ظلم کرتے ہیں

کانپور کے ضلع میں ایک قصبہ ہے بارہ، وہ پٹھانوں کی بستی ہے وہاں کے پٹھان بہت شریف ہیں مگر آخر تو رئیس ہیں، کبھی کسی غریب کو کچھ کہہ بھی لیتے ہیں۔ ایک پٹھان نے کسی جلاہے سے تمسخراً پوچھا، کہ میاں جی! کس حال میں ہو۔ کہا خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہوں،

---

[1] : قانون

کہ خدا نے مجھکو جولاہا بنا دیا۔ جس سے مجھکو کوئی کچھ کہہ لیتا ہے، کوئی دوچار ڈنڈے لگا دیتا ہے، تو قیامت کے دن مجھے کسی کی نماز ملے گی، کسی کے روزے ملیں گے، پٹھان نہیں بنایا۔ اگر پٹھان ہوتا تو قیامت میں دوسرے لوگ میرے سب اعمال لے جاتے اور میں مفلس بن کر کھڑا رہ جاتا، تو میں اس بات پر خدا تعالیٰ کا بہت شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے پٹھان نہ بنایا۔ یہ جواب سنکر کوئی دوسرا ہوتا تو نہ معلوم اس جلاہے کی کیا گت بناتا مگر وہاں کے پٹھان شریف ہیں، انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ نہ برا مانا۔

بدعت و سنّت

ان لوگوں کی شرافت کا ایک اور اس سے بھی زیادہ عجیب قصہ ہے وہ یہ کہ میں کئی سال ہوئے ایک دفعہ کانپور گیا تھا تو مجھے معلوم ہوا، کہ نواح کانپور میں بعض دیہات کے نومسلم راجپوت مرتد ہونے والے ہیں۔ آریہ ان کو بہکا رہے ہیں، تو میں نے اپنے احباب میں سے کچھ علماء اور رؤسا کو ساتھ لیا اور موضع گجنیر میں قیام کیا جو سب دیہات میں بڑا گاؤں تھا۔ پھر وہاں سے دو دو تین تین عالموں کو متفرق دیہات میں تبلیغ کے لئے بھیجا گیا اور ان کے چودھریوں کو بلایا اور کہا کہ بھائی ہم نے یہ سنا ہے کہ تم آریہ ہونے والے ہو، اگر کوئی شبہ اسلام میں ہو رفع کر لو۔ ایک نے جواب دیا کہ ہم آریہ کیوں ہوتے، ان کے یہاں تو نیوگ کا بڑا فحش طریقہ ہے، جس سے کوئی شریف ہرگز گوارا

نہیں کر سکتا۔ پھر ہم نے کہا کہ ہاں بھائی بس تم مسلمان ہی رہنا۔ وہ کہنے لگے کہ ہم مسلمان بھی نہیں ہوتے، ہم تو نو مسلم ہی اچھے رہیں گے۔ میں نے کہا اچھا تم نو مسلم ہی رہو۔ پھر باتوں باتوں میں ان سے پوچھا گیا۔ تم ہماری طرح مسلمان کیوں نہیں ہوتے۔ تو کہنے لگے اصلی بات یہ ہے، کہ ہم تمہاری طرح مسلمان ہوجائیں تو ڈر یہ ہے کہ ہمیں تم میں سے کوئی اپنی لڑکی نہ دیگا نہ ہماری لڑکی لے گا، اس لئے ہم تمہارے ساتھ بھی نہیں مل سکتے اور نہ آریوں کے ساتھ ملیں گے۔ اس جواب پر میں ذرا خاموش ہوا تھا کیونکہ اس کا وعدہ میرے اختیار سے باہر تھا۔ خدا بھلا کرے قصبہ بارہ کے پٹھانوں کا کہ وہ بھی یہ خبر سنکر آگئے تھے۔ ان میں سے ایک رئیس کھڑے ہوئے، اور فرمایا کہ صاحبو! تم بے فکر رہو، تم کو ہم اپنی بیٹیاں دیں گے اور تمہاری لڑکیاں لیں گے۔ گو اس سے برادری میں ہماری ذلت ہوگی، مگر اسلام کی وقعت و خدمت کے لئے ہماری جان و آبرو سب فدا ہیں۔ میں اس جواب سے بڑا خوش ہوا اور ان کو بہت دعا دی۔ کہ شاباش! ع

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

مگر یہاں آکر چودھری لاجواب تو ہوگیا، لیکن اپنی حالت کے بدلنے پر آمادہ نہ ہوا۔ معلوم ہوگیا کہ یہ بات اس نے محض شرارت کی راہ سے کہی تھی جس سے ہم کو صرف لاجواب کرنا مقصود تھا، اور حقیقت میں ان لوگوں کو اپنی حالت کا بدلنا منظور نہیں، وہ اپنے اسی طرز میں

خوش ہیں۔ دراصل وہ مسلمان بھی برائے نام ہی ہیں۔ حالت ان کی یہ ہے کہ ان کے نام ہندوؤں جیسے ہیں۔ چنانچہ ایک چودھری کا نام ننو سنگھ تھا، اور دوسرے چودھری کا نام ادھار سنگھ تھا۔ یہ بہ نسبت پہلے کے ذرا سمجھدار تھا۔ بڑے چودھری سے کہا گیا کہ تجھے کلمہ بھی آتا ہے۔ کہنے لگا ہاں آتا ہے، کہا گیا سناؤ، تو کہنے لگا کہ بس سنو مت، گاؤں کے لوگ یوں کہیں گے کہ بڈھا سٹھیا گیا جو کلمہ پڑھتا ہے۔ ان کو کلمہ پڑھنے سے بھی رکاوٹ تھی۔ وہ ایسے مسلمان تھے۔ بس چند باتیں ان میں اسلام کی موجود تھیں، ایک تو وہ ختنہ کراتے تھے۔ دوسرے مردوں کو دفن کرتے تھے۔ تیسرے نکاح قاضی سے پڑھواتے تھے۔ مگر ساتھ ہی ہندوؤں کی طرح پھیرے بھی کرتے تھے، اور ایک یہ بات ان میں اسلام کی تھی کہ محرم میں تعزیہ بناتے تھے اور اس کو اتنا بڑا شعار سمجھتے تھے کہ ادھار سنگھ نے یوں کہا تھا کہ ہم آریہ کیسے بنیں۔ ہمارے یہاں تو تاجیہ (تعزیہ) بنتا ہے۔ میں نے یہ سنکر کہا کہ بھو تعزیہ مت چھوڑنا۔ کہنے لگے اجی بھلا اسے ہم کب چھوڑنے لگے۔ بعض علماء کو میری اس بات پر خیال ہوا کہ اس نے ایک بدعت کی مسلمانوں کو اجازت دی۔ میں نے کہا بس چپکے بیٹھے رہو۔ یہ کانپور اور لکھنؤ میں ہی شرک و بدعت ہے، مگر یہاں فرض ہے، کیونکہ اس جگہ تعزیہ ہی ان لوگوں کے دین کا دھاگہ ہے۔ ابھی تو ان لوگوں کا تعزیہ بناتے رہنا ہی ان کے اسلام کا محافظ ہے۔ پھر جب رفتہ رفتہ یہ پکے مسلمان ہو جائیں گے، اس وقت بدعت و سنت کی تعلیم دے دینا۔ ہمارے

ایک دوست نے عجیب بات کہی میں نے اسے کہا کہ کالج علیگڈھ میں
مولود شریف ہوا کرتا ہے جو کہ بدعت ہے، وہ دوست فرمانے لگے کہ
یہ مولود شریف (بہیئۃ معروفہ) اور جگہ تو بدعت مگر کالج میں جائز بلکہ
واجب ہے، کیونکہ اس بہانہ سے کبھی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کا ذکر شریف اور آپ کے فضائل و معجزات سُن لیتے ہیں تو اچھا ہے۔
اسی طرح حضورؐ کی عظمت و محبت ان کے دلوں میں قائم رہے۔ ورنہ
وہ تو سال بھر ایسی خرافات میں مبتلا رہتے ہیں کہ بھول کر بھی خدا و رسول
کا نام ان کی زبان پر نہیں آتا۔ مجھے ان کی یہ بات پسند آ گئی۔ کیونکہ واقعی
اگر کسی جگہ بدعت ہی لوگوں کے دین کی حفاظت کا ذریعہ ہو جائے،
تو وہاں اسی بدعت کو غنیمت سمجھنا چاہیئے، جبتک کہ ان کی پوری
اصلاح نہ ہو، غرض بارہ کے پٹھان بڑے شریف ہیں، اور ان کی شرافت
ہی ہے کہ اس جلاہے کا جواب ناگوار نہ ہوا۔ ورنہ کوئی دوسرا ہوتا تو خوب
مرمت کرتا، مگر واقعی بڈھے نے بات سچی کہی کہ اللہ کا شکر ہے، جو
میں جولاہا ہو گیا پٹھان نہ ہوا ورنہ میں بھی ظلم کرتا اور لوگ میرے نیک
اعمال چھین لیتے۔ سو ہمارے قصبہ میں تو یہ ریاست اب نہیں رہی کہ کوئی
کسی کے ڈنڈے لگا سکے، گو تھوڑا سا کہیں ہو بھی جاتا ہے، مگر پھر کھسک
جس سے میں خوش ہوں، لیکن اور قصبات میں جہاں تھوڑی بہت ریاست
ہے، وہاں اس قسم کا ظلم زیادہ ہوتا ہے، اور افسوس یہ ہے کہ اس سے غرباء
بھی بچے ہوئے نہیں، ان میں بھی تکبر بہت ہوتا ہے، گو امیروں کی برابر

قدرت نہ ہو مگر اینٹھ مروڑ ان میں بھی ہے، چنانچہ خود اقرار کرتے ہیں، کہ کوئی مال مست ہے کوئی کھال مست ہے، اور یہ بہت سخت بات ہے،

عنداللہ قابلِ نفرت لوگ

حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تین شخصوں سے بہت زیادہ بغض و نفرت ہے، ایک ملک کذاب، بادشاہ جھوٹ بولنے والا۔ کیونکہ آدمی اس لئے جھوٹ بولا کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے اپنا کام نکالے اور اس کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں کوئی اپنے سے زیادہ زبردست ہو، جسکے سامنے سچ بولنے سے کچھ اندیشہ ہوتا ہے، تو بادشاہ سے اوپر تو کوئی ہے ہی نہیں ہوتا، اس کو جھوٹ بولنے کی کیا مار آئی، دوسرے "شیخ زانی" یعنی بڈھا زنا کار، کیونکہ جوان میں تو ایک داعی زنا کا موجود ہے جسکا روکنا ہمت کی بات ہے، مگر بڈھے میں تو وہ داعی بھی موجود نہیں۔ یہ تو زبردستی اپنے نفس کو سوچ سوچ کر آمادہ کرے گا، تو اس کا زنا کرنا محض حرص اور خباثت و شرارت ہی ہے۔ تیسری عائل متکبر یعنی غریب تکبر کرنے والا۔ کیونکہ امیر کے پاس تو تکبر کا کچھ سامان بھی ہے اور یہ خواہ مخواہ فرعون بے سامان بنا ہوا ہے۔ غرض جس شخص میں جس گناہ کا سبب اور داعی موجود ہے، اس کا جرم اس شخص سے کم درجہ کا ہے جس میں کوئی سبب اور داعی موجود نہیں اسلئے غریبوں کا تکبر امیروں کے تکبر سے اشد ہے، مگر حالت یہ ہے کہ غریب بھی اپنی کھال میں ایسے مست ہیں کہ جہاں ان کا بس چلتا ہے وہاں یہ بھی

دوسروں کی ایذا رسانی سے نہیں چوکتے ۔ ہمارے قصبہ میں ایک رئیس کے
یہاں تقریب ہوئی تھی جس میں بہت کچھ سامان کیا گیا تو برادری کے ایک
غریب شریف زادہ نے اسکی آبرو ہی بہانا چاہی اور سوچتے رہے کہ کسی بات
پر موقع ملے تو اس کی خوشی میں کھنڈت ڈالوں، مگر وہاں ایسا عمدہ انتظام
تھا کہ کسی بات میں ان کو بولنے کا موقع نہ ملا ۔ اتفاق سے سقہ پانی کی مشک
لئے ہوئے ان کے پاس سے گذرا اور مشک کی ایک باریک دھار سے کچھ
چھینٹے ان کے کپڑوں پر پڑ گئے ۔ بس یہ کہاں تھے فوراً جھلا کر کھڑے ہو گئے ۔
اور رئیس کو برا بھلا کہنا شروع کیا کہ نو آموز دولت ہے، انتظام کا سلیقہ
نہیں، برادری کے بھائیوں کے سامنے سے سقوں کو نکالا جاتا ہے جس سے
سب کے کپڑوں پر چھینٹے پڑتے ہیں اور ان کو ذلیل کیا جاتا ہے ۔ ہم ایسے اوچھے
کی تقریب میں شریک نہیں ہو سکتے، یہ کہہ کر چلتے ہوئے ۔ پھر اس رئیس بیچارہ
نے ان کی خوشامد کی، ٹوپی انکے پیروں میں ڈالی ۔ جب آپ تشریف لائے ۔
کیونکہ مقصود یہی تھا کہ ذرا اس کو ذلیل کر دیں اور اپنے پیروں میں اس کی ٹوپی
ڈلوائیں ۔ مگر یہ اینٹھ مروڑ بھی اسی کی بدولت تھا کہ جانتے تھے وہ ہماری خوشامد
کرے گا ۔ آگے ہاتھ جوڑے گا، اس لئے اس پر ناز تھا، اور اس رئیس کی یہ
تواضع بھی ریاست ہی کی بدولت تھی ۔ کیونکہ رؤسا جانتے ہیں کہ ہماری شان
اتنی بڑی ہے جو ایسی باتوں سے نہیں گھٹتی ۔ پس غرباء میں بھی تکبر اور ایذا رسانی
کا مرض موجود ہے، اسلئے میں اب اہل دولت کا لفظ چھوڑ کر "اہل قدرت"
کہوں گا ۔ تو جس کو جتنی بھی قدرت حاصل ہے، اس میں وہ دوسرے کی جان

پر دست اندازی کرنے سے باک نہیں کرتا۔ گو زیادہ دست اندازی رؤسا ہی کے ہاتھ سے ہوتی ہے، کیونکہ ان کو قدرت زیادہ ہے۔ غریب آدمی کسی پر زیادتی کرتا ہے تو دوسرا اس کا بدلہ لے سکتا ہے، اور امراء پر اول تو غرباء نالش نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے، اور غریبوں کے پاس اتنا روپیہ کہاں، اور اگر نالش کریں بھی تو کامیابی دشوار ہے، کیونکہ حکام بھی امراء کی رعایت کرتے ہیں۔ بس وہی حال ہو جاتا ہے ؎

ہم نے سوچا تھا کہ حاکم سے کرینگے فریاد
وہ بھی کمبخت ترا چاہنے والا نکلا

خصوصاً حکومت غیر عادلہ میں تو امراء کی بہت ہی رعایت ہوتی ہے

حکومت عادلہ کی مثال

ہاں حکومت عادلہ ہو تو وہاں کسی کی پرواہ نہ ہوگی چاہے کوئی کتنا ہی امیر اور مالدار ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جبلۃ الایہم شاہ غسان اسلام لایا تھا، حضرت عمر کو اسکے اسلام سے خوشی ہوئی تھی، کیونکہ بادشاہ کے مسلمان ہونے سے اس کی رعیت کے بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں، دوسرے اس سے مخالفین پر بھی رعب پڑتا ہے، مگر اس خوشی کا یہ اثر نہ تھا کہ جبلہ کی ایسی رعایت کی جاتی کہ وہ جسپر چاہے ظلم کرنے لگے اور کچھ باز پرس نہ ہو۔ چنانچہ ایک مرتبہ جبلہ لنگی باندھے ہوئے خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا، لنگی باندھنا اہل عرب کا عام شعار تھا، بادشاہ اور غریب

سب لنگی باندھتے تھے، تو اس وقت اتفاق سے کسی غریب کے پیر سے جبلہ کی لنگی کا کونہ دب گیا۔ جبلہ نے جو قدم آگے بڑھایا دفعۃً لنگی کھل گئی، غصہ سے سرخ ہو گیا اور اس غریب مسلمان کے بڑی زور سے طمانچہ مارا، اس کا دانت ٹوٹ گیا۔ اس نے جبلہ کو تو کچھ نہ کہا سیدھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجلاس میں جاکر دعوے دائر کر دیا۔ عمرؓ نے جبلہ کو بلایا اور پوچھا کہ تو نے اس مسلمان کو طمانچہ مارا ہے اس نے اقرار کیا، آپ نے مدعی سے فرمایا، کہ تم جبلہ سے قصاص لے سکتے ہو۔ جبلہ نے کہا اے امیر المومنینؓ اس بازاری کو مجھ جیسے بادشاہ کی برابر کس چیز نے کر دیا، جو اس کو مجھ سے قصاص لینے کا حق حاصل ہو گیا آپ نے فرمایا اسلام نے تم دونوں کو برابر کر دیا۔ جبلہ نے کہا اچھا مجھے کل تک کی مہلت دی جاوے، میں کل قصاص دیدوں گا۔
حضرت عمرؓ نے فرمایا میں مہلت نہیں دے سکتا یہ مدعی کا حق ہے، اگر وہ چاہے مہلت دے یا نہ دے۔ بیچارہ غریب آدمی ذرا سی بات پر پسیج جاتا ہے، مدعی نے کہا کہ مجھے کل تک کی مہلت دینا منظور ہے، پھر رات کو وہ کمبخت چپکے سے نکل کر بھاگ گیا اور مرتد ہو کر نصرانیوں میں جا ملا۔ مگر حضرت عمرؓ کو ذرا بھی پروا نہ ہوئی (اور نہ اسلام کو جبلہ کے ارتداد سے کچھ نقصان پہنچا، بلکہ اگر حضرت عمرؓ اس کی رعایت کرتے تو اس سے بیشک اسلام کو ضرر پہنچتا، کیونکہ عقلاء کو یہ کہنے کا موقع ملتا کہ اسلام میں ضعیف کا حق قوی سے نہیں دلایا جاتا، بلکہ زبردستوں کی رعایت کی جاتی ہے، اور یہ خلاف عدل ہے، اور اب تو گو ظاہر میں ایک جبلہ اسلام سے نکل گیا۔

مگر عدل اسلامی کی نظیر تمام دنیا کے سامنے قائم ہو گئی، اور سب کو معلوم ہو گیا کہ قانون اسلام میں کوئی زبردست کسی کمزور کا حق نہیں دبا سکتا! جس سے ہزاروں لاکھوں آدمی عدل اسلامی کے شیدا بن گئے ۱۲ جامع)۔

اور تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں جبلہ بھی اپنے ارتداد پر بہت پچھتاتا تھا، اور باوجودیکہ نصرانیوں میں اس کی بڑی عزت و آؤ بھگت ہوتی تھی اور ہر قسم کے سامان عیش اس کے لئے مہیا تھے، مگر بعض دفعہ وہ رو کر یہ کہتا تھا کہ اے کاش میں اس دن قصاص کو گوارا کر لیتا تو وہ میرے لئے اس عزت سے ہزار درجہ بہتر ہوتا۔ اسلام واقعی ایسی چیز ہے کہ اس کو چھوڑ کر کبھی چین نہیں مل سکتا۔

تو جہاں حکومت مسلمہ عمریہ ہو وہاں البتہ کسی رئیس یا بادشاہ کی کسی غریب کے مقابلہ میں کچھ رعایت نہ ہو گی۔

وسعتِ اختیار کا اثر

میں مسلمانوں کو وصیت کرتا ہوں کہ اگر کوئی بڑا ہندو یا عیسائی مسلمان ہو جایا کرے تو اس کو نچاتے نہ پھرا کرو، ہاں اس کی خدمت اور خاطر کرو۔ بلکہ ایسی دھوم دھام نہ کیا کرو جس سے کسی کو عجیب بات معلوم ہو، کیونکہ کوئی رئیس ہو یا بادشاہ جو کوئی بھی اسلام لاتا ہے اپنی نجات اور اپنی فلاح کے لئے لاتا ہے، مسلمانوں پر کیا احسان کرتا ہے، یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں کہہ رہا تھا کہ حضرت عمرؓ جیسی حکومت ہو تو خیر ورنہ غیر عادل حکومتوں کی یہی حالت ہے،

براہ کرم ورق نہ موڑیں!

کہ ان میں رؤسا و امراء کی غریبوں کے مقابلہ میں بہت رعایت کی جاتی ہے، تو غرباء نالش کرکے بھی مالداروں سے انتقام نہیں لے سکتے، اسلیئے مالداروں کے ہاتھ سے مخلوق کی جان پر زیادہ ظلم ہوتا ہے اور ایک ظلم حکام کے ہاتھ سے یہ ہوتا ہے کہ کسی کے دو چار بیدیں بلا وجہ لگوا دیں۔ ان کی تو کون نالش کرتا ہے، اور بعضے اس طرح ظلم نہیں کرتے تو یوں کرتے ہیں کہ مقدمہ میں ایک فریق سے رشوت لیکر کسی کا حق ضائع کردیا۔ ایک ڈپٹی صاحب کی یہ حالت تھی کہ دونوں فریق سے رشوت لے لیا کرتے تھے، مگر ان سے سب خوش تھے، بلکہ ایماندار مشہور تھے، کیونکہ جس فریق کے خلاف وہ فیصلہ کرتے تھے ان کی رشوت واپس کردیا کرتے تھے، اور بعضے یہ کرتے ہیں کہ جس نے زیادہ رشوت دے دی اسکے موافق فیصلہ کردیا اور دوسرے کی رقم بھی ہضم کرلی۔ مقدمہ تو حاکم کے ہاتھ میں ہوتا ہے، جسکے چاہے موافق کردے، حاکم کو مقدمہ کا الٹنا کیا مشکل ہے، ہیر پھیر کر جس طرح چاہے بنا دے۔ انکی وسعت خیال پر نظر کرکے میں مسلمانوں کو کہا کرتا ہوں کہ تم حکام وقت کو ناراض نہ کرو۔ یہ طریقہ بہت مضر ہے، اس پر بعض نوجوان کہا کرتے ہیں کہ ہم تو جو کچھ کرتے ہیں قانون کے اندر کرتے ہیں، خلاف قانون کچھ نہیں کرتے پھر حکام کیا کرسکتے ہیں، میں نے کہا کہ حکام کو تمہاری نیت تو معلوم ہے، جب وہ یہ جانیں گے کہ یہ لوگ ہم کو ناراض اور تنگ کرنے کے لیئے یہ حرکت کررہے ہیں تو قانون ان کے ہاتھ میں ہے، جس بات کو تم خلاف قانون

نہیں سمجھتے ہو وُہ اس کو بھی کسی ترکیب سے خلافِ قانون کر دیں۔ اور شریعت کا امر ہے:

لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّہْلُکَۃِ

کہ اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو، تو ایسا کام نہ کرنا چاہیے جس میں حاکم کی ناراضی ہو، کیونکہ اس کا انجام قریب بہ ہلاکت ہے اور مدت دراز تک مسلمانوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے، اور ایسے خطرات سے حفاظت نفس شرعاً مطلوب ہے، مگر اتنا فرق ہے کہ عوام تو اپنی جان سمجھکر اپنے نفس کی حفاظت کرتے ہیں، اور اہل اللہ خدا کی امانت سمجھکر حفاظت کرتے ہیں کہ اس کو خلافِ منشاء حق تصرف نہ کیا جاوے اسلئے عارف ایسے موقع میں جہاں شریعت نے حفاظت نفس کا حکم دیا ہو، اپنی جان کی بہت حفاظت کرتا ہے، گو عوام اس کو بزدل نہ ڈرپوک کہیں اور جہاں شریعت نے بذل نفس کا حکم دیا ہو وہاں اہل اللہ سے زیادہ جانبازی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ ۱۲ جامع) تو دو طبقے تو یہ ہیں جو ظلم میں زیادہ بدنام ہیں، یعنی رؤساء اور حکام۔

زیادتی کی تلافی کی صُورت

ایک طبقہ اور ہے میانجیوں کا، یہ بچوں کے ساتھ بہت ظلم کرتے ہیں۔ ان کو جب کسی بچہ پر غصہ آتا ہے تو قہرِ عام کی طرح سب پر برستا ہے کہ ایک طرف سے سب کی خبر لیتے چلے جاتے ہیں، اس سے میاں جی

بہت کم بچے ہوئے ہیں، ہاں اگر کوئی ایسا ہو جیسے حافظ علی حسن صاحب
کیرانوی مقیم گنگوہ تھے تو بیشک وہ اس ظلم سے بچ سکتا ہے، مگر ان میں
افراط نہ تھا تو یہ تفریط تھی کہ بچوں کو مار کر ان سے کہتے تھے کہ تم مجھ سے بدلہ
لے لو۔ اور بعضے لڑکے ایسے شریر تھے کہ بدلہ بھی لے لیتے اور حافظ جی
کو قمچی سے سڑاسڑ مارتے تھے اور وہ ایسے سیدھے تھے کہ بچوں کے ہاتھ
سے مار کھا لیتے تھے۔ ان کے سیدھے پن کی یہ حالت تھی کہ ایک دفعہ
سقے کہیں بارات میں چلے گئے اور کئی روز تک محلہ والوں کو پانی کی
تکلیف رہی تو آپ اپنے لڑکے سے فرماتے ہیں کہ ارے سعید تو ہی
ایک مشک بنالے اور گھروں میں پانی بھر دیا کر۔ حافظ جی تو پرانے زمانے
کے آدمی تھے ان کو تو باوجود سید زادے اور شریف ہونے کے ایسے
کاموں سے عار نہ تھا، مگر ان کے صاحبزادے بڑے خفا ہوئے کہ لو
ابا جان تو ہمیں سقہ بنانا چاہتے ہیں، غرض وہ بڑے سیدھے تھے اور نیک
بھی بہت ہی تھے، نماز تو ایسی اچھی پڑھتے تھے کہ سبحان اللہ! بڑی لمبی
نماز پڑھتے تھے اور ہر رکن کو اعتدال و آرام سے اطمینان کے ساتھ ادا
کرتے تھے۔ مگر عدم علم کی وجہ سے وہ جماعت میں بھی ایسی ہی تطویل کرتے
تھے، جس سے نمازیوں کو تکلیف ہوتی تھی۔ بہر حال وہ تو ایک میاں جی
ہم نے ایسے دیکھے ہیں جو بچوں پر ظلم نہ کرتے تھے اور کبھی ذرا سی زیادتی
ہو گئی تو اس کی تلافی اس طرز سے کرتے تھے۔ گو یہ طریقہ اچھا نہیں، اس
سے لڑکوں کی شرارت اور بد دماغی اور بد خلقی بڑھ جاتی ہے، اور معلم کو

اس کی رعایت بھی ضروری ہے۔ بچوں کے اخلاق خراب ہوں۔ تو اب
اگر کوئی اپنی زیادتی کی تلافی کرنا چاہے تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ سزا کے
بعد بچوں کے ساتھ شفقت کرو اور جس پر زیادتی کی ہے اسکے ساتھ احسان
کرو یہاں تک وہ خوش ہو جاوے، جیسے میرٹھ کے ایک رئیس نے ایک غریب
ذاکر کے طمانچہ مار دیا تھا، پھر اس کو اپنی غلطی پر تنبہ ہوا تو اس کو ایک روپیہ
دیا۔ پھر دوسرے ذاکر سے کہا کہ اس سے پوچھنا اب کیا حال ہے۔ کہنے لگا
میں تو دعا کر رہا ہوں کہ ایسا طمانچہ روز لگ جایا کرے۔ بس یہ طریقہ تلافی
کا بہت اچھا ہے، اس سے بچوں کے اخلاق پر بھی برا اثر نہ ہوگا۔ اور ظلم
کا دفعیہ بھی ہو جاوے گا، اور جب میاں جی کا ایک دو دفعہ کرنے میں کچھ
خرچ ہوگا تو آئندہ کو وہ خود بھی ذرا سنبھل کر مارا کریں گے۔ نیز سزا
کے بعد بچوں کو خوش کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ ان کے دل میں معلم
سے بغض و عداوت نہ پیدا ہو جاوے جو علم سے محرومی کا سبب ہے،
اس راز کو ایک رئیس نے سمجھا تھا۔ قصہ ان کا یہ ہے کہ میں جب کانپور
میں تھا تو ہمارے مدرسہ میں ان رئیس کا بھانجا پڑھتا تھا جو بہت ہی شریر
تھا۔ اس کی یہ حالت تھی کہ پاخانہ کی دیواروں پر اساتذہ مدرسہ کے نام
لکھتا تھا۔ لوگوں کو فکر ہوئی کہ کون نالائق ہے۔ آخر لوگوں نے خفیہ طور پر
تفتیش کی اور پہلا لکھا ہوا سب مٹا کر یہ انتظام کیا، کہ جو شخص پاخانہ سے
نکلتا اس کے نکلنے کے بعد فوراً دیکھا جاتا کہ کچھ لکھا ہوا تو نہیں ہے۔ آخر
وہ لڑکا جو ایک دفعہ نکلا تو دیوار پر نام لکھے ہوئے پائے گئے، اور اسکو

پکڑ کر مدرسین کے پاس لایا گیا تو ایک مدرس نے سخت سزا دی، حتیٰ کہ مارتے مارتے بیہوش کر دیا اور اس کی جان کا خطرہ ہو گیا۔ بعض لوگوں نے اس کے ماموں کو اطلاع دی وہ فوراً کانپور آ گئے تو واقعی لڑکے کی حالت نازک تھی، مگر علاج معالجہ سے افاقہ ہوا اور بچنے کی امید ہو گئی۔ شہر کے لوگوں نے ان کو بہت بہکایا کہ پولیس میں رپٹ لکھوا دو، مگر وہ سمجھدار آدمی تھے، انہوں نے گوارا نہ کیا کہ ایک دینی مدرسہ کی شکایت غیروں کے پاس لے جاؤں۔ بالآخر وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ صاحب میری عدالت تو آپ ہیں، میں آپ کے یہاں استغاثہ کرتا ہوں۔ میں نے چپکے سے ان مدرس صاحب کے پاس رقعہ لکھا کہ تم اسی وقت اپنا استعفیٰ داخل کر دو، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، پھر میں نے رئیس صاحب سے کہا کہ میرے پاس ان صاحب کا استعفیٰ ملازمت سے آگیا ہے اور وہ آپ کے سامنے ہے، اب ہم کو ان پر کوئی حق مواخذہ کا نہیں رہا، کیونکہ وہ مدرسہ کے ملازم ہی نہ رہے، اس لئے میں کچھ نہیں کر سکتا، آپ کا جہاں جی چاہے استغاثہ دائر کر کے انتقام لیجئے، وہ کہنے لگے کہ کیا آپ نے اس کا استعفاء منظور کر لیا ہے۔ میں نے کہا اور رد کرنے کا ہم کو کیا اختیار ہے۔ وہ بیچارے بہت بڑے اہل آدمی تھے، کہنے لگے کہ یہ تو میری بڑی نحوست ہوئی کہ میری وجہ سے ایک عالم مدرسہ سے الگ ہوتے ہیں۔ اور ان کا فیض مدرسہ سے بند ہو جاتا ہے۔ میں اپنا استغاثہ واپس لیتا ہوں، اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کہیں استغاثہ نہ کروں گا۔ میں نے اپنا حق

معاف کیا، آپ ان کا استعفا واپس کر دیں۔ ان کی اس اہلیت سے میں بڑا خوش ہوا کہ شاباش مسلمان کو دین سے اتنی ہی محبت ہونا چاہیے۔ اس کے بعد ان کی عجیب خوش فہمی یہ تھی کہ مجھ سے کہنے لگے کہ میرا خیال یہ تھا کہ اس لڑکے کو اپنے ہمراہ لے جاؤں اور گھر پر اس کی تعلیم کا انتظام کروں مگر اب میں یہ چاہتا ہوں کہ اس کو کچھ دنوں مدرسہ ہی میں رکھو کیونکہ ابھی اگر میں اسے گھر لے گیا تو یہ اس حالت میں جائیگا کہ اس کے دل میں ایک عالم سے کینہ اور بغض ہوگا اور یہ اس کی آخرت کو مضر ہے۔ اس لئے چند روز اس کو مدرسہ ہی میں رکھا جاوے اور انہیں حضرت کے سپرد کیا جائے جنہوں نے اس کو مارا تھا اور ان کو کہہ دیا جائے کہ اب اس کے ساتھ شفقت و ملاطفت کا ایسا برتاؤ کریں جس سے اس کے دل کا خار نکل جائے اور ان سے اس کو محبت ہو جائے، پھر میں اس کو گھر بلا لوں گا۔ واقعی میں اس کی سلامت فطرت پر حیران رہ گیا اور بے ساختہ میرے دل سے ان کے لئے دعا نکلی، اور اس وقت ہی سے میری سمجھ میں یہ تدبیر آئی کہ بچوں پر زیادتی ہو جائے تو اس کی تلافی اس طرح کرنا چاہئے دیکھئے بعضے دنیا دار بھی کیسی سمجھ کے ہوتے ہیں ۱۲)

معلمین کی زیادتیاں

بعضے میاں جی بچوں پر مار کا ظلم نہیں کرتے مگر اور طرح ظلم کرتے ہیں وہ یہ کہ ان سے اپنے گھر کی خدمت لیتے ہیں۔ کہیں پانی بھرواتے

ہیں، کبھی آٹا پسواتے ہیں، کبھی تختی ڈھلواتے ہیں۔ یاد رکھو والدین کی اجازت کے بغیر نابالغ بچوں سے ایسی خدمت لینا جائز نہیں۔ بعضے میاں جی یہ کرتے ہیں کہ گرمیوں کی دوپہر میں خود تو سو رہتے ہیں اور بچوں سے پنکھا جھلواتے ہیں، یہ کتنا بڑا ظلم ہے۔ آخر جس طرح تم کو نیند آتی ہے ان کو بھی تو آتی ہے مگر بعضے لڑکے ان کے بھی چچا ہوتے ہیں۔ لوہاری میں ایک میاں جی تھے ان کے پاس جہاں سے کچھ مٹھائی آتی اور وہ حفاظت کے ساتھ رکھتے لڑکے سب کھا جاتے اور کوئی ثبوت ہوتا نہ تھا۔ ایک مرتبہ کہیں سے بتاشے آئے تو انہوں نے بتاشوں کو لوٹے میں رکھ کر اوپر سے آٹا لگا کر منہ بند کر دیا، جو سوکھنے کے بعد بچوں سے دقت کے ساتھ کھلتا اور راز ظاہر ہو جاتا۔ اب لڑکے آئے اور سوچنے لگے کہ آج تو میاں جی نے بڑا انتظام کیا ہے۔ اگر منہ کھولتے ہیں تو پتہ چل جائے گا۔ ایک لڑکے نے کہا میں اسکی ترکیب بتاتا ہوں، اس کی ٹونٹی میں پانی ڈالو، اس سے بتاشے گھل جائیں گے۔ پھر شربت کر سب پی جاؤ۔ چنانچہ ایسے ہی کیا اور لوٹا منہ کا بند رہا۔ اب جو میاں جی نے کسی دن خوش خوش اس کے منہ کو کھولا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ تو بعض لڑکے ان میانجیوں کی بھی خوب گت بنا دیتے ہیں۔ مگر اکثر یہی زیادتی کرتے ہیں۔ بعضے میاں جی دوسروں کے کام بھی بچوں سے لیتے ہیں۔ مثلاً کوئی مر گیا تو اس کا تیجہ بچوں سے پڑھواتے ہیں اور بعضے میت کے گھروں پر بھی بھیج دیتے ہیں۔ کانپور میں بھی یہ رواج تھا کہ بچوں کو تیجے کے لئے لے جاتے ہیں۔ میں نے روک دیا کہ بچے مدرسہ میں تیجے

کے واسطے نہیں آتے بلکہ نتیجہ کے واسطے آتے ہیں۔ یہاں سے اس کام کے لئے کوئی نہ جائے گا تب یہ سلسلہ بند ہوا۔ غرض بچوں سے ایسی خدمت لینا جائز نہیں جس میں والدین کی رضا نہ ہو، اور اگر رضا بھی ہو تو جو خدمت بچوں کی طاقت سے باہر ہو یا خدمت خلاف سنت ہو (جیسے تیجہ کے دانے پڑھوانا ۲:) وہ بھی جائز نہیں۔ میانجیوں کو اس کا خیال رکھنا چاہیے۔

رسمی مشائخ کا ظلم

ایک طبقہ اور ہے جو بچوں کی جان و مال پر ظلم کرتا ہے وہ رسمی مشائخ کا طبقہ ہے۔ یہ تو مریدوں کو اپنی ملک سمجھتے ہیں اور ان سے آئے دن فرمائشیں کرتے ہیں۔ کبھی پاؤں دبواتے ہیں۔ کبھی پنکھا جھلواتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں، کہ اب کے آؤ تو انگور لانا، بعضے گھوڑے کے لئے گھاس منگواتے ہیں اور ایسی خدمتیں لیتے ہیں جو اکثر ان پر بار ہوتی ہیں، یاد رکھو یہ بھی جائز نہیں ہے۔ کیسا ہی مخلص مرید ہو از خود اس سے کوئی فرمائش نہ کرنا چاہیے، ورنہ تمہاری وہ حالت ہوگی جیسے ایک مرید نے کہا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ آپ کی انگلیاں تو شہد میں بھری ہوئی ہیں اور میری انگلیاں پاخانے میں وہ بڑے خوش ہوئے کہنے لگے کیوں نہ ہو، الحمد للہ ہم پاک صاف ہیں، اور تم دنیا دار گندگیوں کے اندر بھرے ہوئے ہو۔ کہنے لگا حضور یہ تو سچ ہے مگر ابھی خواب پورا نہیں ہوا۔ پھر میں نے یہ دیکھا کہ آپ کی انگلیاں میں چاٹ رہا ہوں اور میری انگلیاں آپ چاٹ رہے ہیں۔

اب تو وہ بڑے جھلائے کہ نامعقول تو ہے مردود ہے۔ کہنے لگا حضور میں نے
خواب بیان کیا ہے، جو دیکھا تھا وہی عرض کر دیا۔ واقعی اگر یہ خواب تھا
تو اس کی تعبیر ظاہر ہے کہ مرید تو شیخ سے دین حاصل کر رہا ہے اور شیخ
مرید سے دنیا وصول کر رہا ہے اگر اس نے گڑھا تھا تو بہت ہی موقع کے
مطابق گڑھا۔ اس لئے مشائخ کو اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ مریدوں کی
دنیا پر نظر نہ کریں اور از خود کسی سے کچھ فرمائش نہ کریں۔ ہاں کسی سے بہت
ہی بے تکلفی ہو جہاں بار ہونے کا مطلق احتمال نہ ہو۔ اس سے کوئی بہت
ہی ہلکی فرمائش کا مضائقہ نہیں مگر ایسے مخلص ہزار میں ایک ہی دو ہوتے
ہیں۔ عام حالت یہی ہے کہ لوگوں کو فرمائش سے گرانی ہوتی ہے۔ بلکہ خود
ہدایا میں بھی جن کی خود فرمائش بھی نہیں کی جاتی خلوص و محبت کی رعایت
سخت ضروری ہے۔ ہر وقت ہدیہ قبول کرنے کو تیار نہ بیٹھے رہا کریں۔
کیونکہ بعض لوگ محض اس خیال سے ہدیہ دیتے ہیں کہ اگر نہ دیں گے تو
شیخ کو یہ خیال ہو گا کہ اس کو ہم سے محبت نہیں یا دوسرے یہ سمجھیں گے کہ
اس کو تعلق نہیں اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں خلوص کہاں اور خلوص و
محبت کے تو معنی یہ ہیں کہ ہدیہ دینے والے کو دنیا کی غرض سے تو کیا آخرت
کی بھی غرض مقصود نہ ہو۔ یعنی ثواب کا بھی قصد نہ ہو، کیونکہ ثواب کیلئے
کچھ دینا صدقہ ہے ہدیہ نہیں ہے۔ ہدیہ وہ ہے جو محض تطییب قلب مہدی لہ
کے لئے دیا جائے۔ گو تطییب قلب مسلم بھی ثواب کا موجب ہے اور اس
سے ثواب کی نیت مذموم نہیں۔ مگر ثواب اعطاء کا قصد نہ ہونا چاہئے

کذا قالہ الشیخ ۱۲) اور فکر کے بعد خلوص و محبت کی پہچان ہو جاتی ہے، پھر دھوکہ کم ہوتا ہے، ہمیشہ سے اسکی فکر ہے، گو کبھی دھوکہ بھی ہو جاتا ہے چنانچہ بحمد اللہ مجھے اس کی پہچان میں ملکہ ہو گیا ہے۔ بہت کم دھوکہ ہوتا ہے کیونکہ ہمیشہ سے اسکی فکر ہے۔ گو کبھی دھوکہ بھی ہو جاتا ہے، کیونکہ آخر بشر ہوں اور وہ بھی باجارہ کے ساتھ نہ کہ فاءِ فعل کے ساتھ مگر ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے۔ میرے پاس آج کل ہی میں تین خط آئے اور تینوں ساتھ ہی آئے اور ایک ہی جگہ سے چلے ہوئے تھے۔ غالباً بہار کی طرف سے آئے تھے اور تینوں کا طرز خط بھی یکساں تھا۔ ایک خط میں لکھا تھا۔ کہ میں ڈیڑھ سو روپیہ ہدیۃً بھیجنا چاہتا ہوں، جس کے لئے اجازت کا طالب ہوں، دوسرے میں ایک سو اٹھارہ روپے لکھے تھے اور تیسرے میں شاید صرف اٹھارہ روپے تھے۔ مجھے ایک ہی دن میں تین خطوں کے آنے سے شبہ ہوا۔ پھر مضمون اور رسم الخط یکساں دیکھکر یہ شبہ قوی ہو گیا۔ کہ شاید ان سب میں کچھ مشورہ ہوا ہے۔ یا ایک ہی شخص نے نام بدلکر تین خط بھیجے ہیں۔ اب میں بڑا پریشان ہوا کہ کیا جواب دوں۔ اگر منظور کر لوں کہ ہاں بھیجدو، تو اس کے ساتھ یہ شبہ ہوا تھا کہ شاید یہ محض باہمی مشورہ اور ان لوگوں کو امتحان مقصود ہو تو اس جواب سے دین کی سبکی ہو گی، اور اگر انکار کر دوں تو شبہ تھا کہ شاید ان لوگوں نے خلوص سے لکھا ہو۔ سو محض اپنے گمان پر میں مخلصین کی دلشکنی کیسے کر دوں۔ پھر گمان بھی اتنا ہی ہوا تھا کہ شاید باہم مشورہ ہوا ہے۔ سو مشورہ میں

بھی خلوص ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے یہاں کسی طالب علم کو یہ شبہ پیدا ہوا ہو کہ جب عدم خلوص کا علم نہ تھا تو قبول کرنا حلال تھا۔ ہاں بیشک یہ صحیح ہے مگر جب تھوڑی سی کوشش سے علم ہو سکے تو پھر سستی کیونکر جائز ہو گی۔ بات یہ ہے کہ باہم مشورہ میں گو خلوص ہو سکتا ہے مگر بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک کی رائے ہوتی ہے ایک کی نہیں ہوتی، وہ محض شرما شرمی سے شریک ہو جاتا ہے اور یہی اغلب اکثر ہے۔ مشورہ میں سب کا خلوص نادر ہے تو اس احتمال قوی کے ہوتے ہوئے ان ہدایا کا مطلقاً قبول کر لینا کیونکر جائز ہوتا اور ترجیح کے لئے کسی مرجح کی ضرورت تھی۔ یہاں مرجح کوئی تھا نہیں کیونکہ میں ان کاتبین میں سے کسی سے بھی واقف نہ تھا۔ اس لئے میں نے اس شبہ کے زائل کرنے کی تدبیر سوچی؛ اور جو شخص اللہ و رسول کی اتباع کرنا چاہتا ہے، حق تعالیٰ اس کی امداد فرماتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے میری امداد فرمائی اور یہ دل میں آیا کہ ابھی نہ اقرار کرنا چاہیئے نہ انکار۔ بلکہ ان لوگوں سے استفسار کرنا چاہیئے کہ مجھکو یہ شبہ ہوا ہے آیا یہ صحیح ہے یا نہیں؛ اس کے بعد جو کچھ جواب آئیگا، اس سے اصل حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ چنانچہ میں نے ہر شخص کو یہی لکھدیا کہ آپ کا خط آیا ہے اور تعجب ہے کہ اس کے ساتھ اسی دن کی ڈاک میں دو خط اسی مضمون کے اور آئے اور جن کا رسم الخط بھی اسی خط سے ملتا ہوا تھا۔ اس اتفاقی اجتماع سے مجھے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید باہم کچھ مشورہ ہوا ہے۔ آیا میرا یہ خیال صحیح ہے یا غلط۔ اس جواب کو لکھے ہوئے تقریباً دس بارہ دن ہو گئے، مگر آج تک

بھی ان کا خط نہیں آیا، بس سب خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔ میں نے خدا تعالیٰ کا بہت شکر ادا کیا کہ اس نے دنیا داروں کی چالاکی و تحقیر سے بچا لیا۔ اور صاحب ہماری عزت تو کیا چیز ہے مگر اہل علم کی حرص وغیرہ سے لوگ دین اور علم کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں، پس مشائخ کو اس میں بہت احتیاط کرنا چاہیئے اور بدوں سوچے سمجھے ہر ایک کا ہدیہ قبول نہ کیا کریں، کیونکہ التزام میں خلوص نہیں رہتا

خالی آنے جانے کا مسئلہ

اور یہ مشہور ہے کہ خالی جاوے خالی آوے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو خلوص سے خالی جاوے وہ فیوض سے خالی آوے۔ یہ مطلب نہیں کہ جو خلوص سے خالی جاوے وہ بھی محروم ہی آتا ہے ہرگز نہیں۔ اور اگر کسی کو ایسا ہی التزام کا شوق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ اس کا اہتمام نہ کرے، کہ ہر دفعہ بڑھیا چیز ہی لے جاوے، بلکہ کبھی کبھی معمولی چیزیں بھی لے جایا کرے (مثلاً مسواک لے گئے یا ایک دو پیسہ کی روشنائی ہی لے گئے، یا ایک دو قلم لے گئے، کبھی دو چار خوشبودار پھول لے آئے وغیرہ وغیرہ ۱۲)۔ بزرگان سلف ایسا ہی کرتے تھے، کہ جب ہدیہ کا شوق ہوا تو جو چیز بھی ملی خواہ کیسی ہی معمولی ہو وہی لے گئے، اس کے لئے اہتمام اور تکلف نہ کرتے تھے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک بزرگ دوسرے بزرگ سے ملنے گئے۔ راستہ میں خیال ہوا کہ کچھ ہدیہ لے

چلنا چاہیئے، کوئی دوسرا ہوتا تو گھر واپس آتا. مگر انہوں نے یہ کیا، کہ جنگل میں سے کچھ سوکھی ہوئی لکڑیاں اٹھالیں اور لاکر ان بزرگ کے سامنے رکھدیں کہ یہ لکڑیاں حضرت کے لئے پانی گرم کرنے کو لایا ہوں۔ وہ بزرگ اس ہدیہ سے بڑے خوش ہوئے اور اس کی ایسی قدر کی کہ فوراً اپنے خادم کو بلایا اور کہا کہ لکڑیاں بہت حفاظت سے رکھو، جب ہم مرجائیں تو ہمارے غسل کے لئے اس سے پانی گرم کیا جاوے، امید ہے کہ حق تعالی اس ہدیہ حلال و خالص کی برکت سے میری مغفرت فرمادیں۔ سبحان اللہ کیسے قدردان لوگ تھے، تو اس طرح اگر التزام بھی کرو تو کچھ مضائقہ نہیں اگر گھاس پھوس نہ ملے تو کم ازکم دو چار مٹی کے ڈھیلے ہی استنجے کے لئے جاؤ، اور اگر یہ خیال ہو کہ ایسے حقیر ہدیہ سے شیخ ناخوش ہوں گے، اور اس کی قدر نہ کریں گے تو یاد رکھو ایسا شخص شیخ بنانے کے قابل نہیں جس کو خلوص کی قدر نہ ہو فلوس ہی کی قدر ہو۔ صاحب تم کرکے تو دیکھو محبت کی قدر ضرور ہوتی ہے، چاہے ہدیہ ظاہر میں قلیل ہی ہو، اور دنیا میں قدر نہ ہو تو خدا کے یہاں تو ضرور قدر ہوگی۔ حضرت سلطان نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ نے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (فداہ آباءنا و امہاتنا وارواحنا ومابایدینا ۱۲) کی روح پرفتوح کو ثواب پہنچانے کے لئے کھانا پکوایا تھا. ماشاء اللہ سلطان جی کے ہاں شاہانہ انتظام تھا. بڑے عمدہ عمدہ کھانے پکوائے تھے (کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہدیہ ثواب سے زیادہ اور کس چیز میں وہ خرچ کرتے ۱۲-) کھانا تیار ہوگیا تو خدام نے اجازت

چاہی کہ اسکو اٹھا کر تقسیم کر دیا جائے۔ سلطان جی نے فرمایا کہ ابھی ذرا ٹھہرو۔ پھر کچھ دیر کے بعد پوچھا تو فرمایا ابھی ٹھہرو۔ کچھ دیر کے بعد فرمایا کہ اب تقسیم کرو۔ کسی خادم نے وجہ پوچھی کہ آپ کو کس کا انتظار تھا۔ پہلے بار بار انکار کیوں تھا اور اب اجازت کیسے دے دی، فرمایا اسوقت میرے بھائی علی احمد صابر نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پر فتوح کو ثواب کے لیئے بھونے ہوئے چنے تقسیم کیئے تھے، تو میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمہ تن ادھر متوجہ ہیں، تو ایسی حالت میں میں نے اپنا کھانا تقسیم کرنا نہیں چاہا، بلکہ میں نے یہ چاہا کہ ذرا حضور ادھر متوجہ ہوں تو پھر کھانا اٹھاؤں، تو دیکھیئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت صابر کے چنے اس قدر محبوب تھے کہ آپ ہمہ تن اس طرف متوجہ تھے، حالانکہ حضرت سلطان جی کے کھانے ظاہر میں ان سے بہت بڑھے ہوئے تھے، مگر چونکہ حضرت صابر رحمۃ اللہ علیہ کے پاس زیادہ سامان نہ تھا، انہوں نے ساری عمر گولر اور درخت کے پتے کھا کر ہی گزار دی، حتیٰ کہ چند سیر سے زیادہ اناج عمر بھر میں بھی ان کے پیٹ میں نہیں پہنچا۔ واقعی بڑے صابر تھے، تو حضور کو ان کا قلیل ہدیہ ہی دوسروں کے سازو سامان سے زیادہ عزیز تھا۔ مگر آج کل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جیسا ہدیہ ہوگا ویسا ہی ثواب ہو گا، اگر ہدیہ قلیل ہو تو ثواب بھی قلیل ہو گا۔ صاحبو! یہ صحیح نہیں، بلکہ وہاں تو خلوص کو دیکھا جاتا ہے۔ اگر ہدیہ قلیل ہو مگر خلوص زیادہ ہو تو ثواب زیادہ ملے گا، اور ہدیہ زیادہ ہو اور خلوص کم ہو ثواب کم ہو گا البتہ اگر دونوں زیادہ ہوں خلوص

بھی اور ہدیہ بھی تو بیشک یہ نورٌ علیٰ نور ہوگا۔ ہاں اس کے بعد پھر اس کو بھی دیکھا جاتا ہے، جس نے زیادہ دیا ہے، وہ صاحبِ وسعت ہے، اور جس نے کم دیا ہے وہ صاحبِ وسعت نہیں، تو باوجود خلوص میں برابر ہونے کے بھی کم وسعت والے کا ہدیہ صاحبِ وسعت کے ہدیہ سے بڑھ جائیگا۔۱۲)

ایصالِ ثواب میں اعتقادی غلطی

بعض لوگوں میں ایک غلطی اعتقادی یہ بھی ہے کہ ثواب کو نوعیت میں بھی کھانے کے موافق سمجھتے ہیں۔ چنانچہ شیر خوار بچوں کے لئے ایصال ثواب میں دودھ دیتے ہیں، گوشت نہیں دیتے، یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے دانت کہاں ہیں جو گوشت کھائیں، اسی طرح شہداء کو سبیل میں شربت کا ثواب پہنچاتے ہیں کیونکہ وہ پیاسے شہید ہوئے تھے۔ اس میں علاوہ اس اعتقادی غلطی کے دوسری غلطی یہ بھی ہے کہ گویا ان کے نزدیک شہداء اب تک پیاسے ہی ہیں۔ نعوذ باللہ! اے صاحب انہوں نے تو مرتے ہی جنت کا ایسا شربت پیا ہوگا جس سے عمر بھر بھی پیاس نہ لگے۔ اس کے متعلق خیر آباد کے ایک بزرگ کا قصہ مشہور ہے، کہ ان کے ایک مرید نے زندگی ہی میں ان کی فاتحہ کی تھی۔ جب وہ فاتحہ دلا کر ان سے ملنے آیا تو فرمانے لگے کہ بھائی ذرا فاتحہ دیتے ہوئے گرم ٹھنڈے کا تو خیال کر لیا کرو۔ تم نے فاتحہ میں کھیر ایسی جلتی ہوئی دی کہ اب تک میری زبان میں چھالے پڑے ہوئے ہیں، حالانکہ مرید نے اپنے گھر پر فاتحہ

دی تھی، مگر وہ جلتی جلتی ہی فقیروں کے منہ سے پیر صاحب کے منہ میں پہنچ گئی، ہمیں یہ قصہ گڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے، واہیات۔ بھلا ایصال ثواب سے دوسروں کو ثواب پہنچتا ہے یا وہی کھانا پہنچتا ہے، یقیناً ثواب پہنچتا ہے اور ثواب گرم ٹھنڈا ہوتا نہیں، بلکہ وہ نیکیاں ہیں جو چودھری جی کے نامۂ اعمال میں لکھی جاتی ہیں، جسکا صلہ جنت کے درجات ہوتے ہیں۔ بہرحال یہ قصہ محض لغو ہے۔ ثواب کے لئے تو نص قطعی ہے:

لَن يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِن يَّنَالُهُ
التَّقْوٰى مِنكُمْ

کہ خدا کے یہاں نہ قربانی کے جانوروں کا گوشت پہنچتا ہے، نہ خون، بلکہ وہاں تو تقوےٰ (اور خلوص) پہنچتا ہے۔ اس نص سے عوام کی غلطی ظاہر ہو گئی جو ثواب کو کھانے کے موافق سمجھتے ہیں، اور اسی نص کے موافق اہل اللہ کے یہاں بھی خلوص کی قدر ہوتی ہے، گو ظاہر میں ہدیہ قلیل ہو۔ چنانچہ ان بزرگ نے لکڑیوں کے گٹھر کی یہ قدر کی کہ اس کو اپنے جنازہ کے غسل کے لئے احتیاط سے رکھوایا۔ بعض دفعہ اہل اللہ تو کسی کے ہدیہ کی تحقیر نہیں کرتے مگر ان کے خدام تحقیر کرتے ہیں، تو خدام کی رعایت نہ کرنا چاہیئے، اور مشائخ کو چاہیئے کہ کسی کو اپنا خادم خاص نہ بنائیں جس کو ان کے کاموں میں زیادہ دخل ہو۔ بعض دفعہ یہ حواشی غضب کرتے ہیں کہ مریدوں کے ہدایا کی تحقیر کرتے اور بعض مریدوں کی شکایتیں شیخ سے کرتے رہتے ہیں۔ جس کو چاہتے ہیں بڑھا دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں گرا دیتے ہیں، پھر شیخ بھی آخر بشر ہے۔

سنتے سنتے کچھ اثر اس کے قلب پر بھی ہو ہی جاتا ہے۔ اس لیے میں تو بجائے حواشی کے ان کو مواشی کہتا ہوں۔ غرض ظلم سے بہت کم لوگ بچے ہوئے ہیں مشائخ تو مریدوں کی جان میں تصرف کرتے ہیں اور میاں جی بچوں کی جان میں اور رؤسا غریبوں کی جان میں۔

صفائی معاملات

بعض جگہ رؤسا میں یہ دستور ہے کہ چوپال میں بیٹھے ہوئے ہیں اور سامنے سے کوئی غریب مزدور سر پر بوجھ رکھے ہوئے گزرا تو اُس کو بلا کر کہہ دیا کہ بوجھ تو یہاں رکھ دے اور فلاں جگہ جا کر یہ کام کر آ۔ یہ صریح ظلم ہے کیونکہ اس سے لوگوں پر عموماً ناگواری ہوتی ہے۔ وہ غریب بیچارہ رئیس کے ڈر سے کچھ نہیں کہتا مگر اس کا دل ہی جانتا ہے کہ اُس کا وقت کیسا کھوٹا ہوا۔ اگر کام ہی لینا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس سے کہو کہ ہم کو فلاں جگہ ایک آدمی بھیجنے کی ضرورت ہے اور اتنی مزدوری دیں گے۔ اگر تجھے مزدوری لینا ہو تو بوجھ رکھ کر یہ کام کر لے۔ غرض غریب کا دل خوش کر کے پھر کام لو اور غریب کا خوش کر دینا ہی کیا مشکل کام ہے۔ دو چار آنے کے پیسوں میں بیچارہ خوش ہو جاتا ہے۔ مگر تراضی طرفین سے ہو۔

بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ ٹمٹم اور گاڑی کا کرایہ طے نہیں کرتے نہ قلی کی مزدوری چکاتے ہیں۔ بس بے کہے سُنے سوار ہو گئے یا مزدور کے سر پر بوجھ لاد دیا۔ اور بعد میں سرکاری نرخ کے موافق کرایہ دیتے ہیں تو یاد رکھو یہ جائز نہیں۔ بلکہ کرایہ اوّل چکانا چاہیے۔

اس پر بعض لوگوں کو شبہ ہوگا کہ پیچھے حکومت نے تو ٹمٹم والوں اور قلیوں کی زیادتی سے مسافروں کو محفوظ کرنے کے لیے ایک نرخ مقرر کیا تھا شریعت نے اس کو بھی ناجائز کر دیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بس جتنا بھی کوئی مانگے وہی دو چاہے لٹ ہی جاؤ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے ظلم کو روکنا چاہا نیز اس سے بھی بچانا چاہا کہ بعد میں نزاع نہ ہو۔ سو ظاہر ہے کہ مزدور سے بلا رضامندی کام لینے کا کسی کو کیا حق ہے۔ اسی طرح کسی کی گاڑی میں بدون اس کی خوشی کے سوار ہونے کا کسی کو کیا حق ہے۔ باقی حکومت نے جس مصلحت سے نرخ نامے مقرر کئے ہیں شریعت اس کو فضول نہیں کہتی۔ مگر اس کی صورت شریعت کے موافق یہ ہے کہ ٹمٹم والے سے یا قلی سے کام لینے سے پہلے صاف کہہ دو کہ ہم سرکاری نرخ نامے کے موافق تم کو کرایہ یا مزدوری دیں گے۔ اس سے زیادہ نہ دینگے اگر خوشی ہو قبول کر لو۔ اگر وہ اس پر بھی آپ کو بٹھالے یا سامان اٹھالے تو پھر سرکاری نرخ کے موافق کرایہ دینا جائز ہے۔ کیونکہ آپ نے اب معاملہ صاف کر لیا۔ اور دوسرے نے بخوشی اس کو منظور کر لیا ہے۔ پس تم سرکاری نرخ نامہ کے موافق ہی دو مگر پہلے کہہ کر دو۔ یہ نہیں کہ اول تو خاموش سوار ہو جاؤ اور بعد میں سرکاری نرخ کے حساب سے دو۔ کیونکہ ممکن ہے کہ ٹمٹم والے نے اس مزدوری کے خیال سے آپ کو نہ بٹھایا ہو بلکہ ٹمٹم والوں کے عام رواج کے موافق مزدوری لینا چاہتا ہو۔ پھر بعد میں نزاع ہو گا۔ چنانچہ ہم نے اکثر لوگوں سے نزاع ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ (اگر انسان میں تھوڑی سی بھی

شرافت ہو تو وہ بعد کے نزاع کو ہرگز گوارا نہ کرے گا۔ یہی شریعت کی تعلیم ہے کہ مزدوری اور کرایہ اوّل طے کر لو چاہے سرکاری نرخ ہی کے موافق طے کر لو بدون صفائی کے کسی چیز سے منتفع نہ ہو)

حکام کا ظلم

اسی طرح بعض حکام یہ ظلم کرتے ہیں کہ دورہ کے وقت کہیں سے بلا قیمت دودھ منگاتے ہیں کہیں سے پھل منگاتے ہیں اور بعض جگہ قصبات کے رؤسا ان کے لئے یہ چیزیں بھیجتے ہیں۔ پہلی صورت تو صریح ظلم ہے اور دوسری صورت رشوت میں داخل ہے اور اس میں بھی اکثر ظلم ہی ہوتا ہے کیونکہ زمیندار اور رئیس اپنے گھر سے یہ سامان نہیں بھیجتے بلکہ بستی کے دکانداروں پر ظلم کر کے اُن سے لیتے ہیں اور حکام کے ڈیرہ پر پہنچاتے ہیں۔ جب حکومت کی طرف سے دورہ کرنے والوں کو ماہوار تنخواہ ملتی ہے اور دورہ کا بھتہ بھی ملتا ہے۔ پھر اُن کو بستی والوں سے یہ چیزیں لینے کا کیا حق ہے۔ مسلمانوں کو اس طریقہ سے بچنا چاہیئے۔

بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ حاکم خود تو منتظم ہوتا ہے کسی سے رشوت نہیں لیتا نہ کسی پر ظلم کرتا ہے۔ مگر ان کے متعلقین چپراسی وغیرہ ظلم کرتے ہیں اس لئے حاکم تنہا اپنی احتیاط سے نجات نہیں پا سکتا بلکہ اس کا انتظام بھی اس کے ذمہ ہے کہ متعلقین بھی ظلم نہ کرنے پائیں۔ جس کی صورت یہ ہے کہ عام طور سے اشتہار دے دے کہ میرے یہاں رشوت کا بالکل کام نہیں۔ اس لئے اگر میرے عملہ میں سے کوئی شخص کسی سے رشوت مانگے تو ہرگز کوئی نہ دے بلکہ ہم سے

اس کی اطلاع کرے۔ پھر اطلاع کے بعد جس نے ایسی حرکت کی ہو اُس سے رقم واپس کرائے اور کافی سزا دے۔ نیز جو شخص حاکم سے ملنے آئے اس کو خود جا کر دروازہ سے باہر تک پہنچائے تاکہ نکلتے ہوئے کوئی چپراسی وغیرہ اس کو تنگ نہ کرے۔ قرآن میں نص ہے

وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ

علّت سے اس کے عموم میں یہ صورت بھی قیاساً داخل ہے۔ نیز حکام کو یہ بھی چاہیئے کہ لوگوں کے تعلقات براہ راست اپنے سے رکھیں کسی شخص کو واسطہ نہ بنائیں کیونکہ یہ واسطے بہت ستم ڈھاتے ہیں۔

اگر یہ کہو کہ صاحب! یہ تو بڑا مشکل ہے تو میں کہوں گا ہاں بے شک بڑا مشکل ہے مگر حکومت کرنا آسان نہیں۔ یہ منہ کا نوالہ نہیں۔ حاکم ہر وقت جہنم کے کنارے پر ہے۔ اگر جہنم کے عذاب سے بچنا چاہتے ہو تو اس کی صورت یہی ہے اور تم نے تو یہ بلا خود اپنے سر لی ہے۔ تم نے کوششیں کر کے اور سفارشیں کرا کے حکومت حاصل کی ہے پھر اس کے حقوق ادا کرنے سے کیوں جان چراتے ہو۔ جو بلا خود تم نے اپنے سر لی ہے اس کا مزہ چکھو۔

صاحبو ــــ حکومت وہ چیز ہے کہ حضرات سلف تو اس سے بھاگتے تھے۔ ماریں کھاتے تھے اور قبول نہ کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جن کے آپ مقلد کہلاتے ہیں، اسی پر شہید کئے گئے۔ خلیفہ وقت نے کئی دفعہ ان کو عہدہ قضا پر مامور کیا مگر انکار کر دیا۔ کیوں کہ ان کو یہ حدیث یاد تھی کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

من جعل قاضیا فقد ذبح بغیر سکین

یعنی جو شخص قاضی بنا دیا گیا وہ بدون چھری کے ذبح کر دیا گیا۔ اس لئے امام صاحب عذر کرتے تھے۔ آخر اسی بات پر امام صاحب قید کئے گئے اور قید خانہ ہی میں زہر دے کر شہید کئے گئے۔ یہ سب کچھ گوارا تھا مگر حکومت منظور نہ تھی۔

صاحبو۔ سلف کی یہ حالت تھی کہ جب خلفا کسی عالم کو قاضی بنانا چاہتے اور وہ قضا کی مذمت اور وعیدیں ان کو احادیث سناتے تو سلاطین ان کی خوشامد کرتے تھے کہ اچھا ہم تم کو چھوڑے دیتے ہیں مگر لِلّٰہ یہ باتیں دوسروں سے نہ کہنا ورنہ سب لوگ قضا کو چھوڑ دیں گے۔

لیکن یہ وعیدیں اسی حاکم کے لئے ہیں جو حکومت کے حقوق ادا نہ کرے اور جو عدل و انصاف کا اہتمام کرکے اُس کے حقوق ادا کرے تو اس کے لئے قیامت میں عرش کا سایہ بھی ہے۔

مثالی حکام

مگر اب دیکھئے کہ جن لوگوں نے اس کے حقوق ادا کئے ہیں اُن کی کیا حالت تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب شام کا دورہ کیا ہے تو آپ کے ساتھ کل یہ سامان تھا کہ ایک غلام تھا اور ایک اونٹ۔ اسی پر آقا اور غلام دونوں باری باری سوار ہوتے تھے۔ اور کھانے کے لئے ستو کا ایک تھیلا تھا اور ایک کھجوروں کا۔ بس سادے راستہ اسی کو گھول کر پی لیا اور دو چار

کھجوریں کھالیں۔ نہ ساتھ میں خیمہ تھا نہ گھوڑے تھے۔ نہ بہت لاؤ لشکر تھا۔ پھر راستہ میں جہاں ٹھہرتے تھے وہاں استقبال کرنے کی ممانعت تھی۔ نہ کسی سے ہدیہ لیتے تھے نہ کسی گاؤں سے دودھ اور جنس منگاتے تھے۔ یہ تو خلیفہ کی حالت تھی۔

اب سردار لشکر کی حالت سنئے جس وقت حضرت عمرؓ ملک شام میں پہنچے اور حضرت ابو عبیدہؓ امیر العساکر اسلامیہ کے خیمہ میں داخل ہوئے، تو دیکھا نہ وہاں فرش و فروش ہیں نہ کچھ زیب و زینت ہے۔ بس چمڑہ کا بستر تھا اور خیمہ کی چوب میں ایک تھیلہ لٹکا ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا اے ابو عبیدہ! اس تھیلہ میں کیا ہے۔ فرمایا، اس میں روٹی کے سوکھے ہوئے ٹکڑے ہیں۔ افطار کے وقت ان کو بھگو کر کھا لیتا ہوں۔ فرمایا اے ابو عبیدہؓ! تم اس وقت ملک شام میں ہو جہاں قسم قسم کی نعمتیں ہیں۔ ہر چیز ارزاں ہے۔ تم یہ سوکھے ٹکڑے کس لئے کھاتے ہو۔ اپنے کو راحت کیوں نہیں دیتے۔ کہا اے امیر المومنین! کیا آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیشت یاد نہیں کہ حضورؐ نے کس طرح زندگی بسر کی ہے۔ بس میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ حضورؐ کی طرح زندگی گزار دوں۔ اے امیر المومنینؓ! زندگی ایک دن ختم ہونے والی ہے چاہے اس کو راحت سے گزار دو یا مشقت سے۔ اس وقت منعم اور غیر منعم سب یکساں ہوں گے۔ یہ باتیں سن کر حضرت عمرؓ بھی رونے لگے اور وہ بھی روتے رہے۔

اس مضمون میں ایک بزرگ کا قطعہ عجیب ہے جو انہوں نے

ایک رئیس کے جواب میں لکھا ہے۔ غالباً رئیس نے ان کی تکلیف کا حال سن کر لکھا تھا کہ آپ میرے پاس آجائیں تو یہاں آپ کو خوب راحت ملے گی۔ وہ جواب میں لکھتے ہیں ؎

خوردنِ تو مرغِ مسمّی و مے — خوردنِ ما نانکِ جوینِ ما

پوششِ تو اطلس و دیبا حریر — بخیہ زدہ خرقۂ پشمینِ ما

اسی طرح سب چیزوں کا موازنہ کر کے فرماتے ہیں ؎

نیک ہمین است کہ می بگذرد — راحتِ تو محنتِ دوشینِ ما

فرماتے ہیں کہ ہاں بے شک اس وقت تیرا کھانا ہمارے کھانے سے اچھا اور لباس ہمارے لباس سے اچھا ہے مگر یہی حالت اچھی ہے، جو گزر رہی ہے ؎

باش کہ تا طبلِ قیامت زنند — آں تو نیک آمد و یا این ما

قیامت آنے دو اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ کس کی حالت اچھی ہے (اہل اللہ کو خدا پر بھروسہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہ فرما دیا۔ فخر کی نیت نہ تھی کیونکہ وہ آپ سے زیادہ ترساں و لرزاں رہتے ہیں۔ ان کو فخر کی کہاں مہلت ہے۔ کبھی تحدیث بالنعمہ کے طور پر کچھ کہہ دیتے ہیں جو صورت دعویٰ میں ہوتا ہے مگر واقع میں دعویٰ نہیں ہوتا) سرمد اسی مضمون کو اس طرح فرماتے ہیں ؎

منعم کہ کباب می خورد می گذرد — در بادۂ ناب می خورد می گذرد

یعنی کباب و شراب کھانے والے بھی مر بن گئے اور فاقہ کرنے والے

بھی مریں گے جس کا آگے ذکر ہے ؂

ہر جا کہ بکاسہ گدائی نان را
نہ کرد و با آب می خورد می گذرد

غرض سلف کے پیش نظر یہ باتیں تھیں ان کو حکومت میں مزا کہاں تھا عارف شیرازی فرماتے ہیں ؂

مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم
جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محمل ہا

واقعی جس کو یہ فکر ہو کہ یہاں سے ایک دن جانا ہے وہ کس طرح چین سے بیٹھ سکتا ہے۔

احساس ذمہ داری

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ دوپہر کو سخت گرمی میں سر پر چادر ڈالے ہوئے ایک اونٹ کی تلاش میں جا رہے تھے۔ اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے بالاخانہ پر بیٹھے تھے۔ دور سے دیکھ کر یہ خیال ہوا کہ شاید امیر المومنین جا رہے ہیں۔ جب قریب آئے تو پکارا اے امیر المومنین! آپ اس دھوپ اور لو میں کہاں جا رہے ہیں۔ فرمایا، بیت المال کا ایک اونٹ گم ہو گیا ہے اس کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ عرض کیا کہ تھوڑی دیر کے بعد بھی تلاش ممکن تھی اس دھوپ میں کیوں تکلیف کی۔ فرمایا جہنم کی آگ اس سے بھی سخت ہے۔ حضرت عثمانؓ نے عرض کیا کہ اچھا میں اپنے غلام کو بھیجے دیتا ہوں آپ یہاں آرام کیجئے۔ فرمایا کہ قیامت میں تم سے یا تمہارے غلام سے باز پرس نہ ہو گی۔ بیت المال کے متعلق باز پرس تو مجھی سے ہو گی۔ اس لئے میں اپنی

رہائی کی فکر خود ہی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ فرما کر تشریف لے گئے۔ اور دوپہر کی دھوپ ہی میں اس کو تلاش کیا۔

عرب کی گرمی اور دھوپ مشہور ہے۔ اندازہ کر لیجئے کیسی سخت دھوپ ہوگی مگر امیر المومنین اس وقت خود تلاش کے واسطے نکلے دوسروں پر بھی بھروسہ نہ کیا۔ تو حضرت جن کو حکومت میں جہنم سے بچنے کا خیال ہے، وہ ایسی ایسی تکالیف برداشت کر کے حکومت کرتے ہیں۔ آپ نے اس کو منہ کا نوالہ سمجھا ہے۔ اور باوجودیکہ حضرت عمرؓ کے عدل و انصاف و جفاکشی کی یہ حالت تھی کہ دنیا میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے اور خود حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو فخر تھا کہ میں نے ایسے شخص کو اپنا خلیفہ بنایا ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ چنانچہ جب حضرت صدیقؓ نے ان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے تو ایک شخص نے کہا اے ابو بکرؓ تم نے مسلمانوں پر ایک سخت مزاج شخص کو خلیفہ بنا دیا۔ خدا کو اس کا کیا جواب دوگے تو حضرت صدیقؓ نے فخر کے ساتھ فرمایا کہ تو مجھے کیا ڈراتا ہے۔ اگر مجھ سے سوال ہوا تو میں حق تعالیٰ سے عرض کر دوں گا کہ میں نے ایسے شخص کو خلیفہ بنایا تھا کہ روئے زمین پر اس سے بہتر کوئی نہ تھا۔

صاحبو! خدا کے یہاں ایسی ویسی بات نہیں چل سکتی۔ خدائے تعالیٰ کے سامنے یکی ہی بات کوئی کہہ سکتا ہے۔ پس حضرت صدیقؓ کو کوئی وثوق تھا جو وہ حضرت عمرؓ کے متعلق حق تعالیٰ کے سامنے شہادت دینے کو تیار تھے مگر اس پر بھی کسی صحابی نے حضرت عمر کو وصال سے دس یا پندرہ سال بعد خواب میں دیکھا کہ پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے آ رہے ہیں۔ پوچھا

اے امیر المومنین! آپ کا کیا حال ہے۔ فرمایا، عمر قریب بہلاکت ہو گیا تھا مرنے کے بعد سے جو حساب شروع ہوا ہے تو آج حساب سے فراغت ہوئی ہے الحمد للہ کہ خدا تعالیٰ نے مجھے بخش دیا۔

تو حضرت حکومت کوئی مباہ کی چیز نہیں ہے۔ جس کو جتنی بھی حکومت حاصل ہے اسی قدر اس کے ذمہ حقوق ہیں جن کا ادا کرنا اس کے ذمہ لازم ہے۔ پس حکام پر لازم ہے کہ جو شخص اُن سے ملنے آئے اس کو جائے امن تک خود پہنچائیں تاکہ عملہ والے اس کو پریشان نہ کریں۔ یہ تو جان و مال کے حقوق تھے۔

خلوص کی پہچان

ایک حق آبرو کا ہے۔ یہ بھی حق العباد کی ایک فرد ہے جس کے ضائع کرنے میں ہم لوگ بہت مبتلا ہیں خصوصاً علماء و مشائخ کیونکہ عوام تو عوام ہی کی آبروریزی اور غیبت کرتے ہیں اور یہ لوگ اولیاء اللہ اور مشائخ کی غیبت اور آبروریزی کرتے ہیں۔ تاکہ لوگ اُدھر سے ہٹ کر اُن کی طرف آویں۔ یاد رکھو یہ خلوص کے بالکل خلاف ہے۔ خلوص کی پہچان تو یہ ہے جو شیخ علی خواص رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بستی میں دین کا ایک کام کر رہا ہو۔ پھر اس سے اچھا کام کرنے والا آجاوے تو اس کام کو چھوڑ کر اس دوسرے ہی شخص کے سپرد کر دے اور اپنے متعلقین کو خود اس کے یہاں بھیج دے اور آپ کسی دوسرے کام میں لگے اور اس سے خوش ہو کہ الحمد للہ! دین کا کام کرنے والا اس بستی میں دوسرا آگیا جس سے

میرا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اب مجھے خلوت و ذکر کا خوب موقع ملے گا۔ ہائے عارفین اہل اللہ تو ہر وقت اس کو ترستے ہیں کہ کوئی وقت فراغت اور خلوت کا ملے جس میں یہ محبوب حقیقی کے ساتھ مشغول ہوں۔ ان کا تو مذاق یہ ہے کہ ؎

دلا آرامے کہ داری دل درو بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اسی کو عارف جامی فرماتے ہیں ؎

چہ خوش وقتے و خرم روزگارے
کہ یارے برخورد از وصل یارے

حضرت گو شغل علمی بھی دین ہے اور ثواب کا کام ہے مگر پھر بھی عارفین خلوت کے لئے تڑپتے رہتے ہیں کیونکہ ان کے مشاغل میں کوئی نہ کوئی بات دین کے خلاف سرزد ہو ہی جاتی ہے تو ان سے قلب کی پوری اصلاح نہیں ہوتی۔ اصلاح قلب کے لیے ایک وقت خلوت کا ضرور ہونا چاہیے اس لیے عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

از قیل و قال مدرسہ حالے دلم گرفت
یک چند نیز خدمتِ معشوق مے کنم

بھلا اور عارفین تو کس شمار میں ہیں جب سید العارفین سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حق تعالیٰ خلوت کا امر فرما رہے ہیں۔ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ۔ جن لوگوں کو خلوت کا لطف حاصل ہو چکا

ہے ان کے دل سے اس کی قدر پوچھو۔ حضرت نواب شیفتہ کا ایک شعر اس
کے متعلق مجھے بہت ہی پسند آیا ہے

چہ خوش است باتو بزمے بنہفتہ ساز کردن
درِ خانہ بند کردن سرِ شیشہ باز کردن

اس میں بنہفتہ ساز کردن عجیب تعبیر ہے (ایسے ہی سر شیشہ باز کردن
میں حضور قلب کی کیفیت کا فوٹو کھینچ دیا ہے)

غرض مخلص کی شان یہ ہے کہ وہ محض ضرورت دینی کی وجہ سے کسی
منصب کو ادا کرتا ہے خواہ وہ درس و تدریس ہو یا تعلیم و تربیت باطن ہو
یا وعظ و امامت ہو۔ اپنے نفس کی بڑائی کے لیے کسی منصب پر پیش قدمی
نہیں کرتا اور اس کی علامت یہ ہے کہ جب کوئی دوسرا اس کام کا کرنے
والا آجاتا ہے اور یہ دیکھ لیتا ہے کہ دینی ضرورت اس سے پوری ہو گئی
تو اب وہ اپنے کو اس منصب سے علیحدہ کر لیتا ہے اور خود خلوت و
ذکر میں مشغول ہو جاتا یا دین کا کوئی دوسرا کام لے لیتا ہے جس کا کرنے والا
اس بستی میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔

مگر اب تو یہ حالت ہے کہ جو شخص کسی جگہ پڑھاتا ہے وہاں دوسرا
پڑھانے والا آجائے تو یہ اس سے جلتا ہے۔ کوئی واعظ ہے اور اس کی
بستی میں کوئی دوسرا واعظ آجائے تو یہ اس سے حسد کرتا ہے۔ کسی جگہ ایک
مدرسہ ہے وہاں دوسرا مدرسہ ہو جائے تو پہلے مدرسہ والے اس کے مٹانے
کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی شیخ ایک مقام میں تربیت باطن کر رہا ہے وہاں

دوسرا شیخ آجاوے تو اس کو گراں گزرتا ہے۔ پھر ایک دوسرے کی آبرو ریزی اور غیبت میں مشغول ہوتے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ یہ نہ رہے یہ چاہتا ہے کہ وہ نہ رہے۔

صاحبو ــــ کیا اسی کا نام دین ہے۔ کیا اسی کو خلوص کہتے ہیں پھر تماشا یہ ہے کہ باوجود اس بددینی کے ہر ایک بجائے خود نازاں ہے اور سمجھتا ہے کہ میں دنیا سے الگ ہوں اور دین کا کام کر رہا ہوں حالانکہ اس کے دل میں سراسر دنیا بھری ہوئی ہے اور اس کا مصداق بنا ہوا ہے۔

اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا۔

غرض کیا خاص کیا عوام سبھی نے آبرو کے حق سے غفلت کر رکھی ہے اور غیبت و شکایت کو کچھ گناہ ہی نہیں سمجھتے۔ اس تقریر سے صاف واضح ہو گیا ہوگا کہ حقوق العباد صرف اموال ہی میں منحصر نہیں بلکہ مال کا بھی حق ہے آبرو کا بھی حق ہے۔ پس باہم ایک دوسرے کا بھی حق ہے۔ پس باہم ایک دوسروں کی اتلافِ جان، اتلافِ مال، اتلافِ آبرو سے بچو۔

اتلافِ دین

ایک چوتھی چیز اور ہے جو ان تینوں سے بھی اہم ہے مگر لوگ اس کو بہت کمتر اور معمولی بات سمجھتے ہیں۔ وہ کیا چیز ہے ــــ اتلافِ دین ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر یہ بھی حق ہے کہ اس کے دین کا ضرر نہ کرے یعنی اپنی وجہ سے کسی کا دین ضائع نہ کرے۔ یہ سب سے مقدم ہے اس

کے بعد آبرو کا درجہ ہے پھر جان کا پھر مال کا۔ کیونکہ شریف آدمی جان کو مال سے مقدم سمجھتا ہے اور جان بچانے کے لئے مال کو خرچ کر دیتا ہے مگر آبرو کو جان سے بھی مقدم سمجھتا ہے۔ چنانچہ شریف آدمی آبرو کے لئے جان پر کھیل جاتا ہے اور جو شریف دیندار ہو گا اور مسلمان سبھی دیندار ہیں وہ آبرو اور جان سے زیادہ دین کو سمجھتا ہے۔ چنانچہ دیندار آدمی دین کی حفاظت کے لئے آبرو کی پروا نہیں کیا کرتا۔

حضرت مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت (مجدد زمان) سید احمد صاحب بریلوی قدس سرہ کے خلفاء میں سے ہیں ایک مرتبہ لشکر کے ساتھ جا رہے تھے اور خود امیر عسکر تھے کہ راستہ میں نماز کا وقت آ گیا تو آپ نے اپنی بی بی صاحبہ کو برقع اڑھا کر نماز کے لئے سب کے سامنے بہلی سے اتارا اور بلند آواز سے فرمایا کہ صاحبو! دیکھ لو یہ عبدالحی کی بیوی ہے جو نماز کے واسطے سب کے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔

حضرت دیندار کو تو یہی حالت ہو گی کہ وہ عرفی آبرو کو دین کے لئے فدا کر دے گا۔ مگر اب لوگ یہ کہتے ہیں کہ آبرو کو دین سے زیادہ سمجھتے ہیں اسی واسطے تقریبات میں محض اپنی آبرو کے لئے دین کے خلاف بہت سے کام کرتے ہیں حالانکہ آبرو سے دین مقدم ہے اور آبرو جان و مال پر مقدم ہے۔ مگر بعضے ایسے بھی ہیں جو مال کو آبرو سے مقدم کرتے ہیں۔ جیسے بعضے رذیل بھیک مانگ کر مال جمع کرتے ہیں اور آبرو کی پروا نہیں کرتے بعضوں نے مسجد اور مدرسہ کے چندہ کی آڑ پکڑ لی ہے کیونکہ ویسے بھیک مانگنے

سے تو کون دیتا ہے۔ مسجد اور مدرسہ کے نام سے کچھ مل ہی جاتا ہے پھر جو کچھ ملتا ہے وہ اسی مانگنے والے کے پیٹ ہی کو لگ جاتا ہے نہ مسجد کو ملتا ہے نہ مدرسہ کو۔

کسی مقام میں ایک صاحب تھے۔ وہ مسجد کے لئے چندہ کیا کرتے تھے اور چند روز کے بعد پھر آدھمکتے اور قسمیں کھا جاتے کہ میں سارا چندہ مسجد ہی کو لگا آیا ہوں۔ ایک شخص ان کے حال سے واقف تھا۔ اس نے کہا کم بخت جھوٹی قسم تو نہ کھایا کر۔ تو مسجد کو کہاں لگاتا ہے سارا خود ہی کھا لیتا ہے۔ کہنے لگا کہ واللہ میں سب مسجد کو لگا دیتا ہوں۔ آؤ تم کو دکھاؤں چنانچہ روپوں کی تھیلی کو مسجد کی دیوار سے رگڑ کر دکھا دیا کہ میں اس طرح لگایا کرتا ہوں۔ اس لئے میری قسم جھوٹ نہیں ہوتی۔

یہ ویسی ہی تاویل ہے جیسی ایک دودھ والے نے کی تھی۔ وہ بھی قسم کھایا کرتا تھا کہ واللہ میں دودھ میں پانی نہیں ملاتا۔ ایک شخص نے کہا کم بخت تو نے میرے سامنے پانی ملایا ہے تو آپ کہتے ہیں کہ میں نے دودھ میں پانی نہیں ملایا پانی میں دودھ ملایا ہے۔ وہ یہ کرتا تھا کہ ایک برتن میں پانی پہلے سے بھر لیا اور اس میں دودھ ڈال لیا۔ تو اس صورت میں پانی میں دودھ ملایا گیا نہ کہ دودھ میں پانی۔ اس لئے اپنے نزدیک وہ اس قسم میں سچا تھا کہ میں دودھ میں پانی نہیں ملاتا۔

آج کل لوگ ایسی ایسی استادیاں کرتے ہیں اور چندہ والے اس میں زیادہ مبتلا ہیں مگر ان کو تو مال سے غرض ہے۔ چاہے دین اور آبرو

ضائع ہوتا رہے ہے۔

ایک محصل چندہ سفر کانپور میں مجھ سے ملے اور شکایت کرنے لگے کہ فلاں رئیس نے مدرسہ کے لئے چندہ مانگنے پر مجھے بہت مارا۔ اب میں کیا کروں۔ میں نے کہا تم اس نوکری پر لعنت بھیجو کوئی اور کام کرو۔ کہنے لگے یہ تو دین کا کام ہے اسے کیوں کر چھوڑ دوں۔ میں نے کہا پھر جاؤ ایسی تیسی میں۔ اگر یہ دین کا کام ہے تو شکایت کیوں کرتے ہو۔ ماریں کھاتے رہو اور صبر کرو۔ کوئی قسم لے کر ان سے پوچھے کہ وہ دین ہی کے لئے تو محصل چندہ بنے ہوئے تھے۔ یہ بھی محض ایک بہانہ ہے ورنہ اصل مقصود تنخواہ ہے اگر پچاس ساٹھ روپے ان کو گھر بیٹھے مل جایا کریں تو پھر ہم دیکھیں کہ وہ پھر بھی دینی خدمت کے لئے یہ ذلت گوارا کرتے ہیں مگر اب کیا کریں پیٹ کو بھی کسی طرح دیں۔ اس واسطے یہ ساری ذلت گوارا کرتے ہیں۔

دین کی حالت تو یہ تھی کہ وہی محصل چندہ اس رئیس کے یہاں بھی آئے تھے جہاں میں مقیم تھا۔ ان سے چندہ مانگا تو انہوں نے دس روپے دے دیئے۔ تو محصل صاحب کہتے ہیں کہ جناب آپ تو ہر سال بیس روپے دیا کرتے تھے اب کے دس کیوں دیئے۔ یہ طریقہ تھا ان کے چندہ کا جس میں سب کے سامنے وہ دینے والے کو ذلیل کرتے تھے۔ بس کسی رئیس کے ساتھ یہی حرکت کی ہوگی۔ اس نے مار پیٹا ہوگا ورنہ محض مانگنے پر کون مارتا ہے۔ ہاں ان کے مانگنے کے بعد اگر دوسرا عذر کر دے یا تھوڑا سا دے دے اور اس پر اس کو ذلیل کیا جاوے تو بے شک کوئی دل جلا مار بھی دیتا

ہے۔ چندہ کا یہ طریقہ بالکل خلاف شریعت ہے اور حرام ہے اور آج کل زیادہ تر چندہ کے طریقے حرام ہی ہیں۔ مگر محصلین چندہ اس کو دین سمجھتے ہیں کچھ نہیں، اس کا نام تو بے حسی ہے کہ مال کے واسطے نہ آبرو کی پرواہ ہے نہ دین کی۔ ہاں چندہ کا ایک طریقہ جائز بھی ہے کہ مسلمانوں کو اطلاع کر دو کہ فلاں جگہ مدرسہ ہے اور فلاں شخص کے پاس اس کے لئے چندہ جمع ہو رہا ہے جس کا جی چاہے وہاں اپنی رقم جمع کر دے۔ پھر دیکھیں کتنے آدمی دیتے آتے ہیں۔ غرض بعضے ایسے بے حس بھی ہیں جو آبرو کو مال کے واسطے ضائع کر دیتے ہیں۔ بعضے ایسے بھی ہیں جو مال کے واسطے جان بھی دے دیتے ہیں

عذابِ قبر کا ایک واقعہ

تھانہ بھون کا ایک قصہ ہے کہ ایک میاں جی کے پاس دو سو روپیہ جمع ہو گئے تھے جن کو ایک لوٹے میں رکھ کر زمین کے اندر گاڑ رکھا تھا۔ مگر محبتِ مال کی حالت یہ تھی کہ روز ان کو گنا کرتا تھا۔ کسی دن لڑکوں نے بھانپ لیا۔ وہ موقع کے منتظر رہے۔ آخر ایک دن ملا جی کہیں دعوت میں گئے ہوئے تھے۔ پیچھے لڑکوں نے وہ روپیہ نکال لیا اور خوب عمدہ عمدہ کھانے پکوائے اور ملا جی کے حال پر اتنا رحم کیا کہ ان کی بھی دعوت کر دی۔ ملا جی خالی الذہن تھے۔ خوشی خوشی دعوت کو چلے گئے۔ انہیں ایسے عمدہ کھانے کب ملے تھے۔ بڑے خوش ہوئے۔ کھاتے جاتے اور پوچھتے جاتے کہ بھائی آج کیا تقریب تھی جو ایسے کھانے پکوائے گئے۔ لڑکوں نے کہا حضور یہ سب آپ ہی کی جوتیوں کا طفیل ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ملا جی نے پھر کہا کہ

آج کیا بات ہے۔ کون مہمان آگیا ہے جس کے لیئے یہ اہتمام ہوا ہے۔ پھر بھی لڑکوں نے وہی جواب دیا کہ سب حضور ہی کا طفیل ہے۔ اس پر ایک لڑکے کو ہنسی آگئی تو ملا جی کھٹک گئے کہ شاید میرے روپیوں میں ہاتھ پڑ گیا ہے جبھی یہ بار بار اس کو میرا طفیل بتلاتے ہیں۔

بس اب تو کھانا پینا سب بھول گئے۔ اندھے باولوں کی طرح سیدھے حجرہ میں آئے اور کھودا تو روپے ندارد۔ بس فوراً ہی جان نکل گئی۔ لوگ دوڑے کہ یہ قصہ کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ روپے گم ہونے کا اتنا صدمہ ہوا۔ یہ قصہ بستی میں مشہور ہوا تو اس وقت تھانہ بھون میں ایک عالم مولانا سعدالدین علی صاحب موجود تھے۔ اُنہوں نے فرمایا کہ یہ روپیہ منحوس ہے جس نے ایک مسلمان کی جان لے لی، اس کو کوئی ہاتھ نہ لگائے بلکہ جنازہ کے ساتھ ہی قبر میں دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ اہل محلہ نے اس کی تعمیل کی اور کسی نے اُن روپیوں کو ہاتھ نہیں لگایا بلکہ سب کو ایک تھیلی میں باندھ کر قبر میں میاں جی کے ساتھ دفن کر دیا۔

کفن چوروں کو خبر لگی۔ اُنہوں نے کہا مولوی کی تو عقل جاتی رہی۔ خواہ مخواہ اتنا روپیہ زمین میں گاڑ دیا۔ چلو اس کو نکالنا چاہیئے۔ چنانچہ رات کو ایک شخص نے قبر کھودی تو دیکھا کہ سب روپے کفن سے باہر سینے کے اوپر ترتیب وار رکھے ہوئے ہیں اور خوب چمک رہے ہیں۔ یہ خوش ہوا کہ اب تو اور آسانی ہو گئی اوپر ہی سے سب سمیٹ لوں گا۔ بس انگلی ہی ربوں سے لگی تھی کہ چیخ مارتا ہوا بھاگا۔ وہ روپے عالم برزخ کی آگ سے دہک

رہے تھے۔ جن سے میت کو عذاب دیا جا رہا تھا۔ پھر اس کفن چور کی عمر بھر یہ حالت رہی کہ ہر وقت ایک آبخورہ ہاتھ میں لئے پھرتا تھا جس میں وہ انگلی ہر وقت ڈوبی رہتی تھی۔ اس طرح کچھ تسکین رہتی اور جہاں پانی بدلنے کو انگلی آبخورہ سے نکالی فوراً چیخیں مارتا تھا کہ ہائے میں جلا ہائے مرا۔

تو بعض ایسے بے حس بھی ہیں جو مال کے واسطے جان دے دیتے ہیں مگر ایسے کم ہیں۔ زیادہ حالت تو یہی ہے کہ مال سے جان کو زیادہ سمجھتے ہیں اور جان سے زیادہ آبرو کو سمجھتے ہیں مگر دین کو سب سے کم تر کر رکھا ہے۔

اضرارِ دین

اسی لئے کسی کے اضرارِ دین سے کچھ باک نہیں۔ کسی کی خوشامد میں آکر غلط فتوٰی دے دیا۔ جیسا ہمارے یہاں ایک جاہل نے دنیوی خوشامد میں مطلقۃ الثلاث کو حلال کر دیا۔ دنیا دار مولوی اس مرض میں بہت مبتلا ہیں اور ان کے غلط فتوٰی سے عوام کے لئے حرام چیز حلال نہیں ہو جاتی کیونکہ فتوے کی غلطی چھپی نہیں رہا کرتی۔

ایک اضرارِ دین یہ ہے کہ کسی کو دین کا راستہ معلوم نہیں، تربیت کا طریقہ جانتا نہیں اور خواہ مخواہ شیخ و مرشد بن کر بیٹھ گیا ہے اور لوگوں کی راہ مارتا ہے۔

ایک اضرارِ دین یہ ہے جس میں اہل مدارس مبتلا ہیں کہ کسی طالب علم نے کسی سے مشورہ لیا کہ میں کون سے مدرسہ میں پڑھوں تو ہر مدرسہ والا اپنے

ہی مدرسہ کا مشورہ دیتا ہے، گو جانتے ہیں کہ اس کا نفع دوسرے مدرسہ میں زیادہ ہے۔ افسوس آج کل اہل علم بھی غلط مشورے دینے لگے ہیں اور پہلے زمانہ میں کفار بھی غلط مشورہ نہ دیتے تھے۔

چنانچہ ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ اُن کے ایک لڑکی تھی جس کے شادی کے پیام جا بجا سے آرہے تھے۔ تو انہوں نے اپنے ایک پڑوسی سے جو کہ یہودی تھا مشورہ کیا کہ میری لڑکی کے فلاں فلاں جگہ سے پیام آرہے ہیں۔ تمہارے نزدیک کونسی جگہ اچھی ہے؟ اس نے اول تو عذر کیا کہ آپ کو مجھ سے مشورہ نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ میں دین میں آپ کا مخالف ہوں۔ مخالف کے مشورہ کا کیا اعتبار۔ تو بزرگ نے فرمایا کہ شریف آدمی ہو گو مسلم نہیں ہو اس لئے غلط مشورہ نہیں دو گے۔ اس لئے تم بے تکلف مشورہ دو۔ تو وہ یہودی کہنے لگا میں نے سنا ہے کہ آپ کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِاَرْبَعٍ لِمَالِهَا وَجَمَالِهَا وَحَسَبِهَا وَدِيْنِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ۔

عورت سے نکاح کرنے میں چار باتوں کو دیکھا جاتا ہے، مال کو اور جمال کو اور حسب کو اور دین کو۔ پھر آپ نے فرمایا کہ تم دین دار سے نکاح کرنے کی کوشش کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے مذہب اسلام میں سب سے زیادہ دیکھنے کی چیز دین ہے تو میرے خیال میں جتنے لوگوں نے بھی پیام بھیجا ہے دین

پورا پورا کسی میں بھی نہیں ہے۔ میرے نزدیک تو ایک طالب علم جو آپ کی مسجد میں رہتا ہے وہ بڑا دیندار ہے۔ ہر وقت خدا کے کام میں لگا رہتا ہے پس آپ اپنی بیٹی کو اس سے بیاہ دیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ بہت برکت ہو گی چنانچہ ان بزرگ نے ایسا ہی کیا اور عمر بھر اُن کی لڑکی راحت سے رہی۔

مشورہ کی اہمیت

حدیث میں آتا ہے المستشار مؤتمن۔ جس سے مشورہ لیا جاتا ہے اُس کو امانت دار سمجھا جاتا ہے پس مشورہ غلط دینا خیانت ہے۔ اس سے بہت احتراز کرنا چاہیئے۔

ہماری بستی میں ایک صاحب اپنا گھر فروخت کرنا چاہتے تھے پہلے مجھے بھی اس کے خریدنے کا خیال تھا مگر بعد میں اُن کی رائے بدل گئی۔ پھر کچھ ایسے واقعات بستی میں ان کے ساتھ پیش آئے جن سے گھبرا کر انہوں نے باہر ملازمت کر لی اور گھر بیچنے کا پھر ارادہ کر لیا۔ اس وقت بھی میرا خیال تھا کہ یہ اگر فروخت کریں گے تو میں ضرور لے لوں گا کیونکہ اس مکان کے نہ لینے سے مجھے گونہ تکلیف ہے لیکن اس دفعہ انہوں نے مجھ سے مشورہ کیا کہ میں گھر بیچنا چاہتا ہوں اس میں آپ کی کیا رائے ہے۔ اس وقت اگر میں اپنی غرض کا لحاظ کر کے ان کو یہ مشورہ دے دیتا کہ ہاں فروخت کر دو تو وہ فوراً بیچ دیتے کیونکہ اُن کی زیادہ رائے اسی طرف مائل تھی مگر جب مجھ سے مشورہ کیا تو میں نے اپنی مصلحت پر نظر کرنا اور ان کی مصلحت کو نظر انداز کر دینا خیانت سمجھا اور وہی رائے دی جو اُن کے لئے مناسب تھی میں نے

کہا کہ آپ گھر کو ہرگز فروخت نہ کریں کیونکہ دوسری جگہ چاہے کیسی ہی راحت ہو مگر کسی وقت پھر وطن یاد آتا ہے اور جب باہر جاکر ٹھوکریں لگتی ہیں تو اس وقت اپنے وطن سے زیادہ کوئی چیز نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس رائے کی وجہ سے اُنہوں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

اس پر بعض لوگوں نے مجھے بے وقوف بھی بنایا کہ تم نے یہ رائے دے کر ساری عمر کی مصیبت پھر اپنے سر لی۔ میں نے کہا کچھ بھی ہو یہ تو مجھ سے کبھی نہ ہوگا کہ ایک شخص امین سمجھ کر مجھ سے مشورہ کرے اور میں اس کی مصلحت کے خلاف مشورہ دوں۔ مجھے دین سب سے مقدم ہے، اب چاہے مجھے راحت ہو یا کلفت ہو (اور انشاءاللہ اس نیت کی برکت سے راحت ہی ہو گی)، مگر عموماً آج کل مشیروں کی یہ حالت ہے کہ جان جان کر غلط مشورہ دیتے ہیں جس میں اُن کے نزدیک صراحۃً دوسرے کا نقصان ہوتا ہے۔

بگھرہ[۱] میں ایک شخص ملازمت سے گھر آیا اور ساتھ میں بہت کچھ نقد اور سامان وغیرہ بھی لایا۔ پھر اُس کی لڑکی کا بیاہ ہونے لگا تو بستی کے بھائیوں نے اس کے پاس اٹھنا بیٹھنا شروع کیا اور یہ رائے دی کہ ذرا شادی میں خوب دھوم دھام کرو تاکہ لوگوں کی نگاہ میں تمہاری عزت ہو اور خاندان کا

---

[۱] یہ ایک قصبہ ہے ضلع مظفر نگر میں جو تھانہ بھون سے تقریباً ۵ میل پر ہے۔

نام ہو۔ چنانچہ اُس نے ایسی دھوم دھام کی کہ جو کچھ باہر سے کما کر ساتھ لایا تھا سب غارت کر دیا۔ بعد میں ان مشیروں میں سے ایک نے فخراً کہا کہ یہ بہت بڑھ گیا تھا۔ یہ رائے دے کر ہم نے اس کو اپنے برابر کر دیا۔ آج کل برادری کے بھائیوں کی عام حالت یہی ہے کہ کسی کو اپنے سے بڑھا ہوا دیکھ نہیں سکتے۔ بس جہاں کوئی بڑھا اور اُنہوں نے اس کو ایسی پٹیاں پڑھانی شروع کیں جس سے چار دن میں وہ اُن کے برابر بلکہ کم ہو جائے اور برابر دو غرض سے کرتے ہیں کبھی حسد سے اور کبھی اس لئے کہ وہ ہم کو گھٹانے کی فکر نہ کرے کیونکہ آج کل جہاں کوئی ذرا بڑھتا ہے وہ دوسروں کو گھٹانا شروع کر دیتا ہے۔ اس لئے وہ اپنی جان بچانے کو اس کوشش میں رہتے ہیں کہ کسی طرح یہ ہم سے بڑھا ہوا نہ رہے۔

جیسے ایک گاؤں کا آدمی باہر جا کر چار پانچ سو روپیہ کا ملازم ہو گیا تھا۔ اس کے گھر پر ایک میاں جی بچوں کو پڑھانے کو نوکر تھے یہی سارے گاؤں میں خط پڑھنا جانتے تھے۔ اس شخص کا خط آیا کہ میں اتنے کا ملازم ہو گیا ہوں۔ تو گھر والوں نے میاں جی کے پاس خط بھیج دیا کہ ذرا اس کو پڑھ دو کیا لکھا ہے۔ میاں جی خط کو دیکھ کر رونے لگے تو خط لانے والا گھبرا گیا۔ کہا میاں جی خیر تو ہے کیا لکھا ہے۔ کہا ایسی ہی بات لکھی ہے جس پر مجھے رونا چاہیئے۔ اُس نے دوڑ کر گھر میں خبر کی۔ تو اُس کی بیوی نے دروازہ پر بلا کر پوچھا کیا بات ہے خیر تو ہے۔ میاں جی نے کہا بتلاؤں گا مگر تو بھی رو۔ وہ بھی رونے لگی۔ اتنے میں محلہ والے آ گئے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ میاں جی

نے کہا کہ تم بھی روو۔ وہ بھی رونے لگے۔

پھر پوچھا کہ میاں جی آخر بتاؤ تو سہی کیا لکھا ہے۔ کوئی مر گیا ہے یا بیمار ہو گیا ہے۔ کہا نہیں، اس میں یہ لکھا ہے کہ میں پانچ سو روپیہ کا نوکر ہو گیا ہوں لوگوں نے کہا لاحول ولا قوۃ۔ پھر یہ رونے کی بات ہے یا خوشی کی۔ میاں جی نے کہا، یہ رونے ہی کی بات ہے۔ مجھے تو اس لئے رونا چاہیئے کہ اب یہ مجھے اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے کیوں نوکر رکھے گا۔ کسی انگریزی جاننے والے ماسٹر کو بلا دے گا۔ اور بیوی کو اس واسطے رونا چاہیئے کہ اب وہ اس گاؤں کی عورت کو کیوں اپنے نکاح میں رکھے گا۔ بس اسے طلاق دے کر کوئی شہر کی تعلیم یافتہ عورت لائے گا۔ اور گاؤں والوں کو اس لئے رونا چاہیئے کہ اب وہ سال بھر کے بعد آتے ہی اپنا گھر بہت عالیشان بنائے گا جس میں غریبوں کے مکانات جبراً معمولی داموں میں خرید کر ملائے جائینگے پھر زمین جائداد بہت سی خرید ے گا جس میں غریبوں کے حصے دبائے جائینگے واقعی باتیں تو میاں جی نے سب معقول کہیں۔ آج کل زیادہ مال و دولت حاصل کر کے لوگ یہی حرکتیں کرتے ہیں۔ اس واسطے بھی لوگوں کو فکر ہوتی ہے کہ کسی طرح یہ ہم سے بڑھا ہوا نہ ہو۔

خیر یہ تو وہ ظلم ہے جو انسان اپنی غرض کے واسطے دوسروں پر کیا کرتا ہے اور بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ اپنی غرض سے بھی نہیں محض دوسروں کے آرام کے واسطے مخلوق کا گلا دبایا کرتے ہیں۔ جیسے بعض زمیندار حکام کو خوش کرنے کے واسطے گاؤں والوں سے چندہ جبراً وصول کرتے ہیں اور خوشامد

کے لئے چندہ کی رقم سے اُن کے سامنے ڈالی پیش کرتے ہیں۔ اور اسی طرح اور بہت سے قصے کئے جاتے ہیں۔ فروع کو کہاں تک بیان کروں۔ میں نے بطور قاعدہ کلی کے یہ حقوق بیان کر دیئے ہیں۔ فروع انہی سے سمجھ میں آ سکتی ہیں۔ اب یہ سمجھئے کہ جو کچھ حقوق میں نے اب تک بیان کئے ہیں، یہ تو حقوق عامہ ہیں۔ ان کے بعد کچھ حقوق خاصہ ہیں۔ جب کسی صاحب حق میں کوئی خاص خصوصیت ہوتی ہے تو اس کے کچھ خاص حقوق ان حقوق عامہ پر بڑھ جاتے ہیں۔ یہ حقوق مذکورہ تو ہر انسان کے دوسرے انسان پر بحیثیت عبد ہونے کے ہیں۔

خصوصی حقوق

اب اگر کوئی شخص مسلمان بھی ہے تو اسلام کی وجہ سے اس کا حق اور بھی بڑھ جائے گا۔ مثلاً مسلمان کا دوسرے مسلمان پر یہ حق ہے کہ بیمار ہو تو عیادت کرو۔ جب ملے تو سلام کرو۔ اس کو چھینک آوے اور الحمد للہ کہے تو یرحمک اللہ کہو۔ مر جاوے تو جنازہ کی نماز پڑھو، دفن کفن میں شریک ہو وغیرہ وغیرہ ایک خصوصیت یہ ہے کہ کوئی شخص ہمارا پڑوسی ہے۔ جوار کی وجہ سے اس کا حق بڑھ جائے گا۔ ایک خصوصیت یہ ہے کہ کوئی ہمارا محسن بھی ہے جیسے استاد یا پیر یا کوئی دوست وغیرہ۔ سو احسان کی وجہ سے ان کے حقوق عام مسلمانوں کے حقوق سے زیادہ ہوں گے۔ محسن ہونے میں باپ ماں کا درجہ سب سے بڑھا ہوا ہے۔ ان کے حقوق سب سے زیادہ ہیں۔

اسی طرح بعض اور رشتے بھی بواسطہ احسان میں داخل ہیں مثلاً سسرالی رشتہ جیسے بیوی کی ماں اس کا باپ وغیرہ کہ وہ بیوی کے محسن ہیں اور بیوی

سے دوستی کا رشتہ ہے تو دوست کے محسن گویا اپنے ہی محسن ہیں اُن کے حقوق بھی عام لوگوں سے زیادہ ہیں۔ غرض کہ خصوصیات کی وجہ سے حقوق عامہ پر حقوق خاصہ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت نہ میں اس کی تفصیل کر سکتا ہوں نہ اتنا وقت ہے۔ علماء کی کتابیں موجود ہیں جن میں سب کے حقوق لکھے ہوئے ہیں۔ اہل قرابت و اہل خصوصیت کے حقوق تو سب جانتے ہی ہیں احکام کی کتابوں میں رعایا اور حکام کے حقوق بھی لکھے ہوئے ہیں۔ غرض اسلام میں سب انسانوں کے لئے کچھ نہ کچھ حقوق ہیں۔

میری ایک کتاب مختصر اس بارہ میں طبع ہو چکی ہے جس کا نام حقوق الاسلام ہے۔ اس کو دیکھو اس میں مختصراً سب کے حقوق لکھے ہوئے ہیں۔ ایک مسلمان ڈپٹی نے وہ کتاب ایک انگریز کو دکھائی تھی۔ اس نے جو دیکھا تو اس میں رعایا اور حکام کے بھی حقوق تھے کہ رعایا کو حکام کے ساتھ اس طرح رہنا چاہیئے اور حکام کو رعایا کے ساتھ یوں برتاؤ کرنا چاہیئے۔ ایک حق تو حاکم مسلم کا ہے وہ الگ ہے۔ اسلام میں مطلق حاکم کا بھی بوجہ معاہدہ کے نیز بوجہ احسان انتظام راحت کے ایک حق ہے چاہے مسلم ہو یا غیر مسلم۔ تو وہ انگریز بڑا متعجب ہوا کہ اسلام میں حکام کے بھی حقوق ہیں۔ اس کو اسی پر تعجب ہوا۔ اُسے یہ خبر نہ ہوئی کہ اسلام میں بہائم کے بھی حقوق ہیں تو اور زیادہ تعجب ہوتا۔

صاحبو۔ یہ قانونِ خداوندی کی ہی خصوصیت ہے جس میں باغیوں کے بھی حقوق ہیں۔ کفار حالانکہ خدا تعالیٰ کے باغی ہیں اور ان کے بارہ میں

ارشاد ہے اِنْ ھُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ۔ مگر اس کے ساتھ ان کے کچھ حقوق بھی رکھے ہیں۔

بیوی کے حقوق

بہر حال خصوصیت محل وغیرہ سے یہ حقوق بڑھ جاتے ہیں اور خصوص ان انسانوں کے حقوق بہت زیادہ ہیں جو کسی سے کچھ نہ کہہ سکیں۔ وہ کون ہیں وہ بیویاں ہیں۔ یہ بیچاری عموماً ایسی بے کس اور بے بس ہوتی ہیں کہ کسی سے کچھ شکایت کر ہی نہیں سکتیں۔ اور اگر کسی کے باپ ماں زندہ بھی ہوں جب بھی شریف عورتیں اپنے خاوند کی شکایت کسی سے نہیں کرتیں۔ پھر مردوں کی یہ حالت ہے کہ اپنی بیوی کے سوا اور جگہ بھی اُن کی نظر اُٹھ جاتی ہے اور بعضے ایسی ایسی جگہ پھنس جاتے ہیں مگر ہندوستان کی عورتیں عموماً اپنے شوہروں کی عاشق ہوتی ہیں گو شوہر کیسا ہی ہو۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بعض مرد بدصورت بھی ہوتے ہیں مگر اُن کی بیویاں بجز شوہر کے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں۔

واقعی ہندوستان کی عورتیں تو اس صفت میں حوریں ہیں۔ حق تعالٰے نے حوروں کی تعریف میں جہاں حسن و جمال کو بیان فرمایا ہے وہاں قاصرات الطرف بھی فرمایا ہے کہ وہ اپنی نگاہوں کو شوہر ہی پر منحصر کرنے والی ہوں گی کسی غیر پر نظر نہ ڈالیں گی۔ واقعی ہندوستان کی عورتیں اس صفت میں تمام ممالک کی عورتوں سے ممتاز ہیں۔ یہ تو نکاح کر کے شوہر کے ساتھ ایسی وابستہ ہو جاتی ہیں کہ اپنے باپ ماں کو بھی بعض دفعہ چھوڑ دیتی ہیں۔ چنانچہ اگر ان

کے باپ ماں یا اور کسی عزیز کے ساتھ کبھی شوہر کی اَن بَن ہو جائے تو عورت
عموماً شوہر کا ساتھ دیتی ہے، باپ ماں کا ساتھ نہیں دیتی۔ مگر اس پر بھی بعضے
مرد اُن پر بہت زیادتی کرتے ہیں۔ باوجودیکہ وہ اُن پر ایسی فدا ہیں مگر بعض
لوگ اُن کے ساتھ جوتے ہی سے بات کرتے ہیں۔ باندی اور غلام سے
بھی اُن کی اوقات بدتر رکھتے ہیں۔

بعضے ایسے بے مروّت ہیں کہ اُن کی آمدنی ہزاروں کی ہے مگر بیوی کو
دس ہی روپیہ کا روزینہ دیتے ہیں اور بعضے تو کھانے کپڑے کی بھی خبر نہیں
لیتے۔ نہ ہوا عرب یا بعض ہندوستانی ریاستیں کہ وہاں عورت فوراً قاضی
کے یہاں جا کر نالش کر دیتی ہے۔ اب یا تو قاضی کی تجویز کے موافق نان و نفقہ
دینا پڑتا ہے ورنہ جبراً طلاق دلوائی جاتی ہے۔ جس کے بعد فوراً عورت کی
طرف سے مہر کی نالش ہو جاتی ہے اور بعض ممالک میں مہر نکاح کے وقت
ہی پیشگی دھروا لیتے ہیں۔ یہ بےچاری ہندوستان کی ہی عورتیں ہیں، جو مہر
بھی معاف کر دیتی ہیں اور عمر بھر نان و نفقہ کی تکلیف بھی سہتی ہیں۔ خیر کسی کے
پاس ہو ہی نہیں تو اس کی شکایت نہیں۔ اس صورت میں تو عورتیں خود محنت
مزدوری کر کے شوہر کو بھی کھلاتی ہیں۔ لیکن جس کو خدا تعالیٰ نے سب کچھ دیا
ہو وہ بیوی کو تنگ رکھے یہ نہایت بےغیرتی اور بےحمیتی ہے۔ سعدی فرماتے
ہیں ؎

مرہ بیں آں بے حمیت را کہ ہرگز   نخواہد دید روئے نیک بختی
تن آسانی گزیند خویشتن را   زن و فرزند بگذارد بہ سختی

حالانکہ عورتوں کا ایک حق تو اس واسطے ہے کہ وہ بے کس و بے بس ہیں۔ دوسرے اس واسطے بھی حق ہے کہ وہ تمہاری دوست ہیں اور اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ دوستی کی وجہ سے حق بڑھ جاتا ہے پھر وہ تمہاری دین کی محافظ بھی ہیں۔ اسی لئے صوفیاء نے تقلیل وقاع کو مجاہدہ میں داخل نہیں کیا باوجودیکہ وہ تمام لذات میں الذ ہے مگر صوفیاء نے اس کی تقلیل کو مجاہدہ میں شمار نہیں کیا اور نہ کثرت وقاع سے منع کیا ہے۔ گو اور وجہ سے منع کیا ہے مگر مجاہدہ کی حیثیت سے منع نہیں کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ صوفیہ محض ترک لذات نہیں کراتے بلکہ اصلاح قوت بہیمیہ کراتے ہیں۔ اگر ان کا مقصود ترک لذات ہوتا تو کثرت وقاع سے پہلے منع کرتے۔

غرض بیوی اس لحاظ سے بھی قابل قدر ہے کہ اس سے دین کی حفاظت اور خیالات فاسدہ کی روک ہوتی ہے۔ اس وجہ میں وہ بڑی محسن ہے جو لوگ دیندار ہیں۔ وہ اس احسان کی قدر کرتے ہیں۔

مولانا محمد مظہر صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرس مظاہر العلوم کی یہ حالت تھی کہ اُن کی بیوی بوڑھی ہو گئی تھیں مگر مولانا کو اُن سے ایسا تعلق تھا کہ جب وہ ذرا بیمار ہوتیں تو مولانا فوراً مدرسہ سے رخصت لے کر خود اپنے ہاتھ سے ان کی خدمت کرتے تھے۔ آج کل تو بعض لوگ بوڑھی بیوی سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ تم نے ہی تو اس کو بوڑھی کیا ہے۔ مگر مولانا کی یہ حالت تھی کہ نوکروں اور ماماؤں پر اپنی بیوی کی خدمت کو نہ ڈالتے تھے

بلکہ مدرسہ سے رخصت لے کر خود خدمت کرتے تھے۔ اسی لئے تو علماء کو لوگ بیوی کا مرید کہتے ہیں۔ مگر جی ہاں ان کا مرید ہونا تمہاری طرح پیر ہونے سے اچھا ہے۔ تم بیویوں کے پیر ہو مگر ڈاکو پیر ہو۔ اور اصل یہ ہے کہ مولوی بیویوں کے مرید نہیں ہیں بلکہ ان کے دل میں خدا کا خوف ہے۔ وہ حقوق العباد کو ادا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ بیوی کے حقوق نصوص میں ان کی نظر سے گزرے ہوئے ہیں۔ حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی معاشرت کا حال انہوں نے پڑھا ہے اس لئے وہ بیوی کے ساتھ نرمی اور ملاطفت کرتے ہیں۔ ان کو راحت پہنچاتے ہیں۔ بلکہ جتنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا ہے اتنا تو کوئی مولوی کر بھی نہیں سکتا اور اگر کوئی ویسا کرنے لگے تو نہ معلوم لوگ اس کو زن مرید سے بڑھ کر اور کیا خطاب دینے لگیں گے۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ایک بار دوڑے تو اس وقت وہ ہلکی پھلکی تھیں۔ آپ سے وہ آگے نکل گئیں۔ اس کے بعد کچھ عرصہ میں دوبارہ پھر آپ ان کے ساتھ دوڑے۔ اس وقت حضرت عائشہ رض بھاری پڑ گئی تھیں تو اب حضور آگے نکل گئے تو آپ نے فرمایا تلك بتلك یہ پہلی بار کا بدلہ ہے۔

میں نے ایک مولوی سے جو بڑے وقار و تمکنت سے رہتے تھے کہا تھا کہ تم نے جس چیز کا نام وقار رکھا ہے یہ تکبر ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری طرح کے وقار سے نہ رہتے تھے۔ بتلاؤ کیا تم بھی کبھی

اپنی بیوی کے ساتھ دوڑے ہو۔ بس چپ ہو گئے اس کا کچھ جواب نہ تھا میں نے کہا بس رہو، وقار وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت کے موافق ہو اور جو اس کے خلاف ہو وہ وقار نہیں تکبر ہے۔

غرض مولوی اس واسطے اپنی بیویوں کی خاطر زیادہ کرتے ہیں کہ ان کی نگاہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت ہے۔ پھر بیوی کی خاطر کرنے میں دنیا کی بھی تو بڑی مصلحت ہے۔ اول بات تو یہ ہے کہ اس سے زندگی لطف سے گزرتی ہے۔ ایک دوسرے کی راحت و رنج کا شریک ہوتا ہے اور اگر میاں بی بی میں موافقت اور بے تکلفی اور انشراح ہو تو پھر زندگی کا کیا لطف ہے۔ جہاں ہر وقت جوتی بیزار ہو وہاں کوئی خوشی نہیں ہے۔

در خرمی بر سرائے بہ بند　　　　کہ بانگ زن از وے بر آید بلند

لطف تو اسی میں ہے کہ آدمی دن بھر کا تھکا ماندہ گھر میں جائے تو گھر والوں کی باتوں سے جی خوش کرے وہ اس کو راحت دیں۔ یہ ان کی راحت کا خیال کرے اور یہ کیا زندگی ہے کہ دن بھر تو کام میں تھکے اب شام کو گھر جا کر بھی رنج و غم ہی کی باتیں کی جائیں۔ مگر آج کل لوگوں کے مذاق بگڑ گئے ہیں بے حسی چھا گئی ہے۔ وہ اسی حالت میں رہنا پسند کرتے ہیں مگر جن کو ذرا بھی حس ہے، وہ تو اس کو دنیا ہی میں دوزخ سمجھتے ہیں اور جن کی معاشرت گھر والوں کے ساتھ عمدہ ہے واقعی ان کو دنیا ہی میں جنت نصیب ہے۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد　　کسے را با کسے کارے نباشد

(یعنی کار ایذا نباشد) اور سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

زنِ خوب فرماں بر و پارسا　　کند مردِ درویش را پادشاہ

ہمہ روز اگر غم خوری غم مدار　　چو شب غمگسارت بود در کنار

بیوی کی اہمیت

صاحبو۔ یہ راز ہے اہل اللہ کی دل جوئی میں۔ وہ اس لئے اپنے گھر والوں کو راحت پہنچاتے ہیں تاکہ زندگی لطف کے ساتھ گزرے اور واقعی خدا تعالیٰ نے یہ تعلق ہی ایسا بنایا ہے کہ بیوی سے زیادہ کوئی بھی انسان کو راحت نہیں دے سکتا۔ بیماری میں بعض دفعہ سارے عزیز الگ ہو کر ناک منہ چڑھانے لگتے ہیں۔ خصوصاً اگر کسی کو دستوں کی بیماری ہو جائے مگر بیوی سے یہ کہیں نہیں ہو سکتا کہ وہ شوہر کو اس حال میں بھی چھوڑ دے۔ وہ بیماری میں سب سے زیادہ راحت پہنچاتی ہے۔

شاہجہاںپور میں ایک رئیس نے بڑھاپے میں شادی کی تھی۔ اُن کے لڑکوں نے اعتراض کیا کہ تم کو اس عمر میں شادی کی کیا ضرورت تھی۔ خدمت کے لئے تو آپ کی اولاد بہت تھی۔ کہا تم نہیں جانتے۔ بیوی کے برابر مجھے کوئی راحت نہیں دے سکتا۔ اتفاق سے ایک بار وہ بیمار ہوئے اور دست لگ گئے تو سارے لڑکے اور بہو بیٹیاں چھوڑ کر الگ ہو گئے اور بدبُو کی وجہ سے کوئی بھی پاس نہ آتا تھا مگر بیوی اس وقت بھی خدمت گزار تھی۔ وہ بیچاری ہر وقت سہارا لگا کر بٹھاتی، کپڑوں کو دھوتی، صاف کرتی

تھی۔ پھر وہ بیماری سے شفایاب ہوئے تو لڑکوں کو بلایا اور کہا تم نے اپنی خدمت کا حال دیکھ لیا۔ اسی کے بھروسے پر مجھے کہتے تھے کہ تمہیں شادی کی کیا ضرورت ہے۔ اب تم نے ضرورت دیکھ لی۔ اگر اس وقت میری بیوی نہ ہوتی تو تم چھوڑ کر الگ ہو گئے تھے میں اکیلا پڑا مرتا رہتا۔

حقیقت میں بیماری کے اندر بہو بیٹیاں ہرگز وہ کام نہیں دے سکتیں جو بیوی دے سکتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے یہ راحت اسی تعلق میں رکھی ہے اسی لئے حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحبؒ نے پہلی بیوی کے انتقال پر اخیر عمر میں پھر شادی کی تھی۔ حالانکہ اس وقت مولانا کی عمر سو برس سے اوپر تھی۔ یہ تو بیوی سے دنیا کی راحت پہنچتی ہے۔

دین کی راحت یہ ہے کہ گھر کے انتظام سے بے فکری ہو جاتی ہے جس سے قلب کو فراغ و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ تجربہ ہے کہ بدون بیوی کے گھر کا انتظام درست نہیں ہو سکتا۔ بس مرد کا کام تو اتنا ہے کہ یہ مادہ جمع کر دیتا ہے پھر ہیئت عورتوں ہی سے بنتی ہے۔ میں نے بعض رؤسا کو دیکھا ہے کہ مال و دولت اُن کے پاس بہت کچھ تھا مگر بیوی نہ تھی۔ تو اُن کے گھر کا کچھ بھی ڈھنگ نہ تھا۔ لاکھ باورچی رکھو نوکر رکھو وہ راحت کہاں جو بیوی سے ہوتی ہے۔ باورچی تو تنخواہ کا ملازم ہے۔ ذرا ایک دن تم نے کوئی سخت بات اس سے کہہ دی اور وہ ہاتھ جھاڑ کر الگ ہوا پھر مصیبت کا سامنا ہے پکاؤ روٹی اپنے ہاتھ سے اور چولھا جھونکو، برتن دھوؤ اور بیوی سے یہ کب ہو سکتا ہے کہ مرد کو اپنے ہاتھ سے پکانے

دے ———"

پھر تجربہ ہے کہ اگر بیوی کے سامنے بھی نوکروں سے کام لیا جائے اور بغیر بیوی کے بھی ان سے کام لیا جائے تو دونوں صورتوں میں زمین آسمان کا فرق ہوگا۔ گھر کی مالک کے سامنے مامائیں اور نوکر زیادہ چوری نہیں کر سکتے اور اس کے بغیر تو گھر کا بیڑا ہو جاتا ہے البتہ اگر کوئی مرد گھر کا کام خود بھی جانتا ہو تو اس سے نوکر ذرا دبتے ہیں گو عورت جیسا کام تو پھر بھی نہیں ہوتا مگر پھر بھی زیادہ سرکشی نہیں کر سکتے۔

اس پر مجھے اپنے والد صاحب کا قصہ یاد آ گیا کہ جب میرٹھ میں والد صاحب ملازم تھے تو ایک بار سفر میں باورچی کو کھانا پکانے کے لئے ساتھ لے گئے۔ ایک دفعہ والد صاحب اس پر کچھ خفا ہوئے اور کھانا پکانے والے کو جواب دے دیا۔ وہ بھی بیچ میں کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ لیجئے میں جاتا ہوں۔ اپنے نزدیک تو اُس نے یہ سوچا تھا کہ اب منشی جی میری خوشامد کریں گے اور کم از کم اس وقت کے لئے کھانا پکا دینے کو تو ضرور کہیں گے مگر والد صاحب نے اسی وقت اُس کا حساب کر دیا اور کہا جاؤ رخصت۔ وہ باورچی تھوڑی دیر کھڑا رہا کہ دیکھوں یہ کھانا پکانے کا اس وقت کیا انتظام کرتے ہیں۔ والد صاحب نے اسی وقت آستین چڑھا اور ہاتھ دھو چولھے پر جا بیٹھے اور روٹیاں پکانی شروع کیں تو بہت عمدہ پکائیں۔ نہ معلوم کہاں سیکھ لیا تھا۔ بس یہ دیکھ کر تو باورچی قدموں میں گر پڑا کہ میری خطا معاف ہو والد صاحب نے فرمایا کہ نالائق تو نے یہ سمجھا ہوگا کہ اب میں تیری خوشامد کروں گا

خدا کا شکر ہے مجھے سارے کام آتے ہیں۔ میں صرف آسانی کے لئے دوسروں سے کام لے لیتا ہوں نہ اس لئے کہ مجھے کچھ آتا نہیں۔

والد صاحب کو سینا پرونا بھی آتا تھا اور اپنے سب کام خود کر لیا کرتے تھے کسی بات سے عار نہ تھا۔ ایک بار والد صاحب تھانہ بھون میں تشریف لائے تو برسات کی وجہ سے گھر کی چھتوں پر گھاس بہت کھڑا تھا۔ والد صاحب نے کھرپا اپنے ہاتھ میں لیا اور کوٹھے پر تشریف لے گئے اور مجھ سے بھی کہا کہ آؤ میاں اشرف علی ہم خود گھاس اکھاڑیں گے۔ غرض تھوڑی دیر میں سب چھتیں صاف کر دیں۔

تو کوئی شخص ایسا صاحب ہمت ہو جو سب کام کر سکتا ہو وہ تو شاید بیوی بغیر پریشان نہ ہو مگر ایسے بہت کم ہیں زیادہ وہی ہیں جو نوکروں کو جواب دینے پر پریشان ہو جاتے ہیں۔ اس لئے بیوی کی قدر کرنا چاہیے کہ وہ دنیا اور دین دونوں کی معین ہے اور اس کے حقوق کی رعایت بہت زیادہ ضروری ہے کیونکہ اس میں چند در چند خصوصیات ہیں جن میں سے ہر ایک کے بہت سے حقوق ہیں۔ چونکہ آج کل لوگ عورتوں پر بہت ظلم کرتے ہیں اس لئے میں نے اس پر تنبیہ کرنا ضروری سمجھا۔

اب میں آیت کا ترجمہ کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔

بس الزام تو ان ہی لوگوں پر ہے جو آدمیوں پر ظلم کرتے ہیں اور ناحق تکبر

کرتے ہیں۔ عبارۃ النص اور مسوق لہ الکلام۔ تو اس آیت میں انتقام کے وقت ظلم کی وعید کا بیان کرنا ہے مگر اشارۃً ابتداءً ظلم کو بھی شامل ہے خواہ انتقام میں ہو یا نہ ہو کیونکہ الفاظِ آیت میں عموم ہے اور اسی لیے میں نے اپنی تفسیر میں تعمیم پر تنبیہ کر دی ہے بلکہ اشارہ کے ساتھ دلالۃً بھی تحریم ظلم پر دال ہے اور یہ بات بہت ہی ظاہر ہے کیونکہ انتقاماً ظلم کا حرام ہونا ابتداءً ظلم کی حرمت کو بدرجہ اولیٰ مستلزم ہے۔ کیونکہ انتقام کے وقت انسان کو جوش غضب ہوتا ہے اس لیے کہ پہلے دوسرے کی طرف سے ظلم ہو چکا ہے۔ اور جوش میں حد سے بڑھ جانا مستبعد نہیں بلکہ حد پر قائم رہنا بھی بڑی ہمت کا کام ہے۔ تو جب مقامِ عذر میں بھی ظلم کی اجازت نہیں تو جہاں کوئی سبب اور عذر بھی نہ ہو وہاں تو ظلم کی اجازت کیونکر ہو سکتی ہے۔ لہذا دلالۃ النص سے بھی یہ آیت ابتداءً ظلم کو شامل ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔

وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ ——— اور سرکشی وتکبر کرتے ہیں زمین میں

یہ اس لیے بڑھایا کہ بتلا دیا کہ ظلم کا منشا اور سبب تکبر ہے۔ چنانچہ میں نے کہا تھا کہ حقوق العباد کے عدم اہتمام کا ایک سبب ہے۔ وہ یہ کہ لوگوں نے ادائے حق کا سبب صرف عظمت میں منحصر کر لیا ہے جس کی عظمت دل میں ہے اس کے حقوق تو ادا کرتے ہیں اور جس کی عظمت قلب میں نہیں اس کے حقوق کو ادا نہیں کرتے اور کسی کی عظمت نہ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ اس کو اپنے سے حقیر سمجھا جاتا ہے۔

تکبّر کا علاج

یہی حاصل ہے تکبّر کا۔ اسی کو حق تعالیٰ نے یَبْغُوْنَ میں بیان فرمایا ہے اور چونکہ تکبّر کا مذموم ہونا عقلاً و نقلاً سب کو مسلّم ہے لہٰذا اس کا علاج بھی ضروری ہوا۔ آگے حق تعالیٰ نے فی الارض میں اس کا علاج بتلایا ہے۔ حق تعالیٰ کی بھی عجیب تعلیم ہے کہ بیماری کے ساتھ ساتھ دوا بھی بتلاتے ہیں۔ تمام قرآن کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جہاں کسی مرض کو بیان فرمایا ہے وہاں ساتھ ساتھ علاج بھی بتلا دیا ہے بس وہ شان ہے کہ ؎

درد از یار است و درماں نیز ہم
دل فدائے او شد و جاں نیز ہم

حق تعالیٰ نے کائنات میں بھی یہی طرز رکھا ہے کہ جو چیز کسی بات کو مضر ہے اُس کے پاس ہی مصلح بھی موجود ہے۔ ایک سیّاح کہتے تھے کہ ایک گھاس سخت زہریلی ہے جس کا نام بچھو ہے۔ اگر کسی کو لگ جائے تو بچھو کے کاٹے کی سی لہر دوڑ جاتی ہے مگر اس کے پاس ایک دوسری گھاس بھی پیدا ہوتی ہے۔ وہ اس کا تریاق ہے کہ جہاں اس کو ملا فوراً تکلیف رفع ہو گئی۔

اسی طرح یہاں فی الارض میں علاج کبر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ حیرت کی بات ہے کہ زمین پر رہ کر اور مٹی سے پیدا ہو کر تکبّر کرتے ہو۔ ذرا سوچو تو تمہاری اصل کیا ہے۔ یہی زمین تمہاری اصل ہے جس پر آدمی اور جانور چلتے پھرتے پیشاب پاخانہ کرتے ہیں۔ یہ تمہاری ماں ہے۔ پس تم کو تو خاک بن کر رہنا

چاہیے۔ ایک دوسرے مقام پر بھی حق تعالیٰ نے اس بات پر تنبیہ کی ہے
مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً
أُخْرَىٰ۔

اس میں بھی مراقبہ ارض کی تعلیم ہے کہ ہم نے تم کو زمین ہی سے پیدا کیا اور اسی میں لوٹا دیں گے کہ مر کر سب خاک ہو جاؤ گے۔ سارا بدن گل سڑ جائے گا۔ پھر کس بات پر تکبر کرتے ہو۔ واقعی تکبر کا یہ عجیب علاج ہے پس ہم کو اس سے کام لینا چاہیے اور زمین کی حالت میں تفکر کرنا چاہیے۔ اسی کو سعدیؒ نے لیا ہے ؎

ز خاک آفریدت خداوند پاک
پس اے بندہ افتادگی کن چو خاک

افسوس ہماری ماں کی تو یہ حالت ہے کہ وہ سب کے پاؤں کے تلے ہے اور ہماری یہ حالت کہ آسمان پر چڑھے جاتے ہیں۔ صاحب یہ سارا ناز اسی وقت تک ہے جب تک خدا کی نعمتیں ہمارے پاس ہیں اگر ایک نعمت بھی چھین جائے تو سارا ناز خاک میں مل جائے۔ آخر مجنون میں کس بات کی کمی ہو جاتی ہے جو اس کو جانور سے بدتر سمجھنے لگتے ہو۔ بس دماغ میں کمی ہو جاتی ہے مگر دیکھ لیجئے پھر کیا حشر ہوتا ہے۔

ہمارے ایک دوست کو فالج ہو گیا تھا حالانکہ وہ بہت بڑے عالم تھے مگر دماغ پر فالج پڑنے سے سارا علم غتربود ہو گیا۔ الحمد تک بھول گئے تھے۔ افاقہ کے بعد بچوں کی طرح ان کو الحمد یاد کرائی گئی تو ان کے

بھائی کو بڑی خوشی ہوئی اور مٹھائی بانٹی گئی جیسے بچوں کی بسم اللہ میں مٹھائی بانٹی جاتی ہے۔

پھر انسان کا ہے پر تکبر کرتا ہے۔ یہ سب چیزیں خاک میں ملنے والی ہیں۔ فی الارض میں اسی پر متنبہ کیا گیا ہے کہ ہیں! زمین میں رہ کر تکبر کرتے ہو تم کو شرم نہیں آتی۔

اس کے بعد بغیر الحق دونوں کے لئے واقعی قید ہے ظلم کے لئے بھی اور بغی کے لئے بھی کیونکہ ظلم اور تکبر دونوں بغیر الحق اور ناحق ہی ہوتے ہیں۔ اس میں تصریحاً یہ بات بتلا دی کہ تم کو تکبر اور ظلم کا کچھ حق نہیں ہے پھر ناحق کیوں ظلم کرتے ہو۔ اور گو اس کے بیان کی ضرورت نہ تھی مگر اس کی تصریح اس لئے کر دی کہ بعض لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو تکبر کا حق ہے کیونکہ خدا نے ہم کو بڑا بنایا ہے۔ اس لئے تصریحاً بتلا دیا کہ خدا نے تو تم کو زمین سے پیدا کیا اور زمین میں رہنے کا حکم دیا ہے تم کو آسمان پر چڑھنے کا کیا حق ہے۔

ظالموں کا انجام

آگے اس سبیل کی تعیین فرماتے ہیں کہ ظلم کرنے والوں پر جو الزام ہے اس کی صورت کیا ہو گی۔ فرماتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ ان لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ صاحبو! یہ ظلم کا معاملہ ایسا سخت ہے کہ جب تک بندہ اپنا حق نہ معاف کر دے اس وقت تک خدا بھی معاف نہ کرے گا۔ خدا تعالیٰ اپنے حقوق تو معاف کر دیتے ہیں مگر بندہ کے

حقوق جب تک وہ معاف نہ کرے معاف نہیں کرتے۔ یہ بہت سخت بات ہے۔

سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ بڑے عادل اور غازی بادشاہ تھے ایک دفعہ انہوں نے خواب میں ایک بڑا عالیشان خوبصورت جنت کا محل دیکھا فرشتوں سے پوچھا کہ یہ محل کس کے واسطے ہے۔ کہا محمود غزنوی کے لئے ہے۔ انہوں گے کہا، پھر مجھے اندر جانے دو۔ میں اپنے محل کو دیکھوں فرشتوں نے کہا ابھی آپ کو اندر جانے کی اجازت نہیں۔ آپ کے ذمہ ایک مقدمہ ہے۔ اس کا فیصلہ ہو جائے تو پھر اجازت ہو گی۔ پوچھا کیا مواخذہ ہے۔ تو انہوں نے ایک چابک جو دیوار میں لٹکا ہوا تھا کہ تم نے اس کوڑے سے ناحق ایک ملازم کو مارا ہے۔ جب تک اس کا حق ادا نہ ہو جائے آپ جنت میں نہیں جا سکتے۔

بس یہ سُن کر محمود رحمۃ اللہ علیہ کانپ ہی تو گئے اور گھبراہٹ سے آنکھ کھل گئی۔ صبح تک بیتابی کے ساتھ کروٹیں بدلتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو اس ملازم کو بلایا اور چابک اُس کے سامنے ڈال دیا کہ تیرا جتنا جی چاہے مجھے اس سے مارلے اور آگے ہاتھ جوڑے کہ للہ تو اپنا بدلہ لے لے ورنہ میں جنت سے محروم ہو جاؤں گا۔ اُس نے کہا حضور مجھ پر ایک تو وہ ظلم ہوا تھا اس سے بڑھ کر آپ دوسرا ظلم یہ کرتے ہیں کہ مجھ سے انتقام کو فرماتے ہیں۔ وہ قدموں میں گر پڑا اور کہا کہ میں نے جہاں پناہ کو معاف کیا آپ بالکل بے فکر رہیں۔ مگر محمود کی اس سے تسلی نہ ہوئی اُس کو بہت سا انعام واکرام

دیا جس سے وہ خوش ہوا تب چین پڑا۔

تو صاحب یہ ظلم ہلکی چیز نہیں۔ ساری عبادتیں اس وقت تک ناکافی ہیں جب تک ظلم سے برأت نہ ہوگی۔ درمختار میں ہے کہ ایک دانگ کے بدلے میں جو درہم کا چھٹا حصہ ہے جس کو تین پیسے سمجھ لیجئے سات سو مقبول نمازیں حق دار کو دلائی جائیں گی۔

مجھے اس روایت کی صحت وضعف کی تحقیق نہیں۔ ممکن ہے فقہا کو تحقیق ہوئی ہو۔ پھر دوسرے نصوص بھی تو اس بارہ میں موجود ہیں۔ غرض ہر حال میں کتنی سخت مصیبت ہوگی۔ اوّل تو ہماری نمازیں مقبول ہی کتنی ہیں پھر تین تین پیسہ کے بدلہ میں وہ بھی جاتی رہیں تو بتلایئے قیامت میں کیسی حسرت ہوگی۔

مفلس کی تعریف

حدیث مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا مَنِ الْمُفْلِسُ فِیْکُمْ۔ تم مفلس کس کو سمجھتے ہو۔ صحابہ نے عرض کیا کہ ہمارے نزدیک مفلس وہ ہے جس کے پاس درہم و دینار نہ ہو۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اس سے بڑھ کر مفلس وہ ہے جس نے نمازیں بھی بہت پڑھی تھیں، روزے بھی بہت رکھے تھے، حج بھی کیا تھا، زکوٰۃ بھی دی اور صدقات بھی کئے تھے۔

ولکن قذف ھذا وضرب ھذا واخذ مال ھذا فجاء رجل فذھب بصلوٰتہ وجاء آخر فذھب بصیامہ الحدیث۔

مگر اس کے ساتھ اس نے کسی کو گالی دی تھی کسی کو مارا پیٹا تھا کسی کا مال لے لیا تھا۔ اب قیامت میں ایک آیا وہ اس کی نمازیں لے گیا دوسرا

آیا وہ روزے لے گیا۔ تیسرا آیا وہ حج لے گیا۔ چوتھا آیا وہ زکوٰۃ وصدقات لے گیا۔ پھر بھی کچھ حق دار بچ گئے اور اُن کو دینے کو نیکیاں نہ بچیں تو اُن کے گناہ اُس کے اوپر ڈال دیئے گئے۔ اور یہ طاعات سے خالی ہو کر گناہوں میں لاکر جہنم میں داخل ہوا۔ یہ ہے سب سے بڑا مُفلس۔

پہلی روایت میں اگر کچھ کلام ہو تو یہ حدیث تو بالکل صحیح ہے تو کیا یہ بات تھوڑی ہے کہ ذرا ذرا سے حقوق العباد کے بدلہ میں ساری کی کرائی محنت دوسروں کو مل جائے گی۔ اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ حقوق العباد من وجہ نماز روزہ سے بھی مقدم ہیں۔ ان کا بہت اہتمام کرنا چاہیئے۔ مگر افسوس آج کل لوگوں کو ان کا بالکل ہی اہتمام نہیں۔

حقوق العباد کی تلافی کا طریقہ

اب یہاں ایک سوال ہے۔ وہ یہ کہ ایک شخص نے کسی پر ظلم کیا ہو اور کسی سے رشوت لی ہو، کسی کی غیبت کی ہو اور اب وہ مر چکے ہیں یا لاپتہ ہیں تو اُن کے حقوق کیونکر ادا کئے جائیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت میں کوئی صورت لاعلاج نہیں ہے۔ کرنے والا ہونا چاہیئے۔ اس کی تدبیر یہ ہے کہ اوّل تو پوری کوشش کرے اُن لوگوں کے پتہ لگانے میں۔ اگر ان کا پتہ لگ جائے تب تو ان کو حق پہنچائے اگر معلوم ہوا کہ وہ مر گئے ہیں تو مالی حقوق ان کے ورثا کو پہنچائے۔ اگر ورثا کا بھی پتہ نہ لگے تو جتنی رقم تم نے ظلم ورشوت سے لی ہے اتنی رقم خیرات کر دو۔ اور نیت کر لو کہ یہ ہم اُن کی طرف سے دے رہے ہیں۔ یہ تو حقوق

مالیہ کا حکم ہے۔

غیبت شکایت اور جانی ظلم کی تلافی کا طریقہ یہ ہے کہ اگر مظلوم مر گیا ہو یا لاپتہ ہو گیا ہو تو اس کے حق میں دعا کرو۔ نماز اور قرآن پڑھ کر اس کو ثواب بخشو اور عمر بھر اس کے لئے دعا کرتے رہو۔ انشاء اللہ حق تعالے اُن کو تم سے راضی کر دیں گے۔ جس کی صورت قاضی ثناء اللہ صاحب نے یہ لکھی ہے کہ قیامت میں مسلمانوں کو بڑے بڑے خوبصورت عالیشان محل دکھلائے جائیں گے اور حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ان محلات کا خریدار کوئی ہے اور ارشاد ہوگا کہ ان کی قیمت یہ ہے کہ جس کا جو حق کسی کے ذمہ ہو اُسے معاف کر دے۔ اس وقت کثرت سے اہل حقوق اپنے حق معاف کر دیں گے۔ پھر سرکار کی طرف سے مسل داخل دفتر ہو جائے گی۔ قاضی صاحب اپنے زمانے کے محدث اور محقق تھے۔ اُنہوں نے تحقیق کر کے یہ روایت کہیں سے لکھی ہوگی۔ ہم کو اُن پر اعتماد ہے۔

غرض معذرت کرنے والوں کی وہاں بڑی قدر ہے۔ اُن کے حقوق اللہ تعالیٰ خود ادا کر دیں گے۔ وہاں تو اینٹھ مروڑ پر گرفت ہوتی ہے کہ باوجود ظلم و تعدی کے پھر بھی فکر نہ ہوا اور ادائے حقوق کا اہتمام نہ ہو۔

اب ایک سوال اور رہ گیا وہ یہ کہ کسی نے مثلاً دس ہزار روپے سود یا رشوت میں لئے ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ کس کس سے لئے ہیں۔ اب وہ چاہتا ہے کہ اس کا حق ادا کرے تو کیونکر کرے۔ اس لئے کہ اس وقت اُس کے پاس دس ہزار روپے نہیں ہیں۔ ساری عمر میں جو حرام مال

کھایا تھا۔ آج ایک دن میں سب کیسے ادا کر دے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں کام کا شروع کر دینا اور ادا کا عزم کر لینا بھی مقبول ہے۔ تم اوّل تو صاحب حق سے معافی کی درخواست کرو۔ اگر وہ خوشی سے معاف کر دے تب تو جلدی ہلکے ہوئے اور اگر معاف نہ کرے تو اب تھوڑا تھوڑا جتنا ہو سکے اس کا حق ادا کرتے رہو مگر یہ ضروری ہے کہ اپنے فضول اخراجات کو موقوف کر دو۔ بس ضروری ضروری خرچوں میں اپنی آمدنی خرچ کرو اور اس سے جتنا بھی بچے وہ حق داروں کو ادا کرو اور اگر وہ مر گئے ہوں تو اُن کے ورثا کو دو اور اگر ورثا بھی نہ معلوم ہوں تو اُن کی نیت سے خیرات کرتے رہو۔ انشاء اللہ اوّل تو امید ہے کہ دنیا ہی میں سارا حق ادا ہو جائے گا اور اگر کچھ ادا ہوا اور کچھ رہ گیا تو اس کو حق تعالیٰ ادا کر دیں گے۔ حق تعالیٰ کے یہاں نیت کو زیادہ دیکھا جاتا ہے جس کی نیت پختہ ہو کہ میں حق ادا کروں گا پھر اس پر عمل بھی شروع کر دے حق تعالیٰ اس کو بالکل بری کر دیتے ہیں۔

نیت کی برکات

صاف نیت وہ چیز ہے کہ جنت میں جو آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے معلوم بھی ہے یہ کس چیز کی برکت ہے۔ یہ نیت ہی کی تو برکت ہے کیونکہ عمل تو انسان زندگی بھر کرتا ہے۔ اس کا صلہ بہت سے بہت یہ تھا کہ ہزار دو ہزار سال تک بہشت میں رہنا ہو جاتا۔ عمل محدود کی جزا عقلاً محدود ہوتی ہے مگر یہ غیر محدود جزا آپ کی نیت ہی کی وجہ سے ہے کہ

مسلمان گو عمل کرتا ہے محدود زمانہ میں مگر اس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ اگر میں ابدالاباد تک بھی زندہ رہوں تو ہمیشہ اسلام و اعمال صالحہ پر جما رہونگا اس لئے ان کی جزا بھی دائمی ہے اور یہی راز ہے کفار کے عذاب دائمی کا کیونکہ وہ بھی گو زمانہ محدود تک کفر کرتے ہیں مگر نیّت ان کی یہی ہوتی ہے کہ ابدالاباد تک بھی زندہ رہیں گے تو اسی طریقہ پر جمے رہیں گے۔ پس نیت کو آپ حقیر نہ سمجھیں۔ ثواب ابدی کے مستحق آپ اسی وجہ سے ہیں۔ لہذا اسی وقت سے ادا حقوق کا اہتمام شروع کر دو اور نیت پختہ کر لو کہ ادا کر کے رہیں گے اور تھوڑا تھوڑا ادا کرتے رہو۔ انشاء اللہ پھر آپ اس بوجھ سے ہلکے ہو جائیں گے ورنہ یاد رکھئے کہ حق دار قیامت میں آپ کی بوٹیاں کھالیں گے۔ اور ساری نیکیاں چھین لیں گے۔ نیز حدیث میں آتا ہے۔

—— الظلم ظلمات یوم القیمہ۔ کہ ظلم کے لئے قیامت میں بہت ظلمتیں ہیں۔ خدا اس سے محفوظ رکھے۔

اب میں ختم کرتا ہوں۔ بحمد للہ اس وقت حقوق العباد کی تفصیل اور توضیح کافی ہو چکی ہے اور اشکالات کا حل بھی ہو گیا ہے۔ اب کسی کے پاس کوئی عذر نہیں رہا۔ ع

جو اس پر بھی نہ وہ سمجھے تو اس بُت کو خدا سمجھے

حدیث میں ہے کہ حقوق کو دنیا ہی میں ادا کر دو یا معاف کرالو پہلے اس دن کے جس میں روپیہ پیسہ کچھ نہ ہو گا۔

اب دعا کیجیے کہ حق تعالیٰ ہم کو توفیق دیں اور فہم سلیم عطا فرماویں

وصلی اللہ علی سیدنا و مولانا محمد و علی آلہ و اصحابہ
وسلم تم بحمد اللہ و بنعمتہ وجلالہ تتم الصالحات
واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

HINDUSTANI LIBRARY:
Estd. 1923
ھندستانی لائبریری
Garden Reach, Calcutta.

کف الاذیٰ

حقوق المسلمین کے متعلق یہ وعظ ۲۲ صفر ۱۳۳۱ھ کو مدرسہ مصباح العلوم بانس بریلی میں بیٹھ کر بیان فرمایا، جو ۲ گھنٹے میں ختم ہوا۔ مولانا سعید احمد صاحب تھانوی نے اسے قلمبند فرمایا

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان محمدا عبدہٗ ورسولہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ و اصحابہ وبارک وسلم اما بعد فقد قَالَ النَّبِیُّ صَلَّے اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہٖ وَ یَدِہٖ۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ پورا مسلمان وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان سالم رہیں۔

ہندوستانی لائبریری
گارڈن ریچ روڈ۔ مٹیا برج۔ کلکتہ

۴۰۱
ہندستانی لائبریری
گارڈن ریچ روڈ۔ مٹیا برج۔ کلکتہ

غایت اور خاصیتِ شریعت

یہ ایک حدیث ہے جس کے الفاظ باوجود نہایت مختصر ہونے کے باعتبار معانی کے نہایت جامع ہیں۔ اس میں ایک ضروری قاعدہ بیان کیا گیا ہے جو مصالح شرعیہ و تمدنیہ دونوں کو شامل ہے مگر اس سے یہ غرض نہیں کہ شریعت کی غرض تمدن کو محفوظ رکھنا ہے بلکہ شریعت کی غرض صرف یہ ہے کہ رضائے خداوندی حاصل ہو اور تعلق ما بین العبد والحق (یعنی اللہ تعالیٰ اور بندہ کے درمیان تعلق) صحیح پیدا ہو۔ لیکن یہ حق تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اُنہوں نے احکام اس طور پر مقرر فرمائے ہیں کہ اُن پر مصالح تمدنی بھی مرتب ہو ہی جاتے ہیں۔ یعنی اُن میں حق تعالیٰ نے یہ خاصیت رکھی ہے اور خاصیت کے مرتب ہونے کے لئے قصد کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ بلا قصد ہی مرتب ہو جاتی ہے تو ایک تو غایت ہوتی ہے اور ایک خاصیت۔ یہ دونوں ایک چیز نہیں ہیں۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ مثلاً ماکولات (کھانے کی چیزیں) میں بعضی تو اس قسم کی چیزیں ہیں جن کی

غرض تو جزوِ بدن بنانا ہے لیکن اگر اُن میں لذت بھی ہو تو وہ لذت مقصود نہیں بلکہ مقصود وہی جزو بدن بنانا ہے لیکن چونکہ لذت اُس کے لوازم اور خاصیات میں سے ہے اس لئے لذت بھی حاصل ہوگی اگرچہ مقصود نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کسی ماکول چیز سے محض لذت مقصود ہو تو بھی اُس میں طبی منافع جو اُس کی خاصیات میں سے ہوں گے حاصل ہوں گے۔ مگر یہ منافع اس وقت مقصود نہیں ہیں، بلکہ مقصود صرف لذت حاصل کرنا ہے۔

خلاصہ یہ کہ تغذیہ (غذا دینے) کے لئے جو ماکولات کھائے جاتے ہیں وہاں مقصود جزو بدن بنانا ہے اور لذت وغیرہ خاصیت ہونے کی وجہ سے بلا قصد حاصل ہو جاتی ہے اور جو ماکولات تفکہ (لذت حاصل کرنے) کے لئے کھائے جاتے ہیں اُن سے مقصود لذت ہے اور دیگر منافع بلا قصد حاصل ہو جاتے ہیں ——— اسی طرح احکامِ شرعیہ میں مقصود تو رضائے خداوندی ہے مگر منافع تمدن کی خاصیت اُن میں حق تعالیٰ نے رکھی ہے جو بلا قصد بھی حاصل ہوتے ہیں۔

عقلاء کو دھوکا

اب سمجھئے کہ بعضے عقلاء کو اس مقام پر دھوکا ہوا۔ وہ یہ کہ جب انہوں نے دیکھا کہ احکامِ شرعیہ میں مصالح تمدنیہ بھی مرتب ہوتے ہیں۔ تو وہ یہ سمجھے کہ اصل غرض یہی منافع تمدن ہیں۔ چنانچہ اس وقت سب سے بڑا حکیم وہ سمجھا جاتا ہے جو احکام دین میں مصالح تمدنیہ بیان کرے۔ حالانکہ اوّل تو وہ تخمینی ہیں لیکن اگر یقینی بھی ہوں تو وہ لوازم ہیں مقاصد نہیں۔ سو اُن عقلاء کو تلبیس ہوئی کہ

وہ لوازم کو مقاصد سمجھے۔

مثلاً سفرِ حج کے لوازم میں سے ہے سیرِ بمبئی و سیرِ جہاز۔ تو اگر کوئی اسی کو مقصود سمجھے تو اُس کو کچھ بھی ثواب نہ ہوگا کیونکہ حکم شرعی کا یہ مقصود نہیں بلکہ لوازم میں سے ہے اور اسی کو مختصر جملہ میں فرمایا ہے کہ —— انما الاعمال بالنیات —— (اعمال کی مقبولیت نیّت پر موقوف ہے) کہ اگر احکامِ دین میں دنیا کی نیت ہو تو وہ مقبول نہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ منافع دنیویہ مقصود نہیں گو مرتب ہو جاتے ہیں۔ مثلاً جماعت کی نماز پر اتفاق کا مرتب ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ سفرِ حج پر سیرِ بمبئی اور سیرِ جہاز مرتب ہوتا ہے۔

بس خوب سمجھ لینا چاہئے اس میں بڑا دھوکا ہو جاتا ہے کہ جن منافع کو احکام پر مرتب ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں اُن کو احکام کا مقصود سمجھ لیتے ہیں۔ تو سمجھ لینا چاہئے کہ لوازم اور ہیں اور غایت اور ہے تو اگر کوئی جماعت کی نماز محض اتفاق کے حصول کی نیت سے پڑھے تو ثواب نہ ہوگا۔ اور اگر حق تعالیٰ کی رضا اس سے مقصود ہو تو یہ تو حاصل ہو ہی گی اور منفعت اتفاق بھی مفت میں ملے گی۔ تو مرتب ہوتے دیکھ کر اُن کو مقصود سمجھنا یہ دھوکا ہے اور اس میں بہت لوگ مبتلا ہیں۔ حتیٰ کہ اُن کا مشن یہ ہو گیا ہے کہ ہر حکم میں مصالح تلاش کرتے ہیں اور علماء سے بھی اُن کی جستجو کرتے ہیں اور علماء ہیں چونکہ محقق کم ہیں کیونکہ استعداد حل الفاظ کا نام نہیں ہے بلکہ علم کہتے ہیں حقیقت بینی کو، تو ایسے لوگ کم ہیں۔ تو اس وقت بہت سے بھولے بھالے اہل علم بھی اس میں مبتلا ہو گئے ہیں اور انہوں نے اپنا بڑا فرضِ منصبی یہ سمجھ لیا ہے کہ احکام کے مصالح

اور اسرار بیان کرتے ہیں۔
تو تین قسم کے لوگ ہوئے۔ ایک تو وہ کہ بالکل منکر ہیں۔ یہ تو تفریط ہے اور ایک وہ کہ ان ہی مصالح کو مقصود سمجھتے ہیں۔ یہ افراط ہے پہلی صورت تو تفریط اس وجہ سے ہے کہ جب ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ جماعت سے مثلاً اتفاق ہوتا ہے تو پھر مصالح کا کیسے انکار کر دیں۔ اور ان کا مقصود سمجھ لینا افراط اس واسطے ہے کہ اس کو یہ حدیث رد کرتی ہے کہ

من کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ و
رسولہ ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا اوامرءۃ
تیزوجھا فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ۔

یعنی جس شخص کی نیت اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کرنے کی ہے اس کی ہجرت تو اللہ اور رسول کی طرف ہے۔ اور جس کی نیت ہجرت میں دنیا حاصل کرنے کی ہے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کی ہے۔ تو اس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف نہیں بلکہ اسی چیز کی طرف ہے جس کی اس نے نیت کی ہے۔۔۔ تو صاف فرما رہے ہیں کہ ہجرت میں اگر یہ عورت یا دنیا مل ہی جاوے لیکن اگر وہی مقصود ہو اور اسی کی نیت ہو تو ثواب نہ ہوگا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں مسلک غلط ہیں۔

محققین کی شان

اب محققین کی شان دیکھئے کہ نہ ترتیب مصالح کا انکار کیا اور نہ ان کو مقصود بنایا بلکہ مصالح کے نفی واثبات کو اس طرح جمع کیا کہ فرق ہے ترتب

اور قصد ہیں اور لازم اور غایت ہیں۔ غایت تو وہی ہے کہ اِلاّ ابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ۔ محب کو محبوب کی اطاعت سے۔ اصل غرض اور مقصود یہی ہوگا کہ محبوب خوش ہو مگر مل جاتی ہے تنخواہ بھی۔ لیکن اگر یہ مقصود ہو کہ تنخواہ بھی ملے گی تو یہ محب نہیں بلکہ اجیر (مزدور) ہے۔ اسی واسطے کہتے ہیں ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن
کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند

(یعنی محبوب حقیقی کی اطاعت ثواب کی غرض سے نہ کرو بلکہ اس سے رضا مطلوب ہو مگر ثواب بھی مل جائے گا۔)

بعض نے اس میں بھی غلو کیا ہے کہ جیسے احکام کے بجا لانے میں دنیا مقصود نہیں ثواب بھی مقصود نہیں۔ واقعی اس رستہ میں قدم قدم پر خطرہ ہے پس جو دامن پکڑ لے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کے لئے کچھ خطرہ نہیں۔ سو یہ راستہ آسان بھی ہے اور دشوار بھی۔ عمل کے لئے تو آسان ہے کہ تحقیق ہونے کے بعد عمل میں کچھ دشواری نہیں ہوتی اور تحقیق کی شان مشکل ہے۔ اسی لئے ہر ایک کو اجتہاد کی ہوس نہ چاہیے۔

تو یہ بھی غلطی ہے کہ ثواب کو بھی مقصود نہ سمجھے۔ اور اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے غور نہیں کیا۔ اور طلب رضا اور طلب جنت میں منافات سمجھے: اگر منافات ہوتی تو بے شک دونوں جمع نہ ہو سکتے مگر منافات نہیں کیونکہ جس کو راضی کرنے کی فکر ہے اُس سے پوچھو کہ تحقق رضا کی کیا صورت ہے تو وہاں سے یہ جواب ملتا ہے کہ یسقون من رحیق مختوم ختامہ مسک۔

یعنی خالص شراب پلائی جاوے گی جو مشک سے سربمہر ہو گی۔ اس کے بعد فرماتے ہیں وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ تو امر فرماتے ہیں کہ ان کے اندر رغبت کرو۔ یہ چیزیں قابلِ تحصیل ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَسْاَلُكَ رِضَاكَ وَالْجَنَّةَ

کہ اے اللہ! میں آپ سے آپ کی رضا اور جنّت کا سوال کرتا ہوں۔ قربان جائیے کہ کیسا اس کو صاف کہہ دیا کہ ایک ہی دُعا میں دونوں کو جمع کر دیا اور بتلا دیا کہ دونوں لازم ملزوم ہیں کیونکہ ان ہی کا حکم ہے کہ جنت مانگو۔ تو جب جنت کے مانگنے کا حکم ہے تو مطلب یہ ہوا کہ جنت کو مانگنے سے وہ راضی ہوں گے۔ پس جب اُنہی کی یہ خوشی ہے کہ ہم جنت کو طلب کریں تو پھر ہم کیوں اس کے خلاف کریں۔ اسی کو مولانا نے فرمایا ہے ؎

چوں طمع خواہد ز من سلطانِ دیں
خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

یعنی جب سلطانِ دیں ہی ہم سے طمع کرنے کے خواہشمند ہوں تو اس کے بعد قناعت پر خاک ڈالنی چاہیے۔

رضائے خداوندی

صاحبو۔ اس کا ایک راز میں بتلاتا ہوں۔ سنیئے راز اس کا یہ ہے کہ خدا کی شان ہے بہت بڑی اور بندہ ہے بہت محتاج۔ تو براہ راست رضا طلب کرنا دعویٰ ہے بڑائی کا۔ تو اس واسطے حق تعالیٰ نے واسطے رکھے ہیں کیونکہ واسطے نہ ہونے کی حالت میں چونکہ رضا سے محض حظ روحانی ہو گا تو اگر

اس پر اکتفا کریں تو گویا یہ حظِ جسمانی سے مستغنی ہے اور یہ شانِ افتقار کے خلاف ہے۔ تو اس لیئے حق تعالیٰ نے یہ واسطہ رکھا کہ جنت کا سوال کیا جائے تاکہ ہر طرح احتیاج ظاہر ہو۔ حظوظ روحانی میں بھی اور حظوظ جسمانی میں بھی۔ کیونکہ جنت کے اندر دونوں قسم کے حظوظ ہوں گے۔

اگر کوئی کہے کہ اگر یہی بات ہے تو دنیا کی نعمتوں میں بھی یہ تقریر ہو سکتی ہے کہ عبادت میں اُن کی طلب بھی اس اظہار کے لیئے کرے کہ میں اتنا محتاج ہوں کہ نعماء دنیا (دنیا کی نعمتوں) سے بھی مجھ کو چارہ نہیں۔

تو بات یہ ہے کہ استغنا تو بے شک اس سے بھی نہیں مگر اس کا طریقہ حضورؐ نے دعا کو بتایا اور آخرت کے لیئے عمل کو مشروع کیا ہے اور یہ صرف حاکم ہی کو اختیار ہے کہ جس کے لیئے جو چاہے مقرر کر دے۔ تو دعا تو دنیا اور آخرت دونوں کے لیئے رکھی اور اعمال دنیا صرف دنیا کے لیئے رکھے اور اعمال آخرت صرف آخرت کے لیئے جیسے نماز روزہ وغیرہ۔ تو اعمال تو دونوں کے لیئے الگ الگ اور ایک دعا دونوں میں مشترک۔ تو کتنا عدل ہے تو وہ شبہ بھی جاتا رہا کہ عبادات میں نعماء آخرت کی طلب ناجائز ہے اور یہ شبہ بھی جاتا رہا کہ پھر دنیا کی طلب بھی ہونی چاہیئے۔

حاصل یہ ہے کہ اعمال آخرت سے دنیا کی طلب ناجائز ہے بلکہ اُن سے تو صرف رضائے خداوندی اور جنت کی طلب ہونی چاہیئے۔ تو اب معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہ خیال کہ دنیا کے مصالح مقصود ہیں غلط ہے بلکہ مقصود صرف رضا اور جنت ہے البتہ اُن میں مصالح دنیا بھی ہیں مگر اُن کی ایسی مثال ہے

جیسے کہ سفرِ حج کے لیے بمبئی تو مصالح کے وجود سے اُن کا مقصود ہونا لازم نہیں آتا۔ اس لیے میں نے کہا تھا کہ احکام شرعیہ میں بے شک دنیا کے مصالح بھی ہیں مگر اس سے جو اُن کی مقصودیت کا شبہ ہوتا ہے وہ دفع ہو گیا کیونکہ مقصود تو محض آخرت ہوتی ہے احکام شرعیہ سے مگر مرتب ہوتے ہیں مصالح دنیا بھی۔ یہ حاصل ہے اس مضمون کا۔

مُسلمان کی صفت

اب تعیین اُن مصالح کی جو اس حدیث کے متعلق ہیں ترجمہ سے ہو گی کہ دنیوی ثمرات بھی اس پر کیا کیا مرتب ہوتے ہیں تو فرماتے ہیں

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ ؕ

یعنی مسلمان کی صفت یہ ہے کہ نہ اُس کی زبان سے کسی کو اذیت پہنچے نہ اُس کے ہاتھ سے ـــــ یہ حاصل ہے ترجمہ کا۔ اس سے اندازہ ہوا ہوگا کہ اس پر آخرت اور دنیا دونوں ہی کے مصالح کا ترتب ہے مگر ایک کا قصداً اور دوسرے کا لزوماً۔ یعنی آخرت کا ترتب تو مقصود ہے اور دنیا کا ترتب لازم۔ چنانچہ اوّل کا مقصود ہونا خود عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ مسلم وہ ہے جس کے اندر یہ صفت ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صفت کی تحصیل سے مقصود اسلام کی تکمیل ہے اور اسلام ایسی شے ہے کہ اُس کی نسبت فرماتے ہیں۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ

یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول دین اسلام ہے۔ اس کے سوا اور کوئی دین اُن کے یہاں مقبول نہیں۔

تو مقصود اسلام سے یہ ہوا کہ مسلم کی اُس سے مقبولیت ہو اور اسلام کے مقبول ہونے کا یہی حاصل ہے اور مقبولیت المسلم عنداللہ (اللہ تعالےٰ کے نزدیک مسلمان کی مقبولیت) کا ثمرہ اُخروی ہونا ظاہر ہے۔ پس آخرت کے ثمرہ کا مرتب ہونا ظاہر ہوا اور دنیا کے لئے بھی دیکھ لیجیے کہ تعلیم اس کی ہے کہ کسی کو اذیت نہ پہنچاؤ۔ تو ظاہر ہے کہ ایسا شخص جو اس تعلیم پر عمل کریگا وہ کسی کو تکلیف نہ پہنچائے گا۔ اور اس سے لوگوں کو نفع پہنچے گا تو اس کو بھی لوگوں سے نفع ہوگا کیونکہ یہ اپنی نفع رسانی کے سبب سے لوگوں کا محبوب ہوگا اور جب اُن کو اس سے محبت ہوگی تو وہ اس کے ساتھ احسان کریں گے اور چونکہ الانسان عبدالاحسان (انسان احسان کا بندہ ہے) تو اُس کو بھی لوگوں سے محبت ہوگی۔ اور جانبین سے محبت ہونا ہی مدار ہے اتفاق کا۔ تو ادنیٰ درجہ یہ نفع ہوگا کہ باہم اتفاق پیدا ہو جائے گا۔ اور اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اتفاق ہی پر برکاتِ دنیا کا مدار ہے۔ چنانچہ جن قوموں میں اتفاق ہے اُن میں برکات دنیا مشاہد ہیں۔ اگرچہ ان کا اتفاق اصول شرعیہ کے اعتبار سے ناتمام ہے۔ اور برکات اسی قدر ہوں گے جس قدر اتفاق ہوگا اور اتفاق کی تعلیم اسلام سے زیادہ کہیں ہے نہیں۔

چنانچہ اسلام میں یہاں تک رعایت رکھی گئی ہے کہ اگر ایک جگہ تین آدمی ہوں تو یہ جائز نہیں کہ دو آدمی تنہا باتیں کریں تاکہ تیسرے کو اکیلے

رہنے سے رنج نہ ہو البتہ اگر کوئی جو تھا بھی ہو تو جائز ہے۔ تو دیکھئے کیسی رعایت ہے ـــــ سبحان اللہ۔ تو اسلام کی اس تعلیم کے موافق کسی کو رنج نہ ہوگا۔ تو کتنی ایک دقیق امر کی رعایت فرمائی ہے کہ کسی اور دستور العمل میں اس کی رعایت ہے ہی نہیں۔ تو اس اتفاق کے برکات ظاہر ہیں کہ نہایت اکمل ہوں گے۔

اسی طرح سے اگر احادیث کو دیکھا جاوے تو معلوم ہو گا کہ جس امر میں ذرا بھی شائبہ ہو کدورت کا اس کی اجازت نہیں دی اور افسوس ہے کہ اُس کو اہل نظر دیکھتے نہیں اور صرف چند وعدوں اور وعیدوں کو دیکھ لیا اور سمجھنے لگے کہ شریعت بس انہیں باتوں کا نام ہے۔ جس طرح ان لوگوں نے شریعت کو ناتمام نگاہ سے دیکھا ہے یعنی صرف بعض اجزاء کو اسی طرح ان لوگوں نے اور علماء کو بھی دیکھا تو صرف ایسوں ہی کو جو کہ سخت ہیں اور تمام علماء شریعت کو اُن ہی پر قیاس کر کے اُن سے وحشت پیدا کر لی۔

چنانچہ مجھے اس پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک منعم صاحب تھے جو کہ نماز جماعت کے ساتھ نہ پڑھا کرتے تھے۔ اُن کے یہاں ایک مولوی صاحب مہمان آ گئے جو کہ امر بالمعروف میں بہت تشدد کرتے تھے۔ حالانکہ حدیث میں ہے بَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا کہ عوام کو خوش خبری سناؤ اور سختی کر کے اُن کو دین سے متنفر نہ کرو۔ مگر ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ بعض کو اس بات کا خیال ہی نہیں ہوتا۔ اُن سے بجائے نفع کے اور ضرر ہو جاتا ہے۔

ناصح کو نصیحت :

خرابی یہ ہے کہ بعض نصیحت کرنے والوں ہی کو نصیحت کرنے کا سلیقہ نہیں ہوتا پھر عوام پر کیا اثر ہو۔ دیکھئے لطف ایسا ہوتا ہے کہ کاندھلہ کے ایک مولانا مظفر حسین صاحب تھے۔ وہ گڑھی کے ایک رئیس کے پاس تشریف لے گئے۔ انہیں دیکھا تو وہ نماز نہیں پڑھتے تھے۔ مولانا نے فرمایا کہ خانصاحب آپ نماز نہیں پڑھتے۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں آپ سے سچی بات کہے دیتا ہوں۔ مجھ کو ڈاڑھی چڑھانے کا شوق ہے اور وضو میں کھولنی پڑتی ہے۔ مجھے بار بار کھولتے چڑھاتے ہوئے دقت معلوم ہوتی ہے اس لئے میں نماز نہیں پڑھتا۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ بلا وضو ہی نماز پڑھ لیا کیجیے مگر جماعت کی پڑھیے اور مسجد میں۔

مولانا تو یہ فرما کر تشریف لے گئے اب خانصاحب نے نماز شروع کی مگر خیال ہوا کہ مولانا تو میری ہمت بڑھانے کے لئے یہ اجازت دے گئے ہیں کہ بلا وضو ہی نماز پڑھ لیا کرو ورنہ بلا وضو نماز تھوڑا ہی ہوتی ہے۔ میں محنت بھی کروں اور نماز نہ ہو۔ یہ کیا حماقت ہے۔ وضو کرکے نماز پڑھنی چاہیے یہ خیال کرکے انہوں نے وضو سے پڑھنا شروع کر دیا۔ مولانا تو اسی لئے کہہ گئے تھے کہ وہ سمجھتے تھے کہ نماز ان کو خود ہی کھینچ لے گی۔ اور باقاعدہ نماز پڑھیں گے۔ چنانچہ اس نے کھینچ لیا تو وہ وضو کرتے اور داڑھی چڑھاتے۔ آخر جب روز پانچ مرتبہ کھولنی اور چڑھانی پڑی تو بہت تنگ ہوئے اور یہی فیصلہ کیا کہ داڑھی چڑھانا چھوڑ دو۔ بس اچھے خاصے نمازی ہو گئے اور داڑھی

پڑھانا بھی چھوٹ گیا۔

تو یہ ہیں حکمائے اُمت۔ ایسی نرمی کی میں سند بیان کرتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بنی ثقیف آئے اور اسلام لانے میں یہ شرط کی کہ نہ جہاد کریں گے نہ زکوٰۃ دیں گے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اچھا۔ بعض نے حضورؐ سے پوچھا کہ آپ نے یہ شرط کیسے منظور فرمائی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اس وقت یہ لوگ یہ شرط لگاتے ہیں مسلمان ہونے کے بعد تم دیکھنا کہ خود ہی سب کام کریں گے آخر انہوں نے سب کچھ کیا۔

مگر یہ نرمی وہاں ہے کہ جہاں قدرت نہ ہو۔ اب یہ نہیں کہ بیوی بچوں کی بھی خوشامد کرے۔ وہ اگر نہ مانیں تو اُن کے ساتھ سختی سے کام لیا جائے مگر جہاں قدرت نہ ہو وہاں البتہ نرمی کرنی چاہیئے

خلاصہ یہ کہ اُن منصرم صاحب کے پاس ایک متشدد مولوی صاحب آگئے۔ وہ جماعت سے نماز نہ پڑھتے تھے تو مولوی صاحب اُن کو سخت وسست کہا کرتے اور صبح کی نماز میں وہ ذرا دیر میں اٹھتے تھے اس پر بھی بُرا بھلا کہا کرتے۔ آخر ایک روز تنگ ہو کر منصرم صاحب کہنے لگے کہ مولوی صاحب مجھے تنگ نہ کیا کیجئے۔ ہر وقت طبیعت یکساں نہیں ہوتی۔ شاید کسی وقت مجھ کو بھی غصہ آجائے اور غصہ میں میرے منہ سے بھی کوئی بات نکل جاوے مگر وہ ایسے سر ہوئے کہ مانا ہی نہیں۔ آخر ایک روز جو منصرم صاحب کو جہالت سوار ہوئی تو کہہ دیا کہ جاؤ نہیں پڑھتے۔ بس اس روز سے ایک وقت کی نماز بھی نہیں پڑھی۔ بعض نے اُن کو نماز کی نصیحت کی۔ اس پر انہوں نے کہا

صاحب میں تو پکا نمازی تھا میری نماز تو ایک مولوی صاحب نے چھوڑائی۔ اور پھر یہ قصہ بیان کیا اور عجب یہ کہ اس پر یہ کہتے تھے کہ میری نماز نہ پڑھنے کا گناہ اُن مولوی صاحب کو ہوگا۔

تو لوگوں نے ایسے علماء کو دیکھا بس سمجھے کہ شریعت یہی ہے مار دھاڑ تشدد۔ واللہ شریعت کا سراپا دیکھیے تو کہیے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

سر سے پیر تک جس جگہ نظر ڈالتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ فریفتہ ہونے کی ہے۔

واللہ ہر ادا اُس کی دلربا ہے۔ ہاں سادہ اتنی ہے کہ تکلف ذرا نہیں مگر دلفریب اتنی ہے کہ دنیا میں کوئی چیز اس کے برابر نہیں۔ اور حسن سادگی ہی میں ہوتا ہے۔ حافظ شیرازی فرماتے ہیں ؎

دلفریبانِ نباتی ہمہ زیور بستند
دلبر ماست کہ با حسن خداداد آمد

اوروں کے محبوب زیورِ متعارف سے آراستہ ہیں۔ ہمارے محبوب کو زیورِ متعارف کی حاجت نہیں اُس میں خداداد حسن ہے۔

حقیقت میں سادگی شریعت ہی میں ہے۔ شریعت کی سادگی کا حسن اس کا مصداق ہے ؎

حُسْنُ الْحَضَارَةِ مَجْلُوْبٌ بِتَطْرِيَةٍ　　وَفِي الْبَدَاوَةِ حُسْنٌ غَيْرُ مَجْلُوْبٍ

یعنی شہروں میں تو بناؤ سنگار کا حسن ہے اور دیہات میں سادگی کا حسن ہے تو شریعت کے حسن کو وہ شخص معلوم کر سکتا ہے جو اس کی پوری تعلیم کو دیکھے تو کیسی عجیب تعلیم ہے کہ ایک کو تنہا چھوڑ کر دو آدمی بات نہ کریں۔

آمد ورفت کے آداب

اسی طرح استیذان (آنے کی اجازت چاہنا) کا مسئلہ ہے کہ اس کے اندر بھی بڑی مصلحتیں ہیں۔ تفصیل اس مسئلہ کی یہ ہے کہ دو مواقع ہوتے ہیں ایک تو وہ موقع کہ قرائن سے معلوم ہو کہ وہاں آنے کی عام اجازت ہے ایسی جگہ تو بلا اجازت جانے میں مضائقہ نہیں اور ایک وہ موقع کہ کوئی آرام کے لئے بیٹھا ہو وہاں کسی کو آنے کی اجازت نہ ہو یا تو کسی کو بٹھلا دیا ہو یا کواڑ بند ہوں یا پردے پڑے ہوں، اس وقت یہ بے تمیزی ہے کہ اندر گھس گئے اول اطلاع کرنا اور اجازت لینا چاہئے۔

غیر قوموں نے اس کو اسلام ہی سے لیا ہے اور مسلمانوں کو اس سے ایسی اجنبیت ہوئی ہے کہ اس کو دوسری قوموں کا طریقہ سمجھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ جو لوگ انگریزوں کی تقلید کر رہے ہیں ایسی بات کو نہیں دیکھتے جو مفید اور کام کی ہے بلکہ فضول اور مضر باتوں کی تقلید کرتے ہیں۔ اور بالفرض یہ اگر انہیں کا طریقہ ہوتا تو جہاں اور فضول باتوں کی تقلید کرتے ہو اس مفید بات میں بھی سہی۔ مگر یہ تو شریعت ہی نے سکھایا ہے۔ کھلا حکم ہے قرآن کے اندر۔ اور اس استیذان میں ایسی آزادی دی ہے کہ

ان قیل لکم ارجعوا فارجعوا

یعنی اگر تم سے کہہ دیا جاوے کہ اس وقت واپس ہو جاؤ تو تم واپس چلے جاؤ
اور حدیث میں ایک قانون ایسا مقرر کیا گیا ہے کہ ارجعوا بھی نہ کہنا پڑے
وہ قانون یہ ہے کہ تین دفعہ پکارو۔ اگر کچھ جواب نہ ملے تو واپس ہو جاؤ اور
استیذان کا طریقہ یہ ہے کہ اگر یہ احتمال ہو کہ سوتے ہوں گے تو ایسی طرح
اجازت لو کہ اگر جاگتا ہو تو سن لے اور اگر سوتا ہو تو آنکھ نہ کھل جائے۔

اور دلیل اس کی مقداد رض کی حدیث ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے
مسافر مہمانوں کو صحابہ اہل مدینہ پر تقسیم کر دیا تھا اور تین آدمی خود رکھ لیئے
تھے۔ اُن میں حضرت مقداد رض بھی تھے۔ حضور نے اُن کو بکریاں بتلا دی تھیں کہ
اُن کا دودھ نکال کر پی لیا کرو۔ تو یہ معمول ہو گیا تھا کہ بکریوں کا دودھ نکال
کر خود پی لیا اور حضور کا حصہ رکھ دیا۔ حضرت مقداد رض کہتے ہیں کہ ایک روز
حضور کو تشریف لانے میں دیر ہو ئی۔ مجھے شیطان نے یہ وسوسہ ڈالا کہ حضور
کی آج کہیں دعوت ہو گئی ہو گی۔ اب آپ کو کیا حاجت رہی ہو گی۔ لاؤ حضور کے
حصہ کا بھی پی لوں۔ یہ خیال کر کے اُس کو بھی پی لیا۔ جب پی لیا تو شیطان
نے یہ وسوسہ ڈالا کہ اگر حضور نے کچھ نہ کھایا ہو اور کہیں دعوت نہ ہوئی ہو تو
حضور بھوکے ہی رہیں گے اور اگر اس حالت میں بد دعا دے دی تو کیا ہو گا۔
اس خیال سے یہ بہت پریشان ہوئے۔

آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت دیر میں تشریف لائے تو حضور کی یہ
عادت تھی کہ جب تشریف لاتے تو نہ تو یہ کرتے کہ سلام نہ کریں اور نہ یہ
کرتے کہ بہت زور سے سلام کریں بلکہ ایسا کہ اگر جاگتے ہوں تو سن لیں اور

اگر سوتے ہوں تو نیند میں خلل نہ پڑے۔ چنانچہ حسب عادت حضورؐ نے آہستہ سے سلام کیا اور پھر نماز پڑھی اور پھر آہستہ سے برتن کھولے اور پھر مصلّے پر تشریف لے گئے اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اب اُن کا دم ہوا کہ بس اب بد دعا کریں گے۔ مگر بھلا حضورؐ بد دعا کیوں فرماتے۔ آپ نے یہ دعا فرمائی کہ

اَللّٰھُمَّ اَطْعِمْ مَنْ اَطْعَمَنِیْ ــــــ۔ اے اللہ جو مجھے کھانا کھلائے آپ اس کو کھانا کھلایئے۔

دیکھئے یہ ہے توکل کہ نہ کوئی شخص ہے نہ کوئی سامان ہے مگر دعا فرما رہے ہیں اور پھر اسباب سے بُعد بھی نہیں اختیار کیا۔ یہ دُعا کی کہ اے اللہ جو مجھے کھانا کھلائے آپ اس کو کھانا کھلایئے۔ جس کا حاصل یہ ہوا کہ کسی ایسے شخص کو بھیج دیجئے کہ جو مجھ کو کھانا کھلائے۔ اس سے بتلا دیا کہ متوکل کو بھی اسباب ہی سے ملنا ہے۔ اللہ اکبر ــــ آخر نبیؐ تھے یہ بات آپ نہ بتلاتے تو اور کون بتلاتا۔ سو توکل میں بھی اسباب کو بالکل ترک نہیں کیا جاتا۔

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ متوکل کو نہ دروازہ بند کرنا چاہئے اور نہ دروازہ پر نظر رکھنی جائز ہے۔

غرضیکہ حضرت مقدادؓ نے جب یہ دُعا سنی تو بد دعا سے تو بے فکری ہوئی اب یہ تمنا ہوئی کہ حضورؐ کی یہ دعا بھی لوں۔ چونکہ حضورؐ کی خدمت میں رہتے تھے توکل اُن میں بھی غالب ہوا اور بکریوں کا دُودھ دوبارہ دوہنے بیٹھ گئے وہاں دیکھا تو دُودھ بھرا ہوا تھا۔ غرض دُودھ نکال کر پیش کیا اور پلایا۔

سو مقصود میرا یہ ہے کہ اس حدیث میں ایک جزو یہ ہے کہ آپ سلام کرتے تھے آہستہ کہ سوتے ہوں تو نہ جاگیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاں سونے کا احتمال ہو وہاں ایسا کھٹکا خواہ ہاتھ سے خواہ زبان سے نہ کرو کہ وہ پریشان ہوں تو اب میں کہتا ہوں کہ اس کی فرع ایک یہ بھی ہے کہ اگر استیذان میں سلام کرے تو ایسی طرح کرنا چاہیے کہ دوسرے شخص کو تکلیف نہ ہو۔

آداب ملاقات

تو آپ نے دیکھا کہ اسلام کی کیا تعلیم ہے۔ اس مقام کو شاہ عبدالقادر صاحب نے خوب لکھا ہے ھُوَ اَزْکٰی لکم (یعنی یہی بات تمہارے لئے بہتر ہے) کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس سے ملاقات صاف رہتی ہے کدورت دل میں نہیں آتی ورنہ اگر جا کر سوتوں کو جگا دیا اور استیذان میں اُس کو تکلیف ہوئی یا تقاضا کر کے جا گھسے تو دل مکدر ہو جاتا ہے اور ملاقات میں صفائی نہیں باقی رہتی۔

ہمارے حضرت کی خدمت میں ایک شخص عین دوپہر کو آئے۔ یہ بھی لوگوں میں اکثر مرض ہے کہ یا تو دوپہر کو آویں گے یا بعد عشاء کے کہ یہ تنہائی کا وقت ہے۔ تنہائی کو تو دیکھتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس سے کہیں دوسرے کو تکلیف نہ ہو۔ اُن کی راحت میں خلل نہ ہو۔ سب سے بہتر یہ ہے کہ پہلے مزاج دیکھ لے بلکہ دریافت کر لیں کہ آپ کو کس وقت ملنے میں سہولت ہے مگر افسوس ہے کہ ہم میں تکلف بھر گیا ہے۔ ہماری کسی بات میں سادگی نہیں ہے۔ بس اپنی فرصت کا وقت دیکھ کر آویں گے اور وہاں جا کر گھنٹے لگا دیں گے اور

کچھ کہنا بھی نہیں ہوتا۔ بس یوں ہی اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کو جا بیٹھتے ہیں اب انگریزوں کے ہاں لوگ جاتے ہیں تو وہ پوچھتے ہیں کہ کیا کہنا ہے اور ہمارے ہاں اگر یہ بات پوچھے تو بہت بُرا مانتے ہیں کہ ہم سے پوچھتے ہیں کہ کیا کہنا ہے۔ کہنا کیا ہوتا بیٹھنے کے لئے آئے ہیں اور اگر کہا جاتا ہے۔ جائیے آرام کیجئے میں بھی سوتا ہوں۔ تو کہتے ہیں تکلیف کی کیا بات ہے ہم بیٹھے ہیں آپ آرام کیجئے۔ حالانکہ ایسی حالت میں راحت نہیں ملتی کیونکہ بعض لوگوں سے لحاظ ہوتا ہے تو اُن کے سامنے آرام نہیں کر سکتے تو ایسے لوگوں کو دیر تک بیٹھنے سے گرانی اور تکلیف ہوتی ہے تو مجلس کو جہاں تک ہو مختصر کرنا چاہئے تاکہ تکلیف نہ ہو۔

یہی راز ہے کہ عیادت کے متعلق ارشاد ہے کہ فَلْیُخَفِّفِ الْجُلُوْسَ۔ (چاہئے کہ بیٹھنے میں تخفیف کریں) کیونکہ دیر تک بیٹھنے سے مریض کو تکلیف ہوگی۔ سبحان اللہ کتنی دقیق رعایت ہے اور بعض لوگ تو ایسے بے حس ہوتے ہیں کہ وہ کسی طرح اٹھتے ہی نہیں۔

میں سفر میں عشاء کے بعد آرام کرنے کے لئے لیٹا۔ چند لوگ آن بیٹھے اور باتیں کرنی شروع کیں۔ جب بہت دیر ہو گئی تو میں نے کہا کہ آرام کیجئے مگر پھر بھی نہیں مانے۔ آخر مجھے بے مروتی کرنی پڑی۔ میں نے کہا کہ مجھے اس سے تکلیف ہوتی ہے۔ تو کہنے لگے کہ تکلیف کی کیا بات ہے۔ میں نے کہا کہ یہ وقت مباحثہ کا نہیں ہے کہ تکلیف کی کیا بات ہے۔

غرض جیسے کہ عمو کا عادت ہے ایسے ہی ایک صاحب عین دوپہر کے

وقت حضرت حاجی صاحب کے پاس آئے۔ حضرت کو سخت تکلیف ہوئی مگر لحاظ کی وجہ سے کچھ نہیں فرمایا۔ آنکھوں میں نیند تھی بیٹھے ہوئے جھوم رہے تھے مگر کچھ نہ فرماتے تھے۔ اگلے دن پھر وہ صاحب تشریف لائے۔ حضرت نے تو اُس روز بھی کچھ نہ کہا مگر حضرت حافظ ضامن صاحب تھے صاف اُنہوں نے خبر لی کہ تمہیں شرم نہیں آتی۔ خود تو رات بھر جورو کی بغل میں پڑے ہوئے سوتے رہتے ہو اور اللہ والے جو رات کو جاگتے ہیں اور دوپہر کو ذرا اُن کے آرام کرنے کا وقت ہوتا ہے اُس وقت تم اُن کو پریشان کرنے کو آ بیٹھتے ہو۔ خبردار! جو اب کبھی اس وقت آئے۔ پھر اگر اس وقت دیکھوں گا تو ٹانگیں ہی توڑ دوں گا۔

اب لوگ کہتے ہیں کہ بعضے بزرگ بہت سخت مزاج ہیں تو وہ خود سخت مزاج نہیں ہوتے مگر اُن کو سخت مزاج کر دیا جاتا ہے۔ تو یہ ہماری معاشرت ہے اور ساری خرابی یہ ہے کہ کسی کو اس بات کا خیال نہیں ہوتا کہ کسی کو تکلیف ہوگی۔ سو شریعت کی یہ تعلیم ہے کہ تکلیف کی ہر بات میں رعایت ہونی چاہیے۔ کوئی بات ایسی نہ کرنی چاہیے جس سے دوسرے کو تکلیف ہو مگر ہم کو خبر نہیں۔

تو میں اس پر بیان کر رہا تھا کہ ھوازکی لکم جو اس حکم کی حکمت بیان کرنے کے لئے آیا ہے۔ اُس کی یہ تفسیر لکھی ہے کہ ملاقات صاف رہے اسی طرح اور احکام کو بھی اگر عمل میں لا دیں تو کدورت ہو ہی نہیں سکتی۔ نے ہر حکم کو ایسا رکھا ہے کہ اُس پر عمل کرنے سے باہم کدو

اور ہر ایک کو دوسرے سے راحت پہنچے گی جس کی وجہ سے آپس میں محبت ہو گی اور اتفاق پیدا ہو گا۔

تو غرض یہ ہے کہ اتفاق کامل کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔ اگر اس کے احکام پر سب لوگ عمل کریں تو ضرور اتفاق ہو گا۔ اور اتفاق ہی جڑ ہے، تمدن کی۔ تو یہ تعلیم بھی ایسی خوبی کی ہے کہ اس پر عمل کرنے سے دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی ہو گی۔ اصل مقصود تو رضائے حق تعالیٰ ہے اور جنت بھی حاصل ہو گی اور تمدن کے مصالح بھی مرتب ہوں گے۔

کفر و عدم کفر کا جواز

اب میں اس کی مختصر شرح کرتا ہوں مگر اول یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ تو وجہ یہ ہے کہ وہ مضمون بیان کرنا چاہیے جس کی ضرورت ہو اور جس میں لوگ کوتاہی کرتے ہوں۔ تو یہ مضمون بھی اُن ہی میں سے ہے کہ اس میں لوگ بہت کوتاہی کرتے ہیں۔ اس کا لوگ اتباع نہیں کرتے یعنی باہم اس کا خیال نہیں رکھتے کہ ہم سے کسی کو تکلیف نہ ہو۔ ایسے تو بہت سے لوگ ہیں کہ جان کر ظلم نہیں کرتے لیکن اُن کی بہت سی حرکات ایسی ہیں کہ اُن سے تکلیف ہوتی ہے۔ پس یہ خیال نہیں کہ ہماری کسی بات سے تکلیف نہ پہنچے اور زیادہ تر وجہ اس کی یہ ہے کہ عوام کو بلکہ بہت سے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی اس کی خبر نہیں کہ یہ دین کی بات ہے حالانکہ اسلام کامل کا مدار اسی پر ہے کیونکہ اسلوب عبارت اس بات کو بتلا رہا ہے کہ اگر کسی شخص میں یہ نہ ہو تو وہ مسلم ہی نہیں۔ تو اگر دوسری احادیث نہ ہوتیں تو تنہا اس حدیث کے مقتضا پر

تو یہ اثر ہوتا کہ جس شخص کو اس کا خیال نہ ہو کہ ہم سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے، وہ اسلام سے خارج مانا جاتا جیسے کہ اعتزال والوں نے مرتکب کبائر کو ایمان سے خارج کیا ہے مگر کفر میں بھی داخل نہیں کیا بلکہ کافر اور مومن کے درمیان میں ایک مرتبہ مان کر اُس میں داخل کیا ہے۔ اور خوارج نے تو کفر میں داخل کیا ہے اہل سنت نے دوسری احادیث سے یہ سمجھا کہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا تو ایسی احادیث سے اہل بدعت یعنی خوارج و معتزلہ تمسک کر سکتے ہیں مگر اہل سنت کہتے ہیں کہ حضورؐ ہی کا ارشاد ہے کہ

لَا تُكَفِّرُوهُ بِذَنْبٍ وَلَا تُخْرِجُوهُ عَنِ الْإِسْلَامِ

یعنی مسلمان کو کسی گناہ کی وجہ سے نہ تو کافر کہو اور نہ اس کو اسلام سے خارج کہو۔

بہت دنوں تک میری سمجھ میں یہ نہیں آیا تھا کہ دو جملے کیوں بیان فرمائے صرف پہلا ہی جملہ کافی تھا۔ دوسرے جملہ کی کیا ضرورت تھی مگر بہت دنوں کے بعد سمجھ میں آیا کہ ایک جملہ میں تو رد ہے خوارج (ایک فرقہ ہے) کا اور ایک میں معتزلہ (ایک فرقہ ہے) کا۔ اوّل جملہ خوارج کا تو رد ہو گیا مگر معتزلہ کا رد نہ ہوتا کیونکہ وہ گناہ کی وجہ سے کفر میں نہیں داخل کرتے۔ اس لئے دوسرا جملہ بھی بیان فرمایا کہ معتزلہ پر بھی رد ہو گیا۔ اور لَا تُكَفِّرُوهُ بِذَنْبٍ (مسلمانوں کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہ کہو) پہلے اس لئے فرمایا کہ دوسرے جملہ میں ترقی ہو کیونکہ اوّل لَا تُكَفِّرُوهُ بِذَنْبٍ سے تو یہ فرمایا کہ کافر نہ کہو۔ تو اب ممکن ہے کہ کوئی کہے کہ ہم تو کافر نہیں کہتے بلکہ اسلام سے صرف خارج کرتے ہیں تو اس کے رد کے لئے فرماتے ہیں

کہ اسلام سے خارج بھی نہ کہو۔

دیکھئے حضورؐ کیا فرما رہے ہیں۔ اب بہت سے لوگوں کی یہ حالت ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر کافر کہہ دیتے ہیں یہ ہرگز جائز نہیں کیونکہ علاوہ اور دلائل منع کے اس سے تکلیف بھی تو ہوتی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ ہم تو زبان سے نہیں کہتے بلکہ لکھ کر کہتے ہیں، تو یہ بھی لسان (زبان) ہی سے ہے کیوں کہ نقوش کی دلالت الفاظ پر اصطلاح سے ہوتی ہے اور اصطلاح زبان سے مقرر ہوئی۔ تو مترجم اس کا بھی زبان ہی ہے تو لسانہ میں داخل ہے اور اسی کو فقہا کہتے ہیں الکتابۃ کالنطق کہ لکھنا زبان سے کہنے کے مثل ہے۔ اور اگر یہ دقیقہ کسی کی سمجھ میں نہ آوے تو چلئے جانے دیجئے آخر یدہ میں تو داخل ہے۔

اور لَا تُکَفِّرُوْہُ (اس کو کافر نہ کہو) کے بعد بِذَنْبٍ (کسی گناہ کی وجہ سے) اس لئے فرمایا کہ اگر کوئی بات صریح کفر کی ہو اور اس میں احتمال دوسرا نہ ہو تو اُس وقت کافر کہنے کی اجازت ہے لیکن اگر اس میں دوسرا احتمال بھی ہو جس کے اعتبار سے وہ بات کفر نہ ہو تو اُس صورت میں کافر نہ کہے۔

چنانچہ فقہا کہتے ہیں کہ اگر ننانوے وجہ کفر کی ہوں اور ایک وجہ عدم کفر کی تو بھی کافر نہ کہو۔ آج کل بعض لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ننانوے عمل کفر کے ہوں اور ایک عمل عدم کفر کا ــــ الخ۔ تو یہ مطلب نہیں۔ اگر یہ مطلب ہوتا تو دنیا میں ایک بھی کافر نہ رہتا کیونکہ ہر شخص میں کوئی بات تو اچھی ہوتی ہی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایک قول میں مثلاً ننانوے توجیہ کفر

کی اور ایک توجیہ عدم کفر کی ہو۔

مثلاً امام صاحبؒ کے پاس ایک شخص آیا کہ ایک شخص کہتا ہے کہ کوئی کافر جہنم میں نہ جاوے گا تو وہ اس کہنے سے کافر ہوا یا نہیں! امام صاحبؒ نے شاگردوں سے پوچھا کہ اس کلام کے کوئی ایسے معنی ہو سکتے ہیں جس کی بناء پر یہ شخص اسلام سے خارج نہ ہو۔ شاگردوں نے کہا اس میں تو کوئی تاویل نہیں ہو سکتی۔ یہ تو نص قطعی کا صریح انکار ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ کوئی کافر دوزخ میں جاتے وقت کافر نہ رہے گا کیونکہ اُس وقت تو سب ایمان لے آئیں گے گو اُس وقت کا ایمان مقبول نہ ہو۔

یہاں سے امام صاحبؒ کی ذہانت کو خیال کیجئے اور عجب نہیں کہ امام صاحبؒ نے یہ وہاں سے سمجھا ہو کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جنت میں کوئی بڑھیا نہ جاوے گی۔ جیسا کہ کافر ومنکر اور اُس وقت کوئی منکر نہ ہوگا بلکہ سب مومن ہوں گے گو اس وقت کا ایمان مقبول نہ ہو۔ یہ ہے حاصل اس تاویل کا۔ تو امام صاحب نے فرمایا کہ اس قول کا یہ مطلب ہو سکتا ہے۔ پھر اس میں کفر کی کونسی بات ہے۔ تو حاصل یہ ہوا کہ جس قول میں تاویل ہو سکے اور اس کی بناء پر مومن ہو سکے تو ایسی بات سے اُس کو کافر نہ کہہ دینا چاہیے۔ اگر ننانوے مطلب کی بناء پر کفر ہو اور ایک مطلب کی بناء پر کفر نہ ہو تو یوں سمجھو کہ شاید وہی مطلب ہو۔

دیندار کی تعریف

تو خلاصہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں کہ جہاں صریح کفر کی بات ہو اور کوئی

تاویل چل ہی نہ سکے کافر کہیں گے۔ باقی گناہ اور غلطی سے کافر نہ کہا جاوے گا
تو چونکہ یہ حدیث موجود ہے کہ مسلمان کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر اور غیر مسلم نہ کہو
اس لیے ہم اُس شخص کو جس کو یہ خیال نہ ہو کہ ہم سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے کافر اور
غیر مسلم نہ کہیں گے بلکہ اس حدیث کے (کہ مسلم وہ ہے کہ نہ اُس کی زبان سے
کسی کو تکلیف پہنچے نہ اُس کے ہاتھ سے) دوسرے معنی قرار دیں گے کہ مسلم سے
مراد مسلم کامل ہے۔ اور یہ ایک محاورہ ہے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ مرد وہ ہے کہ غصہ
کو ضبط کرے یعنی مرد کامل۔ تو اسی طرح مطلب یہ ہے کہ کامل مسلمان وہ ہے کہ جس کی
زبان یا ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

اب سمجھ میں آگیا ہو گا کہ اُس شخص کو ناقص الایمان بتلا رہے ہیں جو اس کا
خیال نہ رکھے۔ تو یہ بھی دین کا ایک جزو ہوا۔ پس یہ زعم غلط ٹھہرا کہ اُس کو دین سے
کچھ علاقہ نہیں اور یہ جب دین ہے تو پھر جو اس کی رعایت نہ کرے وہ دین دار
کہاں ہے جب کہ دین کا ایک جزو ہی اُس سے فوت ہو گیا۔ جیسے حسین وہ ہے
کہ جس کے تمام اعضا حسین ہوں اور دین کا ایک جزو ہے حسن معاشرت بھی تو اگر
یہ ناقص ہے تو وہ دیندار کامل نہیں کیونکہ حضورؐ اس کو اسلام کامل کا مدار فرما
رہے ہیں۔

اگر کوئی یہ کہے کہ اس سے تو معلوم ہوا کہ ایمان ناقص بھی ہوتا ہے حالانکہ
امام صاحبؒ کہتے ہیں کہ ایمان زاید اور ناقص نہیں ہوتا۔

تو جواب یہ ہے کہ امام صاحبؒ کا یہ مطلب نہیں کہ ایمان میں درجات
کا تفاوت نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ کمی اور زیادتی کے دو معنی ہیں۔ ایک تو ہے

کثرت و قلت اجزاء جیسے سیر بھر گیہوں زیادہ ہے اور آدھ سیر کم اور ایک معنی ہیں ضعف و قوت، جیسے فلاں کم عقل ہے اور فلاں بڑا عقلمند ہے یعنی ضعیف العقل اور قوی العقل۔ تو امام صاحب نے جو زیادت اور نقصان کی نفی کی ہے تو وہ بمعنی کثرت اجزاء و قلت اجزاء ہے نہ کہ بمعنی قوت و ضعف۔ کیونکہ گفتگو اس میں ہے کہ اسلام نام کس کا ہے۔ تو امام صاحب فرماتے ہیں کہ تصدیق اور اطاعت کا نام ہے اور اعمال اس کا مکمل (کامل کرنے والا) ہے اور امام صاحب کے پاس دلیل یہ ہے کہ ایک جزو کے انتفاع سے کل مرتفع ہو جاتا ہے۔ تو اگر اعمال جزو ایمان ہوں تو چاہیے کہ اگر کوئی نماز نہ پڑھے تو کافر ہو جائے حالانکہ کافر نہیں ہوتا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ جزو ایمان نہیں ہے بلکہ نماز اس کی ضروریات میں سے ہے۔ تو اس میں کوئی امام صاحب کا مخالف نہیں۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ ایمان بڑھتا ہے اُن کا مطلب یہ ہے کہ قوی ہوتا ہے۔ تو نزاع لفظی ہے۔

اب اگر کوئی کہے کہ جب معنوں میں متفق ہیں تو پھر عنوان کے بدلنے سے اور پھر اس میں اختلاف کرنے سے کیا فائدہ ہوا۔

تو بات یہ ہے کہ ہر وقت ضرورت دین کی جدا ہوتی ہے۔ مثلاً ایک عالم کے وقت میں مرجئہ (ایک فرقہ ہے) کے اثر سے لوگوں نے اعمال کو چھوڑ دیا تو اس وقت یہ عنوان اختیار کیا کہ یزید و ینقص (ایمان میں کمی اور زیادتی ہوتی ہے) تو اس سے لوگوں کی نظروں میں اعمال کی وقعت ہوئی اور ایک وہ وقت تھا کہ خوارج کے غلبہ سے تشدد بڑھ گیا تھا کہ ذرا سے عمل چھوڑنے سے کہہ دیا کہ

کافر ہو گیا۔ تو امام صاحبؒ نے لا یزید ولا ینقص (ایمان میں کمی اور زیادتی نہیں ہوتی) فرمایا۔ تاکہ تشدد نہ ہو۔ تو دو ضرورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اعمال کی بے وقعتی نہ ہو دوسرے یہ کہ تشدد نہ ہو کہ ذرا سی بات میں کافر کہہ دیا جائے۔ خوب سمجھ لینا چاہیئے یہ بات منقول نہیں مگر مصلحین کے طرز کو دیکھنے سے یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ اختلاف عنوان سے یہ فائدے مقصود ہیں۔

غرض حدیث سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ جس کے اندر اس بات کا خیال نہ ہو کہ اُس سے دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے وہ کامل دیندار نہیں اور اسی سے اُن لوگوں کی بھی غلطی معلوم ہو گئی جو کہ محض نماز وغیرہ پڑھ کر اپنے کو دیندار سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ دین کے دو جزو ہیں حقوق اللہ (اللہ تعالیٰ کے حقوق) اور حقوق العباد (بندوں کے حقوق)، تو دیندار وہ ہو سکتا ہے جو دونوں کو ادا کرتا ہو۔ صرف اوّل کے ادا کرنے سے دیندار کیسے ہو سکتا ہے۔ اور مسلمان کے حقوق دو قسم کے ہیں۔ ایک کرنے کے جیسے عیادت کہ جب کوئی مسلمان مریض ہو تو اُس کی مزاج پرسی اور اُس کے دیکھنے کو جائے۔ دوسرے حقوق ہیں ترک یعنی چھوڑنے کے کہ اُس کی آبرو سے تعرض نہ کرے ذلیل نہ کرے۔ پس انہی حقوق ترک میں سے یہ بھی ہے کہ

مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ (کامل مسلمان وہ شخص ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سالم رہیں۔)

تین حق

اب دوسری بات سمجھنے کی یہ ہے کہ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ (جس سے

مسلمان سالم رہیں) کا یہ مطلب نہیں کہ غیر مسلم کی رعایت ضروری نہیں۔ کیوں کہ حدیث میں یہ بھی ہے کہ

اَلْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَ النَّاسُ بَوَائِقَہٗ۔

کہ مومن وہ ہے جس کے خطرات سے تمام آدمی امن میں رہیں تو تمام لوگوں کی رعایت ضروری ہوئی خواہ وہ مسلم ہوں یا کافر اور اُن سب ہی کے حقوق بھی ہوئے البتہ حربی اس حکم میں داخل نہیں تو یہاں صرف اس لئے مسلمون فرمایا کہ یہ موقع اسی کا تھا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کتاب تو تصنیف فرمائی نہیں جس کے الفاظ کا عام ہونا ضروری ہو بلکہ جس وقت جس امر کی ضرورت دیکھی زبان مبارک سے بیان فرمادیا

اور مسلمون جو جمع کے صیغہ سے فرمایا تو جمع سے کبھی تو مجموعہ مراد ہوتا ہے اور کبھی ہر ہر واحد۔ تو ظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہر ہر واحد مراد لیا جاوے کہ ہر مسلمان اُس کی ایذا سے محفوظ رہے۔ اور اگر مجموعہ مراد ہوگا تو اس پر یہ شبہ ہوگا کہ مجموعہ مسلمین کو تکلیف نہ دی جائے اگر بعض کو تکلیف دی جائے تو کوئی حرج نہیں لیکن غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُن احکام میں سے ہے کہ جہاں مجموعہ اور ہر ہر واحد کے حکم میں فرق نہیں ہوتا تو بصورت مجموعہ مراد ہونے کے یہی معنی ہوں گے کہ مجموعہ مسلمانوں کا ہر ہر واحد تکلیف سے بچا رہے۔ اب وہ شبہ جاتا رہا کہ اگر بعض کو تکلیف پہنچ جائے تو کچھ حرج نہیں کیونکہ جب ایک مسلمان نہ بچا تو مجموعہ کہاں بچا۔ کیونکہ ایک جزو نکل جانے سے مجموعہ نہیں رہا۔ تو مطلب یہ ہوا کہ کسی کو بھی تکلیف نہ پہنچے۔

آگے فرماتے ہیں مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ (اس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے) اس میں دو قسم کے حقوق کی طرف اشارہ ہے۔ گو یہ حقوق ترک (چھوڑانے کے) ہیں۔ تین قسم کے مالی، جانی، عرضی جس کو اس حدیث میں صاف فرمایا کہ

اِنَّ دِمَاءَكُمْ وَاَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا ــــ الخ

(تحقیق تمہارے خون اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں تم پر حرام ہیں مثل تمہارے اس دن کی حرمت کے یعنی نہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرے نہ ناحق مال لے نہ آبروریزی کرے) پس یہ تین قسم کے حق ہیں۔ مگر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مال اور جان کے حقوق تو اکثر ہاتھ سے تلف ہوتے ہیں اور عرضی اکثر زبان سے۔ مال کا حق مثلاً کسی کا مال لوٹ لیا یا کسی کو لکھ دیا لوٹنے کے لئے، تو اس کا آلہ بھی ہاتھ ہو گا۔ اب رہا جان کا حق یہ بھی ہاتھ ہی سے ہوتا ہے اور اگر کسی کو زبان سے کسی کے قتل کرنے کو کہا۔ تو یہ بھی پورا تو ہاتھ ہی سے ہو گا۔ اب رہی آبرو، وہ کبھی ہاتھ سے تلف کی جاتی ہے اور اکثر زبان سے۔ سو یہ حقوق گو تین قسم کے ہیں مگر حیثیت اضافہ کے اعتبار سے انہیں دو صورتوں میں داخل ہیں مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ (اس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے) پس اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تینوں حقوق کو جمع کر دیا اجمالاً۔ پس حاصل اس حدیث کا یہ ہوا کہ نہ جان کو تکلیف دے نہ مال کو نہ آبرو کو۔ اب ہر شخص کو دیکھ لینا چاہیے کہ کہاں تک اس پر عمل کرتا ہے۔ اور کتنے حقوق ترک ہوتے ہیں

فقدان تفکر

بعضے حقوق تو خیر کھلے ہوئے ہوتے ہیں لیکن بعضے ایسے مخفی ہوتے ہیں کہ ان کا پتہ نہیں چلتا۔ بہت لوگ اُن کو حقوق ہی میں سے نہیں سمجھتے۔ تو ضرورت اس کی ہے کہ احکام کو دیکھے اور پھر اپنے اعمال کو دیکھے۔ اس وقت بہت سے لوگ علم پڑھتے ہیں مگر ان کو احکام کی خبر نہیں ہوتی۔ پڑھتے سب ہیں مگر وقت پر یاد کچھ نہیں رکھتے۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ سہارنپور میں ایک مولوی صاحب نے اپنے بچہ کے لئے پانچ روپے کی کامدار ٹوپی خریدی اور کہا کہ قیمت پھر دوں گا۔ دکاندار نے کہا کہ مولوی صاحب یہ جائز بھی ہے۔ انہوں نے کہا، کیوں ناجائز ہونے کی کونسی بات ہے۔ دکاندار نے کہا کہ اس میں چاندی کا جو کام سچا ہو رہا ہے اس میں ادھار کب جائز ہے۔ تو چونکہ یہ چاندی کی بیع چاندی سے تھی۔ اس لئے اس میں یہ ضروری تھا کہ اگر دو روپے بھر چاندی ہے تو کم از کم اتنے دام تو ضرور اسی وقت دینا چاہئیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ اچھا ابھی ٹوپی اپنے پاس رہنے دو۔ جب میں روپیہ لاؤں گا اُس وقت خرید لوں گا۔ دکاندار نے کہا کہ مولوی صاحب کیا کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی کہ ٹوپی اسی وقت خرید لیں اور روپیہ پھر دے جائیں تاکہ ابھی لے جانے سے بچہ کا دل خوش ہو جائے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ میری سمجھ میں تو کوئی ایسی صورت نہیں آتی۔ اُس نے کہا کہ آپ مجھ سے پانچ روپے قرض لے لیجئے اور اُس سے ٹوپی کی قیمت ادا کر دیجئے۔ پھر جب دل چاہے وہ

فرض ادا کر دیجئے۔ یہ سُن کر مولوی صاحب کو بڑا افسوس ہوا کہ ہم مدرس ہیں اور ہمیں ان ضروری باتوں کی خبر نہیں جن کا رات دن کام پڑتا ہے

سو بڑی کمی اس کی ہے کہ عمل کے لئے نہیں پڑھتے بلکہ بعض تو محض اس لئے پڑھتے ہیں کہ نام ہو گا۔ کیونکہ بعض جگہ مولویت کی بڑی قدر ہے حتیٰ کہ دعوت کھا کر بھی اُجرت لی جاتی ہے۔ تو بعض تو محض اپنی قدر بڑھانے کے لئے پڑھتے ہیں اور بعض کی نیت استعداد کی ہوتی ہے مگر اس لئے کہ طلباء کی جماعت میں ہماری قدر ہو جاوے۔ اُن کو زیادہ فکر اس کا ہوتا ہے کہ حواشی جمع کر لئے حمداللہ بھی قاضی بھی اور سبق کو زائد باتوں سے اس قدر بھر دیا کہ طالب علم متحمل نہ ہو سکیں۔ اسی طرح ہم حدیث پڑھتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ اس سے کیا حکم نکلا۔ تو ہم اگر غور کریں تو معلوم ہو کہ بعض باتیں جو بظاہر اس میں داخل نہیں ہیں واقع میں وہ بھی اس میں داخل ہیں۔

بات یہ ہے کہ دین کی بعض چیزیں تو ظاہر ہیں جیسے مار دھاڑ سے بچنا اور بعض ظاہر نہیں جیسے رات کو آہستہ سے سلام کرنا اور اس کو لوگ طاعت نہیں سمجھتے حالانکہ حضورؐ رات کو آہستہ سے اُٹھتے تھے اور آہستہ ہی سے سلام کرتے تھے۔ بس ایسی چیزوں کا مدلول حدیث ہونا مخفی ہے مگر ہے مدلول صریح۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضورؐ رات کو بستر پر سے اُٹھے اور آہستہ سے جوتیاں پہنیں اور آہستہ ہی سے دروازہ کھولا اور آہستہ ہی بند کیا۔ وہاں یہ الفاظ ہیں۔

وَفَتَحَ الْبَابَ رُوَیْدًا وَاَغْلَقَ الْبَابَ رُوَیْدًا وَخَرَجَ رُوَیْدًا

یعنی آپ نے آہستہ دروازہ کھولا اور آہستہ سے دروازہ بند کیا اور آہستہ سے باہر نکلے۔

حضرت عائشہؓ کو شبہ ہوا کہ شاید حضورؐ کسی اور بی بی کے ہاں جاتے ہیں اور وجہ یہ تھی کہ حضرت عائشہؓ حضورؐ پر عاشق تھیں اور عشق میں یہ حالت ہوا کرتی ہے ؎

عشق است و ہزار بدگمانی　　　　با سایہ ترا نمے پسندم

(یعنی عشق میں ہزاروں بدگمانیاں ہیں۔ اس لئے ہم آپ کا سایہ کے ساتھ رہنا بھی پسند نہیں کرتے ہیں)

پس اس شبہ کی وجہ سے آپ بھی پیچھے پیچھے ہو لیں۔ یہاں تک کہ حضورؐ بقیع میں پہنچے اور وہاں پہنچ کر اموات کے لئے دعا فرمائی۔ جب دعا کر چکے وہاں سے واپس ہوئے۔ حضرت عائشہؓ جلدی جلدی چلیں اور پہلے آ کر بستر پر لیٹ رہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مالک یا عائشہ حشیا رابیۃ یعنی اے عائشہؓ کیا بات ہے کہ تمہارا سانس پھولا ہوا ہے۔ حضرت عائشہ نے عرض کیا کچھ نہیں۔ فرمایا کہ یا تو بتلا دو ورنہ مجھ کو خدا تعالیٰ خبر دے دیں گے۔ تب حضرت عائشہؓ نے سارا واقعہ بیان کیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میرے پاس جبرئیلؑ آئے تھے کہ بقیع میں جا کر مومنین کے لئے دعا استغفار کرو۔ اس لئے میں وہاں گیا تھا۔ تو حضرت عائشہؓ سے حضورؐ کو کیسا بے تکلفی کا علاقہ اور پھر آپ عاشق۔ چنانچہ کہتی ہیں ؎

لَوَاحِیُ زُلَیخَا لَوْرَأَیْنَ جَبِیْنَہٗ
لَآثَرْنَ بِالْقَطْعِ الْقُلُوْبَ عَلَی الْیَدِ

یعنی اگر زلیخا کو ملامت کرنے والی عورتیں آپ کی جبینِ مبارک کو دیکھ لیتیں تو بجائے ہاتھوں کے قطع کرنے کے قلوب کو قطع کر لیتیں۔

سو حضرت عائشہؓ اس قدر عاشقِ زار تھیں تو آپ کے کسی فعل سے بھی اُن کو اذیت نہ ہوتی مگر اس پر بھی حضورؐ نے یہ رعایت کی کہ رات کو جب اٹھے تو سارے کام آہستہ کیے تاکہ اُن کی نیند میں خلل نہ آوے۔ سو حضورؐ تو جہاں ناگواری کا احتمال بھی نہ ہوتا وہاں بھی ایسے امور کی رعایت فرماتے تھے اور ہماری یہ حالت ہے کہ رات کو اٹھے تو دھڑ دھڑ کرنا شروع کر دیا۔ خصوصاً اگر انگریزی جوتے ہوں۔ یا رات کو ڈھیلے لیتے ہیں تو بھڑ بھڑ توڑتے ہیں۔ حالانکہ اس سے لوگوں کو سخت تکلیف ہوتی ہے مگر کچھ پرواہ نہیں۔ تو یہ امور ظاہراً ناجائز نہیں اس لیے ان سے بچنے کو دین نہیں سمجھتے مگر واقع میں ناجائز ہیں۔

ذکرِ جہر کی شرط

ایک قسم اور ہے سب سے بڑھ کر کہ ظاہر میں حسنات ہیں اور پھر اُن سے لوگوں کو ایذا ہوتی ہے تو وہ بھی نہ کرنا چاہیے۔ مثلاً بعضے لوگ نمازِ تہجد پڑھ کر ذکر جہر کرتے ہیں۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اس کے جواز کی شرط یہ ہے کہ کسی سوتے ہوئے کو یا نمازی کو تکلیف نہ ہو۔ تو جہاں اور لوگ سو رہے ہوں وہاں ذکر جہر سے نہ کرنا چاہیے۔ گو کوئی لحاظ سے نہ کہے مگر واقع میں اُن کو تکلیف ہوتی ہے اور ناگوار ہوتا ہے۔

کانپور میں ایک صاحب رات کو دو منزلہ مکان میں اونچی جگہ بیٹھ کر ذکر جہر کرتے تھے اور اس میں مشاعرہ بھی کرتے تھے کہ ؎

با مقیمان کوئے دل داریم　　رُخ بدُنیا و دیں نمے آریم

(ہم محبوب کے کوچہ کے مقیم ہیں۔ رُخ دنیا اور خشک دین کی طرف نہیں کرتے ہیں)

کبھی شعر پڑھتے کبھی رونے لگتے۔ میں نے دو تین دن تک تو ادب کیا آخر ایک روز کہلا بھیجا کہ آپ کے اس قدر جہر کرنے سے سونے والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ تو حضرت بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ گذشتہ سال رمضان میں ایک نئے نمازی صاحب بعد عشاء ہی کے محلہ کی ایک مسجد میں بیٹھ کر ذکر شروع کر دیتے اور اس قدر جہر سے کرتے کہ محلہ والوں کو نیند نہ آتی۔ آخر ان سے بھی کہا گیا۔ تو اگر کسی کی عبادت سے تکلیف ہوتی ہو تو ایسی عبادت، عبادت نہیں ہے۔

خدمت و تعظیم کے آداب

اور دیکھئے کہ خدمت اور تعظیم کیسے آرام کی چیز ہے مگر بعضے وقت خدمت سے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ مثلاً ایک شخص نے آکر پیر دبانے شروع کئے اور ان سے بے تکلفی ہے نہیں، تو اس خدمت سے کلفت نہ ہوگی تو اور کیا ہوگا۔ اب لوگ اس بات کو تو دیکھتے نہیں کہ ہم سے دل بھی کھلا ہوا ہے یا نہیں اور خدمت شروع کر دیتے ہیں حالانکہ ہر ایک سے اتنی خصوصیت نہیں ہوتی۔ تو ایسی صورت میں خدمت کرنے سے ظاہر ہے کہ اور الٹی تکلیف ہوگی۔ میں تو کہا

کرتا ہوں کہ اگر کسی کی خدمت کرنی ہو تو اوّل اُس سے خصوصیت اور بے تکلفی پیدا کرو۔ تو یہاں تک لوگوں کی نظر ہی نہیں جاتی۔

ایک اور تعظیم کی صورت سنیے۔ جنہیں سمجھا کہ یہ بزرگ ہیں۔ بس گئے اور اُن کے پیچھے بیٹھ گئے اور بعضے تو یہ غضب کرتے ہیں کہ پیچھے کھڑے ہو کر نیت باندھ لیتے ہیں اور نماز پڑھنے لگتے ہیں اور بعضے لوگ نماز تو نہیں پڑھتے مگر پس پشت بیٹھ گئے اور کھنکارا کہ توجہ دیں گے۔ میں نے تو کانپور میں اس کا علاج مقرر کیا تھا کہ ایسے میں اُن کی پشت کی طرف جا بیٹھے تاکہ انہیں بھی تو معلوم ہو کہ اس سے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ اور بعضے لوگ یہ کرتے ہیں کہ پشت کی طرف تو نہیں بیٹھتے مگر مشغولی اوراد یا تلاوت کی حالت میں برابر میں اس طرح جا کر بیٹھ جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ فراغ کے منتظر ہیں جس سے بے حد گرانی اور پریشانی ہوتی ہے۔ غرض جس تعظیم سے گرانی ہو ایسی تعظیم بھی نہ کرنی چاہیے۔

اس راز کو حضرات صحابہ نے خوب سمجھا۔ فرماتے ہیں کہ

مَا کُنَّا نَقُوْمُ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِمَا کُنَّا نَعْرِفُ مِنْ کَرَاہِیَتِہٖ۔

یعنی ہم حضورؐ کی تعظیم کے لئے نہیں کھڑے ہوتے تھے کیونکہ ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ حضورؐ کو اس سے گرانی ہوتی ہے۔

مگر آج کل لوگوں کو اس کا بالکل خیال نہیں۔ میں نے دیکھا کہ میرے اُستاد مولانا فتح محمد صاحب ہاتھ میں جوتے اٹھا کر جامع مسجد سے گرمیوں کے موسم میں باہر آنے لگے تو ایک صاحب نے لپک کر چاہا کہ مولانا کے جوتے میں

لے لوں۔ اُنہوں نے تو اپنے نزدیک ادب کیا کہ مولانا کے ہاتھ میں اور جُوتے ہوں۔ مگر یہ بھی کوئی خدمت ہے کہ چار قدم جُوتے پہنچا دیئے۔ کیا جوتوں کا کوئی بڑا بوجھ تھا اور وہ چار میل لے کر جانا تھا کہ مولانا تھک جاتے۔ تو اگر خدمت کرو تو کوئی معتد بہ خدمت کرو تاکہ کچھ راحت پہنچے۔ آخر مولانا نے نہیں دیا۔ مگر اُنہوں نے نہ مانا اور ایک ہاتھ سے تو مولانا کی کلائی پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے جھٹکا مار کر جُوتا چھین لیا۔ یہ بے تمیزی ہے ہم لوگوں میں۔ اپنے نزدیک تو بڑی خدمت کی کہ لڑ کر جُوتا چھین لیا۔ تو ساری خرابی ناعاقبت اندیشی اور تکلّف کی ہے۔

غرض ہر طرح سے تکلیف ہی دیتے ہیں۔ تو اُن لوگوں کی یہاں تک نظر ہی نہیں جاتی۔ مگر حدیث میں صحابہ کا صاف قول ہے مَا كُنَّا نَقُوْمُ ـــــ الخ کہ ہم حضورؐ کی گرانی کی وجہ سے آپ کی تعظیم کے لئے کھڑے بھی نہ ہوتے تھے اور اسی قبیل سے ہیں مہمانداری کے قصّے کہ اُس میں اس قدر تکلّف کرتے ہیں کہ بجائے آرام کے اور تکلیف ہو جاتی ہے۔ مجھے بہت دفعہ یہ پیش آیا کہ کھانے کے اندر زیادہ تکلّف ہونے کی وجہ سے کھانا نہیں کھایا گیا۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ بعض دفعہ خفیہ طور پر کچوریاں منگا کر کھائیں۔ تو یہ خرافات ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے مسلمانوں میں بے لطفی کی۔ کیونکہ بڑا ذریعہ لُطف کا راحت ہے اور جب ہر وقت کدورت ہوتی رہے تو پھر لُطف کہاں۔ اس لئے میں نے اس مضمون کو اختیار کیا۔

اب شاید کسی کو شبہ ہو کہ پھر تو چاہئے کہ کسی کو بھی کچھ نہ کہے۔ اگر کوئی

بچہ بے تمیزی کرے تو اُس کو بھی سزا نہ دی جاوے۔ کیونکہ اس سے اُس کو تکلیف ہو گی۔

تو سمجھو کہ شریعت یہ نہیں کہتی کہ ادب دینے کے لئے بھی کسی کو نہ مارا جائے اور جو اس حدیث سے یہ شبہ ہو تو اس کا جواب بھی اسی میں ہے کہ تمہارا ہاتھ سبب نہ بنے تکلیف کا اور ادب دینے کے موقع پر اُس شخص کا فعل سبب بنا ہے تکلیف کا ادب دینے والے کا ہاتھ سبب نہیں بنا۔ بلکہ اس نے تو اُس کو تکلیف سے بچایا ہے کہ بداخلاقی کے ذریعہ سے جو تکالیف ہوتیں وہ اُن سے بچا رہے گا۔ تو وہ ادب دینے والا موذی نہیں ہے بلکہ اُس کا فعل تو اماطۃ الاذیٰ (تکلیف دینے والی چیز کو دور کرنا) ہے۔

دیکھئے اگر کسی بچہ کے پیر میں کانٹا چبھ جاوے تو کیا اُس کو ویسا ہی رہنے دیا جاوے گا۔ تو جب اُس کے پیر میں کانٹا چبھنا گوارا نہیں ہے تو اس کا دوزخ میں جلنا کیسے گوارا ہو گا۔ تو بدتمیزی پر اس لئے ادب دیا جاتا ہے تاکہ یہ اس ایذا سے بچا رہے۔ پس یہ شبہ بھی رفع ہو گیا کہ یہ اُس کو تکلیف دینا ہے۔ اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں۔

خلاصۂ وعظ

خلاصہ یہ ہے اس حدیث کا کہ ہم کو حقوق العباد کی بھی رعایت کرنی چاہیئے۔ اور یہ جو فہرست حقوق العباد کی میں نے بیان کی ہے، یہ نمونہ کے طور پر ہے۔

ایک بات اور یاد آئی کہ اکثر لوگ مسجد کے اندر جا کر پچھلی دیوار سے

مل کر نیت باندھتے ہیں۔ اب اگر کوئی وہاں سے نکلنا چاہے سو اگر نمازی کے آگے سے نکلے تو گنہگار ہو اور گناہ سے بچے تو نکل نہیں سکتا۔ اب اُس کو تکلیف ہوئی۔ تو یہ بھی نہ چاہیئے۔

اسی طرح ہر عمل میں اس کا لحاظ رہنا چاہیئے۔ یہ یہاں ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ کسی کو تکلیف نہ ہو۔ باقی اس کی مثالیں اتنی کثرت سے ہیں کہ مدتوں تک سوجھتی پڑیں گی۔ اور اس کے لئے ایک سہل قاعدہ بتلاتا ہوں کہ جو برتاؤ کسی کے لئے کرو سوچ لو کہ اگر ہمارے ساتھ کوئی یہ برتاؤ کرے تو کیا اثر ہو۔ مثلاً جیسے کسی کی پشت کی طرف بیٹھے تو سوچ لے کہ اگر میرے پسِ پشت کوئی بیٹھے تو ناگوار ہوگا یا نہیں۔ تو ایسے قول و فعل کو چھوڑ دو جس کا اثر تکلیف ہو۔ اگر اس معیار کو پیش نظر کرلیں تو ہماری بہت اصلاح ہو جائے گی۔ اور اُس وقت ایمان کامل نصیب ہوگا۔

غرض جیسے نماز روزہ ضروری ہے ایسے ہی معاشرت کا درست کرنا بھی ضروری ہے۔ جب اس پر عمل ہوگا اُس وقت دنیا کی راحت بھی نصیب ہوگی اور یہ حالت ہوگی کہ ؎

بہشت آں جا کہ آزارے نباشد
کسے را باکسے کارے نباشد

(جہاں کوئی آزار و تکلیف نہ ہو اور کسی کو کسی سے کچھ سروکار نہ ہو وہ جگہ بہشت ہے)

اب دعا کیجیئے کہ حق تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرماویں۔ وصلے اللہ تعالےٰ

علے خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین!

ہندستانی لائبریری
گارڈن ریچ روڈ۔ مٹیابرج۔ کلکتہ

HINDUSTANI LIBRARY
Estd. 1924.
ہندستانی لائبریری
Garden Reach, Calcutta.

اصلاح الیتامیٰ

یتامیٰ کے حقوق کے متعلق یہ وعظ ۴ شعبان المعظم ۱۳۳۷ھ یوم دوشنبہ بعد مغرب یتیم خانۂ اسلامیہ کانپور میں ہوا جو ۲ گھنٹہ ۳۵ منٹ میں ختم ہوا۔ تین ہزار کا مجمع تھا۔ اسے احقر عبدالحلیم صاحب نے قلمبند کیا ۔۔۔۔۔

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ
ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ
اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا
الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا
محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ
وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم
بسم اللہ الرحمن الرحیم. وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتَامٰى قُلْ
اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ وَاللّٰهُ
يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ
عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ.

تمہید

جس مضمون کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں اور جس کے لئے میں نے اس آیت کی تلاوت کی ہے اس کی تعیین آیت کی عبارت و الفاظ سے کسی قدر اجمالاً سب کے ذہنوں میں ہو گئی ہو گی۔ اس واسطے کہ قرآن مجید کے الفاظ کچھ ایسے مانوس ہیں کہ کم و بیش سب مسلمانوں کی عام اس سے کہ وہ عربی پڑھے ہوں یا نہ پڑھے ہوں، سمجھ میں آجاتے ہیں۔ نیز وہ شرعی الفاظ ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ یوں بھی مسلمانوں کے محاورات میں مستعمل ہیں۔ اس لئے اکثر مقاموں کو سن کر مسلمان کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہے اور اجمالاً مضمون متعین کر لیتا ہے۔

مثلاً اس مقام پر لفظ یتامیٰ ہے۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں جس نے اسے اس کے معنی میں استعمال نہ کیا ہو یا بارہا استعمال ہوتے نہ سنا ہو۔ اور بوجہ تکرر استعمال کرنے اور بار بار سننے کے ہر مسلمان سمجھتا ہے کہ یتامیٰ کے متعلق ان آیتوں میں مضمون ہے۔ اس لئے اس کے متعلق تو زیادہ کہنے کی ضرورت

نہیں۔ البتہ تعیین کے بعد بطور دفع دخل مقدر کے اتنا کہنا ضروری ہے کہ شاید موقع کے لحاظ سے (کہ یتیم خانہ میں بیان ہو رہا ہے) کسی کو شبہ ہوا ہو کہ غالباً مہتمم کی جانب سے اس مضمون کی فرمائش کی گئی ہو اور اس وسوسہ کا ہونا کوئی بعید از قیاس بھی نہیں کیونکہ عام عادت اب یہی ہو رہی ہے کہ اکثر بیان کرنے والے سے فرمائش کی جاتی ہے۔ اس لئے یہ وسوسہ اگرچہ بے جا نہیں مگر پھر بھی اتنا ضرور ہے کہ سب کو ایک ہی لکڑی کیوں ہانکا جاوے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ سب کی طرف سے سب ہی سے فرمائش کی جاتی ہو اور پھر فرمائش بھی کی جاتی ہو تو سب اس کی پابندی بھی کرتے ہوں۔ اس لئے یہ قیاس سب کے متعلق صحیح نہیں ہو سکتا۔

نیز مسئلہ شرعیہ ہے کہ قیاس انشائیات میں مفید ہوتا ہے اخباریات میں مفید ظن۔ تو کیا معنے؟ کسی درجہ میں بھی اُس کا اثر نہیں ہوتا بلکہ اور غلط نتائج پیدا کرتا ہے۔ انشائیات میں جو حکم ایک جزئی کے لئے متعلق ہوتا ہے دوسری جزئی کو دیکھ کر تشابہ و تشارک کی وجہ سے اس حکم کو اس کی طرف بھی متعدد کر دیتے ہیں اور یہاں قیاس کی ضرورت بھی ہے۔ کیونکہ کوئی جزئی حکم شرعی سے خالی نہیں ورنہ انسان کا سدیٰ (مہمل) ہونا لازم آئے گا۔

ایحسب الانسان ان یترک سدی

کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ مہمل چھوڑ دیا جاوے گا —— مہمل کے یہ معنی کہ اُس کو خطاب ہی نہ ہو اور اُس کے دو درجے ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی حکم ہی نہ ہو اور ایک یہ کہ بعض جزئیات میں احکام ہوں اور بعض میں مہمل چھوڑ

دیا جاوے۔ اس آیت نے اپنے اطلاق کی وجہ سے دونوں درجوں کی نفی کر دی۔ البتہ اوّل درجہ میں اہمال کامل ہے دوسرے میں اہمال ناقص۔ مگر مطلق اہمال تو دونوں میں مشترک ہے اور آیت مطلق اہمال کی نفی کرتی ہے پس دونوں کی نفی ہو گئی۔

تشبہ بالنصاریٰ

اس موقعہ پر ایک اور کام کا مضمون ذہن میں آیا۔ وہ یہ کہ بعض لوگ حدیث من تشبہ بقوم فھو منھم کو تسلیم کر کے اس کے معنی میں تصرف کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض سے گفتگو ہوئی تو وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم کوٹ پتلون اور بوٹ پر انگریزی ٹوپی بھی پہنیں تب تشبہ بالنصاریٰ ہو۔ ہم تو ٹوپی ترکی پہنتے ہیں اور وہ اسلامی سلطنت کی وضع ہے۔ لہٰذا ہم میں اور نصاریٰ میں فرق ہو گیا سو اس تقریر سے اس کا جواب بھی ظاہر ہے۔ یعنی تشبہ بھی ایسا ہی ہے کہ اس کے بھی دو درجے ہیں۔ ایک تشبہ ناقص ایک تشبہ کامل۔ اور وعید مطلق تشبہ پر ہے لہٰذا دونوں کو شامل ہے۔ خواہ ناقص ہو یا کامل۔ اگر ٹوپی بھی نصاریٰ کی سی ہوتی تو تشبہ کامل تھا۔ ٹوپی نہیں ہے تو تشبہ ناقص ہے اور ناقص قسم ہے مطلق تشبہ کی اور مقسم کا اپنی قسم پر صادق آنا ضروری ہے۔ اس لئے اگر تشبہ ناقص بھی ہو گا اس پر بھی من تشبہ بقوم صادق آئے گا۔ اور جب مقدم صادق آئے گا تو تالی اور جزا فھو منھم بھی ضرور صادق آئے گی۔ البتہ جس طرح تشبہ میں دو درجے ہیں تام و ناقص، اسی طرح اس کی وعید میں بھی دو درجے ہو جائیں گے یعنی تام و ناقص لیکن نفس وعید دونوں پر ہے۔ ایک پر وعید تام اور ایک

پر وعید غیر تام۔

ان دونوں میں ایسا فرق ہے جیسے ایک چھوٹی سی آگ کی چنگاری اور ایک بڑا سا انگارہ کہ آگ دونوں ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ایک چھوٹا سا قطعہ ہے آگ کا اور ایک بڑا۔ تو کیا جو شخص تشبہ ناقص یا غیر تام کو گوارا کرتا ہے، وہ اس کی اجازت دے گا کہ اس کے چھپر میں ایک چھوٹی سی چنگاری رکھ دی جائے۔ اور اسے ناگوار و مضر نہ سمجھے گا۔ اگر مضر نہ سمجھے گا تو ہم اُسے چھوڑ دیں گے۔ اور پھر اُسے خطاب نہ کریں گے۔ مگر ہر شخص جانتا ہے کہ کوئی بھی اُسے گوارا نہ کرے گا۔ کیونکہ یہ ناقص ہی تام بن جاتی ہے۔ چھوٹی سی چنگاری بڑھ کر انگارہ بن جاتی ہے۔ اور اگر بالفرض چھوٹی بڑی نہ بھی بنے اور سارے چھپر کو تباہ نہ کرے تو کم از کم بالشت دو بالشت تو جلا ہی دے گی۔ اگر مضر باضرار کامل نہیں تو مضر باضرار ناقص تو ضرور ہے۔

تو صاحبو ـــ کیا دین ایسی چیز ہے کہ اس کے تھوڑے حصہ کا کم ہونا گوارا کیا جا سکتا ہے۔ اپنے چھپر کی قدر، دوشالہ کی قدر بلکہ کمبل اور ٹاٹ تک کی قدر کہ اس میں سے بالشت دو بالشت بھی کم اور تباہ ہونا گوارا نہیں۔ اگر قدر نہیں ہے تو دین کی قدر نہیں ہے۔ بڑا افسوس ہے۔ دین زبان حال کہتا ہے ؎

خلق از سوزش پروانہ داری ــــ ولے از سوز ما پروا نہ داری

کہ ادنیٰ ادنیٰ ضرر تک ناگوار اور ہمارے جلنے اور نقصان پہنچنے کو کچھ بھی ناگوار نہیں سمجھتے ـــ غرض تشبہ ناقص بھی نفس مذمت میں ویسا ہی

مذموم ہے جیسا کہ تشبہ کامل ۔ صرف درجات کا فرق ہے جیسے عموماً معاصی میں
ایک صغیرہ ہوتا ہے اور ایک کبیرہ ۔ اور یہ فرق اس لئے نہیں کہ صغیرہ کے
کرنے کی جرات ہو بلکہ شریعت مقدسہ ہر چیز کی حقیقت اور واقعی فرق کو ظاہر
کرتی ہے جس کا اثر صرف علم میں ہوتا ہے اور نفس وجوب عمل میں سب یکساں
ہوتے ہیں ۔ جیسا کہ طب کی کتابوں میں اطباء سمیات سے بحث کرتے ہیں کہ
کون اوّل درجہ ہے اور کون دوم درجہ اور اُن کا یہ مقصود نہیں ہوتا کہ جو درجہ
دوم میں ہے اس کی اجازت ہے بلکہ وہ ایک علمی تحقیق ہے باقی اگرچہ عمل
یعنی وجوب احتراز میں اوّل اور دوم دونوں برابر ہیں ۔ اسی طرح جو اہل عقل
ہیں وہ صغیرہ وکبیرہ دونوں سے احتراز کرتے ہیں ۔ اور اس قسم کے فضول اور
مہمل شبہے نہیں کرتے کہ تشبہ ناقص ہے تشبہ تام نہیں ۔ بہر حال مہمل چھوڑنا دونوں درجے
کا ہے اور اس آیت سے دونوں کے اہمال کی نفی ہو گئی ۔

آزادی کا ہیضہ

آج کل آزادی کا اس قدر ہیضہ پھیلا ہوا ہے کہ ایک گروہ یہ چاہتا ہے
کہ انسان کسی حکم کا پابند نہ رکھا جاوے ۔ جن کا مذاق زیادہ فاسد ہے انہوں
نے اس کا نام آزادی مطلق رکھا ہے اور یہاں تک اس کا ہیضہ ہوا ہے
کہ اب وہ شرعیات سے گزر حسیات میں، روحانیات سے گزر کر مادیات
میں اور دین سے گزر کر دنیا تک میں مطلق العنانی چاہتے ہیں ۔ اُن کے نزدیک
قانون سلطنت، قانون شریعت، قانون فطرت سب فضول ہیں ۔ وہ بطور
خود سلطنت کا بھی انتظام اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں اور گویا بالکل جانوروں

کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں کہ نہ کوئی بادشاہ ہو نہ رعیت نہ حاکم نہ محکوم اور اس کو یہاں تک ترقی دی ہے کہ اُن کے خیال میں اب نکاح بھی فضول ہے۔ بس عورتیں اس طرح رہیں جیسے گھوڑیاں بیل وغیرہ کہ تھوڑے روز ایک مالک کی سواری میں اور تھوڑے روز دوسرے مالک کی سواری میں ہیں جب چاہا بیچ ڈالا اور جب چاہا خرید لیا۔

اللہ اکبر! کس قدر بے حیائی ہے۔ حیا سے قطع نظر کرکے ایسی آزادی تو فطرت سلیمہ کے بھی سراسر خلاف ہے۔ الغرض اس قسم کی آزادی تو اعلیٰ درجہ کا اہمال ہے۔ اُس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ایسی آزادی مطلق نہ ہو بلکہ بعض امور میں شریعت کا مخاطب ہو اور بعض میں اُس کی رائے پر چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ بعض آزاد خیالوں کی تحریر میری نظر سے بھی گزری کہ علماء نے اس قدر تنگی کردی کہ ہر چیز کو حتیٰ کہ ناخن، بال، داڑھی، مونچھ تک کو شریعت کے اندر ٹھونس دیا۔ شریعت تو صرف عقائد و عبادات تک ہے۔

سبحان اللہ! کیسے خیر خواہ بنے ہیں۔ اے صاحب میں کہتا ہوں کہ جب قرآن و حدیث میں ہر چیز سے صریح بحث ہے۔ کسی کے کرنے کی تاکید ہے اور کسی پر وعید، کسی کے ترک پر وعید ہے۔ یہ وعدہ وعید بتا رہا ہے کہ یہ قانون ہے اور یہ اس کی تصریح بھی ہے کہ ایسا کرنے والا مجرم اور گنہگار ہوگا یا ایسا نہ کرنے والا مستوجب سزا ہوگا۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اُسے شریعت سے خارج سمجھا جاوے۔ اس میں مولویوں کا کیا دخل۔ بہرحال مکلفین کا ہر فعل کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا سونا، غرض ادنیٰ سے ادنیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ

کوئی فعل بھی ہو اُس کے متعلق شریعت کا ایک حکم ضرور ہے خواہ وہ جواز ہی کا ہو۔ غرض کوئی فعل ممنوع ہوگا اور کسی کی اجازت ہوگی۔ جس کی تفصیل علماء کے تتبع سے معلوم ہو سکتی ہے۔ جب کسی جزئی کے حکم کی ضرورت ہو علماء سے دریافت کر لیجیے۔ غرض کوئی فعل ایسا نہیں جس کے متعلق یجوز یا لایجوز نہ ہو۔ تو اس اعتبار سے یہ قانون تنگ کہاں ہوا بلکہ بڑا وسیع ہوا۔ اور اگر تنگ بایں معنی کہا جاتا ہے کہ اس میں تشدد بہت ہے سو یہ بھی غلط ہے جیسا اپنے محل میں ثابت ہے۔ اور یہ قانون تو ایسی ذات کا بنایا ہوا ہے جو ہماری جان و مال سب کی مالک ہے اور جس کا حق نفوس و اموال و اغراض میں یکساں ہے۔

اُس کے مقابلے میں قانون طب جو انسانوں کا بنایا ہوا ہے اور پھر ایسے انسانوں کا جو ہمارے مالک نہیں کوئی چیز نہیں۔ مگر پھر بھی بیمار کے ہر فعل کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ جو طبیب ہے وہ بیمار سے یہ بھی نہ کہے گا۔ کہ اس چیز کا حکم طب میں نہیں ہے۔ مثلاً کوئی پوچھے کہ گوشت کھاؤں۔ وہ کہے گا کہ ہاں کھاؤ مگر بکری کا کھانا گائے کا نہ کھانا۔ وہ پوچھے مثلاً بیگن یا مسور کی دال کھاؤں۔ وہ کہے گا ہرگز نہیں۔ کوئی پوچھے چلا پھرا کروں۔ ہاں چلا پھرا کرو مگر دھوپ میں نہ چلنا یا مثلاً آہستہ آہستہ چلنا۔ مسہل کی حالت میں پوچھے کہ مسہل لے کر سو رہوں۔ منع کرے گا مت سونا اس سے دست نہیں آئینگے غرض بیمار کا کوئی فعل ایسا نہیں جس کا حکم طب میں نہ ہو۔ چنانچہ اگر شک ہو، تو کسی طبیب سے سوچ سونچ کر پوچھ لو۔ دیکھو سب کا جواب دے گا۔ ایسے

افعال کے متعلق تو پوچھنا نہیں جو مریض سے صادر ہی نہیں ہو سکتے۔ سوچ سوچ کے پوچھنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم گھڑ گھڑ کے پوچھنے لگو کہ صاحب اڑنا کیسا ہے غرض وہ افعال جن کا صادر ہونا مریض سے ممکن ہے۔ واللہ طبیب اُن کے متعلق یہ کبھی نہ کہے گا کہ طب میں اس کا حکم نہیں ہے۔ حکم سب کا ہے کسی کے متعلق ینفع کسی کے متعلق یضر، کسی کے متعلق لا ینفع ولا یضر۔ طب جو انسانوں کا بنایا ہوا قانون ہے جب ایسا جامع ہے تو شریعت جو خدا کا بنایا ہوا قانون ہے اُس میں ایسا احاطہ ہے تو کیا تعجب کی بات ہے۔

شریعت کی آسانی

افسوس! کہ شریعت کی بلکہ خدا کی قدر نہیں ما قدروا اللہ حق قدرہٖ کہ ایسے جامع قانون کو لوگ تنگ کہتے ہیں۔ تنگی تو یہ ہے کہ مثلاً تعزیرات ہند میں بعض جرموں کے متعلق دفعہ کا پتہ نہ لگے تو وہاں کہا جاوے گا کہ اس قدر تنگی ہے قانون میں کہ عام جرائم کو حاوی نہیں ہے۔ سو درحقیقت تمام جزئیات کے احکام کا ہونا تنگی نہیں بلکہ وسعت ہے۔ ہاں تنگ اس معنی کر ہے کہ اس سے آپ کو تنگی ہوتی ہے ورنہ فی نفسہٖ تو وسعت ہے اور یہ بھی خدا کی بڑی رحمت ہے۔ ارے صاحب اگر فکر کیجئے تب سمجھ میں آوے کہ یہ کیسی رحمت ہے۔

دیکھئے بچہ ہے اگر اُسے اس کی رائے پر چھوڑ دیجئے تو کیا یہ آپ کی شفقت سمجھی جاوے گی۔ اسے پابند بنانا، اُس کو اپنی رائے اور مرضی پر چلانا یہ البتہ دلیل شفقت ہے۔ بچہ آپ سے اگر پوچھتا ہے ابا مٹھائی

کھالوں۔ آپ اُسے جواب دیں کہ پوچھنا کیوں ہے تجھے اختیار ہے ہم کیا جانیں تو کیا یہ جواب اور آزادی شفقت ہے یا یہ کہنا شفقت ہے کہ ہاں مٹھائی کھاؤ مگر دیکھو بتاشے کے سوا اور کچھ ثقیل مٹھائی نہ کھانا اور وہ بھی چھٹانک بھر سے زیادہ نہ کھانا۔ دیکھئے اس میں آپ نے اُسے کس قدر پابند کردیا مگر یہ تنگی اور پابندی انتہا درجہ کی شفقت ہے کیونکہ اُس کی مصلحت کے لئے ہے۔ غرض جو شفیق باپ ہوگا وہ بیٹے کے ہر استفسار کا قانونی جواب دے گا۔ اور اس کو آزاد نہ کرے گا بلکہ ایک خاص دستور العمل کا اُسے پابند کرے گا۔ اور اگر شفقت نہیں ہے تو اُسے آزاد چھوڑ دے گا کہ جو چاہے کرے۔ آپ خود اپنے محاورہ میں آزاد چھوڑ دینے والے کو بے پروا باپ کہتے ہیں۔ اور درحقیقت ایسا شخص باپ نہیں بلکہ بیٹے کے حق میں پاپ ہے۔ اس پر یہ لوگ بھی ملامت کرتے ہیں۔ جب یہ سمجھ گئے تو پھر خدا سے یہ چاہتے ہو کہ وہ مطلق العنان چھوڑ دے۔

باپ دوپہر کو بچہ کو باہر نکلنے سے روکتا ہے اور سونے کی تاکید کرتا ہے گو بچہ اُسے تنگی اور قید سمجھتا ہے مگر فی نفسہ یہ باپ کی انتہائی شفقت ہے کہ وہ اس کی صحت کی حفاظت کرتا ہے اور آپ بھی یہ کہتے ہیں کہ کیسا شفیق باپ ہے کہ اپنے بیٹے کی کیسی نگرانی کرتا ہے۔ آہ افسوس! یہ قیود باپ کرے تو نگرانی سمجھی جاتی ہے اور خدا کرے تو سختی اور تنگی سمجھی جاتی ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ مہمل اور آزاد ہونے سے راحت کبھی نہیں مل سکتی۔ راحت اُسی مریض کو مل سکتی ہے جس کی ایک ایک جزئی سے طبیب تعرض کرے

اگر شریعت سے قطع نظر کر لی جاتی تو اس قدر ٹھوکریں لگتیں کہ کہیں پناہ نہ ملتی واقعات نے شریعت کی ضرورت کو ثابت کر دیا ہے۔ ملاحدہ کو دیکھئے کہ اب وہ بھی شریعت کے قائل ہو رہے ہیں جو کہیں تعدد ازدواج پر اعتراض کرتے تھے، کہیں طلاق کے مسائل پر کہیں شراب کی ممانعت پر، اور اپنی نارسا عقل سے طرح طرح کے شبہے کرتے تھے لیکن ایک زمانہ دراز کے تجربہ کے بعد انہیں بھی اپنے اعتراضوں کا غلط ہونا اور اپنی عقل کا ناکافی ہونا ثابت ہو گیا اور در حقیقت جو تجربہ کار ہیں وہ پہلے ہی سے عقل کو ناکافی سمجھتے ہیں اور اسے اس طرح خطاب کرتے ہیں ؎

آزمودم عقلِ دور اندیش را

بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

یعنی ہم نے عقل کو آزما لیا اور اس کی غلطیاں سمجھ لیں۔ اب تو دیوانہ بنیں گے۔ حضرت ادنیٰ سی بات ہے کہ اگر عقل پر مدار ہوتا ہم ایسی مصیبت میں پڑتے کہ سب بھول جاتے۔

عقل اور شریعت

میں اس کا ایک نمونہ پیش کرتا ہوں اور ابھی مشاہدہ کرائے دیتا ہوں مگر مخاطب وہ ہے جو خدا اور اسلام کا قائل ہے یا کسی دین سماوی کا قائل ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ سوچئے کہ دنیا و آخرت میں کیا نسبت ہے۔ ان دونوں میں ایک فانی ہے اور ایک باقی اور بقا بھی کیسا کہ الیٰ مالا نہایۃ ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ دنیا محدود اور آخرت غیر محدود۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ دنیا کے مقاصد کے لئے کتنی کوشش کی جاتی ہے اور آخرت کے لئے کتنی۔ یہ تو واقعات تھے۔

اب تیسرا مقدمہ جس کا عقل حکم کرتی ہے یہ ہے کہ جو نسبت مقاصد میں ہونی چاہیے وہ اُن کی تحصیل کی کوشش میں بھی ہونی چاہیے۔ مثلاً روپیہ اور پیسہ میں کیا نسبت ہے۔ پیسہ روپیہ کا ۶۴/۱ ہے تو جتنی کوشش ایک پیسہ کے حصول کے لئے کی جاتی ہے عقل کا حکم یہ ہے کہ روپیہ کے لئے اس سے چونسٹھ حصہ زائد کرنی چاہیے۔ اگر ایک پیسہ کے لئے ایک چھٹانک کوشش ہے تو دو کے لئے دو چھٹانک اور تین کے لئے تین چھٹانک یہاں تک کہ روپیہ کے لئے چونسٹھ چھٹانک کوشش کرنی چاہیے۔

اب ان سب مقدمات کا مقتضا عقل کا یہ فتویٰ ہے (آپ اس فتویٰ کے موافق غور کیجئے) کہ دنیا سے آخرت کو کیا نسبت ہے۔ ایک محدود ایک غیر محدود۔ تو یہی فرق ان کی تحصیل کی کوششوں میں بھی ہونا چاہیے۔ یعنی دنیا کے لئے محدود کوشش ہونی چاہیے اور آخرت کے لئے غیر محدود اور ظاہر ہے کہ انسان کی عمر محدود ہے اس لئے وہ غیر محدود کوشش پر کبھی قادر نہیں ہوگا تو اب عقل گھبرا کر اس پر صلح ٹھہرا دے گی کہ تیری عمر کا جتنا وقت ہے وہ تو سب کا سب کوشش میں صرف کر دینا چاہیے۔ چلنا، پھرنا، کھانا، پینا، سونا سب چھوڑ دینا چاہیے یہ ہے عقل کا فتویٰ ——! اور شریعت کا فتویٰ مشہور ہے کہ نہیں، تھوڑے اعمال فرض ٹھہرا دیئے باقی آزاد رکھا۔ سو صاحب! ہم تو شریعت کے متبع ہیں آپ عقل کا اتباع کیجئے۔ دیکھئے پھر کیا مصیبت ہوتی ہے۔ ہم تو جہاں تک شریعت

نے آزادی دی سب کچھ کرتے ہیں اور عقل کے فتوے پر عمل نہ کرنے کی بدولت بڑے چین میں ہیں ؎

آزمودم عقل دور اندیش را   بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ۔

اگر لوگوں کی خواہشوں کا اتباع کیا جاتا تو تمام عالم میں فساد برپا ہو جاتا ـــــ،

عقل یہ بھی کہتی ہے کہ نکاح کوئی حقیقت واقعی نہیں ایک موجود اعتباری ہے۔ اسی طرح ملک بھی ایک ذرا سے الفاظ سے بدل جاتی ہے۔ عقل کے نزدیک ایسی چیز کا وجود نہیں۔ تو بس اب نہ کوئی کسی کی بیوی ہے نہ کوئی چیز کسی کی ملک۔ آپ میرے کپڑے چھین لیجئے اور میں اور کسی کے چھین لوں۔ عقل ان فسادات کو جائز رکھتی ہے مگر شریعت کہتی ہے کہ گو عقل اسے جائز رکھے مگر ہم اس اعتباری وجود کا بھی اعتبار کرتے ہیں اور ان افعال کو ناجائز کہتے ہیں۔

اسی طرح کی سینکڑوں مثالیں ہیں جن سے آپ سمجھ لیں گے کہ عقل کچھ زیادہ خیر خواہ نہیں بلکہ شریعت زیادہ خیر خواہ ہے کہ ہر چیز کا قانون مقرر کر دیا ہے۔ بہر حال یہ ثابت ہو گیا کہ انسان مہمل نہیں اور اس کو ہر ہر جزئی میں کچھ نہ کچھ خطاب ہے۔ آگے جزئیات کی دو قسمیں ہیں۔ بعض وہ ہیں جن کا حکم منصوص ہے اور بعض وہ ہیں کہ سکوت عنہ ہیں۔ اُن کے حکم معلوم کرنے کے لئے قیاس کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ فی نفسہ قیاس ضروری نہ تھا۔ صرف ضرورت کی وجہ سے اس کی اجازت ہوئی اور

احکام انشائیات میں تو قیاس کی اجازت ہوئی، واقعات اخبار میں چونکہ کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے اُن میں قیاس کی اجازت نہیں ہوئی۔

مثلاً ایک شخص نے چوری کی تو یہ واقعہ ہے۔ یہاں کونسی ضرورت ہے، قیاس کی کہ کسی دوسرے یقینی چور کے پاؤں، آنکھ، ناک، سر، قد، اور صورت دیکھ کر یہ اندازہ کیا جاوے کہ جتنے اس کے مشابہ ہوں گے سب چور ہوں گے۔ لہذا شہر بھر میں جتنے اس حلئے کے ہوں سب کو پکڑ لو کہ یہ چوری بھی ان لوگوں نے ہی کی ہے۔ سو ظاہر ہے کہ یہ بالکل بیہودہ بات ہے۔ غرض اخباریات میں قیاس نہ عقلاً صحیح ہے نہ نقلاً ماذون فیہ ہے۔

جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب میں کہتا ہوں کہ ایک انسان کی کسی حالت پر دوسرے انسان کی حالت کو قیاس کرنا بھی غلط ہوگا۔ اور ایک انسان کا دوسرے انسان پر قیاس کرنا تو کیا صحیح ہوتا خود ایک انسان کی ایک حالت کا دوسری حالت پر قیاس صحیح نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک شخص نے ایک مرتبہ چوری کی تو یہ کیا ضرور ہے کہ جب کہیں چوری ہوئی ہو اُسی نے کی ہو۔ اس واسطے ارشاد ہے۔

اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔ فَاجْتَنِبُوْا مِنَ الظَّنِّ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا۔

یہ اخباریات کے متعلق ہے اور انشائیات کے متعلق قیاس کرنے کا امر ہے چنانچہ ارشاد ہے فاعتبروا یا اولی الابصار ——— جب یہ سمجھ میں آگیا تو کسی شخص کو ایسے موقع پر فرمائش کرتا ہوا دیکھ کر دوسرے شخص کی نسبت یہ گمان کرنا کہ اس نے بھی فرمائش کی ہے محض فاسد ہے۔

فرمائش اور اطلاع کا فرق

چنانچہ میں واقعی کہتا ہوں کہ مجھ سے بالکل فرمائش نہیں کی گئی۔ گو کسی کو شبہ ہو کہ یتیم خانہ میں بیان ہے تو ضرور فرمائش ہوئی ہوگی کہ یتامیٰ کے حقوق بیان کئے جائیں۔ لیکن مجھ سے فرمائش نہیں ہوئی اور اگر ہوتی بھی تو میں قبول نہ کرتا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ مشورہ ایسے شخص کا ہوتا کہ جس کی نظر صرف محدود تمام مصالح پر ہوتی تو وہ فرمائش ایسی ہوتی کہ ایک مریض فرمائش کرے کہ حکیم جی دوا دو تولہ سے زائد نہ ہو۔ جو طبیب ہے وہ یہ جواب دے گا کہ بھائی پھر خود ہی نسخہ تجویز کر لو۔ اسی واسطے میں نے یہ معمول مقرر کر دیا ہے کہ وعظ میں کسی کی فرمائش پر عمل نہیں کرتا۔ گو اب بھی بعض ناواقف فرمائش کر دیتے ہیں لیکن میں کسی کا دل تو نہیں توڑتا ہاں عذر کر کے ٹال دیتا ہوں۔

اگر کوئی یہ شبہ کرنے لگے کہ غیب کی خبر تو خدا کو ہے۔ بدون اطلاع کے حالات کا علم کیوں کر ہو سکتا ہے اور وعظ میں وہاں کے حالات کا علم ضروری ہے میں کہتا ہوں کہ اوّل تو خدا کو خبر ہونی چاہیے سو اُن کو خبر ہے۔ وہ خود ہی دل میں ڈال دیں گے جس کی ضرورت ہے۔ ہم تو مشین ہیں جس کی کل انہیں کے ہاتھ میں ہے ؎

رشتہ در گردنم افگندہ دوست ... مے برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

ہم تو انہیں کے قبضہ میں ہیں۔ وہ جدھر چاہیں لے جائیں ؎

عشق من پیدا و معشوقم نہاں ... یار بیرون فتنہ او در جہاں

غرض فاعل تو وہ ہیں۔ ہمیں خبر نہیں تو نہ سہی، انہیں تو خبر ہے۔ اگر ان کو خبر

نہیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ گارڈ کو اور ڈرائیور کو تو خبر ہے ۔

می تراود خود بخود از لب سخن   آنچہ خواہی اے ضیاء الدین بکن

یہ تو مولانا کی طرف سے ضیاء الدین کو خطاب ہے۔ یہی خدا کو سب کی جانب سے ہو سکتا ہے ۔

چوں زمامِ عقلِ من در دستِ تست   ہر کجا خواہی بکش جان مستِ تست

بہر حال وہ خبر خدا کے قبضہ میں ہے۔ وہ خود بخود قلب میں ڈال دیتے ہیں اگر نیت میں ذرا خلوص ہو تو ادھر سے اعانت ہوتی ہے۔

دوسرے اطلاع اور چیز ہے اور فرمائش اور چیز۔ اطلاع کر دینے کا مضائقہ نہیں کہ یہاں کے یہ حالات ہیں۔ آگے رائے مصلح کی۔ جس طرح مریض طبیب کو حالات سے تو اطلاع دے دیتا ہے مگر فرمائش نہیں کرتا۔ چونکہ یہ مقامات پیش نظر ہیں اس لئے میں کسی کی فرمائش کو قطعاً قبول نہیں کرتا۔

ایک مرتبہ مجھ کو نواب ڈھاکہ نے بلایا۔ میں نے لکھا کہ اس شرط سے آ سکتا ہوں کہ مجھ سے کسی خاص بیان کی فرمائش نہ ہو۔ جو چاہوں گا اور جب چاہوں گا بیان کروں گا۔ چنانچہ انہوں نے اس شرط کو قبول کر لیا۔ تھے بڑے سلیم الطبع انہوں نے ایک دن بھی فرمائش نہیں کی۔ جو میرے جی میں آیا وہ میں نے بیان کیا۔ بعد میں معلوم ہوا جو میں نے بیان کیا ضرورت بھی انہیں مضامین کی تھی اور وہ چاہتے بھی وہی تھے۔

بہر حال خدا مضامین کا پیدا کرنے والا ہے۔ یہاں بھی نہ کسی نے فرمائش کی نہ میں منظور کرتا۔ اس واسطے کہ مریض اور طبیب کا سا قصہ ہے۔ طبیب کبھی مریض

کے مشورہ پر عمل نہیں کرتا لیکن اتفاق سے ضرورت ہی کسی ایسے مضمون کے بیان کرنے کی واقع ہو جاوے جس کے متعلق فرمائش کا شبہ ہو سکتا ہو۔ تو کیا اس شبہ کو مانع بیان قرار دیا جائے گا۔ سو اگر اتفاق سے یتیم خانہ میں بیان ہو اور ضرورت بھی خاص ہی مضمون کی ہو تو یتیم خانہ بوجہ مناسبت کے مرجح ہو گا نہ کہ مانع غرض اس مضمون کی ضرورت سبب و داعی سے قطع نظر کر کے ذہن میں آئی۔ نہ عمارت کی وجہ سے نہ کسی اور خصوصیت کی وجہ سے۔ اور اس سے پہلے اور کبھی یہ مضمون ذہن میں بھی نہیں آیا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے کیونکہ یتامیٰ کی طرف اُن کی بے کسی اور بے زبانی کی وجہ سے فطرۃً انجذاب ہوتا ہے اس لئے میں اس بیان کی بھی ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ اس سے بڑھ کر معاف کریں ہمدردانِ قوم اُن کے حالات اور واقعات معلوم ہونے کے بعد تو میں ذرا ایسے مضامین بیان کرتے ہوئے اس لئے بھی جھجکتا ہوں کہ کہیں بددیانتی کا میں بھی معین نہ ہو جاؤں، جو آج کل بکثرت ایسے یتیم خانوں اور انجمنوں کے کارکنوں میں پھیل رہی ہے۔ لیکن اس یتیم خانہ کو جو میں نے دیکھا، گو اجمالی ہی دیکھا تو دل نے گواہی دی کہ حالت اچھی ہے۔ اور اگر کوئی مخفی کوتاہی ہو تو مجھے علم نہیں اور نہ اس طور پر اگر اس میں بھی اس کوتاہی کی اعانت ہو جاوے تو مواخذہ بھی نہیں۔

چنانچہ سب سے اوّل یہاں مجھے جو چیز سب سے زیادہ پسند آئی وہ سادگی تھی۔ میں نے سب کو نہایت سادہ اور ضرورت کی حد پر پایا۔ اور جگہ کے یتیم خانے بھی میں نے دیکھے، وہاں یتیموں کی فوج کی طرح ایک وردی ہے۔ ایک دم سے سب کے سب آواز ملا کر السلام علیکم کی صدا بلند کرتے ہیں۔ جس طرح قحط کے

زمانہ میں اذانوں کا شور ہوتا ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ گلے ملا کر کہیں السلام علیکم۔!
یہاں آکر دیکھا تو بچوں کا لباس بھی سادہ تھا جیسا اپنے گھروں میں ہوتا ہے۔ اور
جگہ گو فوج کا سا لباس ہے جو ظاہراً باوقعت ہے مگر دونوں میں بڑا فرق ہے
فوج کا لباس اجنبی لوگوں کی طرف سے ہوتا ہے اور گھر کا سا لباس اپنے عزیزوں
کی طرف سے۔ تو معلوم ہوا اور جگہ یتامیٰ کے ساتھ غیروں کا سا برتاؤ ہوتا ہے
اور یہاں اپنے بچوں کا سا۔ میری یہی رائے ہے۔ اب چاہے کوئی یہی کہے کہ
ملا ہیں بد ذوق ہیں۔ کہا کرو ؎

معشوق من آنست کہ بہ نزدیک تو زشت است

بہرحال میرا خیال خواہ صحیح ہو خواہ غلط، دل کا شگفتہ اور مطمئن ہونا اس بیان
کے لئے محرک ہوا۔ اب غیب کی مجھے کیا خبر۔ اور مخفی کوتاہی کی اعانت سے بد
دیانتی کی اعانت نہ ہوگی۔ اور اس واقعہ سے بھی تحریک ہوئی کہ برخلاف گمان
سابق کے یتامیٰ کی طرف جیسی توجہ ہونی چاہیے ویسی ثابت نہیں ہوئی۔ پھر مشن والوں
کے یتیم خانوں کی تعداد معلوم کر کے بھی غیرت اور حرکت ہوئی۔ غرض ذہن میں اس
بیان کے لئے یہ مرجحات پیدا ہوئے۔

بہرحال بیان سے قبل یہ شبہ رفع کر دینا ضروری تھا کہ مجھ سے اس بیان کی
کسی نے فرمائش نہیں کی کیونکہ فرمائشی بیان مؤثر نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اپنے دل
سے نہ ہونے کی وجہ سے اس میں خلوص کی قوت نہیں ہوتی اور جو بیان بغیر فرمائش
کے ہوتا ہے وہ منجانب اللہ ذہن میں آتا ہے ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　　آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

بے فرمائش تو غیب کی زبان ہے اور متعارف فرمائش کے وقت عیب کی زبان ہوتی ہے۔ اس وجہ سے میں فرمائش کو یا اُس کی تعمیل کو پسند نہیں کرتا کیونکہ فرمائشی بیان اکثر غرض پر مبنی ہوتا ہے خواہ وہ غرض بھی ظاہراً نیک نیتی ہی سے ہو مگر پھر بھی فرمائش پر بیان کرنا دوسرے کی رائے کا اتباع ہے خود اُس فرمائشی بیان میں قوت نہیں ہوتی نیز سننے والوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ اپنی تحقیق سے نہیں کہتے بلکہ کہلوایا ہوا کہتے ہیں۔ اس لیے اس کے کہنے کا وہی اثر ہوگا جو سیکریٹری یا صاحب فرمائش کے کہنے کا ہوتا ہے۔ جب دونوں کے کہنے کا اثر یکساں ہوا تو پھر اُس کے بیان کی کیا ضرورت ٹھہری۔

میں یہ اس لیے بیان کئے دیتا ہوں کہ اہل علم کو بھی اور عوام کو بھی سبق ہو اور یہ فرمائش سے اور وہ فرمائشی بیان سے احتراز کریں کہ اس میں نہ اہل علم کے بیان کی وقعت اور قوت ہوتی ہے اور نہ عوام کو نفع ہوتا ہے۔ بہر حال ضرورت کی اطلاع کا تو مضائقہ نہیں مگر فرمائش نہ کرو۔ جس طرح مریض طبیب سے اپنی حالت کی اطلاع کر کے پھر اپنے کو سپرد کر دیتا ہے اسی طرح تم بھی کر دو۔

سپردم بتو مایۂ خویش را | تو دانی حساب کم و بیش را

افراط و تفریط کا اثر

حالت کی اطلاع اکثر جگہ تو مناسب اور بعض اوقات واجب ہے مگر اس میں بھی کہیں افراط ہے کہیں تفریط ہے۔ مثلاً پیر و مرید کے تعلق میں۔ اس باب میں تفریط ہے کہ مرید صاحب ضروری حالات سے اطلاع بھی نہیں کرتے سمجھتے ہیں کہ پیر صاحب کشف ہیں۔ اُن کی یہ حالت ہے سہ

چہ حاجت ست بہ پیشِ تو حالِ دل گفتن
کہ حالِ خستہ دلاں را تو خوب می دانی

یاد رکھو کہ اس کے خطاب کا اگر کوئی مستحق ہو سکتا ہے تو وہ ذات ہے حق جل و علیٰ شانہ کی۔ لیکن باوجود اس کے وہاں بھی یہ حکم ہے کہ ادعونی اگرچہ یہ دعا اظہار کے لئے نہیں کیونکہ وہ تو عالم الغیب ہیں محض اپنے افتقار کے لئے ہے۔ کیونکہ اگرچہ وہ جانتے ہیں مگر یہ بھی تو اپنا عجز اور محتاجی ظاہر کرے۔ اسی واسطے حدیث میں ہے الدعاء مخ للعبادۃ یعنے دعا مغز عبادت ہے۔ چنانچہ عبادت کے معنی لغت میں غایۃ التذلل کے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں ثوب معبد اے ثوب مذلل۔ پس عبادت غایت تذلل کا مغز ہے۔ تو بروئے حدیث وہ انتہا درجہ کا تذلل ہوا۔ اور واقعی دعا ایسی ہی چیز ہے کہ اس سے بڑے بڑے متکبروں کا تکبر مٹ جاتا ہے اور ان کا عجز افتقار ظاہر ہو جاتا ہے کیونکہ جب یہ خدا کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بھی محتاج ہے۔

ایک مرتبہ اکبر شاہ بہ سبیل شکار کہیں جنگل میں گئے۔ وہاں اتفاق سے راستہ بھول گئے۔ پیاس بہت شدت کی لگی۔ ایک دیہاتی کے گھر گئے۔ اس نے انہیں دودھ پلایا، خاطر کی۔ جب یہ وہاں سے چلنے لگے اس وقت اپنا بادشاہ ہونا ظاہر کیا اور اس سے کہا کہ تم ہمارے دربار میں آنا۔ یہاں آکر اس گنوار کا حلیہ بتا کے حکم دے دیا کہ جب یہ آئے اسے ہمارے پاس پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ ایک بار کسی حاجت کے پیش آنے کے وقت یہ گیا اور بادشاہ کے پاس پہنچا دیا گیا اس نے بادشاہ کو دیکھا کہ نماز سے فارغ ہو کر دعا مانگ رہے ہیں۔ جب فارغ

ہوئے تو اُن کی طرف متوجہ ہوگئے۔ پوچھا کس ضرورت سے آئے؟ اُس نے کہا آیا تو تھا مانگنے ہی کے لیے مگر یہاں آکر دیکھا کہ تم خود ہی مانگ رہے ہو تو پھر تم سے کیا مانگوں۔ اُسی سے نہ مانگوں جس سے تم مانگتے ہو۔ کیا وہ تمہیں بہت دے گا تو مجھے تھوڑا بھی نہ دے گا۔ مجھے کیا ضرورت کہ تمہارا احسان لوں۔

کس قدر عقیل تھا۔ سادگیٔ فطرت پر قائم تھا۔ مصلحت بینی اور رائے کی آمیزش اُس کے خیالات میں نہ ہوئی تھی۔ اُس نے دُعا کی ہیئیت سے اُس کی حقیقت سمجھ لی تو دعا سے بندہ کا تذلل اور عجز ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے خدائے تعالےٰ کے عالم الغیب ہوتے ہوئے بھی اُس سے مانگا جاتا ہے۔ اب غور کرو کہ درحقیقت جس کی شان میں ع

که حالِ خستہ دلاں را تو خوب می دانی

کہا جا سکتا ہے وہاں بھی اپنا حال کہا جاتا ہے تو پھر پیر کی کیا حقیقت کہ وہاں حاجت عرض نہ ہو۔ پھر پیر میں کشف بھی تو ضروری نہیں اور اگر ہو بھی تو دائم نہیں اور اگر دائم بھی ہو تو بغیر تمہاری توجہ کے آخر وہ کیوں التفات کریں۔ اور حال نہ لکھنے سے ضرور استغنا کا شبہ ہوتا ہے۔ ایک محتاج دروازہ پر آئے گو اُس کی ظاہری حالت اُس کی احتیاج کو ظاہر کر رہی ہو مگر تاوقتیکہ وہ زبان سے نہ کہے اُس کی حاجت روائی نہیں ہوتی۔ الغرض کہنا ضروری ہے —— یہ تو اطلاع میں تفریط تھی۔

اور کہیں افراط ہوتا ہے کہ اطلاع کے بعد فرمائش بھی کر دیتے ہیں۔ ایک صاحب کا خط آیا کہ حبس دم کا عمل بتا دو اور اُس کی اجازت دے دو۔ میں نے

لکھا کہ میری اجازت کی کیا ضرورت۔ جب آپ نے خود ہی تجویز کر لیا تو آپ خود ہی شیخ ہیں۔ حکیم صاحب کے پاس آئیے خمیرہ بنفشہ تجویز کر دیجیئے۔ جب خمیرہ بنفشہ خود ہی تجویز کر لیا تو حکیم صاحب کے پاس جھک مارنے کو کیوں آتے ہیں۔ انجمنوں میں عموماً یہی افراط اطلاع کی رسم ہو رہی ہے کہ علماء پر مضامین کی فرمائش ہوتی ہے جس سے زیادہ مقصود اپنی انجمن کی اظہارِ شان ہے کہ اُس میں ایسے ایسے مضامین پر بحث ہوئی۔ اور اسی اظہارِ شان کے لیے ایسا ہوتا ہے کہ اگر ضرورت دو کی ہوتی ہے تو دس بیس کو بلاتے ہیں۔ اس سے بھی محض شان و شوکت مقصود ہوتی ہے تبلیغ مقصود نہیں۔ خوب سمجھ لیجیے کہ دین میں بڑی چیز خلوص ہے نہ کہ افتخار اور اظہار۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اکثر کارناموں میں برکت نہیں۔

سلف کا طرز یہ تھا کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بیت المقدس کے نصاریٰ کے سامنے پیش کرنے کے لئے لے گئے۔ آپ پھٹے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ عرض کیا گیا کہ لباس بدل لیجیے تاکہ کفار کی نظر میں عزت ہو، فرمایا نحن قوم اعزنا اللّٰہ بالاسلام۔ ہم وہ قوم ہیں کہ خدا نے ہمیں اسلام سے عزت دی، لباس سے نہیں دی۔ جب بیت المقدس کے قریب پہنچے تو پھر سب نے اصرار کیا کہ جوڑا اور سواری بدل لیجیے۔ آپ نے مسلمانوں کا دل توڑنا گوارا نہ کیا اور منظور فرما لیا۔ ایک مانگے کا گھوڑا اور مانگے کا جوڑا لایا گیا —— یہ امیر المومنین ہیں، یہ مسلمانوں کے بادشاہ ہیں جن کے پاس ایک اچھا جوڑا بھی نہ نکلا۔ اللہ اکبر! کیا سادگی تھی —— خیر گھوڑے پر سوار ہو کر دو قدم چلے ہوں گے کہ گھوڑا اسختر اور ناز سے مچل مچل کے چلنے لگا۔ آپ اُس سے رو گئے کہ فوراً اتر پڑے اور

فرمایا تمہارا بھائی عمر ہلاک ہو گیا ہوتا کیونکہ گھوڑے پر بیٹھ کر وہ دل ہی نہیں رہا چنانچہ پھر اپنی پہلی ہی سادہ حالت میں پیش کئے گئے۔ نصاریٰ نے جب آپ کو دیکھا فوراً دروازہ کھول دیا۔

اللہ اکبر! یہ تھی خلوص اور سادگی کی برکت مسلمانوں کو اُس حالت سے جھینپ نہ ہونی چاہیئے اور انہیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ اپنی سادہ حالت میں اس کا نمونہ ہیں ؎

مبیں حقیر گدایانِ عشق را کیں قوم — کہ شہانِ بے کمر و خسرواں بے کلہ اند

اور اُن کی یہ حالت ہے ؎

گدائے میکدہ ام لیگ وقتِ مستی بین
کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

بہرحال مسلمان کی شکستگی کسی حالت میں بھی مضر نہیں۔ یہ شکستگی انار کی سی شکستگی ہے اور شکستہ انار اُس وقت شرمندہ ہوتا ہے جب کہ اُس کے اندر دانے خراب ہوں ورنہ مسلمان کی شکستگی میں تو یہ شان ہے ؎

جملہ دانایاں ہمیں گفتہ ہمیں — ہست دانا رحمۃ اللعلمین
گر انارے می خری خنداں بخر — تا دہد خندہ اش ز دانہ او خبر

اور اگر اندر عیب ہے تو اُس کی شکستگی کا یہ رنگ ہوگا ؎

نامبارک خندہ آں لالہ بود — کہ ز خندہ او سواد دل نمود

یعنی نامبارک خندہ لالہ کا تھا کہ جب تک منہ بند تو لال لال اور خوش نما تھا جب منہ کھلا تو اندر سے کالے کالے ریشے نکل آئے۔ اسی طرح ایسا شخص اپنی

شکستگی کو چھپائے گا اور بنے گا جس میں حقیقت نہیں ہے ؎

زعشق ناتمام ما جمالِ یار مستغنی ست
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

صحابہ کے طرز کو دیکھئے۔ مدینہ کی سادی مسجد میں ٹوٹے ہوئے بوریوں پر بیٹھے ہیں اور حوصلہ اس قدر بلند ہے کہ سلطنت روم و فارس کی (جو دنیا کی عظیم الشان سلطنتیں تھیں) قسمت کے فیصلہ کا مشورہ کر رہے ہیں اور سب خوفزدہ تک رہے ہیں کہ دیکھئے یہ بوریہ نشین ہماری قسمت کا کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ سارا جہاں منتظر ہے کہ یہ پھٹے کپڑے پہننے والے کیا کریں گے۔ حضرت یہ نمونہ تھا کام کرنے والوں کا۔ یہ فیشن، یہ وضع اور یہ شان و شوکت ان حضرات میں کہاں تھی ؎

عاقبت ساز و ترا از دیں بری   ایں تن آرائی و ایں تن پروری

قدرتی حسن

اگر واقعی کوئی کام کرنا ہے تو کسی چیز میں شان و شوکت کا خیال مت کرو رمضان میں بعضے لوگ مسجد کو تماشا گاہ بنا دیتے ہیں جس کی کراہت حدیث شریف میں ہے۔

لَتُزَخْرِفُنَّ الْمَسَاجِدَ كَمَا زَخْرَفَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارٰى۔

مگر سنوارنا اور بات ہے اور استحکام اور بات ہے۔ سو فقہاء نے لکھا ہے کہ استحکام جتنا چاہو کرلو۔ حقیقت میں فقہا اور صوفیا ہی حکمائے امت ہیں صوفیا فرماتے ہیں کہ ذاکر کا حجرہ اتنا تنگ ہو کہ پاؤں نہ پھیلا سکے اور اس میں کسی قسم کا سامانِ آرائش وغیرہ نہ ہو تاکہ عبادت کے وقت قلب کو مشغولی نہ ہو

دیکھیے! صوفیۂ کرام حجرہ میں ضروری سامان کی بھی اجازت نہیں دیتے تو اُن کے نزدیک غیر ضروری سامان سے مسجد کو سنوارنا کب درست ہوگا مگر اس وقت عام طور پر مسجد کو آراستہ کیا جاتا ہے۔ مجالس اسلامیہ کو آرائش و زیبائش سے بالکل کھٹیسٹر بنا دیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ غیر قوموں کے مقابلہ میں ہم کو ان سے پیچھے نہیں رہنا چاہیئے۔

اے حضرات غیر قومیں کہ جن کے سامنے آپ یہ ظاہر کر رہے ہیں آپ اُن کا مقابلہ اس میں نہیں کر سکتے۔ اُن کے برابر دولت آپ کے پاس کہاں ہے اگر وہ بھی ضد باندھ لیں تو یقیناً آپ اُن کے مقابلہ میں شرمندہ ہوں گے۔ اس لئے آپ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی پیروی کیجئے اور کفار کا یہ نفسانی مقابلہ چھوڑ دیئے۔ بس ایک سچے مسلمان کی شان یہ یہ ہونی چاہیئے ؎

دلفریبان نباتی ہمہ زیور بستند　　　دلبر ماست کہ با حُسن خداداد آمد

ہندو اپنی زینتیں دکھلائیں، نصاریٰ اپنی زینتیں دکھلائیں، اہنود اپنی زینتیں دکھلائیں اور ایک مسلمان پھٹا ہوا کُرتا پہن کر نکلے گا تو خدا کی قسم سب کی رونقوں کو مات کر دے گا۔ ارے صاحب! خدا نے وہ حُسن آپ کو دیا ہے کہ آپ کو زینت کی حاجت ہی نہیں۔ اے حسین! تجھے خدا نے وہ حُسن دیا ہے کہ تیرے حُسن کے آگے آفتاب و ماہتاب شرماتے ہیں۔ ارے تو پوڈر مل کے کاہے کو اپنے قدرتی حُسن کو پوشیدہ کرتا ہے۔ تجھے اپنے حُسن کی خبر نہیں۔ یہ عارضی حُسن تیرے اصلی حُسن کو پوشیدہ کئے دیتا ہے۔ متنبی کہتا ہے ؎

حسن الحضارة مجلوب بتطرية   وفی البداوۃ حسن غیر مجلوب

یعنی شہری عورتوں کا حسن تو بناؤ سنگار سے ہے اور دیہاتی عورتوں کا حسن خداداد ہے۔ واقعی ایک دیہاتی عورت اگر حسین ہو تو بوجہ اس کے کہ اُس کے قویٰ بھی اچھے ہوتے ہیں اور محنت کی عادت کی وجہ سے صحت عمدہ اور جسم توانا ہوتا ہے۔ ایک شہر کی حسین عورت سے جو بیسیوں تکلفات سے اپنے حُسن کو بڑھا لیتی ہے بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔

ارے صاحب! مجلس اسلامی کے لئے یہ حُسن اور یہ شرف کیا کم ہے کہ وہ اسلام کی طرف حقیقی نسبت سے منسوب ہے (تم نے اسلامی مجلس منعقد کی۔ اُس کو شہنشاہ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار ٹھہرا دیا اور اُس کو اتنا بھی آراستہ نہ کر سکے جتنا دلی دربار یا سلاطین یورپ کے دربار یا یورپ کے بڑے بڑے تھیٹر، تو تم نے گویا ایک نقل کی اور کوّے کی طرح ہنس کے مقابلہ میں شرمندہ اور ذلیل ہوئے) ارے صاحب! مجلس اسلامی ایسی ہو کہ دور سے دیکھ کر خبر ہو جاوے کہ یہ مجلس اسلامی ہے۔ یہ کسی ناچ رنگ کی محفل یا تھیٹر یا سرکس کا اسٹیج نہیں ہے۔ باہر سے مجلس اسلامی بالکل سادہ ہو اندر پہنچو تو صحابہ کا رنگ جھلکتا ہو۔ یہ نہ ہو کہ بازاری عورتوں کی طرح گلے میں پھولوں کے ہار پڑے ہوں، لباس نہایت پُر تکلف اور ایک ایک چیز اور ہر ہر ادا سے روساء کا سا تکبر نمایاں ہو اور حقیقت کا پتہ نہیں۔ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ زیب و زینت وہ شخص کرتا ہے جس کے پاس مال ہے کمال نہیں ہے ورنہ یہ بجائے مال کے اپنے کمال کا اظہار کرتا اور اب کمال نہ ہونے سے مال کا اظہار کر رہا ہے۔

مولانا رومیؒ نے ایک مقام پر ارشاد فرمایا ہے کہ گنجا آدمی اپنے سر کا عیب چھپانے کے لئے خوبصورت ٹوپی کا اہتمام کرتا ہے اور جس کا سر اور بال درست ہوں وہ تو یہ چاہے گا کہ ٹوپی ہی نہ ہو تو بہتر تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ کیسی خوبصورت مانگ اور کتنے اچھے بال ہیں۔ حضرت ہیں تقسیم کہتا ہوں کہ اگر قلب میں حقیقت ہے تو ظاہری آرائش سے نفرت ہو گی۔ اور اگر حقیقت سے کورے ہیں تو ظاہری شان و شوکت سے اس کی لیپ پوت کریں گے۔ مجالس اسلامیہ میں کیسا بناؤ، اسلام کی طرح مجالس اسلامی میں بھی سادگی ہونی چاہئے۔ غرض انجمنوں میں بہت سے واعظین کا جمع کرنا یہ سب اسی افتخار و نمود و اظہار کے لئے ہوتا ہے۔

اس میں ایک غرض اور بھی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ کوئی کسی واعظ کو پسند کرتا ہے کوئی کسی کو۔ سب کو جمع کر لو تاکہ ہر مذاق کے لوگ جمع ہوں اور جلسہ میں خوب رونق ہو۔ میں کہتا ہوں اگر آپ صحیح غرض کے لئے جلسہ کر رہے ہیں تو آپ کو لوگوں کے اس مذاق کے رعایت کی کیا ضرورت۔ اگر کوئی روپیہ تقسیم کر رہا ہے تو سائل خود بخود جمع ہوں گے۔ اس اشتہار کی کیا ضرورت ہے کہ جو سائل روپیہ لینے آئے گا اُسے مٹھائی بھی ملے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ روپے جعلی ہیں۔ اگر سودا کھرا ہے تو بغیر قافیہ اور سجع ملائے بک جائے گا ورنہ مقفیٰ اور مسجع عبارت بولنا پڑے گی۔ حضرت اپنا متاع خالص رکھیے۔ دیکھیے خود بخود خریدار آئیں گے۔

اسی طرح حق ایسی چیز نہیں کہ اس کی طرف کشش نہ ہو۔ اہل حق اور ملمع سازوں کے کلام میں بھی فرق ہے کہ ملمع سازوں کی آمد بڑی رنگین ہوتی ہے اور اس میں بڑا زور شور ہوتا ہے مگر حاصل سوائے قافیہ بندی کے کچھ نہیں ہوتا اور اہل حق کے کلام

میں ابتداءً تو بہت دھیمی ہوتی ہے مگر انتہا میں اُس کے زور اور قوت اور خاص اثر ہوتا ہے۔ ابتداءً اُن کی ہلکی بارش کی طرح آہستہ آہستہ ہوتی ہے جو کہ قلب میں آہستہ آہستہ ایسی بارش کی طرح جذب ہوتی جاتی ہے مگر اس کا انتہائی اثر گلزار اور گلنار ہوتا ہے۔ بقول مولاناؒ

در بہاراں کے شود سر سبز سنگ   خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

اور ملمع ساز اپنا رنگ جمانے کے لئے ابتداء میں خوب مثنوی کے اشعار پڑھتے ہیں اور کہیں کہیں اب تو ڈھولک، ستار اور ہارمونیم سے بھی مجلس وعظ کو گرم کیا جاتا ہے مضامین کے الفاظ بھی دلگداز ہوتے ہیں کہ اُس وقت تو ذرا سا جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر جہاں مجلس برخاست ہوئی اثر بھی تشریف لے گیا اور جو ذرا سا باقی رہ گیا وہ دو چار روز کا مہمان ہوتا ہے اور اہل حق کے کلام کا اثر پائیدار ہوتا ہے مگر کلام اُن کا رنگین نہیں ہوتا۔

پس ان دونوں میں ایسا فرق ہے جیسا ایک چمکدار گلٹ کے چھیچہ اور زنگ آلود روپیہ میں ہے۔ روپیہ کا زنگ اگر نہ بھی چھڑا وہ تب بھی سولہ ہی آنے کو چلتا ہے اور گلٹ کے چھیچہ پر اگر گلٹ بھی چڑھا ہے پھر بھی اُسے کوئی نہیں پوچھتا اور اگر وہ بھی اُتر جاوے تو پھر تو وہ کچھ بھی نہیں۔ غرض روپے کو سفیدی اور چمک کی حاجت نہیں اور وہ جو گلٹ کا چھیچہ اپنے سفید ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے اور انتہا پر روپے سے بھی زیادہ چمک دار ہے اُس کی سفیدی اور چمک تھوڑے دنوں کی ہے کہ اس کے بعد وہ دو کوڑی کا بھی نہ رہے گا۔

نقد صوفی نہ ہمہ صافی بیغش باشد   اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

سب کسوٹی آئے گی تو روپیہ تو سامنے آ کھڑا ہوگا اور گلٹ کا پیچھے منہ چھپاتا پھرے گا۔

نباشد اہل باطن در پے آرائش ظاہر
بہ نقاش احتیاجے نیست دیوار گلستاں را

سادہ زندگی

یہی وجہ ہے کہ جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کی نہایت سادہ زندگی تھی۔ آپ میں تکلف اور ظاہری وضع میں کوئی شان و شوکت نہ تھی۔ کیونکہ آپ سچے تھے۔ باوجودیکہ آپ اعلیٰ درجہ کے باوقار اور انتہا درجہ کے متین تھے۔ مگر ساتھ ہی اس کے نہایت بے تکلف تھے۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضؓ سے جو نو برس کی عمر میں بیاہ کر آ گئی تھیں اُن کی دل جوئی کے لئے فرمایا کہ آؤ مسابقت کریں (یعنی دوڑیں) دیکھیں کون آگے نکل جاتا ہے۔ آپ کا سن شریف بھی زیادہ تھا اور جسم مبارک بھی بہ نسبت اُن کے بھاری تھا۔ حضرت عائشہ رضؓ ایک تو کمسن لڑکی دوسرے پھریرا بدن۔ وہ آپ سے آگے نکل گئیں۔ ایک مرتبہ پھر کئی سال کے بعد آپ نے فرمایا کہ آؤ مسابقت کریں۔ اس مرتبہ حضرت عائشہ رضؓ پیچھے رہ گئیں کیونکہ عورتوں کا بدن مردوں کے مقابلہ میں بہت جلد تھک جاتا ہے اور اس سے جسم میں سستی پیدا ہو جاتی ہے (آج کل لوگ دونوں میں مساوات چاہتے ہیں۔ انہیں چاہئے کہ پہلے اللہ میاں سے درخواست کریں کہ اس تفاوت کو موقوف کریں پھر مساوات کی تحریک کریں) غرض حضرت عائشہ رضؓ میں بچپن کی سی چستی نہ رہی تھی اور آپ اس وقت بھی ویسے ہی تھے جیسے پہلے مسابقت میں تھے۔ اس لئے اس مرتبہ آپ آگے

نکل گئے اور حضرت عائشہ رضؓ کی شرمندگی رفع کرنے کے لئے فرمایا تلک بتلک یہ آگے نکلنا اس وقت کے تمہارے آگے نکلنے کے بدلے ہے یعنی ہم تم دونوں برابر ہو گئے۔

آج کل کے وقار میں اور کبر میں کچھ بھی فرق نہیں رہا۔ چنانچہ آج کل مدعیانِ وقار کبھی ایسا نہ کریں گے۔ حالانکہ یہ وقار کے منافی نہیں البتہ کبر کے مناقض ضرور ہے کہ شان کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

ایک مولوی صاحب سے میں نے یہی واقعہ بیان کیا جو اپنے وقار کا بہت لحاظ رکھتے تھے اور میری نسبت ان کا شبہ تھا۔ کہتے تھے کہ یہ خفیف الحرکات ہیں جو اپنے گھر کے اسرار مجمع میں بیان کر دیتے ہیں۔ میں نے کہا، بتایئے آپ کا وقار بڑا ہے یا حضورؐ کا۔ کہا حضورؐ کا۔ میں نے پوچھا آپ بھی کبھی اپنی بیوی کے ساتھ دوڑے ہیں؟ کہنے لگے نہیں۔ میں نے کہا، تو پھر یہ وقار نہیں تکبر ہے۔ اگر آپ گھر کے اسرار بیان کریں تو بیش بریں نیست کہ کوئی آپ کا معتقد نہ رہے گا۔ نہ رہے گا نہ رہے۔ ایسے شخص کو سُن لینا چاہیے ؎

ہاں وہ نہیں وفا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

تم کسی کو بلاتے ہی کیوں ہو، صاف کہہ دو ؎

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو
دار و گیر و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

تو آپ کی سادہ زندگی اس لئے تھی کہ آپ سچے تھے اور جتنا کوئی سچا ہوگا

اسی قدر اس میں سادگی ہو گی۔ نہ چلنے میں بناوٹ، نہ اُٹھنے میں نہ بیٹھنے میں بناوٹ بلکہ اُسے برتتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ ہمارے آقا کے اور اسلام کے طرز کے یہ بالکل خلاف ہے۔ آج کل بناوٹ کی اس قدر شدت ہے کہ وعظ تک میں بناوٹ زبردستی مضمون نہیں آتا تو اُسے بناتے ہیں۔ مقصود تو ہے شعر پڑھنا اُس کے لئے اِدھر اُدھر سے مضمون کو گھیر گھار بس جھٹ سے شعر پڑھ دیا۔ بھلا زبردستی شعر کے لئے اس تکلیف کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سب چھچھوراپن ہے کہ ایک آدھا شعر یاد ہے تو اُسے ظاہر کیسے کریں خواہ بے موقع ہی پڑھ دیں۔

جیسے ایک حکایت ہے کہ ایک شخص تھے۔ کچھ پڑھے لکھے تو تھے نہیں اپنی جہالت چھپانے کے لئے سنے ہوئے الفاظ بہت بولا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اُنہوں نے ایک شخص کو کسی کے بیٹے کی تعزیت میں نعم البدل کا لفظ بولتے سنا جھٹ اُسے یاد کر لیا اور اپنے دل میں کہنے لگے کہ خدا کرے اور کوئی مرے تو میں اُس لفظ کو بولوں۔ اتفاق سے محلہ میں کسی کے باپ مر گئے۔ اب کیا تھا آپ تو اُس موقع کے منتظر ہی تھے جھٹ پہنچے اور تعزیت ادا کرنے لگے کہ آپ کے والد کے انتقال کا بہت صدمہ ہوا۔ خدا آپ کو صبر دے اور اس کا نعم البدل عطا فرما دے۔ وہ جھلا اٹھا کہ چل دور ہو یہاں سے۔ تو تو میری ماں کو خصم کراتا ہوا آیا۔

اسی طرح ایک اور صاحب تھے، جو سماعی الفاظ کے بڑے شوقین تھے اُنہوں نے رخصت ہوتے وقت کسی کو یہ کہتے سن لیا کہ مرخص ہوتا ہوں۔ بس اُسے یاد کر لیا اور ٹھان لی کہ چلتے وقت میں بھی یہی الفاظ استعمال کیا کروں گا۔ چنانچہ جب

نہ ہوا اور قصداً ایک امیر کی مجلس میں محض یہی لفظ استعمال کرنے کے لئے گئے تھوڑی دیر بیٹھ کر اٹھے۔ اب اصل لفظ یاد نہ رہا۔ بجائے اس کے کہنے لگے، میں بھی مخنث ہوتا ہوں۔ وہ امیر کہنے لگے۔ بسم اللہ! آپ کی ہیز ہے آپ کو اختیار ہے۔ رکھیئے یا نہ رکھیئے۔ اس جواب پر بہت حیران ہوئے۔ باہر آ کر لوگوں سے پوچھا تو اپنی غلطی معلوم ہوئی۔

یہی حال ان شعر ٹھونسنے والے واعظین کا ہے۔ حضرت کیا اسلام کا یہی طریقہ ہے۔ کیا تبلیغ اسی بناوٹ کے طرز سے ہوتی ہے۔ موقع پر کوئی شعر یاد آ گیا پڑھ دیا نہیں آیا جانے دو۔ یاد آ گیا تو ایک وعظ میں دو سو شعر ہیں نہیں یاد آیا تو ایک بھی نہیں ہے۔ غرض تصنع کا بڑا زور ہے جس میں سے کئی کئی واعظین کا جمع کرنا بھی ہے۔ پھر واعظین بھی کیسے کہ علم سے بالکل بے بہرہ۔ دو چار مضمون اردو کے رسالوں سے یاد کر لئے اور بس مولانا بن گئے۔ یہ مولانا معنی سیدنا نہیں بلکہ غلامنا کیونکہ مولا کے معنے سید کے بھی ہیں اور غلام کے بھی ہیں۔ سید تو جب ہوتے کہ جب اہل علم ہوتے اور اب تو نرے غلام ہیں کہ جس کی مرضی دیکھی ویسا ہی اسے سنا دیا۔ حضرت نرے وعظ کہنے سے آدمی اہل علم نہیں ہو جاتا ؎

نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

بلکہ ان دونوں کے لئے یہ شرط ہے کہ ؎

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامی

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

ہزاروں دھوپیں اٹھ کر دماغ میں پہنچیں تب کہیں طالب علم بنتا ہے۔

پُر تکلف زندگی

آج کل جس طرح ہر کام کی مشینیں ایجاد ہو گئیں ہیں اور ان سے ہر کام سہل اور ارزاں ہو گیا ہے اسی طرح مولویت کی بھی مشین بن گئی ہے۔ پہلے دو پیسہ میں شاہ صاحب تو بن جاتے تھے کہ ایک پیسہ کے گیرو میں کپڑے رنگ لئے۔ ایک پیسہ کی مٹی کے دانوں کی تسبیح خرید لی بس شاہ صاحب بن گئے لیکن مولوی بننا مشکل تھا مگر اب تو کتب خانے جا بجا ناول و اخبار بینی کے لئے قائم ہیں۔ قوم کا روپیہ مفت برباد ہو رہا ہے۔ جس کا جی چاہا آیا اور اخبار اور دو چار ناول دیکھے اس کے کچھ الفاظ اور تقریریں یاد کر لیں اور مولانا صاحب بن گئے۔ اخبار اور ناول مولویت کی مشین ہیں۔ اُن سے بلا کسی مشقت اور صرف کے مولوی تیار ہو جاتے ہیں۔ اور ایسے ہی مولوی اکثر مجالس اسلامیہ کی رونق کے لئے جمع کئے جاتے ہیں اور وہ اپنی جہالت اور لالچ کی وجہ سے آپ کی بدعات کی تائید کر جاتے ہیں اب اگر کوئی محقق منع کرتا ہے تو اُس کی سادگی کی وجہ سے اُس کا کہنا نہیں سنتے سنو یا نہ سنو اُس کا تو مذہب یہ ہے ؎

کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے می کنم

(اور اُس کا عمل اس پر ہے ؎

حافظ وظیفۂ تو دُعا گفتن است وبس

در بند آں مباش کہ نشنید یا شنید!)

کیمیا گر کا کبھی دل بُرا نہیں ہوتا۔ اگر کوئی اُس کی کیمیا سازی سے انکار کر دے اور ملمع ساز کا دل بُرا ہوتا ہے کیونکہ اُس کی روزی میں خلل پڑتا ہے۔ بہر حال

اتنے تکلفات کی کیا ضرورت ہے کہ بہت سے واعظوں کو جمع کیا جاوے اور اس میں اہل و نااہل کا امتیاز بھی نہ رکھا جاوے۔ خصوص جب کہ خاص معراج یا میلاد کے جلسے کئے جائیں اور ان میں علماء سے فرمائش کی جاوے کہ وہ عوام کے مجوزہ مضامین کی پابندی کریں۔ اللہ اکبر! علماء کو مشورہ دیں عوام الناس ایک مریض کے ابا جان طبیب سے فرمائش کر رہے ہیں کہ خمیرہ گاؤزبان کا نسخہ تجویز فرما دیجئے تو ابا جان آپ خود ہی علاج کیوں نہیں کر لیتے۔ علماء کی کیا ضرورت معراج اور میلاد کا بیان تو بہت کتابوں میں موجود ہے۔ آپ خود ہی کتاب ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو کر پڑھ دیجئے بلکہ یہ تو اور اچھا ہو گا کیونکہ اتنی روائتیں زبانی تو کسی کو یاد بھی نہ ہوں گی۔

بہر حال علماء سے فرمائش کرنا بہت ہی بے ادبی کی بات ہے۔ انہیں تو آزاد چھوڑ دو اور یہ کہہ دو کہ جو مرض ہوائی کے متعلق بیان کیجئے۔ مگر ایسا اس لئے نہیں کرتے کہ ایک تو رنگ مجلس کے خلاف ہوتا ہے۔ دوسرے یہ بھی غرض ہوتی ہے کہ ہمارے امراض بیان نہ کریں کیونکہ ایسے جلسوں میں مختلف مذاق کے لوگ جمع ہوتے ہیں ممکن ہے کسی کے خلاف گذرے اور ناگوار ہو۔ مثلاً اگر میں یہ کہوں کہ سود لینا حرام ہے، رشوت لینا حرام ہے، ترک نماز پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کافر تک فرمایا ہے۔ تو کہیں سود خوار خفا ہو جائیں گے اور کہیں رشوت خوار ناراض ہو جائیں گے اور کہیں بے نمازی بگڑ جائیں گے اور اس سے مجلس میں سناٹا ہو جائے گا۔ اور اکثر ایسے عام جلسوں میں علماء تو ہوتے نہیں اکثر فیس والے جمع ہوتے ہیں۔ ان سے جو فرمائش کر دے وہ چار و ناچار اسے

پورا کرتے ہیں۔

حالت ان لوگوں کی یہ ہے کہ سیکنڈ کلاس میں تو سفر کر کے آتے ہیں تاروں میں بات چیت کرتے ہیں، خس کی ٹٹیوں میں قیام کرتے ہیں۔ ہم نے خود دیکھا ہے کہ اٹاوہ کے جلسے میں ایسے ہی ایک صاحب مع اپنی فوج کے تشریف لائے تھے۔ صرف چونسٹھ روپیہ اُن کے ریل کے کرایہ میں صرف ہوئے تھے رات کو ایک کمرہ میں لیٹے۔ خس کی ٹٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں برآمدے میں لیٹا برسات کی گرمی، برآمدہ میں تو ہوا آتی تھی مگر کمرہ میں رات کو اور بھی حبس تھا وہ بڑے آدمی تھے اس لئے انہوں نے ہم عوام کے ساتھ برآمدے میں لیٹنا اپنی شان کے خلاف سمجھا مگر وہاں مارے گرمی کے نیند نہ آئی۔ اب آپ نے داعی سے فرمائش کی کہ دو آدمی مقرر کرو جو رات بھر پنکھا کھینچیں۔ چنانچہ آدمی مقرر کئے گئے۔ اب جو سوئے تو صبح کو آٹھ بجے بستر استراحت سے اٹھے صبح کی نماز بھی غائب کر دی۔ منہ ہاتھ دھو کر عبا و قبا سے آراستہ ہو کر مولانا بن کے پھر سب میں آ بیٹھے ——— یہ ہیں صاحب مولانا!

خطاب تو بڑے بڑے ملے جوڑے مل جاتے ہیں۔ کوئی شمس العلما ہے کوئی بدر العلماء ہے۔ میں کہتا ہوں کہ شمس العلماء تو ہیں مگر شمس مخسوف یعنی آفتاب تو ہیں مگر گہنائے ہوئے آفتاب ہیں۔ جن میں نور بالکل نہیں۔ اگر یہی مقتدائے قوم ہوں گے تو انجام یہ ہوگا ؎

اِذَا کَانَ الْغُرَابُ دَلِیْلَ قَوْمٍ ۔۔۔ سَیَھْدِیْھِمْ طَرِیْقَ الْھَالِکِیْنَا

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملّا ۔۔۔ کارِ طفلاں خراب خواہد شد

بہر حال آج کل کے علماء کے یہ حالات ہیں۔ میں زیادہ کہتے ہوئے شرماتا ہوں۔ کیونکہ اول تو میں خود اسی گروہ میں شریک سمجھا جاتا ہوں۔ دوسرے شبہ ہوتا ہے کہ شاید اس کا منشاء وہ مثل ہو کہ سلہاری کو دیکھ کر سلہاری کلسے سوت سوت پر رشک کرتی ہے۔ مگر خیر آپ انہیں مخلص اور مجھے خود غرض سمجھئے اظہار حق کی ضرورت تھی وہ پوری ہو گئی۔ خواہ مجھے کچھ بھی سمجھئے۔ بہر حال علماء سے فرمائش کرنا بھی بے تمیزی ہے اور ان کو فرمائش کے تابع ہونا بھی نامناسب ہے۔ اگر کوئی اسلامی مجلس کیجئے تو علماء کو بلائیے، فیس لینے والوں کو نہ بلائیے

مگر اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کیوں کر پہچانیں؟

اس کی سہل ترکیب یہ ہے کہ مقامی علماء سے انتخاب کرائیے۔ ولی را ولی می شناسد۔ اسی طرح عالم کو عالم ہی خوب پہچانتا ہے۔ اب اگر علماء ہی انتخاب میں گڑبڑ کریں تو وہ ذمہ دار ہوں گے۔ اگر وہ بد دیانتی کریں گے تو خدا کے یہاں انہیں کی گردن پہ ہے گی۔ مگر افسوس ایسا نہیں کیا جاتا۔ خود عوام ہی جو سمجھ میں آتا ہے وہی کرتے ہیں۔

بہر حال اس پر گفتگو شروع ہوئی تھی کہ فرمائشی بیان مناسب نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں فرمائش کو قبول نہیں کرتا۔ گو یہ گفتگو طویل ہو گئی تاہم اس میں بہت سے مفید مضامین آ گئے۔

معاملاتِ بنامی

جو مضمون میں بلا فرمائش بیان کرنا چاہتا ہوں اس کی اجمالی تعیین تو سب کے ذہنوں میں الفاظ قرآن ہی سے ہو گئی ہے جیسا بالکل شروع میں مذکور ہوا

ہے - اب ضرورت کسی قدر تفصیل کی ہے - سو عرض کرتا ہوں - ارشاد ہے ــ
وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتَامٰى - آپ سے یتامیٰ کے بارہ میں پوچھتے ہیں - اس کا
شانِ نزول یہ ہے کہ جب یہ آیتیں نازل ہوئیں

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتَامٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ
فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا -

یعنی جو لوگ یتامیٰ کا مال ظلم سے کھاتے ہیں وہ جز این نیست کہ
اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں -

تو وہ صحابہ جن کے قبضہ میں یتامیٰ کے اموال تھے ڈر گئے - حالانکہ اُس وقت
یہ حالت نہ تھی جو آج کل ہے کہ اب تو قابض اموال بھی ہیں اور قابض ارواح
بھی ہیں - جو امین ہیں اُن کی یہ حالت ہے کہ کوئی مرا - اُس کے ورثا نابالغ ہیں
اُن کے مال میں سے تیجہ، چالیسواں، چھ ماہی، برسی کر رہے ہیں اور یتیم خانوں
مدرسوں اور انجمنوں میں بھیج رہے ہیں - اور اُن کے مہتمم بھی کہیں بلا تحقیق اور
کہیں باوجود تحقیق ہونے کے دھڑلے سے لئے چلے جاتے ہیں - جو آیا رکھ
لیا - کم سے کم اتنی تو تحقیق کر لیجئے کہ یہ عطیہ ترکہ میں سے ہے یا حصہ میں
سے - اگر ترکہ میں سے ہے تو اُس کے سب ورثا بالغ ہیں یا نابالغ بھی
ہیں - پھر اگر سب بالغ ہیں تو دینے کے وقت سب حاضر بھی ہیں یا کچھ غائب
ہیں - اگر سب حاضر ہیں تو سب کی رضا سے دیا گیا ہے یا بلا رضا کے - اگر رضا
سے دیا گیا ہے تو رضا سکوتی ہے یا نطقی - پھر اگر رضا نطقی ہے تو بطیب خاطر دیا
ہے یا محض شرما شرمی - بغیر ان امور کے حل کئے حلال نہیں ہوتا - یہ کیا بدتمیزی

ہے کہ جو ملے رکھ لو۔ یہ خبر نہیں کہ اُس میں یتیموں کا بھی حق ہے حالانکہ خود میراث ہی کا معاملہ بڑا نازک ہے۔

ایک بزرگ کسی بیمار کی عیادت کو گئے۔ اتفاق سے وہ اُن کے سامنے مر گیا۔ اُس کے مرتے ہی انہوں نے چراغ گل کر دیا۔ وہاں جو اور تیمار دار تھے اُنہوں نے پوچھا تو فرمایا کہ جب تک یہ زندہ تھا تو تیل اُس کا تھا اب یہ مر گیا تو یہ تیل ورثا کا ہو گیا اور اب یہ تیل ترکہ میں لگے گا۔ میں نے اپنے پاس سے دو پیسہ کا تیل منگا لیا ہے۔

شریعت میں ادنی ادنی چیزوں کا حساب ہے اگر اور متروکہ دو پیسہ کم ایک ہزار کا ہے تو دو پیسہ کا تیل اُس میں شامل کر کے ایک ہزار کی تقسیم ہو گی۔ چونکہ شریعت میں ادنی چیزوں کا حساب ہے، اسی لئے ادنی ادنی چیزوں پر مواخذہ بھی اتنا ہی ہے جتنا بڑی بڑی چیزوں پر ہے۔

درمختار میں ہے کہ اگر کوئی کسی کا ایک دانگ دبا لے جو بقدر تین پیسہ کے ہوتا ہے تو اُس کے بدلے اُس کی سات سو نمازیں دے دی جائینگی آپ اسے سہل سمجھتے ہیں؟ بڑا سخت قصہ ہے۔ اب تو بڑا اندھیر ہے۔ مشترک ترکہ میں سے تیجہ، چالیسواں سب کرتے ہیں۔ اگر کوئی کہے تو کہتے ہیں۔ کیا ہم اپنے لئے کرتے ہیں۔ انہیں کی عزت کے واسطے کرتے ہیں اگر آپ بڑے ہمدرد بنے ہیں تو اپنی گرہ سے کیجئے۔ کیا ٹھکانا ہے بڑی ہی بدتمیزی پھیلی ہوئی ہے۔

مجھے اپنے یہاں کی ایک حکایت یاد آئی۔ میرے ایک ماموں زاد

بھائی کی لڑکی ایک نابالغ لڑکا اور شوہر اور ماں باپ چھوڑ کر مر گئی۔ اُس کے باپ نے ایک حمائل مدرسہ میں میری معرفت دینا چاہی جس میں اُس نابالغ کا بھی حق تھا۔ اُس کی ماں نے کہا وہاں نہ بھیجو۔ وہاں تو کئی بیبلیں نکلیں گی۔ اُس کے باپ نے کہا، تب تو وہیں بھیجنا اچھا ہے کہ مسئلہ کی بھی تحقیق ہو جاوے گی۔ چنانچہ میرے پاس بھیجی گئی۔ میں نے سب واقعہ دریافت کیا اور کہا کہ بچے کی تو اجازت معتبر نہیں۔ اس لئے اس کی قیمت لگاؤ اور جتنا نابالغ کا حق ہے اُتنے کا اپنے پاس سے کپڑا خرید کر الگ سے اُسے پہنا دو۔ تو اُس کا حصہ تمہاری مالک ہو جاوے گا۔ پھر تم مدرسہ میں دے سکتے ہو۔ یہ جواب پہنچا تو وہ کہنے لگی کہ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا۔ خیر صاحب اُس کی قیمت کا اندازہ کر کے دس آنے کے پیسے لڑکے کے حصہ کے میرے پاس بھیجے کہ تم ہی اس کا کپڑا منگا دو کہیں ہمارا اعتبار نہ آوے۔ میں نے کہا کہ اگر پیسے نہ بھیجتیں تو اعتبار نہ آتا۔ اب اعتبار ہے تمہیں منگا کر سب کر دو۔

تو یہ ہیں احتیاطیں جن کے بغیر حرام و حلال میں فرق نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی کہے کہ بس فاتحہ روک دیں۔ مر گیا مردود نہ فاتحہ نہ درود۔ میں کہتا ہوں کرو فاتحہ درود، مگر جو طریقہ ہے اُس کے موافق کرو۔ طریقہ یہ ہے کہ میت کے مال میں سے سب سے پہلے تجہیز و تکفین کرو مگر ضرورت کے موافق یعنی اسراف اس میں بھی مت کرو۔ اُس کے بعد اگر وہ مقروض ہو تو اُس کا قرض ادا کرو۔ اُس کے بعد اگر اُس نے کوئی وصیت کی ہو تو ثلث مال کے اندر اندر اُسے پورا کرو۔ اُس کے بعد جو بچے ورثاء میں بانٹ لو۔ اب جو چیزیں مساکین کو دینا

ہوں وہ اپنے حصہ کے بقدر اپنے حصہ میں لگاؤ تاکہ کسی نابالغ کا حق یا کسی بالغ کا حق بغیر طیب خاطر تمہارے ہاتھ سے صرف نہ ہو۔ مگر اس کی امید نہیں کہ آپ ایسا کریں۔ اس وقت تو آپ بھی نابالغ بن جائیں گے اور کہیں گے کہ مولانا نے ہمیں اس شعر میں نابالغ کہا ہے ؎

خلق اطفال اند جز مردِ خدا نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

اب تو یہ بھی نابالغ بن جائیں گے کہ خرچ کرنا نہ پڑے۔

جس طرح ایک شخص قصر نماز پڑھا کرتا تھا۔ پوچھا یہ کیا، کہنے لگا حدیث میں ہے ــــ کن فی الدنیا کانک غریب۔ دنیا میں مسافر کی طرح رہو ــــ بس میں مسافر کی طرح رہتا ہوں اس لئے نماز میں قصر کرتا ہوں کم بخت صرف نماز ہی میں مسافر بن گئے۔

تو ایسے ہی مال کی حفاظت کے لئے یہ بھی نابالغ بن جائیں گے۔ تو دینے کا یہ طریقہ ہے کہ اپنے حصہ میں لگا کر پھر دو۔ مگر اب تو دیتے ہوئے دم نکلے گا۔ اسی طرح اپنے حصہ میں سے خیرات کرو۔ مدرسہ میں دو جو چاہو کرو۔ مگر حد سنت سے تجاوز مت کرو۔ بدعت کے طریقوں پر مت چلو۔ غرض جیسی آج کل بے تمیزی پھیلی ہوئی ہے، اس وقت جب یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں ان کا صحابہ میں احتمال بھی نہ تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہ صحابہ جن کے پاس یتامیٰ تھے کھانے پینے کو یتامیٰ کے ملا لیتے تھے۔ نسبت کا لحاظ رکھتے تھے کہ اگر ان کے دو پیسے صرف کئے تو اپنے چار خرچ کئے۔ ان کا ایک چھٹانک مثلاً غلہ لیا تو اپنا پاؤ بھر شریک کیا مگر یہ ضرور ہے کہ حفاظت

تھی اور مخالطت میں ظاہر ہے کہ اپنا اُن کے صرف میں آجاتا ہے اور اُن کا اپنے صرف میں۔ تو جس وقت یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ــــــ الخ

حالانکہ یہ آیتیں اس مخالطت کے متعلق نہ تھیں مگر صحابہ اُن کو سنتے ہی گھبرا اُٹھے اور اُس کے بعد اُن کے کھانے پینے کا انتظام الگ کر دیا کتنی زحمت اٹھائی کہ یتیم کا آٹا گوندھا، سالن الگ پکایا۔ پھر اُس کی حفاظت کی مشقت الگ گوارا کی کیونکہ بچہ ہے۔ کسی وقت کم کھایا کسی وقت زیادہ۔ زیادہ اپنے پاس سے کھلا دیا مگر کم کھایا تو اب اُس کی حفاظت کی مشقت گوارا کرنا پڑی کہ یتیم کا مال ہے ضائع نہ ہو۔ پھر کبھی گرمی ہے کبھی سردی۔ گرمی میں بچا ہوا کبھی سڑ گیا تو یتیم کا نقصان ہوا کیونکہ آپ کھا نہیں سکتے تو اب بہت تنگی ہوئی اور زیادہ اپنی مشقت سے نہیں بلکہ زیادہ تر اُن کے خیال سے گھبرانے لگے تو عرض کیا یا رسول اللہ ہم کیا کریں جو یتامیٰ کا نقصان نہ ہو۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ــــــ الخ

جس نے یہ فیصلہ کر دیا کہ کس طرح کھانا جائز ہے یعنی جہاں مقصود کھانا نہ ہو بلکہ مخالطت کے ضمن میں کھایا جاوے اور کس طرح ناجائز ہے جہاں کھانا ہی مقصود ہو اور دوسرے امور کا بہانہ ہو۔

مہتممان کے کرتوت

جیسے آج کل بھی یتیموں کا مال ظلماً کھاتے ہیں جس کی ایک صورت یہ

بھی ہے کہ یتیم خانہ کا مہتمم بھی جو دستبرد کرتا ہے وہ ایک درجہ میں یتیموں کا مال ظلماً کھاتا ہے کیونکہ جو رقم اس کے قبضہ میں آتی ہے اُس کی دو حالتیں ہیں ایک تو وہ اشیاء جو موجودہ یتامیٰ کے لئے آتی ہیں۔ قواعد شرعیہ سے وہ تو دراصل یتامیٰ کی ہوتی ہیں اور یہ مہتمم یتامیٰ کا امین و وکیل ہے۔ اس لئے جو رقم اس کے قبضہ میں آ گئی۔ اب اگر اُس نے دستبرد کی وہ صریحاً یتامیٰ کے مال میں ظلماً دستبرد کی۔ جیسا بعض بعض جگہ کا حال معلوم کر کے افسوس ہوتا ہے اور ایک جو آنے والے یتامیٰ کے لئے بھیجا ہے۔ اُس میں یہ مہتمم دینے والوں کا وکیل ہے۔ اس میں دستبرد کرنا بھی باعتبار اثر اور ضرر یتامیٰ کے ایک گونہ اکل مال یتیم ظلماً ہے۔

اب تو اکثر لوگوں نے یتیموں کا بہانہ بنا رکھا ہے۔ میں نے ایک سیکرٹری صاحب کو دیکھا کہ وہ یتیم بچوں کو اپنے ساتھ لئے لئے پھرتے ہیں اور اُن کی نظمیں پڑھوا پڑھوا کر چندہ جمع کر واتے ہیں۔ ایک تو بچوں کی رسیلی آواز، دوسرے لباس کی آرائش سے وہ اور بھی گڑیا سے معلوم ہوتے ہیں۔ پھر مضمون بھی دلگداز کہ جس نے سنا رونا شروع کر دیا۔ اے لیجئے تھوڑی دیر میں بہت سا چندہ جمع ہو گیا۔ یتیموں کا نام ہوا اور مہتمم صاحب کا کام ہوا اب جب یہ مہتمم صاحب اپنے مرکز پر پہنچے وہاں آمدنی کی جانچ پڑتال ہوئی انہوں نے وہاں بھی مٹھی گرم کر دی اور سب مزے میں رہے۔

اسی طرح بہت سے لوگ مساجد کے لئے چندہ جمع کرتے ہیں اور اپنے تصرف میں لاتے ہیں۔ ایک شخص مسجد کے لئے چندہ مانگ کر لاتا تھا اور ہاضم

کر جاتا تھا۔ جب ختم ہو جاتا تھا پھر اسی عنوان سے لاتا تھا کہ وہ رقم مسجد میں لگا دی اب اور ضرورت ہے۔ کسی نے جو اُس کے راز سے آگاہ تھا کہا ارے کم بخت! مسجد کے نام سے چندہ لاتا ہے اور خود صرف کر ڈالتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ مسجد میں لگا دیا۔ اُس نے کہا کہ میں جھوٹ کیا کہتا ہوں پہلے مسجد میں لگاتا ہوں پھر خرچ کرتا ہوں۔ کیا کرتا تھا کہ مسجد میں روپیہ کو چھوا لیتا تھا اور پھر خرچ کر ڈالتا تھا۔ اپنے نزدیک گویا سچ بھی بولتا تھا۔

ایک اور شخص بہت ہی کثرت سے پانی ملا کر دودھ بیچتا تھا۔ اور اگر کوئی کہتا تھا تو قسم کھا کر کہتا کہ میں دودھ میں پانی نہیں ملاتا۔ مسلمان لوگ اُس کی قسم پر خاموش ہو جاتے تھے۔ ایک اس کے محلے والے نے جنہیں اُس کا حال معلوم تھا کہا ارے کم بخت! ایک تو پانی ملاتا ہے دوسرے جھوٹی قسم کھاتا ہے۔ کہنے لگا جھوٹی قسم نہیں کھاتا۔ پہلے برتن میں پانی ڈال لیتا ہوں اس کے بعد اس میں دودھ ڈالتا ہوں۔ تو میں تو پانی میں دودھ ملاتا ہوں، دودھ میں پانی نہیں ملاتا۔

تو اس قسم کی احتیاط اور تاویل مہتمان انجمن و یتیم خانہ بھی کر لیا کرتے ہیں مگر ایسی ہی احتیاط و تقویٰ کو عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

ترسم کہ صرفہ نبرد روزِ باز خواست

نانِ حلالِ شیخ ز آبِ حرامِ ما

حضرات! ایسے شریر متقین سے قیامت میں فساق و فجار ہزار درجہ بہتر ہوں گے۔ خوب کہا ہے ؎

گنہ آمرزِ رندانِ قدح خوار   بطاعت گیر پیرانِ ریاکار

خدا بچائے فریب سے۔ آج کل تو یہ بھی کمائی بنا رکھی ہے بعض یتیموں نے خود کہا ہے کہ ہم تو بھوکے رہتے ہیں اور ہزاروں روپیہ معلوم نہیں کدھر کو چلا جاتا ہے۔ خوب سمجھ لیجئے مسئلہ۔ کہیں آپ اس دھوکا میں نہ رہیں کہ ہم نے یتیموں کا کہاں کھایا۔ ہم نے تو چندہ دینے والوں کا کھایا۔ کیونکہ جیسا اوپر بیان ہوا ہے۔ بعض صورتوں میں تو وہ حقیقۃً یتیموں کی ملک ہو گئی اور بعض صورتوں میں گو نسبت مجازی ہوتی ہے مگر بعض مجازی نسبت بھی مؤثر ہوتی ہے۔

چنانچہ مجھے ایک قصہ یاد آیا کہ ایک بادشاہ نے اپنے وزیر سے کہا کہ کون قوم عقلمند ہے اور کون احمق۔ وزیر نے دونوں قوموں کا نام لیا، جن کا میں اس وقت اعادہ کرنا دل شکنی کے خیال سے مناسب نہیں سمجھتا۔ غیر بادشاہ نے کہا امتحان کراؤ۔ وزیر نے احمق قوم کے ایک فرد کو بلایا اور اس سے بادشاہ نے پوچھا، میاں داڑھی بیچتے ہو۔ وہ بہت برہم ہوا کیونکہ آج کل کا زمانہ نہ تھا کہ داڑھی حجام کو مفت دیتے ہیں اور بلکہ ایک آنہ پیسہ بھی دیتے ہیں۔ وزیر نے سمجھایا کہ خفا کیوں ہوتے ہو روپیہ ملے گا۔ اس سے تجارت کرنا۔ داڑھی پھر نکل آئے گی۔ راضی ہو گیا۔ حجام کو بلا کے داڑھی مونڈ لی گئی اور ایک ہزار روپیہ داڑھی کی قیمت میں اُن کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ روپیہ لے کر خوشی خوشی گھر پہنچے۔ وہاں بیوی نے لنڈ منڈ صورت دیکھ کر بہت لتاڑا۔ اب یہ لاکھ سمجھاتا ہے کہ ہزار روپیہ رکھ لو داڑھی پھر نکل آئے گی مگر وہ راضی نہ

ہوئی اور کہا جاؤ ابھی داڑھی لے کر آؤ اور پھینکو ایسے روپیہ کو۔ یہ بیچارے مجبور ہو کر پھر بادشاہ کے یہاں پہنچے کہ لائیے حضور ہماری داڑھی دے دیجئے اور اپنا روپیہ لے لیجئے ہم نہیں بیچتے۔ انہوں نے کہا لیجئے۔

اس کے بعد ایک عقلمند بلایا گیا ———— اس سے پوچھا داڑھی بیچتے ہو۔ پہلے تو وہ بہت بگڑا پھر راضی ہوا۔ پوچھا کتنے کو؟ کہا دس ہزار روپیہ کو۔ نائی بلایا گیا۔ اس نے استرہ نکالا۔ کہنے لگا کہ ابھی ٹھہرو اس کے بعد بادشاہ سے کہا کہ حضور یہ کس کی منڈتی ہے۔ اب یہ میری نہیں منڈتی کیونکہ روپیہ لینے کے بعد وہ آپ کی ہو گئی۔ اس لئے اب آپ کی منڈتی ہے۔ اگر آپ کو منظور ہے تو بسم اللہ! اب بادشاہ بہت گھبرایا کہ یہ تو میری ہی داڑھی بنا کے منڈواتا ہے۔ حکم دیا کہ اچھا بھئی اسے روپیہ بھی دے دو اور داڑھی بھی مت مونڈو۔ دیکھئے یہ داڑھی بھی بچا لے گیا اور روپیہ بھی لے گیا۔

مقصود یہ ہے کہ محض مجازی نسبت سے اس کی داڑھی میں احترام پیدا ہو گیا۔ یعنی فقط بادشاہ کا نام لگنے سے داڑھی کی حرمت بڑھ گئی۔ یہاں بھی اسی طرح کہیں حقیقۃً کہیں مجازاً وہ مال یتامیٰ کا ہے۔ اس لئے اب اگر کھاؤ گے تو یتیموں کا ہی کھاؤ گے۔ تو دوسری صورت اموال یتامیٰ کے ظلماً کھانے کی یہ تھی۔ اور صحابہ کے وقت میں ان دونوں صورتوں کا پتہ بھی نہ تھا مگر پھر بھی صحابہ ڈر گئے۔ تھوڑے روز تک الگ انتظام رکھا۔ اس کے بعد جب نقصان ہونے لگا تو آ کر حضورؐ سے پوچھا۔ سبحان اللہ! کیا رحمت ہے حق جل و

علی شانہ کی کہ جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ یونہی کرنا پڑے گا۔ واللہ ہماری اپنی مصیبت پر اتنی نظر نہیں جتنی اُن کی ہے۔ واقعی ایک طرف شریعت کے ان احکام کو اور دوسری طرف واقعات کو دیکھ کر قدر ہوتی ہے۔ معاملات کی پیچیدہ صورتیں دیکھی جاویں اور اُن کے احکام بھی دیکھے جاویں تو بے ساختہ زبان سے یہ نکلے گا ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

اس قدر دل فریب صورت نظر آئے گی کہ وجد کی سی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔

طریق اصلاح

چنانچہ اسی مقام پر دیکھئے وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامٰى۔ آپ سے یتامٰی کے بارہ میں سوال کرتے ہیں۔ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ۔ آپ اُن کے سوال کے جواب میں کہہ دیجئے۔ حقیقی جواب تو آگے آئے گا۔ پوچھا تو واقعہ جزئیہ اسی کے جواب میں پہلے ایک قاعدہ کلیہ بتاتے ہیں۔ پوچھا ایک تناش سو، کہ شاید ادب کی وجہ سے بار بار نہ پوچھ سکیں۔ اس لئے ایک قاعدہ کلیہ بتاتے ہیں کہ اُسے یاد رکھیں۔ وہ یہ ہے اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ یعنے اُن کے حال کی درستی کرنا۔ یہ ہے بڑی اچھی بات۔ اب آگے جواب ہے۔

وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ

اگر تم ملا جلا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں غیر نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ

کھائے کچھ حرج نہیں مگر یہ قاعدہ کلیہ پیش نظر رہے اصلاح لھم۔ یہ کھانا اُن کی مصلحت کے لیے ہو۔ اصلاح لکم نہ ہو یعنی تمہاری مصلحت کے لیے نہ ہو۔ کیونکہ مخالطت میں دو مصلحتیں ہیں۔ ایک اپنی کہ اپنا کم ملایا اُن کا زیادہ ملایا۔ اور ایک اُن کی مصلحت ہے کہ یوں بچا ہوا بگڑتا ہے اور اب ملا جلا کر کھا لو۔ اگلے وقت اُن کی کم جنس لے لیں گے۔ یا خود اپنی ہی جنس میں اُن کو شریک کر لیں گے۔ تو مخالطت کرو مگر اُن کی مصلحت سے اپنی مصلحت سے نہیں۔ تو فرماتے ہیں اس طور پر مخالطت کر لو کہ تمہارے بھائی ہی ہیں۔ واقعی اگر اتنی بھی مخالطت نہ ہو گی تو آپس میں یک جہتی نہ ہو گی اور وہ بھی غیر سمجھ کر الگ تھلگ رہیں گے اور اُن کی شفقت بھی ظاہر نہ ہو گی۔ بس دل میں حساب کتاب رہے کہ خود سمجھ رہے ہیں کہ یہ اُن کی چیز ہے اور یہ ہماری ہے۔

اب ایک سوال یہ باقی رہا تھا کہ نیت تو اصلاح کی ہے مگر اس طرح کرنے سے ممکن ہے کہ کچھ اُن کا ہمارے ہاں صرف ہو جائے۔ شاید اُس کا مواخذہ ہو۔ اس کا جواب ارشاد ہوتا ہے۔

وَاللّٰهُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ——— یعنی خدا جانتا ہے مفسد اور مصلح کو۔

مطلب یہ کہ کوڑی کوڑی کا حساب نہیں دیکھتے صرف نیت دیکھتے ہیں اگر نیت اصلاح کی ہے اور اُن کا کچھ اپنے ذمہ صرف ہو گیا تو وہ معاف ہے۔ نیت تو کھلانے کی ہے۔ اگر اس پر بھی کچھ کھا لیا گیا تو وہ ہمارے

یہاں معاف ہے اور اس قسم کے کھانے کی اجازت ہے۔

اللہ اکبر ۔۔۔۔ کس قدر رعایتیں ہیں۔ ایسی تعلیم تو کسی بڑے سے بڑے حکیم کی بھی نہیں ہو سکتی۔ حق یہ ہے کہ ذرا سے غور میں ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ واقعات پیش آنے کے بعد ان احکام کی اچھی طرح قدر ہوتی ہے۔ جیسے ایک اور مقام پر والدین کے حقوق کے ضمن میں فرمایا ہے لاتقل لہما۔ اُف یعنی انہیں ہوں بھی نہ کہو وَلَا تَنْهَرْهُمَا انہیں مت جھڑکو الی قولہ تعالیٰ قل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا یعنی اُن کے ساتھ کرم کرو۔ تواضع سے پیش آؤ۔ اُن کے حق میں دعا کرو۔

باپ کے حقوق

اس کے آگے ایک غضب کا مضمون ہے۔ ایک مولوی اور فقیہ اگر حقوق بیان کرنے پر آئے تو والدین کے حقوق بیان کرے گا اور کوتاہی پر وعید کا ذکر کر دے گا۔ باقی کوتاہی میں یہ تدقیق کہ اس کے کسی مرتبہ کو قابل عفو قرار دے کر اس کی شرط عفو کو بھی بیان میں لاوے۔ سو یہاں تک بیان تو کیا ذہن بھی نہ پہنچے گا۔ الغرض یہاں تک حقوق کا ذکر ہے یہاں تک ایک بڑے سے بڑے فقیہ کا کام ختم ہو گیا۔ آگے اس کے ذہن کی رسائی سے باہر ہے مگر قرآن میں یہ بھی ہے۔ وہ یہ اشارہ ہے۔

رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ إِنْ تَكُونُوا صَالِحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا۔

یعنی تمہارے خدا کو خوب معلوم ہے جو کچھ تمہارے جی میں ہے اگر تمہارے

اندر صلاحیت ہے تو وہ رجوع ہونے والوں کے لئے غفور بھی ہیں۔ اب واقعات میں غور کیجئے تو اس کا پتہ چلے گا کہ یہ کتنی دور کی بات فرمائی ہے یہ کبھی تھکا ماندہ جھنجھلایا ہوا ہوتا ہے اور اُدھر والد بزرگوار کی بڑھاپے کی وجہ سے عقل ماری جاتی ہے اور اس سے ایک فضول اور لایعنی بکواس کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے کہ کیوں بیٹا یہ یوں ہے۔ اُس نے کہا جی ہاں۔ پھر پوچھا یوں ہے۔ کہا جی ہاں۔ غرض دو مرتبہ سیدھی طرح بتا دیا۔ تیسری مرتبہ کچھ جوانی کی حدت اور کچھ تھکن کی جھنجھلاہٹ کہ یہ تو دم ہی نہیں لینے دیتے، ذرا ترش لہجہ میں کہہ دیا کہ ابھی تو عرض کر چکا ہوں۔ آپ بار بار پوچھے جاتے ہیں۔ حالانکہ اُن کی حالت خود کسی وقت میں اس سے زیادہ بے عقلی کی باتیں کراتی تھی اور وہی باپ نہایت خندہ پیشانی سے جواب دیتا تھا۔

چنانچہ ایک بنئے کی حکایت ہے کہ ایک مرتبہ اُس کے گھر میں کوا آکر بیٹھا۔ اُس کے چھوٹے بچے نے پوچھا ابا یہ کیا ہے۔ اُس نے کہا بیٹا کوا ہے پھر پوچھا کیا ہے، کہا کوا ہے۔ یہاں تک کہ سو مرتبہ پوچھا اور وہ برابر کہتا رہا کوا ہے۔ تھا ہوشیار، اس کو ایک بہی پر لکھتا گیا۔ اتفاق سے جب صاحبزادہ جوان ہوا اور ابا جان کے بڑھاپے کا زمانہ آیا اور کوا آکر بیٹھا۔ صاحب زادے سے پوچھا کہ بیٹا کیا ہے؟ پہلے ہی سوال پر اپنے دل میں کہنے لگے کہ اب یہ ایسے نابالغ ہو گئے کہ انہیں اس کی بھی خبر نہیں مگر خیر زبان سے کہہ دیا کوا ہے۔ پھر پوچھا تو کہا، ابھی تو عرض کر چکا ہوں کہ کوا ہے۔ تیسری مرتبہ پھر پوچھا تو کہا کیا دماغ میں خبط ہو گیا ہے۔ بنئے نے کہا خفا نہ ہو اور

ناہی لے آیا اور دکھایا کہ تم نے تو سو مرتبہ پوچھا تھا مگر اپنے بوڑھے باپ
کو پانچ مرتبہ بھی نہ بتا سکے۔

الغرض بڑھاپے میں غریب باپ کی بُری گت بنتی ہے۔ اور اگر کہیں
اتفاق سے اماں مرجاویں تو پھر تو باپ کو حکم ہوتا ہے کہ اپنا حقہ پانی
سنبھال کر دہلیز کا پہرہ دو یعنی باہر ڈیوڑھی میں رہا کرو کیوں کہ گھر میں جوان
میاں بیوی رہتے ہیں۔ غرض بڑھاپے میں جوان بیٹے عجیب گت بناتے ہیں۔

ایک گاؤں کا قصہ یاد آگیا کہ ایک بڈھے کے ساتھ اُس کے بیٹے
بُرا سلوک کرتے تھے اور پورے طور پر اُس کی خبر گیری بھی نہ کرتے تھے اتفاق
سے وہاں ایک مولوی صاحب کا گزر ہوا اور انہوں نے نماز کے لئے وعظ
کہا۔ اُس نے یہ خیال کیا کہ دنیا تو ہے ہی خراب، اب آخرت کیوں برباد ہو
لاؤ نماز ہی شروع کر دیں۔ اتفاق سے اُس نے جس روز نماز شروع کی اُسی
روز بیٹے کی بھینس مر گئی۔ جاہل گنوار یہ سمجھے کہ نماز کے سبب یہ مر گئی۔ اب وہ
باپ کے پاس آئے کہ باوا نماز نہ پڑھا کرو۔ اُس نے کہا کہ میں اور کیا کیا
کروں۔ جب کھانے پینے کو نہ ملے تو میں اور کیا کام کروں۔ بیٹوں نے کہا اب
تمہاری خبر گیری کریں گے۔ چنانچہ اُس نے نماز چھوڑ دی اور خوب گھی دودھ
ملنے لگا۔ اب تو یہ کیا، ذرا تکلیف پہنچی اور اُس نے دھمکی دینی شروع کی کہ
لاؤ تو میرے وضو کا کلہڑا میں نماز پڑھوں گا۔ وہ پھر مارے ڈر کے اُن کی
خاطر کرنے لگتے۔

تو بعضے تو باپ کو اس نوبت تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہ تو صریح گناہ

ہے اور بعضے نیک دل ہوتے ہیں۔ دل میں شرارت نہیں ہوتی۔ مگر پھر بھی آدمی ہی تو ہے۔ بعض حالتوں میں وہ اللہ کے سامنے بے ادبی کے کلمات کہہ بیٹھتا ہے تو باپ کی کیا حقیقت۔ غرض منہ سے کوئی بات گستاخی کی نکل گئی اور فوراً ہی خیال آیا کہ ارے مجھ سے یہ کیا کوتاہی ہوئی۔ بس تو مر ہی گیا جتنی خدمت کی تھی سب اکارت ہو گئی۔

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود ۔۔۔ گر ز باغِ دل خلالے کم بود

نرمی کا برتاؤ

سالک کے باغِ دل سے ایک تنکا بھی کم ہو جاوے تو بس اس کی موت ہے کہ میری پچاس برس کی خدمت ایک ذرا سی کوتاہی میں جاتی رہی حق جل و علیٰ شانہٗ اس کا دل تھامتے ہیں اور اس کا قانون بتاتے ہیں رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ۔ یعنی تمہارے خدا کو خوب معلوم ہے جو کچھ تمہارے دلوں کے اندر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک کوتاہی پر نظر نہیں کرتے۔ وہ تو نیت کو دیکھتے ہیں۔

ما بروں را ننگریم و قال را ۔۔۔ ما دروں را بنگریم و حال را

ناظر قلبیم اگر خاشع بود ۔۔۔ گرچہ گفت لفظ نا خاضع بود

گو ظاہر میں بے ادبی ہو گئی مگر دل میں تو بے ادبی نہیں اِن تکونوا صالحین یعنی تم میں صلاحیت ہے تو فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا۔ خدا کے یہاں مغفرت کا بھی قانون ہے تم پریشان مت ہو۔

اللہ اکبر ۔۔۔ اتنی دلداری، اس قدر دلجوئی، اتنی شفقت دنیا کا حاکم

نہیں کر سکتا۔ تعزیرات میں کہیں ایسی دفعہ نہ ملے گی کہ اگر مجرم کی نیت اچھی ہو تو اُسے چھوڑ دو۔ گو حاکم بعض وقت چھوڑ دیتے ہیں مگر قانون نہیں ہے۔ یہ خدا ہی کا قانون ہے، یہ کسی سلطان کا قانون نہیں بلکہ سلطان السلاطین کا قانون ہے، یہ ملکدار کا قانون نہیں بلکہ دلدار کا قانون ہے۔

اس میں ایک راز ہے جسے شیوخ خوب سمجھتے ہیں۔ وہ یہ کہ شدت سے اطاعت کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ جیسے آج کل کے خشک علماء کیا کرتے ہیں کہ ذرا ذرا سی باتوں پر تکفیر کر بیٹھتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ ان لوگوں کو سوائے اس کے کوئی کام ہی نہیں۔ گویا ایک کفر کا ہائی کورٹ بنا لیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی بعض وقت بھڑک اُٹھتا ہے کہ دین کا کام کرنا بہت مشکل ہے۔ اتنی دور پہنچ کر بھی آدمی کو یہ حاصل نہیں ہوتا تو لاؤ پھر چھوڑ دو کوئی اور کام کرو۔ تو یہ خشک علماء اس کی مصلحت سے بالکل ہی ناواقف ہیں البتہ جو علماء محقق ہیں اور صوفی بھی ہیں وہ جانتے ہیں۔

چنانچہ ایک حکایت ہے کہ ایک چور ایک بزرگ کا مرید ہوا اُنہوں نے اُسے چوری سے توبہ کرائی اور اُسے خانقاہ میں رکھا۔ اب جب پچھلی رات آتی اور خانقاہ والے ذکر شغل کرنے کے لئے اُٹھتے یہ بھی اُٹھتا اور اس کا نفس اُسے چوری کے لئے برانگیختہ کرتا اور یہ اُسے روکتا۔ جب کسی طرح نہ رُکتا تو یہ کیا کرتا کہ خانقاہ والوں کے جوتے اِدھر اُدھر کر دیتا۔ کسی کے جوتے کا ٹھکانا بدل دیا۔ کسی کے سامنے ایک پرانی دوسرے کی لگا دی غرض اس سے لوگوں کو بہت پریشانی ہوتی۔ آپس میں اُنہوں نے کہا ابھی پھر

دوا اور پتہ لگاؤ کہ کون ایسا کرتا ہے۔ چنانچہ کچھ لوگ گھات میں رہے۔ یہ حضرت اٹھے اور معمول کے موافق وہی حرکت پھر شروع کی۔ پکڑے گئے اور صبح کو پیر صاحب کی خدمت میں انہیں پیش کیا۔ انہوں نے پوچھا کہ کیوں میاں تم خانقاہ والوں کو پریشان کیا کرتے ہو۔ حالانکہ ایسی حرکتوں سے توبہ کر چکے ہو۔ کہا سنیئے صاحب! میں نے چوری سے توبہ تو کی ہے ہیرا پھیری سے نہیں کی۔ اخیر رات کو نفس ستاتا ہے تو میں اُس کی تسلی کے لئے ہیرا پھیری کر لیتا ہوں۔ اگر آپ اس سے منع کریں گے تو پھر چوری میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ شیخ اُس کے مرض کو سمجھ گئے اور اجازت دے دی کہ تمہیں یہ ہیرا پھیری معاف ہے۔ تو صوفیہ علماء اسے سمجھتے ہیں اور خشک عالم نہیں سمجھتا۔

ایک شخص افیون چھوڑ کر تمباکو کھانے لگے۔ اگر اُس کا تمباکو بھی چھڑا دو گے تو پھر افیون کھانے لگے گا۔ بہرحال نرمی کی ضرورت ہے جسے محقق شیخ ہی خوب سمجھ سکتا ہے۔ پس جو حاصل ہے اِنْ تَكُونُوا صَالِحِيْنَ کا، ایسا ہی حاصل ہے وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ کا۔ پس حق جل و علیٰ شانہ بھی بے انتہا نرمی کا برتاؤ فرماتے ہیں۔

جامعیتِ کلامِ الٰہی

چنانچہ اس مقام میں بھی آگے ارشاد ہے وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ اور اگر خدا کو منظور ہوتا تو تمہیں خوب مشقت میں ڈالتے یعنی مخالطت کی اجازت ہی نہ دیتے اور حفاظت اموال کا امر فرماتے، تو ظاہر ہے بے انتہا مشقت ہوتی۔ اس میں دو دعوے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اُسے مشقت میں

ڈالنے کی قدرت ہے۔ اور دوسرا یہ کہ باوجودیکہ قدرت ہے پھر کسی وجہ سے مشقت میں نہیں ڈالا۔ آگے دونوں کی دلیل علی الترتیب فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ۔ بے شک اللہ غالب ہے حکمت والا ہے۔ غالب ہے اس لئے مشقت میں ڈالنے کی قدرت ہے۔ حکمت والا ہے، دانا ہے اس لئے مشقت میں ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔

یہ ان آیات کا ترجمہ ہے اور اس ترجمہ سے مفصل مضمون معلوم ہو گیا ہوگا۔ اس وقت مجھے قُلْ اِصْلَاحٌ لَّھُمْ خَیْرٌ کے متعلق بیان کرنا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں اصلاح جو مبتداء ہے نکرہ ہے اور خیر جو خبر ہے وہ بھی نکرہ ہے مگر خبر میں اصل نکارت ہی ہے اور مبتدا میں اصل تعریف ہے۔ کیونکہ مثلاً رجل جاءنی ایک آدمی میرے پاس آیا۔ کہنے سے مخاطب کو کوئی نفع نہیں ہوتا تاوقتیکہ رجل کی تعریف یا تخصیص نہ کر دی جاوے۔ اس لئے مبتدا کا معرفہ ہونا یا کسی صفت یا ظرف کے ساتھ مقید ہو کر اس میں تخصیص ہونا ضروری ہے۔ یہاں پر اصلاح اگرچہ نکرہ ہے مگر لھم کی قید نے اُسے مبتدا بننے کے قابل کر دیا۔ اور یہاں معرفہ بھی فرما سکتے تھے۔ یعنی اصلاح لھم یا اصلاحھم مگر نکرہ ہی لائے۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ اصلاح کی تنوین تقلیل کی ہے کہ اگر تھوڑی بھی اصلاح ہو تب بھی خیر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ اصلاح کتنا بڑا حق ہے۔ اور اس کے لئے کس قدر اہتمام کی ضرورت ہے۔ آگے فرماتے ہیں خیر یہ افعل التفضیل کا صیغہ ہے۔ مبتدا میں تقلیل اور خبر میں تکثیر۔ سبحان اللہ کیا رعایت

ہے۔ یعنی تھوڑی بھی اصلاح بہت بہتر ہے اور اس کا اتنا اجر ہے کہ ہزاروں عبادتوں سے بڑھ کر ہے۔ سبحان اللہ!

یوں تو یتامیٰ پر توجہ کے لئے بہت مضامین ہیں مگر اس چھوٹے سے جملہ کا نظیر نہیں اور نہ کوئی نظیر کہاں سے لائیے۔ نہ وہ خدا ہو گا نہ ایسے جملے لا سکے گا۔ اور پھر یہ تو مجھ کم علم کی سمجھ میں آ گیا اور جو واقعی علماء ہوئے ہیں اُنہوں نے خدا جانے کیا کیا سمجھا ہو گا۔ واقعی قرآن عجیب چیز ہے ؎

چیست قرآں اے کلام حق شناس | رونمائے رب ناس آمد بناس
حرف حرفش را ست زیر معنئے | معنئے در معنئے در معنئے

ایک اور بزرگ فرماتے ہیں ؎

مجو دراست سرا برو ہائے قرآنی
چہ دلبر است کہ دل می برد بپنہانی

یہ ہیں قرآن کے علوم —— اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ —— کیا عجیب و غریب جملہ ہے اور کتنا بڑا اہتمام ہے کہ اصلاح کو نکرہ لائے جس سے اصلاح کی تعیین نہ رہی۔ تو اصلاح کی جو نسی قسم خواہ چھوٹی، خواہ بڑی، خواہ جسمانی، خواہ روحانی سب کی خیریت حق تعالیٰ نے بیان فرما دی۔ اصلاح لہم بالکل عام ہے۔ اس میں نہ قید ہے بدن کی نہ روح کی۔ بلکہ یہ دونوں کو جامع ہے۔ سبحان اللہ! جیسے وہ خود جمیع صفات کمالیہ کے جامع ہیں ویسا ہی اُن کا کلام بھی کیا جامع ہے۔ اس لئے نام نہیں لیا کسی خاص اصلاح کا ——!

آداب یتامیٰ

اب اصلاحات کی فہرست سنیئے۔ منجملہ اُن اصلاحات کے ایک بدن کی ہے کہ انہیں کھلایا جاوے پلایا جاوے، سردی گرمی سے بچایا جاوے مگر اس کھلانے پلانے کے آداب کا خیال رکھا جاوے۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا

میں اسی کھلانے پلانے کا ادب بیان کیا گیا ہے۔ بعض ادب تو علی حبہ میں ہیں۔ اس طرح سے کہ اُس کی ضمیر میں کئی احتمال ہیں۔ یا تو اس کا مرجع حق تعالیٰ ہے تو مطلب یہ ہے کہ کیوں کھلاتے ہیں؟ حق تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے کھلاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کھلانے پلانے میں ناموری یا تفاخر مقصود نہیں ہوتا بلکہ محض خدا کی محبت اُس کا سبب ہے۔ سو یہ بھی ادب ہے جس کا حاصل اخلاص ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا مرجع الطعام ہو۔ اس وقت یہ معنے ہوں گے کہ کھانا کھلاتے ہیں باوجود اس کھانے کے محبوب و مرغوب ہونے کے۔ حاصل یہ ہے کہ بچا کھچا گرا پڑا جو بالکل اپنے کام نہ آسکے نہیں کھلاتے بلکہ جو خود کو بھی مرغوب ہے اور اُس کے حاجت مند بھی ہیں۔ وہ کھلاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ کھانا خراب ہو گیا لاؤ یتیم کو دے دیں، مؤذن کو دے دیں۔

جیسے ایک حکایت ہے کہ ایک عورت نے کھیر پکا کر رکھی۔ کتے نے منہ ڈال دیا۔ تو ایک مٹی کے طباق میں کر کے لڑکے کے حوالے کی کہ یہ

موذن کو دے آؤ۔ لڑکا لے گیا تو وہ اتفاق سے اُن سے پڑھتا بھی تھا حریص تو تھے جھٹ ایک منہ مار ہی تو دیا اور جس طرف سے کھایا ہوا تھا اُسی طرف سے ہاتھ مارا۔ لڑکے نے کہا کہ ملاجی اِدھر سے نہ کھائیے۔ کہا کیوں کہا اِدھر کتے نے منہ ڈال دیا ہے۔ یہ سنتے ہی طباق اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ وہ لڑکا رونے لگا۔ پوچھا روتا کیوں ہے۔ کہا اماں ماریں گی کہ بھیا کے پاخانہ اٹھانے کا برتن توڑ دیا۔

سبحان اللہ —— کیا ظرف ہے اور کیا مظروف ہے۔ یہ قدر ہے موذن کی۔ واقعی یتیموں، موذنوں، طالب علموں اور ملاؤں کو لوگ بہت ہی ذلیل سمجھتے ہیں۔ تو اے حضرات خوب سُن لیجئے۔ اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ ان کو وہ کھانا دینا چاہیئے جسے دینے کو جی چاہتا۔ یہ نہیں کہ جو لا محالہ پھینکنا پڑے گا وہ دے دیا۔ یہ دونوں احتمال تو منقول تھے۔

ایک تیسرا احتمال جو میری سمجھ میں آیا ہے اور کہیں منقول نہیں دیکھا یہ ہے کہ جملہ کی ترتیب یہ ہے۔ سب سے پہلے فعل اور اُس کے بعد فاعل پھر مفعول بہ اور اُس کے بعد ظرف وغیرہ ہوتا ہے۔ یہاں الطعام کو تو چونکہ مفعول بہ اوّل ہے موافق قاعدہ کے مقدم کیا۔ اس کے بعد علیٰ حُبّہٖ لائے۔ پھر مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا کو لائے جو معطوف علیہ، سب مل کر مفعول بہ ثانی ہے اور اس وجہ سے اسے علیٰ حبہٖ پر لفظاً نہ سہی مگر معناً تقدم حاصل ہے اور اب علیٰ حبہٖ کی ضمیر بہ تاویل کل واحد کے اُن کی طرف پھر سکتی ہے اور اب اضمار قبل الذکر کا اشکال بھی نہیں رہا۔ کیونکہ اضمار قبل الذکر وہ

ناجائز ہے جو لفظاً اور رتبۃً ہو۔ یہاں اگرچہ لفظاً ہے مگر رتبۃً اضمار قبل الذکر نہیں ہے۔ اب معنی یہ ہوئے کہ اُن کو جو کھلاتے ہیں اُن کی محبت کر کے کھلاتے ہیں۔ تو تیسرا ادب یہ ہوا کہ انہیں محبت و شفقت سے کھلائے۔

غرض پہلا ادب یہ ہوا کہ خدا کی محبت کی وجہ سے کھلاؤ۔ ناموری، شہرت اور تفاخر کی نیت سے نہ کھلاؤ۔

دوسرا یہ ہوا کہ عمدہ کھانا کھلاؤ۔

تیسرا ادب یہ ہوا کہ محبت اور شفقت سے کھلاؤ۔

یہ نہیں کہ کھلا پلا کے اور دے کے اُن سے شکریہ کے متوقع ہو۔ اے خدمت کرنے والو! مصارف خیر میں رقم دے کر کسی سے متوقع شکریہ کے مت ہو۔ اگر تم نے توقع شکریہ کی رکھی تو یاد رکھو اس کا حق ادا نہ کیا۔ کیونکہ دینے والے کا ادب تو یہ ہے۔

لا نرید منکم جزاء ولا شکورا

کہ ہم جو کچھ دیتے ہیں تم سے اُس کا اجر اور شکریہ نہیں چاہتے اور اے مہتمان یتیم خانہ و مدارس و انجمن تم بھی کسی کا شکریہ نہ ادا کرو۔ کیونکہ شکریہ تو اُسے ادا کرنا چاہیے جس کے ساتھ احسان کیا جائے۔

من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ۔

کا مطلب یہی ہے کہ اگر ہو سکے تو احسان کی مکافات کرو۔ اگر استطاعت نہ ہو تو مکافات دعا و تعریف سے کرو اور یہی شکریہ ہے مگر یہ شکریہ خواہ مکافات کے طور پر ہو یا دعا و تعریف کے طور پر اُسی شخص کے ذمہ ہے

جس کے ساتھ احسان کیا جائے بلکہ تمہارے شکریہ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہیں دیا ہے۔ اس سے ایک فہیم شخص کی حوصلہ افزائی کے بدلے اُسے بدظنی کا موقع مل سکتا ہے کہ شکریہ ادا کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود کھا جائیں گے بلکہ بجائے آپ کے انہیں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ کیونکہ ایک کام ہے جو انہیں کرنا چاہیے تھا آپ اُن کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ مال کا موقع پر صرف کرنا، حساب کتاب کو مرتب کرنا، جھگڑے اور دشواری کے کام ہیں جنہیں بجائے اُن کے آپ نے اپنے ذمہ لیا ہے اس لیے انہیں آپ کا ممنون ہونا چاہیے۔ نہ یہ کہ آپ اُن کا الٹا شکریہ ادا کریں ——،

مدرسہ دیوبند کے ایک جلسہ میں جو موتمر الانصار کی طرف سے میرٹھ میں منعقد ہوا تھا میں بھی تھا۔ وعظ میں میں نے کہا کہ اگر چندہ شکریہ کے لئے دیتے ہو تو جیب میں رکھو کیونکہ تمہارے چندہ سے ہمیں کیا فائدہ۔ وہ تو جس کام کے لئے تم دیتے ہو اُس میں صرف کر دیا جائے گا کچھ ہمیں تھوڑا ہی مل جائے گا جو ہم شکریہ ادا کریں بلکہ ہمارے شکریہ ادا کرنے سے ممکن ہے آپ کو شبہ پیدا ہو کہ شاید یہ خود کھا جائیں گے۔

اس شکریہ پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ ایک شاعر تو غلام امام شہید گزرے ہیں اور ایک شہیدی وہ۔ شہیدی اُن سے پہلے گزرے ہیں اور کلام بھی اُن کا اچھا ہے۔ ایک مرتبہ شہید کانپور میں آئے مشاعرہ ہوا انہوں نے غزل پڑھی بہت داد دی گئی۔ اس کے بعد لوگوں نے شرارت سے اُن

کے شرمندہ کرنے کے لیئے باہم مشورہ کیا کہ ایک تو شہیدی کی غزلیں پڑھے اور دوسرے معمول کے موافق خوب داد دیں اور اُن کے اشعار سے زیادہ داد دیں مگر انہوں نے یہ حرکت کی کہ جب کوئی داد دیتا آپ اُس کی طرف متوجہ ہو کے کہتے تسلیمات، تسلیمات!! لوگوں نے کہا یہ کیا، آپ کس بات کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ آخر میری بیوی ہی کی تو غزلیں ہیں۔ دیکھو! شہید اور شہیدی یعنی بقاعدہ اردو یائے تانیث ہے۔ لوگ اُن کے اُس لطیفہ سے بہت ہی شرمندہ ہوئے۔

تو جیسے اُن کی تسلیمات تسلیمات کی بنا دیہ تھی کہ من وجہ یہ اشعار اپنے سمجھے ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی اسی بنا پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ پرائے مال کو یہ سمجھتا ہے کہ گویا مجھ کو دیئے جانے سے میرا ہو گیا۔ جب تو شکریہ ادا کرتا ہے۔ تو صاحب ایسے مہتمم کو تو بدل دینا چاہیئے جو چندہ کے مال کو اپنا سمجھے کیونکہ اُس کا شکریہ گویا نوٹس ہے کہ میں خود کھاؤں گا۔

اگر آپ یہ کہیں کہ ہمارا کچھ خرچ نہیں ہوتا اور شکریہ سے دینے والے کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ تو میں کہوں گا کہ آپ روزہ رکھنے والوں اور نماز پڑھنے والوں کا کیوں نہیں شکریہ ادا کرتے۔ حالانکہ جس طرح وہ عبادت ہے اسی طرح یہ بھی عبادت ہے۔ جس طرح وہاں حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے یہاں بھی ہے۔ مگر وہاں تو آپ کہیں گے کہ نماز پڑھی یا روزہ رکھا تو اپنے لئے ہمیں کیا فائدہ۔ یہی جواب میں یہاں کے لیئے کہوں گا کہ چندہ دیا اپنے لئے تمہارا کیا بھلا کیا۔ واللہ مجھے تو شکریہ سے غیرت آتی ہے۔ غایت ما فی الباب

میری رائے عرف و مصلحت کے خلاف ہے مگر میں یہ کہوں گا کہ ہمارے مضامین تو حقیقت کے موافق ہیں ہم عرف کو نہیں جانتے ؎

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں

ما نمے خواہیم ننگ و نام را

جو کچھ ہم کہتے ہیں یہ دیکھئے کہ منقول بھی ہے یا غیر منقول ۔ اگر منقول ہے تو وہ معقول بھی ہے کیونکہ شریعت کے احکام عقل کے خلاف نہیں ہیں۔ خلاصہ یہ کہ لا نرید منکم جزاء ولا شکورا ۔ دینے والوں کو تو شکریہ کی توقع نہ رکھنی چاہیئے البتہ لینے والوں کو جب کہ انہیں کو دیا جاوے، شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔

غرض ایک اصلاح تو یہ ہے کہ انہیں کھانے پینے کو دو اور قدر و منزلت کے ساتھ دو۔ تقریبات میں جس طرح اپنے عزیزوں کو کھلاتے ہو، اسی طرح اُن کو بھی کھلانا چاہیئے۔ لیکن میری رائے میں کھانے کے لیے اُنہیں گھر پر نہیں بلانا چاہیئے، بلکہ انہیں کے ٹھکانے پر کھانا بھیج دینا چاہیئے کیونکہ آج کل لوگ انہیں ذلیل سمجھتے ہیں اور ان کی جماعت پر طرح طرح کے آوازے کستے ہیں۔

جب میں جامع العلوم میں تھا ایک بزرگ میرے یہاں مہمان تھے بامِ نارائن گنج کے بازار کے ایک غریب مسلمان حلوائی نے میری اور میرے مہمان کی اور دو ایک طالب علموں کی دعوت کی تھی۔ تو ہم سب جارہے تھے۔ ایک گلی میں پہنچے تو ایک صاحب جنہوں نے مجھے نہیں دیکھا ورنہ ضرور لحاظ

کرتے ہیں اور ساتھیوں کو دیکھ کر کیا کہتے ہیں کہ خدا خیر کرے نہ معلوم آج کس کے گھر پر چڑھائی ہے۔ مجھے یہ فقرہ سُن کر بہت ناگوار ہوا۔ جی میں آیا کہ لوٹ جاؤں۔ پھر خیال ہوا کہ لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ۔ بلانے والے کا اس میں کیا قصور ہے جو اُسے سزا دی جائے۔ خیر جب میں لوٹ کر آیا تو میں نے مدرسہ کے سرپرستوں کو جمع کر کے یہ واقعہ بیان کیا اور یہ مشورہ دیا کہ یہ قانون مقرر کر دو کہ جس کو طلبا کی دعوت کرنا ہو، وہ مدرسہ ہی میں کھانا بھیجے طلبا کہیں نہ جائیں گے۔ بلا سے دعوتیں کم ہوں گی مگر ذلت تو نہ ہوگی۔ چنانچہ یہ قاعدہ جب ہی سے چلا آتا ہے۔

اسی طرح میرا دل نہیں گوارا کرتا کہ یتیموں کی ذلت ہو۔ اُن کی عزت کی بھی اور راحت کی بھی سب مستحقین سے زیادہ ضرورت ہے کیوں کہ اور مستحقین تو اپنے حقوق کا اظہار کر کے مطالبہ بھی کر سکتے ہیں اور یہ بچے ہیں انہیں نہ اظہار کا سلیقہ نہ مطالبہ کی ہمت، اس لئے یہ اپنا حق بھی وصول نہیں کر سکتے۔ پھر اوروں کے ساتھ تو اگر کوئی بے اعتنائی کرے تو وہ دوسری جگہ چلے جائیں گے اور یہ سوا اس کے کہ رو لیں اور کیا چارہ ہے۔

الا تا نگرید کہ عرش عظیم   بلرزد ہمی چوں بگرید یتیم

دیکھو! خبردار ہو کہ یتیم روتا ہے تو عرش عظیم کانپ اٹھتا ہے۔ اگر کوئی طالب علم کے ساتھ بے اعتنائی کرے۔ تو وہ یہ جانتا ہے کہ کانپور میں نہ رہیں گے سہارنپور چلے جائیں گے۔ سہارنپور میں گذر نہ ہوگا دیوبند چلے جائینگے غرض بہت سے ٹھکانے ہیں مگر یہ غریب کہاں جائے گا کیونکہ بچہ ہے

ہاں بالغ ہو تو وہ یتیم ہی نہیں۔

جیسے ایک داڑھی مونچھ والے طالب علم میرے پاس آئے تھے کہ میں یتیم ہوں اور اُن کے اس مضحکہ میں وہ اہل ضابطہ بھی شریک ہیں جنہوں نے بلوغ کی ابتدائی حد اٹھارہ یا انیس سال رکھی ہے۔ اس حساب سے تو بعض اوقات باپ بھی بن جائے گا اور نابالغ ہی رہے گا۔ تو ایسے ضابطہ کا نابالغ یتیم نہیں یتیم تو وہی ہے جو واقعی نابالغ ہو اور اُس کا باپ مرجائے۔ بہر حال یہ زیادہ قابل رعایت ہے۔ اور وہ رعایت صرف یہی نہیں ہے کہ چندہ دے دیا اور سبکدوش ہو گئے۔ اُن کو اپنی تقریبات میں بھی مدعو کرو اور اُن کے ٹھکانے پر کھانا بھیجو اور بہت اچھی صورت یہ ہے کہ کھانا بھی بھیجو اور خود بھی وہاں کھلانے کے لیے جاؤ تاکہ اُن کا کھلنا بھی دیکھو۔

ایک عورت کا ذکر ہے کہ وہ اپنے بچے کو تو پیدل چلاتی تھی اور سوتیلے بچہ کو گود میں لیے لیے پھرتی تھی۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ کیسی شفقت اور ہمدردی ہے اس کے مزاج میں۔ خود اُس سے پوچھا تو کہنے لگی کہ اسے اس لیے گود میں رکھتی ہوں کہ اس کا چلنا پھرنا، کھیلنا کودنا مجھے ناگوار ہوتا ہے جب اسے کھیلتے دیکھتی ہوں تو آگ لگ جاتی ہے۔ اور یہ بھی مطلب ہے کہ یہ گود میں پڑے پڑے آرام طلب اور کاہل بن جائے اور اس کے پیروں میں قوت نہ پیدا ہونے پائے۔ بظاہر شفقت تھی اور باطن عداوت تھی۔

دشمن ار چہ دوستانہ گویدت　　دام داں گرچہ ز دانہ گویدت
زانکہ صیاد آورد بانگ صفیر　　تا کہ گیرد مرغ را آں مرغ گیر

تو یہ بھی محبت کا اقتضا ہے کہ اپنے بچوں کا چلنا پھرنا، کھیلنا کودنا اچھا معلوم ہوتا ہے بلکہ کھیلتے کودتے دیکھ کے بھی پیار آتا ہے اور ان سے محبت بڑھتی ہے۔ تو خود جانے میں یہ منظر بھی دیکھنے میں آئے گا۔ کوئی کھیلتا ہے، کوئی گاتا ہے، کوئی چیختا ہے لیکن خود اگر جائیے تو محض تماشاہی دیکھتے جائیے، اور منتظم کے اختیارات میں دخل نہ دیجئے۔ جو کچھ بھیجئے اسے منتظم کے سپرد کر دیجئے کہ وہ جس طرح مناسب سمجھے تقسیم کرے۔

اگر کوئی کہے کہ یہ تو تماشا دیکھنے کی تعلیم دیتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے اپنے دل کے سخت ہونے کی شکایت کی، تو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یتیموں کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو تو دل نرم ہو جائے گا۔ کیونکہ جس قلب میں قساوت ہے وہ خدا سے دور ہے اور اس کا علاج بتاتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہ یتیموں کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو۔ مطلب یہ کہ ان کی سرپرستی کرو جس کا حاصل ترحم و ہمدردی ہے۔ سبحان اللہ! حضورؐ کیسے شفیق ہیں۔ کتنی سہل ترکیب بتا دی کہ یتیموں کے سر پر ہاتھ پھیرو، دل نرم ہو جائے گا۔

تو یہ تماشا نام کا ہے ورنہ واقعہ میں ہمدردی کی ترکیب ہے۔ الغرض اس طرح قاری سے کھلانا چاہئے۔ ہاں اور سنئے تقریبات کے علاوہ بھی کبھی کوئی اچھی چیز پکا کرے تو بھیج دیا کرو۔ اور اگر محض تقریبات ہی پر اکتفا

کروگے تو یہ اُن کے اعتبار سے بتعیدات ہو جائیں گی اور یہ خیال نہ کرو کہ چیز تھوڑی سی ہے۔ اگر تمہارے بہت سے بچے ہوں اور چیز تھوڑی ہو تو آخر بانٹوگے۔ اسی طرح ان کا بھی حصہ لگاؤ۔ اب مہتمم کو اگر تھوڑی چیز تقسیم کرنے میں دقت ہو تو باری مقرر کر دے۔

اسی طرح محض چندہ اور کھانے ہی پر اکتفا نہ کرو بلکہ یہ التزام بھی کرلو کہ جب اپنے بچوں کے کپڑے بناتے تو کم از کم ایک جوڑا اُن کے لیے بھی بنا دیا۔ اگر ایسا ہونے لگے تو یتامیٰ کو کافی امداد پہنچ جائے مثلاً یہاں چار پانچ جوڑے روزانہ بننے کا اوسط ہوگا۔ اس حساب سے اگر ایک جوڑا روز کے اوسط سے یتیم خانہ میں بھیج دیا کریں تو تین سو ساٹھ جوڑے سال بھر میں اکٹھے ہو جائیں اور سو یتیموں کے ایک سال کے لئے کفایت کر جائیں۔ اور یہ التزام کسی کی خاطر یا رعایت سے نہ ہونا چاہیئے بلکہ آپ کو یتامیٰ سے تعلق ہونا چاہیئے اور وہ تعلق ایسا ہو کہ وہ اپنے ماں باپ کو بھول جائیں۔ اور آپ کے وجود اور سرپرستی کو غنیمت سمجھیں۔ یہ تو اصلاح فی المال کا بیان تھا۔

تربیتِ یتامیٰ

ایک ہے اصلاح فی الحال یعنے اس کا بھی انتظام کرنا چاہیئے کہ وہ آیندہ اپنی بسر اوقات میں کسی کے دست نگر نہ رہیں۔ اس کے لئے انہیں کچھ صنعتیں سکھا دینی چاہئیں تاکہ وہ یتیم خانہ سے نکل کر بھیک نہ مانگیں اور ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ نقریریں اور نظمیں سکھلاویں۔ یہ طریقہ بہت مضر ہے۔

اس کے لئے یہ قانون مقرر کر دینا چاہیئے کہ جو کم از کم جلالین اور مشکوٰۃ شریف پڑھے اُسے تقریر سکھلائی جاوے۔ اور اس سے پہلے تقریر سکھلانے میں بڑا ضرر یہ ہے کہ اگر یہ علم میں ادھورہ رہ گیا تو لوگوں کی خواہش کے موافق تقریریں کر کے کما کھائے گا جس سے سخت گمراہی پھیلے گی۔ ہاں تفسیر و حدیث پڑھے تو اگرچہ وہ کامل الاستعداد نہ ہو مگر اُسے حق تو ہے تقریر کا اور جو شخص تفسیر حدیث نہیں جانتا اُسے تو حق ہی نہیں۔ اگر اس حالت میں انہیں تقریر سکھادی گئی یا نظمیں یاد کرادی گئیں تو پھر اُن سے محنت نہیں ہوگی بلکہ مولود شریف اور معراج شریف پر نذرانے ٹھہرا ٹھہرا کر کمائیں گے اور کھائیں گے۔

میں نے سنا تھا کہ قصبہ بوڑھانے میں ایک واعظ صاحب آئے تھے جو آٹھ آنہ سے لے کر پانچ روپیہ تک کا وعظ کہتے تھے۔ میں نے کہا کسی نے اُن کے دونوں وعظ سُنے بھی ہیں کہ کیونکہ یہ فرق ہوتا ہے۔ ایک شخص نے کہا کہ میں نے دونوں وعظ سُنے ہیں۔ ایک بیچارے نے ایک مرتبہ آٹھ آنے والا وعظ کرایا تھا تو بہت ہی دھیمی آواز میں اور نہایت مختصر بیان میں ختم کر دیا۔ نہ شعر پڑھے نہ روئے۔ اُس نے کہا، مولوی جی تھوڑا سا اور کہہ دو۔ تو کہتے ہیں کہ کیا تو آٹھ آنہ میں جان لے گا۔ اور جو پانچ روپیہ والا وعظ تھا اُس میں خوب چلا چلا کر شعر بھی پڑھے اور روئے بھی غرض بغیر علم کے تقریر اور نظمیں سکھلانے کا یہ اثر ہوتا ہے ؎

زیاں می کند مرد تفسیر داں   کہ علم و ادب می فروشد بناں

تفسیر داں نہیں بلکہ تقریر داں کہنا چاہیے۔ ایک اور واعظ صاحب وعظ کہنے بیٹھے تو پہلے آپ نے تلاوت کی اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ اور ترجمہ کیا ہم نے آپ کو مثل کوثر کے دی۔ لَکَ کا ترجمہ تو آپ کو ہو گیا اب یہ مثل کا ہے کے معنی ہوئے۔ ایک عالم بھی وہاں موجود تھے، انہوں نے کہا مولانا یہ مثل کا ہے کا ترجمہ فرمایا؟ آپ کہتے ہیں کہ یہ ترجمہ کاف کا ہے۔ لَکَ الکوثر میں یہ کاف تشبیہ کا کہلاتا ہے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ حضرت یہ کاف تشبیہ کا نہیں ہے خطاب کا ہے۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ کاف تشبیہ کا نہیں ہے۔ اور جاہلوں کا مجمع تھا اور ایسے مقام پر تو جاہل ہی غالب آتے ہیں کیونکہ علم سے اُن کا جواب نہیں ہوتا۔ ایسی جہالت کا جواب جہالت ہی سے ہوتا ہے۔

ایک گاؤں کا قصہ ہے کہ ایک شخص وہاں مولوی بن کے رہتا تھا اور جو واقعی اہل علم وہاں جاتے تھے اُن کا رنگ نہ جمنے دیتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک مولوی صاحب وہاں پہنچ گئے۔ وہ تھے بہت ذہین۔ اس جاہل نے عوام کے سامنے اُن کا بھی امتحان لیا کہ مولوی صاحب، یہ بتلاؤ، ایمان نقطہ دار ہے یا بے نقطہ۔ مولوی صاحب پہلے تو چپ ہوئے کہ یہ کیا خرافات بکتا ہے اس کے بعد سوچ کر کہنے لگے کہ بے نقطہ ہے۔ اس نے کہا، ہاں یہ تو ٹھیک ہے مگر کیسے؟ مولوی صاحب نے ذہانت سے ایک بات پیدا کر کے کہا کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ جو ایمان کا کلمہ ہے اس میں نقطہ نہیں ہے۔ کہنے لگا یہ غلط ہے یہ وجہ نہیں ہے بلکہ یہ وجہ ہے کہ جب کوئی پوچھتا

ہے کہ تم مسلمان ہو تو دوسرا کہتا ہے الحمد للہ اور اس میں نقطہ نہیں۔ انہوں نے کہا، واہ غلط کہتے ہو خالی الحمد للہ کون کہتا ہے بلکہ شکرا لحمد للہ کہتے ہیں اور اس میں تین نقطے ہیں۔ اس لیے یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ بس وہ مارا گیا اور گاؤں والوں نے اُسے نکال کے انہیں رکھ لیا۔ تو صاحب جاہلوں سے جیتنا بڑا ہی مشکل ہے۔

تو مولوی صاحب اس سوال سے بڑے گھبرائے کہ اب اس کو کیونکر سمجھاؤں کہ یہ کاف تشبیہ کا نہیں۔ بس ایک بات سمجھ میں آگئی۔ کہنے لگے کہ کاف تشبیہ کا گول گول لکھا جاتا ہے اور یہ لمبا لمبا ہے۔ وہ جاہل لاجواب ہو کر کہنے لگا ہاں ٹھیک ہے اب خیال رکھوں گا۔

ایک اور جاہل سہارنپور میں آیا مسجد میں آپ نے پکار دیا، بھائیو! اُواج (وعظ) ہو گا۔ خیر لوگ جمع ہو گئے۔ آپ نے منبر پر پڑھ کے وعظ شروع کیا۔ پہلے تو تین دفعہ لیسین لیسین لیسین پڑھی پھر یہ ترجمہ کیا کہ اے محمدؐ اے محمدؐ! اگر تجھے پیدا نہ کرتا نہ آسمان پیدا کرتا نہ زمین پیدا کرتا۔ یہ کہہ کے کہنے لگا بھائیو دعا مانگو آج تھکے ہارے ہیں۔ آدھا آج ہوا آدھا کل ہو گا۔ وہاں ایک مولوی صاحب بھی تھے جو نابینا ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے کسی سے کہا ذرا ان واعظ صاحب کو میرے پاس لانا۔ خیر وہ لائے گئے۔ مولوی صاحب نے پوچھا مولانا آپ کی تحصیل کہاں تک ہے۔ کہنے لگا ہماری تحصیل بڈھانہ ضلع میرٹھ ہے۔ اُنہوں نے پوچھا، صاحب آپ نے کیا کیا پڑھا ہے کہنے لگا وفات نامہ ہم نے پڑھا ہے، ہرنی کا معجزہ ہم نے پڑھا ہے۔

دائی حلیمہ کا قصہ ہم نے پڑھا ہے اور تو کیا جانے اندھے۔ مولوی صاحب نے معذور سمجھ کے چھوڑ دیا۔

تو ایسے ایسے واعظ ہیں جو کھاتے کماتے پھرتے ہیں۔ ع

آدمیاں گم شدند ملک خدا خر گرفت

آہ! کوئی اصلاح کرنے والا نہیں۔ لوگ یہ الزام دیتے ہیں کہ علماء اصلاح نہیں کرتے۔ میں کہتا ہوں اُن کی اصلاح تو عوام ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر یہ ایسے جاہلوں کے وعظ نہ سنیں تو یہ خود وعظ کہنا چھوڑ دیں مگر لوگوں کو خدا جانے کیا ہوا ہے کہ ایسے جاہلوں کے وعظ میں مزہ آتا ہے ؎

ہر کسے روز می طلبد از ایام — مشکل این است کہ ہر روز بتر می بینیم
اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالان — طوق زریں ہمہ در گردن خر می بینیم

اس لئے میں کہتا ہوں ایسے واعظ انجمن یتیم خانہ اور مدرسہ سے نہ نکلیں اس کی یہی صورت ہے کہ بجائے تقریر کے انہیں صنعتیں سکھلانی چاہئیں۔ مثلاً درزی کا کام، لوہار بڑھئی کا کام وغیرہ۔ بس یہ تعلیم صنعت اصلاح بدن فی المال تھی۔ اب ایک اصلاح اس اصلاح جسمانی سے زیادہ قابل اہتمام ہے۔

اصلاح روح

وہ اصلاح روح کی ہے اور یہ دو چیزوں سے ہوتی ہے ایک علم سے اور ایک عمل سے۔ پھر اُن میں عمل علم سے بھی زیادہ ضروری ہے مگر اس کے برعکس کہیں کہیں علم پر تو توجہ بھی ہے مگر عمل کی تو بالکل ہی پروا نہیں ہے اور

علم کے متعلق میں کہتا ہوں کہ خواہ عالم نہ بنائیں مگر قرآن مجید اور چھوٹے چھوٹے رسائل ضروری مسائل کے اردو میں تو ضرور ہی پڑھا دیں۔ اس کے بعد پھر صنعت سکھا دیں۔ اور جسے دیکھیں کہ ہونہار ہے اور علم کی صلاحیت اور مناسبت بھی رکھتا ہے اُسے درزی، لوہار وغیرہ کا کام نہ سکھائیں اُسے عالم بھی بنائیں اور قوم سے اُس کے تعلیم کے اخراجات کے لیے وظیفہ بھی دلائیں کیونکہ قوم کو علماء کی بہت ضرورت ہے۔ اور اگر علم سے مناسبت نہ دیکھیں تو پھر کوئی پیشہ ضرور سکھا دیں تاکہ بھیک نہ مانگیں اور اپنی محنت سے زندگی بسر کر سکیں۔

علم سے زیادہ ضرورت اخلاق و عادات کی اصلاح کی ہے جو کہ اصلاح روح یا عمل بالدین ہے۔ اس طریق سے کہ اُن کے اعمال کی نگرانی کریں بات خلاف شرع نہ ہونے دیں۔ کوئی ناجائز حرکت یا شرارت کریں تو اُن پر تنبیہ کریں۔ نماز کی تاکید کریں اور انہیں اُس کا پابند بنائیں نہ پڑھیں تو سزا دیں۔ مگر افسوس ہے کہ اخلاق کی اصلاح جس قدر زیادہ ضروری ہے اسی قدر اس سے لاپروائی ہے۔ شاگردوں کی مولانا کو فکر نہیں، مریدوں کی پیر کو نہیں غرض حلال حرام مناسب نامناسب کی اُن کو کچھ خبر نہیں۔

میرا جی ایک واقعہ سے بہت خوش ہوا۔ لکھنؤ کے زمانہ قیام میں میرے چند احباب بھی میرے ہمراہ تھے اور احباب وہ تھے جن کے اعمال کی میں نے نگرانی کی تھی۔ جہاں قیام تھا وہاں ایک خطوط رساں ایک بیرنگ کارڈ لایا۔ میں اتفاق سے اس وقت نہ تھا۔ ایک دوست نے بدون میری اجازت

کے بیرنگ خط لینے سے انکار کیا تو خطوط رساں نے کہا کہ پڑھ کے واپس کر دیجئے اور مکتوب الیہ کو مضمون کی اطلاع کر دیجئے۔ میں اس سے بہت ہی خوش ہوا کہ اُنہوں نے اُسے یہ جواب دیا کہ بغیر محصول دیئے ان کا پڑھنا بھی جائز نہیں ہے۔

میں بقسم کہتا ہوں کہ الحمد للہ جس پیمانہ پر میں نے اپنے دوستوں کو پہچاننا چاہا وہ پہنچ گئے۔ تو مجھ کو یہ واقعہ بکثرت پیش آتا ہے کہ ڈاک میں اکثر خطوط ایسے آجاتے ہیں جن کے ٹکٹوں پر مہر نہیں ہوتی مگر میں سب سے پہلے ایسے ٹکٹوں کو چھڑا کر چاک کر ڈالتا ہوں۔ اس کے بعد خط پڑھتا ہوں۔ گو میں خلوت میں ہوتا ہوں اور میں اگر اس ٹکٹ کو دوبارہ استعمال کروں تو کسی کو پتہ بھی نہ چل سکے مگر خدا تو دیکھتا ہے۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ گورنمنٹ کے قوانین میں یہ قوت نہیں کہ آدمی چھپ کر بھی ارتکاب جرائم نہ کر سکے۔ یہ صرف خدا ہی کے قانون میں طاقت ہے کہ وہ خلوت و جلوت میں یکساں نافذ ہے۔ بس سوائے خوف خدا کے دنیا کے کسی قانون میں یہ طاقت نہیں کہ وہ آدمی کو جرائم سے باز رکھے جس شخص کے دل میں خوف خدا ہو اگر وہ ہزار پردوں میں ہو مگر کبھی متزلزل نہ ہوگا تو دیکھئے جس چیز میں یہ اثر اور برکت ہے افسوس کہ اسی کا اہتمام نہ ہو اور دین تو دین میں بقسم کہتا ہوں اگر اعمال و اخلاق درست ہو جاویں تو دنیا بھی درست ہو جاوے۔ دنیوی پریشانیاں جو ہم کو پیش آرہی ہیں اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہمارے اعمال ظاہری و باطنی درست نہیں حتیٰ کہ حدیث شریف

میں ہے کہ سلاطین کا تشدد بھی خدا تعالیٰ کی نافرمانی سے ہوتا ہے۔ پس اگر سلاطین ہماری مرضی کے خلاف ہیں تو اُن کو اپنے موافق بنانے کے لئے اپنے اخلاق شریعت کے موافق کرلو ورنہ محض اُن کی شکایت سے کیا فائدہ۔ حدیث شریف میں ہے کہ ظالم بادشاہوں کو بُرا نہ کہو کیونکہ اُن کا قلب میرے ہاتھ میں ہے۔ جب میرے بندے میری نافرمانی کرتے ہیں میں بادشاہوں کے دلوں کو سخت کر دیتا ہوں۔ تو تم میری فرمانبرداری کرو تاکہ میں اُن کے دلوں کو نرم کر دوں۔

ایک مرتبہ جب شروع طاعون کا زمانہ تھا میں بھی یہاں (کانپور میں) تھا تو بعض دوستوں نے جلسہ کرکے حکام کو توجہ دلانا چاہی۔ اس میں مجھ سے شرکت چاہی۔ میں نے کہا ٹھہر جاویں ذرا حافظ علیہ الرحمۃ سے پوچھ لوں۔ پھر میں نے دیوان حافظ دیکھا تو یہ شعر نکلا ؎

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

رموز و مصلحت ملک خسرواں دانند

یعنی تم ایک گدائے گوشہ نشین ہو تمہیں شور و غل نہیں کرنا چاہیے

اپنے ملک کی مصلحتیں بادشاہ ہی جانتے ہیں۔

میں نے کہا کہ دیکھو بھائی حافظ صاحبؒ تو منع کرتے ہیں اور لطیفہ دیکھو حافظا کہا ہے اور میں حافظ بھی ہوں۔ اب میں تو شرکت کر ہی نہیں سکتا لیکن تمہیں بھی یہی رائے دیتا ہوں کہ جلسہ نہ کرو۔ بس پانچ سو مرتبہ لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم تسبیح لے کر پڑھو اور خدا سے دعا کرو۔ چنانچہ کیا گیا۔ اس کے

بعد ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ صاحب کلکٹر نے رپورٹ کی کہ یہاں طاعون وغیرہ کچھ نہیں ہے لہذا قرنطینہ اٹھا لیا جاوے۔ چنانچہ جب سے اب تک جامع مسجد میں روزانہ بعد نماز عصر لاحول کا ختم ہوتا ہے۔

غرض طریق تو یہ ہے مگر اب تو خدائے تعالیٰ سے ایسی بے تعلقی ہے کہ گویا اُن کے ہاتھ میں کوئی کام ہی نہیں سمجھتے۔ بہت سے بدعقیدہ تو یہاں تک بڑھ گئے کہ خدا کی پناہ۔

مکہ معظمہ میں ایام حج میں حافظ احمد حسین کے پاس ایک درویش وضع شخص کچھ امانت لایا کہ اسے رکھ لیجئے۔ اُنہوں نے کہا کہ میاں میں کیا چیز ہوں رکھ جاؤ اور اللہ کے سپرد کر جاؤ۔ تو کہنے لگا کہ اُن کے سپرد تو ہرگز نہ کرنا چاہئے دیکھئے ——— !!

حکایت ہے کہ ایک شخص جب کہیں جاتا تھا تو اپنے اسباب کو بڑے پیر صاحب کے سپرد کر جاتا تھا۔ ایک مرتبہ اُس کے بھائی نے اللہ کے سپرد کر دیا۔ اتفاق سے اس روز چوری ہو گئی۔ جب وہ آیا تو اُس نے کہا کہ تو نے اُن کے ناحق سپرد کیا۔ وہ تو اِدھر کا اُدھر کیا ہی کرتے ہیں اور پھر اُن سے تو کوئی باز پرس نہیں کر سکتا بڑے پیر صاحب کے سپرد کرتے تو وہ خدا کی باز پرس کے خیال سے اچھی طرح حفاظت کرتے۔

الغرض اللہ سے اس قدر بدگمانی ہے کہ زمانہ طاعون میں دعا تک نہیں کرتے اور جیسے ویسے کرتے ہیں۔ الغرض یہ سب باتیں اس وجہ سے ہیں کہ خدا سے تعلق کم ہے۔ اس تعلق کو بڑھاؤ اور یہ بڑھتا ہے علم و عمل اور اصلاح

سے۔ تو یتیموں کے لیئے اس کا بھی اہتمام رکھو۔
خلاصہ یہ کہ روحانی و جسمانی اصلاح اُن کی کرنی چاہیئے اور بڑی قدر اُن کی اس لیئے بھی کرنی چاہیئے کہ اُن کا لقب ہے یتیم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی وہی لقب یتیم عطا فرمایا گیا الم یجدلک یتیما فاوی تو اُن کے لیئے یہ بڑا شرف ہے۔ یہ محبوب خاص کے ساتھ اُن کی حالت میں مشابہت رکھتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ہر طریقہ سے اُن کی رعایت کیا کریں اور چندہ بھی دیا کریں خواہ دوامی یا یکمشت اور مہتمم کے ذمہ یہ ہے کہ اُن کے کھانے پینے کی آسائش کا خیال رکھیں اور اُن کی اصلاح اخلاق کے قواعد مقرر کریں۔

تربیتِ اخلاق

میں نے یہاں کی حالت کا معائنہ کیا۔ اُس وقت قواعد دیکھنا بھول گیا۔ اس لیئے معلوم نہیں کہ اخلاق کی حالت کا کیا انتظام ہے۔ سو اب بتلاتا ہوں کہ تعلیم کا انتظام اتنا ضروری نہیں جتنا تربیت اخلاق کا اہتمام ضروری ہے۔ صحابہ کون سے پڑھے ہوئے تھے۔ ہاں اُن کے اخلاق نہایت اعلیٰ درجے کے تھے۔ بس یہ بھی اگر نہ پڑھیں تو مضر نہیں ہاں اخلاق درست ہوں۔ اور اس کے لیئے قواعد مقرر ہونے چاہیئیں۔ مثلاً یہ کہ دو لڑکے آپس میں دوستی نہ کرنے پائیں کیونکہ یہ دوستی فساد کی جڑ ہے۔ یہ بہت سے منہیات کا ارتکاب کراتی ہے۔ بس نہ دوستی ہو نہ دشمنی اور اس طور پر آپس میں رہیں ؎

بہشت آں جا کہ آزارے نہ باشد
کسے را با کسے کارے نہ باشد

آج کل لوگ کہتے ہیں کہ اتفاق ہونا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ مگر بچپن کے اتفاق میں فساد کا احتمال ہے اس لئے بالغ ہونے کے بعد دوستی ہونی چاہیے اور بچپن میں یہی دوستی ہے کہ دشمنی نہ ہو۔ اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ اُن کا لباس متکبرانہ نہ ہو۔ قصداً اُن سے ایسے کام لیں کہ تکبر پیدا ہی نہ ہونے پائے اپنے کام تو اُن سے نہیں لینا چاہیے کیونکہ نابالغ سے منتفع ہونا جائز نہیں البتہ ایسے کام لو جس میں اُن کا نفع بھی ہو۔ کیونکہ یہ ابھی اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ کام لینے میں اُن کی اصلاح مد نظر ہونی چاہیے۔ اپنی غرض ملحوظ نہ ہونی چاہیے۔ اس کا بھی خیال رکھیں کہ اُن میں حرص بھی پیدا نہ ہونے پائے۔ نیز اُنہیں امراض شہوانیہ جاہ سے بھی بچانا چاہیے بس اس طرح کی نگرانی باعث اجر عظیم ہے۔

ان یتیموں کا حق اس وجہ سے بھی ہے کہ وہ یتیم ہیں اور اس وجہ سے بھی ہے کہ جب وہ یتیم ہیں تو غالباً مسکین بھی ہیں۔ اب دو حیثیتیں پیدا ہو گئیں اور غالباً کا لفظ اس لئے کہا کہ اگر مسکین نہ بھی ہو تب بھی یتیم ہونا ہی اُن کے استحقاق کے لئے کافی ہے۔

تعلیم نسواں

آخر میں تربیت کے متعلق ایک اور مسئلہ بحث کے قابل رہ گیا اور وہ تعلیم نسواں کا مسئلہ ہے کیونکہ جب یتیم خانہ ہے تو یہاں یتیم لڑکے بھی آئینگے اور یتیم لڑکیاں بھی آئیں گی مگر تعلیم نسواں کا مسئلہ بڑا مشکل ہے۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جہاں مدرسہ لڑکیوں کا ہوتا ہے وہاں مفاسد بھی ضرور پیدا ہوتے ہیں

کہیں آنکھ لڑ گئی کہیں اور بے حیائی کی باتیں ہوتی ہیں۔ ایسے واقعات بہت ہوتے ہیں۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ بڑے بوڑھوں کا طبقہ تو خود تعلیم نسواں ہی کا مخالف ہو گیا۔ حالانکہ یہ مخالفت غلطی پر مبنی ہے کہ اس میں تعلیم کا قصور نہیں بلکہ منتظمین اور طرز تعلیم کا قصور ہے ورنہ تعلیم دین تو وہ چیز ہے کہ

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ

خدا سے ڈرنے والے علماء ہی ہوتے ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ اکثر ایسے مدارس اُن ہی لوگوں کے زیر اہتمام ہیں جو علم دین سے بالکل بے بہرہ ہیں اور اسی وجہ سے اُن کا طرز تعلیم بھی اچھا نہیں ہے اور نصاب بھی ناقص ہے۔ سو اس کے لئے ایک تو چند رسالے ایسے ہونے چاہئیں جن میں دینیات کے مسائل روزہ، نماز، طہارت اور ضروری احکام نکاح، طلاق اور بیع شراء وغیرہ کے ہوں اور عقائد ضروریہ کچھ قیامت کے واقعات مختصر سی نیک بیبیوں کی تاریخ اور کچھ سلیقہ کی باتیں سینے پرونے وغیرہ جو خانہ داری کے لئے ضروری ہیں۔ کچھ بیماریاں اور اُن کے علاج کا بھی بیان ہونا چاہیئے کہ بال بچے والے گھر میں اس کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے لیے بہشتی زیور کے مکمل حصے بہت کافی ہیں اور اگر بہشتی زیور ناپسند ہو تو اور کوئی رسالہ جن میں یہ مضامین ہوں جمع کر لینا چاہیئے یا بہشتی زیور ہی میں جو ناپسند ہوں خوشی سے اجازت دیتا ہوں کہ حذف کر دیا جاوے بلکہ اس میں جو مصارف ہوں گے بقدر امکان و وسعت میں بھی بطور چندہ کے اس میں امداد دینے کو تیار ہوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ جو عبارت کاٹی جاوے یا بڑھائی جاوے اُسے حاشیہ پر ظاہر کر دیا جاوے کہ اصل میں

یوں تھا اور اب یوں بنائی گئی اور کوئی مضمون شرع کے خلاف نہ ہو۔
یا یہ کہ آپ بہشتی زیور کو آگ لگائیے اور اپنی عبارت میں کوئی ایسی کتاب لکھ دیجئے۔ میں اپنے دوستوں کو ایک اشتہار دے دوں گا کہ وہ بہشتی زیور کو ترک کر دیویں اور یہ نئی کتاب جو اس کے ہم مضمون ہے بجائے اس کے لے لیں مگر یہ کچھ نہیں ہو گا۔ وہ تو سارا بہشتی زیور ہی بعض مسائل سے اختلاف ہونے سے ردی ہو گیا۔ ایک پسو کمبل میں گھس گیا تو سارا کمبل ہی جلا دیا۔ ارے پسو ہی نہ نکال ڈالو۔ جو مضمون ناپسند ہو وہی نہ حذف کر دو مگر بشرطیکہ حاشیہ پر ظاہر کر دو جیسا اوپر عرض کیا ہے۔ اور خیر اگر تمہیں اس سے ضد ہی ہے تو جانے ہی دو۔ اور علماء کے رسائل کا انتخاب کر لو مگر اسی شرط سے کہ ان میں عبادات، معاملات، ترہیب و ترغیب اور اخلاق و تہذیب کے مضامین اور ضروری معاشرت کی باتیں بھی ہوں۔ یہ ہے نصاب کامل جس کی تعلیم نسواں کے لیے ضرورت ہے۔

مگر آج کل خدا جانے کیا خبط ہے کہ عورتوں کو بھی نئی تعلیم دلانا چاہتے ہیں۔ بھلا بتائیے جغرافیہ کی تعلیم کی عورتوں کو کیا ضرورت؟ اس سے انہیں کیا فائدہ ہو گا بجز اس کے کہ بھاگنے کا طریقہ معلوم ہو جاوے گا کہ غازی آباد جنکشن ہے وہاں سے ریل بدل جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال ایسی مضمونوں سے انہیں بچاؤ۔ اسی طرح ناول بھی انہیں نہ دیکھنے دو گو بظاہر ان سے آوارگی کی تدابیر بہت آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ غرض ایک فہرست غیر ضروری کتابوں کی بنا کر یہ ہدایت کر دو کہ بھولے سے بھی ان کا مطالعہ نہ کریں۔ یہ تو

نصاب تعلیم پر کلام تھا۔ سو ایک تو اس کا اہتمام ہو۔

دوسری چیز ہے طرز تعلیم۔ تو ایک طرز تو یہ ہے جیسے ہمارے قصبات میں ہے کہ اکثر اپنے گھروں میں یا اپنے کسی عزیز قریب یا تعلق و خصوصیت والے کے گھر میں لڑکیاں جمع ہو کر اچھا خاصا نصاب پڑھ لیتی ہیں۔ محلہ کی شریف بیبیاں اپنی لڑکیوں کے ساتھ انہیں بھی پڑھاتی ہیں اور جس طرح اپنی لڑکیوں کی نگرانی کرتی ہیں اسی طرح ان کی بھی کرتی ہیں۔ یہ طرز تو بہت اسلم ہے۔

اور ایک طرز اسکول کا ہے کہ وہاں وقت معین پر جمع ہوتی ہیں ڈولی پر۔ گو معلم اور پہرہ کا بظاہر کافی انتظام ہوتا ہے مگر پھر بھی برابر فتنے پیدا ہوتے رہتے ہیں اور اکثر لڑکیاں آوارہ ہو جاتی ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ تعلیم انہیں خراب نہیں کرتی۔ کیونکہ اگر تعلیم ہی اس کا سبب ہوتی تو گھر کی پڑھنے والیاں بھی خراب ہوا کرتیں۔ معلوم ہوا کہ یہ طرز تعلیم کے فرق کا اثر ہے۔

گھر کی تعلیم میں خاص بات یہ ہے کہ آزادی نہیں آتی۔ لڑکی پر خصوصیت کی وجہ سے معلمہ کا دباؤ پڑتا ہے اور معلمہ خاص طور پر اس لیے خیال رکھتی ہے کہ ان کے سرپرستوں سے خصوصیات ہوتی ہیں اس لیے معلمہ پر ان کا رعب ہوتا ہے پس معلمہ پر سرپرستوں کا دباؤ ہوتا ہے اور لڑکی پر معلمہ کا بھی اور سرپرستوں کا بھی دباؤ ہوتا ہے۔ پھر ماں باپ کی نگرانی کے ہوتے ہوئے ان کی جانب کسی کا رجحان بھی نہیں ہوتا بلکہ ہمت ہی نہیں پڑ سکتی اور اسکول میں یہ بات نہیں ہو سکتی نہ لڑکی سے نہ مہتمم سے رشتہ نہ معلمہ سے کوئی خصوصیت کا تعلق۔ تو مہتمم کا معلمہ پر رعب نہیں اور معلمہ کا جو کہ نوکر ہے لڑکی پر رعب نہیں۔ بلکہ اکثر جو معلم

لڑکوں کو گھر پر پڑھاتے ہیں اُن کا کچھ رُعب زیادہ ہوتا ہے بخلاف اُن کے جو کہ اسکول میں پڑھاتے ہیں اُن کا رُعب نہیں ہوتا۔ کیونکہ گھر کے معلموں کو تو باپ کا نوکر سمجھتے ہیں اور اسکول کے معلموں کو اپنا۔ غرض اسکول میں نہ لڑکی پر معلمہ کا رُعب نہ معلمہ پر لڑکی کے ماں باپ کا رُعب اور بغیر رُعب کے کافی نگرانی نہیں ہو سکتی۔ اور اگر اس قسم کا رُعب نہ ہو تو ایک رُعب کی چیز اور بھی ہے وہ یہ ہے کہ ؎

ہر کہ ترسید از حق و تقوےٰ گزید

ترسد از وے جن و انساں ہر کہ دید

اور اُس کے رُعب کی صورت یہ ہے کہ سیکرٹری اگر دیندار کامل ہو تو معلمہ اُس سے ضرور مرعوب ہو گی۔ پھر اندیشہ نہیں ہے کسی خرابی کا۔ یہ تو نصاب اور طرزِ تعلیم کے متعلق بحث ہے۔

دوسری بات اسکول میں خرابی کی یہ ہے کہ مردوں کا اختلاط ہوتا ہے امتحان کے وقت سیکرٹری اور دوسرے ممتحنوں کے سامنے سیانی سیانی لڑکیاں آتی ہیں۔ اس سے اُن کا دل کھل جاتا ہے۔ حیا ٹوٹ جاتا ہے اور دیدہ پھٹ جاتا ہے۔ تو یہ بڑی خرابی کی بات ہے۔ سیکرٹری کو چاہئے کہ اس سے احتراز رکھے۔

میں نے بھی تھانہ بھون میں لڑکیوں کا ایک مدرسہ کیا ہے۔ لڑکیاں ایک معلمہ کے گھر میں جمع ہو جاتی ہیں اور میں اُن کی خدمت کر دیتا ہوں لیکن میں نے یہاں تک احتیاط کر رکھی ہے کہ میں خود کسی کو لڑکی کے بھیجنے کی ترغیب نہیں

دیتا۔ یہ انہیں معلمہ سے کہہ دیا ہے کہ یہ سب تمہارا کام ہے۔ تم جتنی لڑکیوں کو بلاؤ گی تنخواہ زیادہ ملے گی۔ اس میں امتحان ماہواری بھی ہوتا ہے۔ سو لڑکیاں کبھی تو امتحان دینے میرے گھر پر چلی آتی ہیں اور میری اہل خانہ یا میرے خاندان کی کوئی بی بی اُن کا امتحان لے لیتی ہیں اور کبھی لڑکیوں کو نہیں بلایا جاتا بلکہ ممتحنہ وہیں چلی جاتی ہیں اور امتحان لے لیتی ہیں صرف نتیجہ میرے سامنے پیش ہو جاتا ہے اور باقی میرا نہ کوئی اُن پر اثر اور نہ دخل۔ نمبر ممتحنہ دیتی ہیں اُن نمبروں پر انعام دیتا ہوں۔ الحمدللہ اس طرز پر مدرسہ برابر چلا جا رہا ہے اور ایک بات بھی خرابی کی کبھی نہیں ہوئی۔

تو اُن کی تعلیم کا انتظام یا تو اس طور پر ہو کہ لڑکیاں جمع نہ ہوں۔ اپنے اپنے گھروں پر یا محلہ کی بیبیوں سے تعلیم پائیں۔ یا اگر ایک جگہ جمع ہوں تو پھر یہ انتظام ہو کہ مرد اُن سے سابقہ نہ رکھیں اور اپنی مستورات سے نگرانی کرائیں اُن سے خود بات چیت تک بھی نہ کریں۔

دوسرے اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ سیکریٹری بضرورت متقی بن جائے۔ چاہے وہ آزاد خیال ہو مگر اُسے ملّا کی شکل بنانا چاہیے تاکہ معلمہ پر اُس کے اس صوری تقوی کا اثر پڑے۔ میری دانست میں یہ اصول ہیں تعلیم نسواں کے۔ آگے اور لوگ اپنے تجربوں سے کام لیں۔ کچھ میرے خیالات کی تقلید ضروری نہیں۔

بہرحال یہ تھے حقوق یتامیٰ کے جو اس آیت کے ضمن میں بیان کئے گئے اور جن سب کی میزان یہ ایک چھوٹا سا جملہ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ہے کہ اُن

کی اصلاح سب سے بہتر بات ہے۔ فی نفسہ ان کے حقوق کی وجہ سے بھی اور تشبہ بالنبیؐ کی وجہ سے بھی اُن کی خدمت تمام مستحقین پر مقدم ہے۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور اس وعظ کا نام اصلاح الیتامیٰ رکھتا ہوں۔ حق تعالیٰ سے دُعا فرمایئے کہ وہ ہمارے قلوب کو نرم کرے۔ اور عمل کی توفیق عطا فرماوے۔ آمین یا رب العالمین!

ضمیمہ ضروریہ

یہ ایک خط ہے جو ایک صاحب نے ایک سید زادہ یتیم کو یتیم خانہ میں داخل کرنے کی درخواست کے سلسلہ میں اُس یتیم خانہ کے مہتمم کو لکھا ہے چونکہ اس میں بعض ضروری مسائل ہیں جن کا تعلق یتامیٰ سے بھی ہے اس لئے اس مضمون کو اس وعظ کا ضمیمہ بنا دینا مناسب معلوم ہوا وھو ھذا

مخدوم مکرم جناب سیکریٹری صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

والا نامہ نے بجواب نیاز نامہ صدور فرما کر کو الف مندرجہ سے اعزاز بخشا منظوری درخواست کا شکر گزار ہوں۔ انشاء اللہ اُس یتیم کو ہمراہ لاؤں گا۔ اپنے عیبوں اور کوتاہیوں پر نظر کر کے اس امید پر کہ آپ اہل ہیں اور جو کوتاہی مُضر سمجھ کر عرض کی جاوے گی اُس کی اصلاح پر آپ قادر ہوں گے اور تھوڑی توجہ سے بہت بڑے اجر کے آپ مستحق ہوں گے۔ سطور ذیل عرض کر رہا ہوں، جن کی تحریک آپ کے والا نامہ کے مضمون نے دل میں پیدا کر دی۔

۱۔ جو رقم سید زادوں پر زکوٰۃ میں سے صرف ہو گی اُس سے زکوٰۃ دہندوں کی زکوٰۃ ادا نہ ہو گی۔

۲۔ جو رقم زکوٰۃ کی صرف ہو اور وہ مستحق کی ملک نہ ہو سکے جیسا کہ آپ کے یہاں کھانے کی تقسیم ہوتی ہے کہ وہ کھانا جو یتامیٰ کو تقسیم ہوتا ہے وہ اُن کی ملک نہیں ہو جاتا بلکہ مباح ہوتا ہے۔ اس سے بھی اہل زکوٰۃ کی زکوٰۃ نہ ادا ہوگی۔

ان امور سے غالباً جناب بھی واقف ہوں گے لیکن یا تو خیال نہیں ہوا یا اس کے انتظام سے معذور سمجھ کر توجہ نہیں کی گئی۔ چونکہ میں آپ کی خدمات کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں اور یہ دلی تمنا ہے کہ جس طرح اور انتظامات نے خوش ہونے کا موقع دیا ہے، خدا کرے اس شرعی نقص کو دور فرما کر مزید اجر حاصل کرنے کا آپ کو موقع ملے اور ہم کو خوشی نصیب ہو۔ آپ کو راستہ بتلانا گویا آفتاب کو چراغ دکھلانا ہے۔ لیکن از راہِ ہمدردی و خیر خواہی جو صورت اس انتظام کی ذہن میں آئی ہے اس کو پیش کرتا ہوں۔ آپ کو اختیار ہے کہ اس میں سے جس قدر کو مناسب اور ضروری سمجھیں قبول فرماویں یا اس سے اور جو بہتر صورت ہو اُس پر عمل فرما کر نقص شرعی کو دُور فرماویں۔

غالباً آمدنی زکوٰۃ کا حساب آپ کے دفتر میں ہوگا اور یتامیٰ کی قومیت بھی آپ کے دفتر میں درج ہوگی۔ لہٰذا کاغذی صورت میں ان دونوں کو مخلوط نہ کیا جاوے۔ غیر زکوٰۃ کے روپیہ سے سیدزادوں کی پرورش کی جاوے اور زکوٰۃ سے دیگر کی۔ اور بجائے اس کے کہ اُن کو جتنی روٹی اور کپڑا دیا جاتا ہے آئندہ سے روپیہ اُن کی ملک کر دیا جایا کرے۔ اور اس کے واسطے آسان طریقہ یہ ہوگا کہ اُن لوگوں کو ماہوار رقم زکوٰۃ کی ادا کی جائے کہ اُن کو اس رقم کا

مالک بنا دیا جایا کرے۔ اور بعد کو اس رقم میں سے اُن سے کھانے کی قیمت یا دیگر اخراجات جو اُن کے واسطے ہوا کرتے ہیں لے لئے جایا کریں۔ اس صورت میں زکوٰۃ دہندوں کی زکوٰۃ بھی ادا ہو جائے گی اور غالباً جناب والا کو زیادہ زحمت بھی نہ ہوگی کیونکہ تملیک کے واسطے صرف ماہوار اُن کو دے کر اور بعد کو صرفہ میں اُن سے واپس لینے کا کام ضرور بڑھ جاوے گا۔ جس کے واسطے اگر موجودہ ملازمین کافی نہ ہوں تو اگر ایک آدمی خاص اس کام کے لئے مقرر کر دیا جاوے اس میں صرف تو ضرور کچھ زیادہ ہوگا لیکن زکوٰۃ دینے والوں کی زکوٰۃ ادا ہو جاوے گی اور آپ بھی مواخذہ سے بری ہو جاویں گے۔

مگر تملیک فرضی یا نمائشی نہ ہونا چاہیے بلکہ واقعاً تملیک ہونی چاہیے یعنی اگر خدانخواستہ وہ یتیم یتیم خانہ سے علیحدہ ہونا چاہے تو وہ رقم جو اُس سے لی گئی تھی واپس دینا چاہیے۔ اگر بھاگ جاوے تو بسبیل مناسب اُس کو ادا کی جاوے یا اُس کے پاس پہنچا دی جاوے۔ اور اگر مر جاوے تو تفتیش و تلاش سے اُس کے ورثاء معلوم کر کے اُن کو ادا ہونا چاہیے۔ اس صورت میں زکوٰۃ بھی ادا ہو

؎ اور اگر رقم کی تملیک کو مصلحت یتیم خانہ کے خلاف سمجھا جاوے تو ایک صورت یہ بھی ہے کہ پکا ہوا کھانا بطور کرنہ کھلایا جاوے بلکہ ہاتھ میں دے کر مالک کر دیا جاوے مگر اس صورت میں اُن کو یہ بھی اختیار دینا ضروری ہوگا کہ خواہ مل کر کھائیں یا علیحدہ کھائیں اور دوسری شرط یہ ہوگی کہ وہ پکا ہوا کھانا جو اُن کو ملا ہے وہ قیمت (بقیہ بر ص۵۲۳)

جاوے گی اور یتامیٰ کی پرورش بھی بوجہ احسن ہو گی اور جناب کو انشاء اللہ ذات باری تعالیٰ سے امیدوں سے زیادہ اجر بھی ملے گا۔

دورانِ قیام تھانہ بھون میں فیض صحبت حضرت مولانا سے میں ان امور پر مطلع ہوا اور حضور حضرت مولانا و مرشدنا کے ایماء سے اس قدر مفصل عریضہ جناب کو لکھ رہا ہوں۔ اور حضرت موصوف نے اس کو ملاحظہ فرمالیا ہے۔ اگر ضرورت ہو تو جناب بھی حضرت مولانا یا اور حضرات علماء جن سے آپ چاہیں اس معاملہ کو صاف کر سکتے ہیں۔ فقط والسلام!

خادم ——— ناظر حسن عفا اللہ عنہ

از مقام تھانہ بھون
ضلع مظفر نگر

ہندستانی لائبریری
گارڈن ریچ روڈ۔ مٹیابرج۔ کلکتہ

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۵۲۲) میں رقم زکوٰۃ کے برابر ہو۔ مثلاً کسی نے پانچ روپیہ زکوٰۃ کے دیئے اور اُس کا کھانا پکا کر تقسیم کیا گیا تو یہ پکا ہوا اور تقسیم کیا ہوا کھانا پانچ روپیہ کی قیمت کا ہونا چاہئے اور ایک شرط یہ ہے کہ اُس رقم زکوٰۃ سے کسی ملازم کو نہ کھانا دیا جاوے اور نہ تنخواہ دی جاوے ۱۲ اشرف علی۔

حقوق السرّاء والضرّاء

حقوقِ مصیبت و راحت کے متعلق یہ وعظ ۶ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ کو سہارنپور میں اعانت حامیانِ دین کے جلسہ میں ہوا جو سوا دو گھنٹوں میں ختم ہوا۔ بیان بیٹھ کر فرمایا۔ حاضری تخمیناً تین ہزار کی تھی۔ یہ وعظ مولوی ظفر احمد صاحب نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوکل علیه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سیات اعمالنا من یهده الله فلا مضل له ومن یضلله فلا هادی له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لا شریک له ونشهد ان سیدنا ومولانا محمدا عبده ورسوله صلے الله تعالیٰ علیه وعلیٰ اٰله واصحابه وبارک وسلم اما بعد فاعوذ بالله من الشیطان الرجیم۔ بسم الله الرحمٰن الرحیم قال تبارک وتعالیٰ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ۝ وَاِذْ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْیَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّیْ جَارٌ لَّكُمْ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَیْهِ وَقَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّیْۤ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ وَاللّٰهُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝ (انفال ع ۶)

تمہید

اس رکوع کے ترجمہ کی حاجت نہیں۔ اس میں سے جستہ جستہ مضامین ضرورت کے مطابق بیان کر دوں گا۔ جس سے آیت کا مضمون بھی سمجھ میں آ جائے گا۔ اس آیت کو میں نے اس لئے اختیار کیا ہے کہ اُن لوگوں کی غلطی ظاہر ہو جائے جو یہ سمجھتے ہیں کہ شریعت کی تعلیم کامل نہیں۔ جملہ حالات کے متعلق اس میں احکام نہیں۔ اُن کا یہ خیال ہے کہ شریعت نے صرف عبادات و معاملات ہی کے احکام بیان کئے ہیں، سیاسیات کے متعلق شریعت میں تعلیم نہیں ہے اس خیالِ فاسد سے بڑا ضرر یہ ہوا کہ وہ لوگ حدِ شرعی سے آگے بڑھنے لگے اور جو کچھ جی میں آیا کرنے لگے۔ کیونکہ اُن کے خیال میں شریعت نے تو ان امور کی بابت گفتگو کی ہی نہیں۔ احکام بیان ہی نہیں کئے۔ پھر غیر اقوام بھی ان لوگوں کے طرزِ عمل کو دیکھ کر یوں سمجھتے ہیں کہ دینِ اسلام کی تعلیم ناقص ہے جس نے ایسے

وقت کے لئے کوئی قانون مقرر نہیں کیا بلکہ بعض لوگ تو آج کل کے مسلمانوں کے طرزِ عمل کو دیکھ کر دینِ اسلام کو وحشت اور عدمِ تہذیب کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور بے خبری کی وجہ سے اس نسبت کا منشاء کسی قدر صحیح بھی ہے کیونکہ غیر اقوام ہمارے مذہب کو کہاں معلوم کرتی پھرتی ہیں۔ اُن کے نزدیک تو ہمارے افعال ہی مذہب کا آئینہ ہیں جیسے ہمارے افعال ہوں گے اُسی پر مذہب کو محمول کریں گے۔

تو مجھے اس واہمہ کا دُور کرنا بھی مقصود ہے جس سے سب کو بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کی تعلیم ہر شعبہ کے لئے کافی طور پر موجود ہے اور جن لوگوں کی حرکتیں تہذیب سے دور ہیں، وہ قانونِ اسلامی سے ناواقف ہیں۔ اس وقت میں نے قرآنی آیتیں اسی غرض کے واسطے پڑھی ہیں، ورنہ اگر میں کوئی مضمون فقہی یا کوئی حدیث نبوی پڑھ دیتا تب بھی کافی تھا اور حدیث تجویز بھی کی تھی مگر آج کل مذاق ایسا بدلا ہے کہ مسلمانوں ہی میں مختلف خیالات پیدا ہو گئے ہیں حتیٰ کہ ایک جماعت حدیث وفقہ کو بھی حجت نہیں سمجھتی ——— اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ط مگر چونکہ مجھے اس وقت تعلیم اسلامی کا اکمل ہونا اور اس کا تمام حالات کے احکام کو جامع ہونا ہر فرقہ کے سامنے ظاہر کرنا مدنظر ہے۔ اس لئے میں نے سب کے خیالات اور مذاق کی رعایت کر کے قرآن کی آیتیں تلاوت کیں کیونکہ اگر حدیث پڑھتا تو بعض لوگوں کے نزدیک وہ حجت تامہ نہ ہوتی اگرچہ اس فرقہ کا یہ خیال نہایت فاسد اور غلط ہے مگر اس وقت اس سے بحث مقصود نہیں۔ اس وقت تو عام طور پر سب کے سامنے یہ بات ظاہر کر دی ہے

۔ کہ دین اسلام میں ہر حالت اور ہر شق پر پوری نظر ڈالی گئی ہے اور جسقدر اعتراض تعلیم اسلامی پر کئے جاتے ہیں سب غلط ہیں اور اُن کا منشاد قانون شرعی سے ناواقفیت ہے۔

اہمیتِ شریعت

تعلیم اسلامی کے کامل ہونے کا ایک راز ہے وہ یہ ہے کہ متکلم حکیم دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو حکیم متاثر دوسرے حکیم غیر متاثر۔ سو حکیم متاثر کے کلام میں بعض کیفیات غالب بعض مغلوب ہوں گی اور جو متکلم کہ حکیم غیر متاثر ہے چونکہ اُس کی ذات پر کسی خاص کیفیات کو غلبہ نہیں ہو سکتا اس لئے جس واقعہ میں جو حکم اُس کی طرف سے صادر ہو گا نہایت کامل اکمل ہو گا۔ پس اس سے معلوم ہو گیا کہ خدا کا کلام سب سے زیادہ کامل ہو گا کیونکہ حالات کا سب سے زیادہ علم بھی اُسی کو ہے۔ پھر وہ باختیار مالک ہے اور تمام اشیاء میں خود مؤثر ہے۔ کوئی کیفیت اُس پر غالب نہیں۔ جو حکم اُس کی طرف سے صادر ہو گا وہ نہایت کامل ہو گا۔ نہ اُس کے احکام بہت سخت ہو سکتے ہیں کیونکہ اُس پر کیفیت غضب غالب نہیں، نہ بہت نرم ہو سکتے ہیں کیونکہ اس پر کیفیت رحمت غالب نہیں بلکہ وہ باختیار خود قہار ہے اور باختیار خود رحیم و کریم ہے کسی صفت میں مجبور یا مغلوب نہیں بخلاف انسان کے کہ وہ کیفیات سے مغلوب ہو جاتا ہے پس معلوم ہوا کہ جو کلامِ خداوندی ہے اُس کے تمام احکام افراط و تفریط سے پاک ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت کا پابند ہونا ہر بشر پر لازم ہے کیونکہ وہ احکام سب کی مصالح کو جامع ہیں۔

میں اس وقت ضرورت اتباع شریعت پر بحث نہیں کرتا اور نہ یہ وقت تمام فروعی مسائل پر بحث کرنے کا ہے مگر اتنا اجمالاً ضرور کہوں گا کہ چونکہ ہماری یہ حالت مشاہدہ ہے کہ جو کیفیت شدید ہوتی ہے وہ ہم کو مغلوب کر دیتی ہے اس لیے ہم کو شریعت الٰہی کی پابندی ضروری ہے تاکہ ہم اعتدال پر قائم رہ سکیں۔ ہماری رائے قابل اعتبار نہیں ہو سکتی اور اتباع کے لئے اپنے اپنے زمانہ میں ہر شریعت اگرچہ کافی تھی مگر اس وقت شریعت اسلامیہ ہی کا پابند ہونا ضروری ہے۔ دو وجہ سے۔ ایک تو یہ کہ شریعت اسلامیہ دیگر شرائع سے زیادہ کامل اور کافی ہے۔ دوسری شرائع میں تحریف بہت واقع ہوئی ہے۔ پتہ نہیں چل سکتا کہ خدا کا حکم کیا ہے اور اسی حکمت سے دوسری شرائع منسوخ کر دی گئیں اور ہمارے لئے اصل وجہ دوسری شرائع پر عمل کرنے کی بھی نسخ ہے اور وہ دونوں وجہ حکمت ہیں نسخ کی۔ میں دیگر شرائع کو نعوذ باللہ ناکافی وغیرہ نہیں کہتا جیسا کہ بعض لوگ تفاضل کے وقت کہہ دیتے ہیں۔ میرا اس سے دل کانپتا ہے کہ دوسری شریعتوں کو ناکافی و غیر کامل کہوں نہیں وہ بھی اپنے مخاطبین کے لئے کافی اور کامل تھیں مگر ہماری شریعت مقدسہ اکفی اور اکمل ہے۔ اور یہی اکمل ہونا ختم نبوت کی حکمت بھی ہو سکتی ہے کیونکہ شریعت محمدیہ سے زیادہ کوئی شریعت کامل نہیں کہ اس کے بعد اس کی حاجت ہو۔ اسی لئے میں نے ان آیات کو اختیار کیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ شریعت مقدسہ نے سیاسیات کے متعلق بھی کافی قانون مقرر کیا ہے۔ جس کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام کی تعلیم ناکافی ہے واللہ العظیم شریعت

ہی کے پابند ہو کر ہم سب کچھ ہو سکتے ہیں۔ شریعت کی وہ حالت ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

چنانچہ اس وقت جو میں نے آیتیں تلاوت کی ہیں ان میں ایک بہت بڑے حادثہ کے متعلق احکام اوامر و نواہی بیان کیے گیے ہیں۔ میں اپنے اجزائے بیان میں ان سب باتوں کو بیان کروں گا۔

فکر دین

مگر اول میں ایک ضروری مضمون بیان کرتا ہوں جس میں بعض ان شبہات کا جواب ہے جو میرے ایک عزیز[1] کے بیان سے بوجہ پورا نہ سمجھنے کے پیدا ہو گئے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ لوگوں کو دین کی فکر ہے۔ چنانچہ چند مسلمانوں نے اس وقت سوال کر کے اس کا عملی ثبوت دیا کہ دین کی طرف توجہ ہے اس لئے کہ حدیث میں ہے۔ شِفَاءُ الْعِیِّ السُّوَالُ کہ ناواقف کی شفا سوال سے

---

[1] یہ عزیز حضرت مولانا کے ہمشیرزادے برادرم مولانا سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کا بیان اس جلسہ میں مولانا کے بیان سے پہلے ہوا تھا اور لوگوں پر ان کے بیان سے خاص اثر تھا اور یہ وعظ ان کا اخیر قلمبند کیا ہوا ہے جس کے چند روز بعد یعنی ۷ ار جمادی الاول ۱۳۲۱ھ بروز جمعہ مرض طاعون انتقال ہو گیا۔ ناظرین دعائے مغفرت سے یاد فرمائیں۔

ہوتی ہے (واقعہ یہ ہوا تھا کہ اُن کے بیان کے بعد بعض لوگوں نے کچھ شبہات پیش کر دئیے) جو مسئلہ بیان کیا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے مگر میں اس کے متعلق بیان نہیں کرتا کیونکہ اس میں پھر شبہ ہوگا بلکہ ایک آسان عمل بتاتا ہوں جس کے بعد اس مسئلہ ہی کے سمجھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ وہ یہ ہے کہ یہ تو سب کو معلوم ہو گیا کہ اس ضلع میں کام کرنے والے علماء ہیں اور دوسرے اضلاع میں بھی۔ میں بھی رائے دیتا ہوں کہ علماء کو اپنا شریک حال بنائیں، اگرچہ اُن کا عنصر غالب نہ ہو۔ علماء کو صدارت وغیرہ کا شوق نہیں ہے بلکہ وہ تو اس سے پریشان ہوتے ہیں اور قبول اس لئے کر لیتے ہیں کہ شریعت کا حکم ہے کہ جو کام ضروری سپرد ہو اُس کو کرو۔ تو میں ایک مختصر بات بتلاتا ہوں کہ چرم قربانی کی قیمت وغیرہ دینے کے لئے جو شرائط ہیں اُن کو سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ آسان یہ ہے کہ جو رقم داخل کریں علماء کو اطلاع کر دیں کہ یہ چرم قربانی کی قیمت ہے۔ علماء خود تمام شرائط کا انتظام کر لیں گے۔

مگر اس سے یہ نہ سمجھیں کہ اس عزیز کا بیان بے نتیجہ تھا ہرگز نہیں کیونکہ اس بیان کے بعد سوالات اور شکوک پیدا ہونے سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ بعض معمولی مسائل بھی لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ یہ معلوم ہو جانا بھی بڑا نتیجہ ہے بہرحال دیندار کا کوئی فعل بیکار نہیں جاتا۔ اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ ایک ذراسی بات جب آپ کی سمجھ میں نہیں آتی تو آپ علماء کے کس قدر محتاج ہیں۔ یہ تو اس شبہ کا جواب ہو گیا جو آنعزیز کے بیان پر واقع ہوا تھا اس کے ساتھ یہ بھی بیان کرنا ضروری ہے کہ چرم قربانی کی طرح ادائے زکوٰۃ کے

لئے بھی خاص شرطیں ہیں۔ اُن شرطوں کی رعایت کر کے زکوٰۃ بھی اس چندہ میں ادا ہو سکتی ہے۔ وہ بھی علماء کے ہی ذریعہ اور اطلاع سے داخل کرو۔

پیشگی زکوٰۃ

نیز بڑی خوشی کی بات ہے کہ شریعت نے کئی سال کی پیشگی زکوٰۃ ادا کرنے کو بھی جائز کیا ہے۔ اگر کوئی شخص سالانہ ایک سو روپے زکوٰۃ میں نکالتا ہے تو اکٹھے پانچ سو روپے پانچ سال کی طرف سے پیشگی دے سکتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ اس میں خوشی کی بات کیا ہے۔ یہ تو مصیبت ہوئی کہ پانچ سو روپے ایک دفعہ گھر سے نکل گئے۔ میں کہتا ہوں کہ حَفِظْتَ شَيْئًا وَ غَابَتْ عَنْكَ اَشْيَاءُ۔ اس وقت پانچ سو کا نکلنا واقعی گراں ہوگا مگر پانچ سال تک بے فکر بھی تو ہو جاؤ گے۔ یہ کتنا بڑا آرام ہوا۔ دنیا میں بے فکری سے زیادہ کوئی آرام نہیں مگر یہ زکوٰۃ پیشگی اسی قدر روپیہ کی ادا ہوگی جو اس وقت موجود ہے اس کے اوپر جو مال بڑھے گا اُس کی پھر زکوٰۃ دینا ہوگی۔ یہ نہیں کہ مولوی صاحب نے پانچ سو روپے لے کر پانچ سال کا ٹھیکہ لے لیا ہے کہ تم کو زکوٰۃ سے بالکل سبکدوش کر دیا کہ اگر کچھ مال بڑھے تو اُس کی بھی ادا نہ کرنا پڑے۔

اس پر مجھے ایک بڑھیا کی حکایت یاد آئی کہ وہ جب حج کرنے گئی اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا پڑی، غریب بڑھیا تو تھکی ہی تین چار شوط میں تھک گئی تو آپ مطوف سے کیا کہتی ہیں کہ مولوی صاحب اب تو معاف کر دو گویا مطوف ٹھیکہ دار ہے کہ جس کو چاہے معاف کر دے جس کو چاہے

معاف نہ کرے۔

یہیں سے میں ایک چھوٹی سی بات اور بتلاتا ہوں کہ آج کل کے ذی رائے مولویوں کو رائے دیا کرتے ہیں کہ زمانہ کی ضرورت کے موافق یوں کرنا چاہیئے۔ فلاں بات جائز ہونا چاہیئے۔ تو صاحبو! مولویوں کو دین میں تصرف کرنے کا کچھ اختیار نہیں۔ ہاں آپ اللہ میاں کو جا کر رائے دیجئے کیونکہ احکام تو اُن کے ہیں اور انشاء اللہ آپ دنیا سے ختم ہونے سے پہلے خدا سے مل بھی لیں گے۔ اُن سے عرض کرنا تو برمحل ہے مولویوں سے کہنا سننا فضول ہے اور اُن کے کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ کوئی لاکھ دین کو بدلنا چاہے مگر خدا تعالیٰ اس دین کے محافظ ہیں۔ یہ ہرگز نہیں بدل سکتا البتہ بدلنے والے کی عاقبت خراب ہو ہی جائے گی۔ تو مولوی دین کے ٹھیکہ دار نہیں۔ یہ کسی بات کا ٹھیکہ نہیں لے سکتے۔

تو کوئی یہ نہ سمجھے کہ پانچ سال کی زکوٰۃ پیشگی دے دی گئی، تو مال بڑھنے سے بھی اس کی زکوٰۃ نہیں دینی پڑے گی۔ اگر پیشگی زکوٰۃ دینے پر کوئی یہ شبہ کرے کہ پانچ چھ سال کی زکوٰۃ دینے میں کیا نفع؟ کیا خبر کہ پانچ سال تک مال رہے یا نہ رہے۔ اگر پہلے ہی مال فنا ہو گیا تو زائد زکوٰۃ فضول ہی گئی۔

تو صاحبو ۔۔۔ اوّل تو یہ شبہ لغو ہے کیونکہ اکثر مال زکوٰۃ ادا کردہ باقی رہتا ہے۔ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے۔ اور اگر تلف ہونے کے اندیشہ کو صحیح مان بھی لیا جائے تب بھی ہم کہتے ہیں کہ پیشگی زکوٰۃ دینا پھر بھی مفید ہے

کیونکہ اگر پیشگی زکوٰۃ میں نہ دیئے جاتے تو وہ زکوٰۃ کے روپیہ بھی تلف ہو جاتے اب اتنی مقدار جو زکوٰۃ میں پہلے دے دی گئی وہ تلف ہونے سے بچی اور ثواب کا ذخیرہ ہو گیا تو کیا آپ کے نزدیک روپیہ کا زکوٰۃ میں صرف ہو کر غریب مسلمان بھائیوں کے پاس جانا اور اُن کے کاموں میں معین بننا تلف ہونے سے بھی اچھا نہیں۔

مجھے ایک غیر مسلم شخص کی حکایت یاد آئی تھی۔ تھانہ بھون کے قریب ایک گاؤں ہے۔ وہاں سے ایک ہندو میرے پاس آیا کرتا تھا اور مجھ سے محبت کرتا تھا حتیٰ کہ کبھی کبھی خدمت بھی کیا کرتا۔ ایک دن آیا اور قصہ بیان کیا کہ میرے گھر چوری ہو گئی ہے۔ مجھے اُس کے حال پر ترس آیا اور میں کڑھنے لگا۔ تو اُس نے کہا میرے پاس ایک گائے ہے مجھے اس سے بہت محبت ہے وہ تم لے لو۔ میں نے کہا کہ تمہارے گھر اس وقت چوری ہو گئی ہے اس وقت دینا کیا مناسب ہے۔ کہنے لگا کہ اسی وقت تو دینا زیادہ مناسب ہے کیونکہ اگر میں تم کو دے دیتا تو میرے یہاں چوری ہی نہ ہوتی۔ مجھے اس کی عقل پر بڑی حیرت ہوئی۔ پھر کہنے لگا کہ میرا بچا اس کا مالک تو نہیں ہے مگر میں اس کے خلاف کرنا پسند نہیں کرتا۔ شاید اُسے مفت دینا ناگوار ہو۔ یہ اکیس روپیہ میرے پاس ہیں یہ لے لو اور اس کو میرے پاس بھیج دینا۔ میں اس سے کہہ دوں گا کہ میں نے فروخت کر دی تو اب غور کیجئے کہ ایک غیر مسلم شخص تو سمجھے کہ ایک نیک مصرف میں صرف کرنے سے سب مال محفوظ ہو جاتا ہے اور آپ اس راز کو نہ سمجھے کہ جو

مالی زکوٰۃ ادا کر دہ ہے وہ تلف نہیں ہو سکتا بلکہ اگر آپ کا مال تلف بھی ہو جائے یا تلف کا اندیشہ بھی ہو تب تو اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ زکوٰۃ پیشگی دے دی جائے تاکہ اس قدر تو باقی رہے۔

اس پر مجھے ایک حدیث یاد آئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دولت سرائے میں ایک بکری ذبح ہوئی تھی۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ سب تقسیم ہو گیا یا کچھ باقی ہے؟ گھر والوں نے عرض کیا کہ صرف ایک ذراع باقی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ذراع ہی فانی ہے اور سب باقی ہے کیونکہ وہ تو مصرف میں صرف ہو گیا اور اس سے نفع لے لیا گیا۔ اس لئے حقیقۃً وہی باقی ہے اور جو ظاہراً باقی ہے اس میں اندیشہ ہے کہ ہلاک ہو جائے اور کام نہ آئے۔ تو جو کام میں آ گیا وہ باقی ہے اور جو ابھی کام میں نہیں آیا اس میں اندیشۂ ہلاک بھی ہے۔ اس لئے وہی فانی ہے۔ تو حدیث میں بھی اس مضمون کی تصریح ہے۔

چونکہ بہت سے لوگ اتنی وسعت نہیں رکھتے کہ زکوٰۃ بھی دیں اور زکوٰۃ کے علاوہ زیادہ بھی دیں۔ اس لئے میں نے زکوٰۃ کے مسئلہ کو بھی بیان کر دیا کہ اگر تطوعاً دینے کی ہمت نہ ہو تو زکوٰۃ ہی سے مدد کر دیں۔ یہ تو ان شبہات کے متعلق ضروری مضمون تھا جس کی تقدیم کر دی گئی۔ اب میں اصل مضمون آیت کو بیان کرتا ہوں۔

خلاصہ بیان

گو بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس کی عادت تطویل کی ہے، مگر میں

اس کو طویل نہ کروں گا۔ جلد ہی ختم کر دوں گا۔ اور گو اس وقت مجھے بیان کی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ جس کام کے لئے جلسہ منعقد ہوا ہے اس کو اچھی طرح میرے ایک عزیز نے اپنے بیان میں ظاہر کر دیا ہے مگر میں ایک دوسرا مضمون جو کہ فی نفسہ ضروری ہے اور قابل اہتمام ہے بیان کروں گا۔ وہ یہ کہ تحریک چندہ کے شرائط کیا کیا ہیں۔ کیونکہ شریعت نے ہر تعلیم کو کافی طور پر سمجھایا ہے۔ یہ نہیں کہ سونے کا کشتہ کھانے کو تبلا دیا نہ کچھ بدرقہ ہے نہ پرہیز۔ شریعت کی تعلیم میں غایت تعدیل ہے۔ اس کو معلوم کرنے کے بعد کسی کو الزام دینے کی مجال نہیں۔ اور اس وقت جن لوگوں کو شریعت میں کچھ شبہ ہو جاتا ہے تو اس لئے کہ انہوں نے تعلیم شریعت سنی ہی نہیں۔

اس وقت بیان سے دو غرض ہیں۔ ایک تو یہی تحریک چندہ جس کے لئے جلسہ وضع ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں جو نشیب و فراز ہو وہ دور کر دیا جائے کیونکہ جب تک کوئی کام تمام شرائط کے ساتھ نہیں ہوتا، قابل اعتبار نہیں ہوتا بلکہ بالکل ضائع سمجھا جاتا ہے اور اس پر کوئی صاحب اعتراض نہ کرنے لگیں کہ ہم نے تو بارہا بدون لحاظ شرائط کے چندہ دیا اور چندہ ادا بھی ہو گیا مگر یہ اعتراض ایسا ہی ہے کہ کسی نے کہا تھا کہ بے وضو نماز نہیں ہوتی۔ ایک صاحب بولے بارہا کردیم و شد۔

استاد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میرے پاس ایک شخص مسئلہ پوچھنے آیا کہ عورت اور مرد میں یہ رشتہ ہے۔ نکاح درست ہے یا نہیں؟ میں نے کہا کہ نکاح نہ ہو گا۔ تو کیا کہتا ہے کہ ہم نے تو کیا تھا اور

ہو بھی گیا۔ تو اُس نے نہ ہونے کے معنی یہ سمجھے کہ شوہر کی زبان سے قبول کا لفظ نہ نکلے گا۔

ایسے ہی کوئی صاحب چندہ ادا نہ ہونے کے بھی یہی معنی سمجھتے ہوں کہ دینے والے کا ہاتھ رک جائے گا۔ تو وہ یہ اعتراض کر سکتے ہیں۔ مگر ایسے غبی لوگوں سے میرا خطاب ہی نہیں۔ غرض اس تحریک چندہ کے آداب بھی معلوم ہونے چاہیئں۔ یہ ہے خلاصہ میرے بیان کا اور تحریک چندہ بھی اسی ضمن میں ہو جائے گی۔

کمالِ شریعت

حاصل یہ ہے کہ شریعت نے ہر حالت کے متعلق ضروری قواعد بتلائے ہیں اور اسی سے ہم کہتے ہیں کہ شریعت کامل ہے۔ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ مولوی ہر ہر بات کے متعلق مسئلہ نکالتے ہیں۔ پائجامہ اچکن کے واسطے بھی مسئلہ موجود ہے۔ یہ لوگ شریعت کو تو مختصر سمجھتے ہیں اور یوں خیال کرتے ہیں کہ یہ تفصیل مولویوں نے اپنی طرف سے کی ہے۔ مگر میں اس کو ایک نظیر سے سمجھانا چاہتا ہوں۔

اگر کوئی یوں کہے کہ گورنمنٹ کا قانون مکمل ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ ہر عاقل یہی کہے گا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسری سلطنتوں کی نسبت اُس میں ہر ہر محکمہ کے لئے کافی قانون موجود ہے اور پھر ہر محکمہ کے جزئیات پر پوری تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ مثلاً محکمہ تجارت میں بارود کی تجارت کو بشرط لائسنس جائز اور تیل کی تجارت کو بلا کسی شرط

کے جائز بتلایا گیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ کسی قانون کا مکمل ہونا یہ ہے کہ اُس
میں تمام حالات کے متعلق قواعد ہوں۔ اگر ہم پوچھیں کہ بازار میں چار گھنٹہ
مُتواتر رہنا جائز ہے یا نہیں تو وکیل کا فرض ہے کہ جواب دے کہ جائز
ہے نہیں تو معلوم ہو جائے گا کہ گورنمنٹ کا قانون ناقص ہے کامل نہیں
تو شریعت کا مختصر ہونا حقیقت میں یہ اُس کا نقصان ہے۔ کمال شریعت
یہی ہے کہ اس میں تمام انسانی حالات کے متعلق مفصّل قواعد موجود ہیں کوئی
جزئی ایسی نکلنی ممکن نہیں جس میں شریعت کا کوئی حکم نہ ہو۔ تو جب ایک
سلطنت کے قانون کا مکمل ہونا اس کا عمدہ وصف ہے تو خدا کے قانون
کے لئے نقصان کیوں تجویز کیا جاتا ہے۔ اور اگر خدا کے قانون کے لئے
مکمل ہونا ضروری ہے تو پھر بدون اس کے تمام حالات کے متعلق مفصّل
احکام بیان کئے جائیں تکمیل قانون کیوں کر ہو سکتی ہے اور ظاہر ہے کہ
اس صورت میں شریعت مختصر نہیں ہو سکتی۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ شریعت میں سختی بہت ہے۔ جو مسئلہ
پوچھو ناجائز بہت اور جائز کم نکلتے ہیں۔ صاحبو! آپ نے مسائل پوچھے
نہیں۔ غضب یہ ہے کہ کبھی کبھی برسوں میں تو مولویوں کی صورت دیکھنے میں
آتی ہے اور اتفاقاً اس وقت جو مسئلہ پوچھا تو اس کو عالم نے ناجائز بتایا اس
سے سائل یہ سمجھا کہ شریعت میں ناجائز کا حکم بہت ہے۔ صاحبو! ایک ہزار
مسئلے پوچھو۔ پھر دیکھو کہ کتنے کو جائز کہیں گے اور کتنے ناجائز نکلیں گے۔ انشاء
اللہ چھ سو جائز اور چار سو بلکہ اس سے بھی کم ناجائز ثابت ہوں گے۔ سو اوّل

تو یہی خیال غلط ہے کہ شریعت میں ناجائز کا فتویٰ بہت زیادہ ہے۔ دوسرے اگر ناجائز کا فتویٰ زیادہ ہو بھی تب بھی آپ کو پوچھنا ضروری ہے تاکہ تمہارا عقیدہ تو درست رہے۔ کیونکہ حرام کو حلال جاننا بعض صورتوں میں کفر ہو جاتا ہے بہرحال شریعت میں انسان کی ہر حالت کے متعلق احکام ہیں

احکام مصیبت

حالات دو قسم کے ہیں۔ ایک سرّاء یعنی نعمت و خوشی کی حالت دوسرے ضرّاء یعنی مصیبت و رنج کی حالت۔ اس آیت میں دونوں کے احکام بتلائے گئے ہیں۔ یہ آیتیں ان دونوں کے احکام کو مشتمل ہیں۔ اسی لیے اُن کو پڑھا گیا تو سمجھو کہ نعمت میں کیا احکام ہیں اور مصیبت میں کیا۔ تو خوشی کے احکام تو قریب قریب سب کو معلوم ہیں۔ اگرچہ تفاصیل میں کوتاہی ہو مگر مجملاً اکثر لوگ جانتے ہیں کہ خوشی کے کیا احکام ہیں مگر احکام مصیبت بہت کم لوگ جانتے ہیں کیونکہ یہ طبیعت کے خلاف حالت ہے اور انسان کو ناگوار ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ناگوار چیز کی طرف توجہ کم ہوا کرتی ہے۔ نیز مصیبت میں چونکہ اشتغال ہوتا ہے یا پژمردگی، اس لیے بھی اس کے احکام معلوم کرنے کی طرف توجہ کم ہوا کرتی ہے۔ اس لیے میں اس کو بیان کرتا ہوں۔

سب سے اوّل تو یہ حکم ہے کہ جب مصیبت میں ابتلا ہو تو صبر کیا جائے کہ مومن کی یہی شان ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

عَجَبًا لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ (اِلٰی اَنْ قَالَ) اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ۔

کہ مومن کی بھی عجیب حالت ہے کوئی حالت اس کو خسارہ نہیں پہنچا سکتی اگر اس کو خوشی پہنچتی ہے شکر کرتا ہے اور اگر مصیبت پہنچتی ہے صبر کرتا ہے تو دونوں حالتوں میں نفع ہی میں رہا۔

دوسرا حق مصیبت کا یہ ہے کہ خدا کی رحمت سے مصیبت میں مایوس نہ ہو بلکہ فضل و کرم الٰہی کا امیدوار رہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

لَا تَيْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَيْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ۔

(نا امید مت ہو اللہ کے فیض سے بیشک نا امید نہیں ہوتے اللہ کے فیض سے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں۔)

کہ خدا کی رحمت سے نا امید نہ ہو کیونکہ خدا کی رحمت سے تو کافر ہی مایوس ہوتے ہیں مسلمانوں کو تو خدا سے بہت بڑی امید رکھنا چاہیے۔ پس کتنی ہی بڑی مصیبت کیوں نہ ہو دل شکستہ ہرگز نہ ہونا چاہیے۔

ایک حکم یہ ہے کہ مصیبت کی وجہ سے دوسرے احکام شرعیہ میں کوتاہی نہ کرے اور ان کو ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ ہر کسی کو معلوم ہے کہ عزیز کا مرجانا کتنی بڑی مصیبت ہے مگر حکم یہ ہے کہ صرف آنسو بہا سکتے ہو، چلانا اور شور مچانا حرام ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ احکام شرعیہ کا لحاظ رکھنا بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی واجب ہے۔

ایک حکم یہ ہے کہ خدا سے اس مشکل کے آسان کر دینے کی دعا کرتا رہے اور تدابیر میں بھی مشغول رہے مگر تدبیر کو کارگر نہ سمجھے۔ شریعت کا یہ مقصود نہیں

کہ تمام تدابیر چھوڑ کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاؤ۔ دعا کا حکم تو اس لئے ہے کہ تدبیر میں بغیر دعا کے برکت نہیں ہوتی اور یہ مقصود نہیں کہ صرف دعا پر اکتفا کیا جائے اور تدبیر کچھ نہ کی جائے البتہ جن کی کوئی تدبیر نہیں جیسے بارش، ان کے لئے صرف دعا جائز ہے اور جس میں تدبیر ہو سکتی ہے۔ اس میں تدبیر و دعا دونوں کرو۔

اب ہمارے اندر یہ کوتاہی ہے کہ دو جماعتیں ہو گئیں۔ بعض نے تو دعا کو اختیار کر کے تدبیر کو چھوڑ دیا اور بعض محض تدبیر کے پیچھے پڑ گئے اور دعا سے منکر ہو گئے۔ مگر ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ جو منکر دعا ہیں مصیبت کے وقت وہی زیادہ گڑگڑاتے ہیں۔ ہائے افسوس جو چیز اضطراری ہو، لوگ اس سے منکر ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کا خالق و فاعل ہونا کہ یہی مبنیٰ ہے دعا کا، ایک ایسی فطری بات ہے جس کا ہر دل اضطراراً قائل ہوتا ہے۔ ایک ملحد نے لکھا ہے کہ میں مدتوں خدا کا منکر رہا مگر دل کبھی زبان کے ساتھ متفق نہیں ہوا۔ تو دعا ایک فطری چیز ہے فطرتِ سلیمہ خود اس کے ماننے میں سبقت کرتی ہے۔

ایک حکم مصیبت کا یہ ہے کہ استغفار کرو یعنی اپنے گناہوں سے معافی چاہو کیونکہ مصیبت اکثر گناہوں کی بدولت آتی ہے

مَا اَصَابَکُمْ مِنْ مُصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ۔

اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ انبیاء پر بھی تو مصیبت نازل ہوتی ہے تو کیا ان پر بھی گناہوں کی بدولت نازل ہوتی ہے کیونکہ دیکھنا یہ ہے کہ آیت قرآنی میں مَا اَصَابَکُمْ کے مخاطب کون لوگ ہیں اس کے مخاطب اہل معاصی

ہیں اور انہی لوگوں کا اس آیت میں حکم مذکور ہے اور جو اہلِ مصیبت نہ ہوں وہ اس آیت کے مخاطب اور نہ اُن کے واسطے یہ حکم۔ اور حضرات انبیاء علیہم السلام واقع میں اہل مصیبت ہی نہیں کیونکہ مصیبت مرض کا نام نہیں بلکہ یہ تو صورت مصیبت ہے۔ بادام وہ ہے جس میں مغز بھی ہو۔ مٹی کا خربوزہ خربوزہ ہی نہیں۔ پس انبیاء پر جو مصائب نازل ہوتی ہیں وہ صورت مصیبت ہیں حقیقت مصیبت اُن پر نہیں آتی۔ کیونکہ اصل مصیبت وہ ہے جس سے دل میں پریشانی اور بے چینی پیدا ہو۔ پس جو شخص بیمار ہو اور دل کو پریشان پائے اُس کے حق میں یہ مرض مصیبت ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور اُن کے ورثا اولیاء کرام چونکہ مرض وغیرہ میں بھی پریشان نہیں ہوتے۔ اس لئے یہ مرض اُن کے حق میں رحمت ہے اگرچہ صورۃً مصیبت ہے۔

رہی یہ بات کہ پھر اُن پر یہ بلائیں کیوں آتی ہیں۔ سو اُن پر امراض وغیرہ کا نزول رفع درجات کے لئے ہوتا ہے البتہ ہمارے یعنی گنہگاروں کے اوپر جو مصائب نازل ہوتی ہیں وہ گناہوں کی وجہ سے نازل ہوتی ہیں۔ اس لئے استغفار کرنا بہت ضروری ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ہر چہ بر تو آید از ظلمات و غم　　آں ز بیباکی و گستاخی ست ہم
غم چو بینی زود استغفار کن　　غم بامر خالق آمد کار کن

سو مصیبت کے چار حکم تو یہ ہوئے۔ ایک پانچواں اور ہے وہ یہ کہ اگر مصیبت ہمارے کسی بھائی مسلمان پر نازل ہو تو اس کو اپنے اوپر نازل سمجھا جائے اور اُس کے لئے ویسی ہی تدبیر کی جائے جیسا کہ اپنے اوپر مصیبت

نازل ہوتی اُس وقت کرتے۔ واللہ انسان کا دل تو وہ ہے کہ کتے کی مصیبت کو بھی نہیں سہہ سکتا نہ کہ مسلمان کی مصیبت کو۔

حضرت سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت لکھی ہے کہ آپ نے ایک کتے کو دیکھا کہ چلا جا رہا ہے اور خارش میں مبتلا ہے۔ آپ کو اس کی حالت دیکھ کر رنج ہوا اور طبیب کے پاس تشریف لے گئے اور نسخہ لکھوا کر لائے اور اپنے ہاتھ سے دوا اُس کتے کے بدن پر ملی۔ یہاں تک کہ جب وہ بالکل تندرست ہو گیا تو آپ خوش ہوئے۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ کوئی مجذوب یا سڑی ہوں گے۔ استغفر اللہ، یہ بڑے پایہ کے شخص ہیں۔ حضرت سیّد غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے معاصر ہیں۔ حضرت غوث اعظم سے ان کے مناقب منقول ہیں اور خود اُن کا قصہ ہے کہ اُن سے ایک مرید نے دریافت کیا کہ آپ کا کون سا مقام ہے۔ کیا آپ غوث ہیں؟ تو آپ نے فرمایا نَزِّہْ شَیْخَکَ عَنِ الْغَوْثِیَّۃِ کہ اپنے شیخ کو مرتبہ غوثیہ سے برتر سمجھو۔ اُس نے عرض کیا کہ پھر آپ قطب ہیں؟ فرمایا نَزِّہْ شَیْخَکَ عَنِ الْقُطْبِیَّۃِ کہ اپنے شیخ کو مرتبہ قطبیہ سے بھی برتر سمجھو۔ پھر فرمایا کہ حق تعالےٰ نے تمام ارواح اولیاء کو جمع فرمایا اور ارشاد ہوا کہ جو جس کا جی چاہے مانگے ہر ایک نے جو اُس کے دل میں تھا عرض کیا۔ کسی نے مرتبہ غوثیت طلب کیا کسی نے مرتبہ قطبیہ۔ حَتّٰی دَارَتِ النَّوْبَۃُ اِلٰی ھٰذَا الْاَشْعَثِ اَحْمَدَ۔ یہاں تک کہ نوبت مجھ تک پہنچی، تو میں نے عرض کیا۔ رَبِّ اِنِّیْ اُرِیْدُ اَنْ لَّا اُرِیْدَ وَاخْتَارَ اَنْ لَّا اَخْتَارَ۔ کہ الٰہی میں یہ چاہتا ہوں کہ کچھ نہ چاہوں اور یہ تجویز کرتا ہوں کہ

کچھ تجویز نہ کروں۔ فَاَعطَانِی مَالَا عَینٌ رَاَت وَلَا اُذُنٌ سَمِعَت وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلبِ بَشَرٍ مِن اَھلِ ھٰذَا العَصرِ۔ پس مجھے وہ چیز عنایت ہوئی جو اس زمانہ والوں میں سے نہ کسی کی آنکھ نے دیکھی اور نہ کسی کے کان نے سنی اور نہ کسی کے دل پر گزری۔

تو اتنے بڑے مرتبہ والے شخص اور کتے کا آپ نے خود علاج کیا مگر اس واقعہ سے ہمارے بھائی کتے کے پالنے پر استدلال نہ کریں۔ وہ الگ مسئلہ ہے۔ گفتگو مصیبت کے وقت میں ہو رہی ہے۔ ایسے وقت میں ہر جاندار پر رحم کرنا ضروری ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کو بلا ضرورت بھی اپنا رفیق بنا لیا جائے البتہ ضرورت ہو تو مضائقہ نہیں۔ تو جو لوگ کتوں پر مصیبت میں رحم کرتے ہیں ان کو انسان پر کیونکہ رحم نہ آئے گا۔ مگر اس کو اہل دل ہی سمجھے گا۔

اثر اخلاص

حدیث شریف میں وارد ہے کہ ایک فاحشہ عورت چلی جا رہی تھی راستہ میں اس نے ایک کتے کو دیکھا کہ پیاس کی وجہ سے جاں بلب ہو رہا ہے۔ اس کو ترس آ گیا۔ اپنا چمڑے کا موزہ پیر سے نکال کر اس کا ڈول بنایا اور اوڑھنی اتار کر رسی بنائی اور کنوئیں سے پانی نکال کر اس کتے کو پلا دیا۔ جب وہ مری ہے تو اس فاحشہ کو اس عمل کی وجہ سے بخشدیا گیا۔

اخلاص کے ساتھ تھوڑا سا عمل بھی قبول ہو جاتا ہے اور اخلاص بھی نہ ہو تو خالی الذہن ہو کر بھی عمل مقبول ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس عورت کے ذہن میں بھی

نہ تھا کہ یہ عمل اتنا بڑا ہے۔ نہ اُس نے اخلاص کا قصد کیا نہ ریا سے کیا بلکہ خالی الذہن تھی۔ اس لیئے خدا تعالیٰ کو وہ کام پسند آ گیا اور جب عمل میں ریا شریک ہو جاتا ہے تو کام غارت ہو جاتا ہے۔ ہاں صورت ریا جائز ہے۔ یہ میں نے اس لیئے کہہ دیا کہ شاید کوئی یہاں جلسہ میں چندہ بھی نہ دے اس خیال سے کہ ریا ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ صورت ریا ہو گی۔ اس کا مضائقہ نہیں۔ اصل ریا دل میں ہوتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دو جگہ خیلا (تفاخر) جائز ہے۔ ایک صدقہ میں دوسرے عار دین کے مقابلہ میں۔ تو دکھلا کر دینا ریا نہیں ہے۔ اس میں بعض لوگوں کو غلطی ہو جاتی ہے وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ جس کام کو لوگ دیکھیں وہ ریا ہے مگر یہ صحیح خیال نہیں ریا کا مدار نیت پر ہے۔ اگر کوئی شخص سب کو دکھا کر اس لیئے دیتا ہے کہ دوسروں کو بھی رغبت ہو تو یہ ریا میں داخل نہ ہو گا۔ ہاں حقیقی ریا اگر دل میں ہو گا تو پھر صدقہ مقبول نہ ہو گا اور اگر خالی الذہن ہو کہ نہ دکھاوے کی نیت ہے نہ خدا کے لیئے نیت ہے تب بھی قبول ہے۔ جیسا اوپر مذکور ہوا کہ وہ فاحشہ عورت محض اس ذرا سے عمل پر کہ اُس نے ایک کتے کو پانی پلا دیا تھا بخش دی گئی اور اُس کا عمل قبول ہو گیا۔ حالانکہ اُس نے خالی الذہن ہو کر یہ عمل کیا تھا۔

ایسے ہی اگر آپ کے چندہ سے کسی بیمار کے منہ میں دودھ ڈالا گیا اور اُس بیچارہ کو راحت پہنچی تو کیا خدا اُس کی اتنی بھی قدر نہ ہو گی۔ اس لیئے

سب لوگوں کو اس چندہ میں شریک ہونا چاہیئے۔ جتنا ہو سکے اپنی وسعت کے موافق دینا چاہیئے۔ جو لوگ ایک دو پیسہ دے سکتے ہیں وہ بھی شریک ہوں دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

مَنْ بَنٰی لِلّٰہِ مَسْجِدًا وَّلَوْ کَمَفْحَصِ قَطَاۃٍ بَنَی اللّٰہُ لَہٗ بَیْتًا فِی الْجَنَّۃِ۔

یعنی اگر کوئی قطاۃ پرندہ کے آشیانہ کے برابر بھی مسجد بنائے تو اُس کے لیئے جنت میں گھر بنے گا۔

تو دیکھیئے کتنے قلیل عمل پر کیتنی عظیم فضیلت فرمائی۔ بعض لوگ جن کو شبہات نکالنے کی عادت ہے شاید یہ کہیں کہ یہ حضورؐ کا کلام نہیں کیونکہ اتنی چھوٹی مسجد ہی نہیں ہوگی۔ تو اگرچہ اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ تمام اہل زبان میں مبالغہ کلام کا حسن سمجھا جاتا ہے مگر ہم حدیث کا دوسرا مطلب بیان کرتے ہیں کہ اگر کسی نے مسجد میں مثلاً چار آنے دیئے جس سے عمارت مسجد میں سے اُس کے حصہ میں گھونسلہ کے برابر جگہ آئی تو اُس کو بھی جنت میں پورا گھر ملے گا اگرچہ اُس نے پوری مسجد نہیں بنوائی۔ تو اگر کسی نے خدا کی راہ میں ایک پیسہ بھی دیا تب بھی نجات کے لیئے ویسا ہی کافی ہے جیسا کہ ہزار دو ہزار۔ بلکہ غرباء کے دو چار پیسے امراء کے ہزاروں سے بڑھ جاتے ہیں۔

مثلاً ایک شخص نے لاکھ روپے میں سے ایک ہزار روپے دیئے اور ایک نے ایک پیسہ دیا مگر اس کے پاس ہی ایک پیسہ تھا۔ یہ شخص پہلے سے بڑھ گیا ہے۔ کیونکہ اس کے پاس جو کچھ تھا سب دے دیا، اپنی ضرورت

کا بھی خیال نہ کیا۔ اور پہلے شخص نے ۹۹ ہزار اپنے کاموں کے لئے بچا کر ایک ہزار خدا کی راہ میں دیئے۔

اس لیئے دوسروں کو بھی چاہیئے کہ غریب کے چندہ کی قدر کریں اور اُن پر ہنسیں نہیں کہ یہ بڑا جرم ہے۔ تعزیرات الٰہیہ کا بھی اور تعزیرات ہند کا بھی کیونکہ اہانت ہے لیکن اگر تعزیرات ہند کا جرم نہ بھی ہو تو تعزیرات الٰہیہ کا تو یقیناً ہے۔ دسویں سیپارہ میں فرماتے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ وَالَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ۔

اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضورؐ نے چندہ کی ترغیب دی تھی تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف تو اتنا لائے کہ اٹھ بھی نہ سکا اور ایک صحابی جو کے دانے لائے۔ منافقین دونوں پر ہنسے۔ ایک کو ریاکار بنایا، ایک کو بے شرم۔ حق تعالیٰ اس کو بھلا کیا دیکھ سکتے تھے۔ ایک حدیث قدسی میں فرماتے ہیں۔ میں نے تفسیر مظہری میں یہ حدیث دیکھی ہے کہ مجھے اپنے مقبول بندے کو چھیڑنے پر ایسا غصہ آتا ہے جیسے شیر کے بچوں کے چھیڑنے پر شیر کو دوسری حدیث قدسی میں ہے مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ کہ جو میرے ولی سے عداوت رکھے، اس کو میری طرف سے اعلان جنگ ہے

(براہ کرم ورق نہ موڑیں)

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات
با دُردکشاں ہر کہ در افتاد برافتاد

اور فرماتے ہیں ؎

ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد
تا دلِ صاحب دلے نامد بدرد

ایک ایک مقبول بندے کے ستانے پر شہر کے شہر تباہ کر دیئے گئے ہیں تو حق تعالیٰ اپنے مقبول بندے پر طعن کو نہیں دیکھ سکتے۔ فوراً اس کا بدلہ لیتے ہیں۔ اسی طعن کے بارے میں فرماتے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ وَالَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ۔

کہ جو لوگ طعن کرتے ہیں ان لوگوں پر بھی جو رغبت ظاہر کرتے ہیں صدقات میں اور وہ مومن ہیں اور ان لوگوں پر بھی جو نہیں پاتے خرچ کرنے کو مگر اپنی طاقت کے موافق۔ تو جو اُن سے تمسخر کرتے ہیں، خدا اُن کے تمسخر کا بدلہ لے گا اور وہ بدلہ یہ ہے۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ کہ اُن کو سخت عذاب ہوگا آگے اس کو اچھی طرح موکد فرماتے ہیں کہ آپ اُن کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں برابر ہے۔ اگر آپ ستر مرتبہ بھی استغفار کریں گے تو خدا تعالےٰ اُن کو نہ بخشیں گے۔

اس سے کوئی یہ نہ سمجھیں کہ کوئی گناہ ایسا بھی ہے کہ وہ توبہ و استغفار سے بھی نہیں بخشا جا سکتا۔ کیونکہ اس آیت میں تو حضورؐ کو ارشاد ہے کہ آپ

اُن کے واسطے کتنا ہی استغفار کریں ہم نہ بخشیں گے۔ بات یہ ہے کہ وہ لوگ خود استغفار نہ کرتے تھے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی دعا واستغفار اسی وقت مفید ہو سکتی ہے کہ گناہ کرنے والا خود بھی توبہ کرنا چاہے۔ حق تعالیٰ نے یہ تو نہیں فرمایا کہ یہ لوگ استغفار کریں یا نہ کریں ہم نہ بخشیں گے اگر یہ فرماتے تو شبہ کی گنجائش تھی کہ کیا بعضے گناہ استغفار سے بھی معاف نہیں ہو سکتے۔ تو اگر وہ خود استغفار کرتے تو ایک مرتبہ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ کہنا بارود کی طرح گناہوں کو اڑا دیتا ہے۔

غرض چھوٹے چندوں کو بھی حقیر نہ سمجھو۔ جو کچھ بھی کوئی دے اُس کی قدر کرو۔ اگر کوئی آدھا چھوارہ بھی دے تب بھی لے لو موجب اجر ہے۔ یہ نہیں کہ انبار میں رل جائے گا۔ ہر چیز خدا کے سامنے ہے (یہاں تک بیان فرما کر مولانا نے ارشاد فرمایا کہ میرا چوغہ[ا] اُونی چندہ میں دے دیجئے)

حدِ ثواب

ہر چیز پر ثواب ملے گا بلکہ ذرا سا صدقہ بہت ہو کر ملے گا۔ حضور ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر ایک خرما خدا تعالیٰ کی راہ میں دے، اللہ تعالیٰ اپنے دست مبارک میں اس کو لے لیتے ہیں اور اس کو بڑھاتے ہیں یہاں تک کہ وہ اُحد پہاڑ سے بڑا ہو جاتا ہے۔ تو خیال کیجئے کہ اُحد پہاڑ کتنا بڑا ہے۔ تو میں آپ کو متوجہ کرتا ہوں کہ اگر کوئی اُحد پہاڑ کے ٹکڑے چھوارے

[ا] یہ چوغہ تقریباً ۴۰ یا ۴۵ روپے میں فروخت ہوا۔ ۱۲ ظ

کے برابر کرے تو وہ کتنے ہوں اور حضورؐ فرماتے ہیں کہ وہ صدقہ اُحد سے بھی بڑا ہو جاتا ہے۔ اس سے سمجھ میں آگیا ہو گا کہ ثواب کس قدر بڑھتا ہے اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ حد سے حد ثواب سات سو تک بڑھتا ہے۔ میں اس حدیث سے بتلاتا ہوں کہ لاکھوں کروڑوں تک بڑھتا ہے۔ دیکھو حدیث سے کیسے نفع کی بات معلوم ہوئی اور لیجئے میں قرآن سے بھی بتلاتا ہوں کہ سات سو تک حد نہیں۔ آگے بھی ثواب بڑھتا ہے ارشاد ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ط وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔

ارشاد ہوتا ہے کہ جو لوگ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اُن کی ایسی حالت ہے کہ کسی نے ایک دانہ بو دیا۔ اُس نے سات بالیاں اگائیں۔ ہر بالی میں سو دانے پیدا ہوئے تو ایسے ہی اُن لوگوں کو ایک چیز کے بدلہ میں سات سو گنا ثواب ملے گا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ خدا جس کسی کو چاہے اس سے بھی زیادہ بڑھا دے۔ کیونکہ خدا صاحب وسعت ہے اور جاننے والا ہے۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ سے ایک شبہ دور کر دیا کہ یہ خیال نہ کرنا کہ اتنا ہر ایک کو کہاں سے ملے گا۔ تو فرماتے ہیں کہ ہم دنیا کے بادشاہوں کی طرح عاجز نہیں ہیں۔ خدا بہت بڑا صاحب وسعت ہے۔ مگر جہاں اس قدر ترغیب دی یہ انتظام بھی کر دیا کہ کوئی اتنا ثواب سن کر عجب و تکبر نہ کرے تو فرماتے ہیں عَلِيْمٌ کہ ہم نیتوں کو بھی جانتے ہیں۔ نیت درست کر لو تو صدقہ قبول ہو گا

پس وَاسِعٌ میں تو پھاٹک کھول دیا اور عَلِیْمٌ فرما کر ایک قفل لگا دیا اور یہ نہیں کہ راہ کو تنگ کر دیا کیونکہ تنگ کرنا اس وقت ہوتا کہ کوئی بڑی سخت شرط لگاتے۔ یہاں تو ایسی شرط لگائی کہ دینے سے بھی زیادہ آسان ہے کیونکہ خلوص تو دل میں سمجھ لینا ہے۔ تو آیت اور حدیث دونوں سے معلوم ہو گیا کہ ثواب کی کوئی حد نہیں تو کسی کے صدقہ کو حقیر نہ سمجھو۔ قبول و تضاعف کا مدار نیّت پر ہے خواہ کیسا ہی قلیل ہو۔

حتیٰ کہ آپ نے سُنا ہو گا کہ ایک بڑھیا یوسف علیہ السلام کو سُوت کی آنٹی لے کر خریدنے گئی تھی مگر یوسفؑ تو ایک تھے وہ دس کو کیسے ملتے پھر تاجر طماع تھے اس لئے اُن کو بڑھیا کی قدر نہ ہوئی اور یہاں خریدنے والا قدر دان ہے۔ اگر سوت کی آنٹی بھی خلوص کے ساتھ دی جائے گی تو وہ بھی بہت زیادہ ثواب کی موجب ہو گی۔

فضائلِ خیرات

حدیث شریف میں اس کی نظیر ایک واقعہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف فرما تھے تو آپ کی خدمت میں چند آدمی قبیلہ مضر کے حاضر ہوئے۔ بیچارے کمبلوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ حضورؐ کو اُن کی اس بے سروسامانی پر ترس آیا۔ حدیث کے یہ الفاظ ہیں۔ فَتَمَعَّرَ وَجْہُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یعنے حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک رنج سے متغیر ہو گیا۔

ہمارے حضورؐ کی یہ حالت تھی کہ ہماری ذرا سی تکلیف بھی گوارا نہ تھی

جب دنیا کی تکلیف سے حضورؐ پر اتنا اثر ہوتا تھا، تو بھلا آخرت کی تکالیف سے کیونکر اثر نہ ہوگا۔ مسلمانوں کے لئے بڑی خوشی کی بات ہے کہ خدا نے اُن کو ایسا پیغمبر دیا کہ ہماری خراب و خستہ حالت دیکھ کر اُن کو بے چینی ہو جاتی ہے۔

نماند بعصیاں کسے در گرو　　　که دارد چنیں سیدؐ پیشرو

تو انشاء اللہ ہم کو بہت بڑی امید ہے مگر کچھ اپنا بھی بل بوتا چاہیے ورنہ ایسی مثال ہوگی کہ ایک شخص اولاد کا خواہش مند ہے مگر نکاح نہیں کرتا بلکہ تعویذوں پر بھروسہ کئے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر عاقل اس کو بیوقوف کہے گا۔ کیونکہ تعویذوں کا تو یہ فائدہ ہے کہ تم تدبیر کرو تعویذ سے اس تدبیر میں برکت ہو جائے گی۔ یہ تو نہیں کہ سارا کام تعویذ ہی کر دے گا کہ وہی عورت کا بھی کام دے اور اسی میں سے بچہ پیدا ہو جائے۔

اسی طرح انبیاء اور اولیاء سے بھی جو امید ہے وہ اس وقت ہے کہ خود بھی کچھ کیا جائے اور محض شفاعت کے بھروسہ پر کام چھوڑ دینا اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا سخت نادانی اور حماقت ہے۔

بہرحال ان لوگوں کی بے سروسامانی دیکھ کر حضورؐ کا چہرہ متغیر ہو گیا اور آپ نے خطبہ فرمایا جس میں لوگوں کو صدقہ کی ترغیب دی۔ مسلم اور نسائی کی حدیث میں آپؐ کا ارشاد ہے۔

تَصَدَّقَ رَجُلٌ مِنْ دِیْنَارِہٖ مِنْ دِرْھَمِہٖ مِنْ ثَوْبِہٖ مِنْ صَاعِ بُرِّہٖ مِنْ صَاعِ تَمْرِہٖ۔

لوگوں نے لانا شروع کیا یہاں تک کہ دو ڈھیر لگ گئے اور بحمد اللہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے معلوم ہو گیا کہ جس کو جو دینا آسان ہو وہ دے۔ مثلاً شہریوں کو کپڑا اور نقد دینا آسان ہے۔ یہ کپڑا اور نقدی دیں اور دیہاتیوں کو غلہ دینا آسان ہے وہ غلہ ہی دیں۔ غرض جس سے جو ہو سکے وہ دے۔ صاحبو! گھروں کا جائزہ لو۔ زیادہ وہ چیزیں نکلیں گی جو برسوں صندوقوں میں رہتی ہیں ؎

حرص قانع نیست صائب ورنہ اسباب معاش

آنچہ ما در کار داریم اکثر در کار نیست

واقعی اکثر حرص کی وجہ سے اسباب معاش بڑھ جاتے ہیں ورنہ جو چیزیں ہم کام میں لاتے ہیں اکثر بیکار ہیں۔ دیکھو ضرورت کی چیز وہ ہے جس کے بغیر تکلیف اور ضرر ہو۔ ذرا انصاف کے ساتھ دیکھا جائے کہ گھر میں کتنی چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے نہ ہونے سے تکلیف ہو گی۔ تو جو چیزیں ضرورت سے زائد ہوں، اُن کے کام میں لانے کا اس سے زیادہ کیا موقع ہو گا۔ اللہ کی راہ میں اس کو خرچ کیا جائے۔

دیکھو! حق تعالیٰ کی کتنی بڑی رحمت ہے کہ دین کے کاموں میں خرچ کرنے کو فی سبیل اللہ یعنی خدا کی راہ میں خرچ کرنا کہا۔ کیا معاذ اللہ اس میں کوئی خدا کا نفع ہے ہرگز نہیں بلکہ تمہارا ہی نفع ہے۔ اور یہ خرچ واقع میں فی سَبِیْلِ اَنْفُسِکُمْ ہے مگر حق تعالیٰ کی رحمت تو دیکھئے کہ ہم کو نفع حاصل کرنے کی کس طرح ترغیب دی کہ اس خرچ کو اپنی طرف منسوب فرمایا کہ

ہمارے واسطے اور ہماری راہ میں خرچ کرو۔ حالانکہ اس میں سراسر ہمارا ہی نفع ہے اور ہم اپنے ہی واسطے خرچ کرتے ہیں۔

اس لحاظ سے تو اگر یہ قانون کر دیا جاتا کہ صدقہ اس شخص کا قبول ہوگا جو پہلے اتنی فیس داخل کرے تو ہم کو فیس دے کر خرچ کرنا چاہیے تھا کیونکہ ہمارے نفع کا کام تھا۔ دیکھو، بنک میں یا کسی کوٹھی میں روپیہ داخل کیا جاتا ہے تو بنک کو بھی اس میں سے نفع ملتا ہے اور خدا کے ہاں بلا فیس داخل کیا جاتا ہے۔ اور بنک میں تو اپنا نفع کاٹ کر بقیہ واپس کیا جاتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ کے ہاں اپنے پاس سے ملا کر دیا جاتا ہے۔ مگر افسوس آج کل مسلمانوں کو بنکوں میں تو روپیہ داخل کرنے کی ہوس ہے اور خدا کے پاس جمع کرنے کی ہوس نہیں۔ اور یہ میں کوئی اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ آیت و حدیث سے دکھلا چکا ہوں۔

بہر حال چونکہ خدا کے یہاں ہر چیز کی قدر ہوتی ہے اس لئے ہر شخص کو چندہ میں شرکت کرنی چاہیئے۔ پھر حضورؐ نے یہ بھی فرمایا ہے۔

مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهٗ اَجْرُهَا وَاَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا

تو بانی یعنی ابتدا کرنے والے کو بہت زیادہ ملتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ بعض کو یہ شبہ ہو کہ ہم تو ابتدا نہیں کر سکے کیونکہ ہم سے پہلے بہت لوگ دے چکے ہوں گے۔ تو سمجھو کہ جب مجمع میں چندہ ہوتا ہے تو ہر ایک دوسرے کے لئے بانی ہے۔ یعنی بعض مرتبہ ایک شخص کے دینے سے دوسرا ابھر جاتا ہے۔ تو وہ اس کے لئے بانی اور محرک ہوا۔ اس کے دینے کا ثواب

اُس کو بھی ملے گا۔ حاصل یہ کہ بانی عام ہے، اضافی ہو یا حقیقی۔ تو اگر ابتداد حقیقی نہیں کر سکتے تو ابتداد اضافی تو کر سکتے ہو۔ اور حق تعالیٰ کی رحمت بہت بڑی ہے۔ فرماتے ہیں۔ اِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُہٗ۔ سب چیزوں کے خزانے اسی کے قبضہ میں ہیں پھر نا امید کیوں ہوتے ہو۔ امید رکھو انشاء اللہ ہر ہر بانی کو سب برکات عطا ہوں گی ——— یہ تو مطلق خیرات کے فضائل تھے

فضیلت صدقہ

اب سنیئے کہ صدقہ کی فضیلت خصوصیت محل سے بھی بڑھ جاتی ہے آج کل بہت سے یتیم ہیں، بہت سی عورتیں بیوہ ہیں اور یتیم اور بیواؤں پر رحم کرنا بہت بڑا ثواب کا کام ہے۔ حدیث میں وارد ہے

اَلسَّاعِیْ عَلَی الْاَرْمَلَةِ کَالصَّائِمِ لَا یُفْطِرُ وَالْقَائِمِ لَا یَفْتُرُ۔ اوکما قال۔

ساری رات کا جاگنا اور ساری عمر روزہ رکھنا جتنی فضیلت رکھتا ہے اتنی ہی مساکین کی نگہداشت میں فضیلت ہے۔

ارملہ کی فرد بیوہ عورتیں بھی ہیں اور حدیث میں وارد ہے۔ اَنَا وَکَافِلُ الْیَتِیْمِ کَھَاتَیْنِ۔ اوکما قال۔ یعنے جو شخص یتیم کی کفالت کرے جنت میں وہ اور میں مثل ان دو انگلیوں کے ہوں گے یعنے سبابہ اور وسطیٰ کی۔ حدیث میں یہ بھی مذکور ہے۔ وَفَرَّجَ بَیْنَھُمَا۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد کے وقت دونوں انگلیوں میں کشادگی فرمائی تھی۔ اس تشبیہ سے حضور ؐ کا مقصود

قرب کا تبلاتا ہے کہ ایسے شخص کو جنت میں مجھ سے قرب حاصل ہوگا جیسا کہ سبابہ کو وسطیٰ سے قرب ہے۔

اس سے یہ شبہ نہ ہو کہ وہ شخص حضورؐ کے برابر ہو جائے گا۔ معاذاللہ کیونکہ اوّل تو یہ شبہ اسی سے زائل ہو گیا کہ حضورؐ نے تشبیہ میں انگشت شہادت اور وسطیٰ استعمال فرمایا اور ظاہر ہے کہ اُن دونوں انگلیوں میں ایک انگشت دوسری سے بڑی ہوتی ہے۔ پس جس طرح ان دونوں انگلیوں میں سے ایک دوسرے سے بڑھی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ پھر باہم قرب بھی ہے ایسے ہی سرور عالم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بوجہ نبوت و رسالت کے اس شخص سے بڑھے ہوئے ہیں مگر اس فضیلت کے ساتھ ہی اس عمل مقبول کی وجہ سے کافل یتیم کو حضورؐ کے ساتھ ایک قسم کا قرب بھی ہے۔

دوسرے حضورؐ نے اشارہ میں کشادگی ظاہر کر دینے سے یہ بھی تبلا دیا کہ علاوہ فرق مراتب کے حضورؐ میں اور اس میں حسّی فرق بھی ہوگا۔ تو مساوات کا وہم بالکل نہیں ہو سکتا۔

اگر کوئی کہے کہ پھر کیا ہوا پیغمبر تو نہ ہوئے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کمی نہیں تمہارے لئے بڑی رحمت ہے۔ میں ایک گاؤں کے جاہل آدمی سے پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی تم کو ڈپٹی کلکٹری دینا چاہے تو کیا تم قبول کر لوگے ظاہر ہے کہ یہ شخص قبول نہ کرے گا۔ یہی ڈپٹی کلکٹری ایک شخص کے لئے باعث راحت ہے اور گاؤں والے کے لئے عذاب ہے۔ پس تمہارا پیغمبر نہ ہونا کوئی نقص نہیں بلکہ خدا کی بہت بڑی رحمت ہے۔ کیونکہ ہر چیز

کا ایک بار ہوتا ہے کہ اس کا متحمل ہر شخص نہیں ہو سکتا۔ نبوت کا ایک تو دنیا میں بار تھا جس کو سب جانتے ہیں کہ اس کا برداشت کرنا اور کما حقہٗ اس کا حق ادا کرنا حضرات انبیاء علیہم السلام ہی کا کام تھا اور ایک بار وہاں ہوگا۔ آخرت میں بھی اس کا تحمل بجز ان ذات مقدسہ کے کسی سے نہ ہوگا۔

اگر کہو کہ وہاں کیا بار ہوتا وہاں تو کھانا پینا ہی ہوگا۔ تو میں کہتا ہوں کہ یہ غلط ہے۔ کھانا پینا تو بعد وصول جنّت کے ہوگا وصول جنّت سے پہلے بہت سے مرحلے طے کرنے ہوں گے بلکہ بعض مرحلے ایسے ہوں گے کہ انبیاءؑ میں بھی حضورؐ ہی کے ساتھ خاص ہوں گے۔ مثلاً حق تعالیٰ سے حساب کتاب شروع کرنے کی بابت عرض کرنے کی کسی کو ہمّت نہ ہوگی۔ سارے انبیاء بوجہ خوف کے اس سے انکار کر دیں گے۔ آخر کار حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کا ذمہ لیں گے اور فرمائیں گے اَنَا لَہَا کہ میں اس کے لائق ہوں۔ جب مرتبۂ رسالت محمدیہؐ کے بعض کام ایسے دشوار ہوں گے کہ اس کے متحمل دیگر انبیاء بھی نہ ہو سکیں گے۔ پھر بھلا ہماری اور تمہاری تو کیا حقیقت ہے۔ معلوم ہوا کہ آخرت میں بھی انبیاء علیہم السلام پر منصب نبوت کا ایک ایسا بار ہوگا جس کا تحمل ہر شخص سے نہیں ہو سکتا۔

دوسرے یہ کہ کھانے پینے میں بھی تو سب برابر نہیں ہو سکتے۔ مرتبۂ محمدیؐ کے لائق جو انواع و اقسام کی نعمتیں ہوں گی ہر شخص ان کے قابل اور اُن کا متحمل نہیں ہوگا۔ اگر کوئی کہے کہ دیدارِ خداوندی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوگا اگر اتنا ہی اس شخص کو بھی ہو جو یتیم کی پرورش کرتا ہے تو البتہ اس

کو ہم حضورؐ سے قرب سمجھیں گے۔ تو میں کہتا ہوں صاحبو! اگر نگاہ کمزور ہے تو پانی میں آفتاب کو دیکھا کرتے ہیں۔ قوی نگاہ بلاواسطہ آفتاب کو دیکھ سکتی ہے۔ تو ایسا ہی خداوند کریم کا دیدار ہے۔ آپ کو دیدار الٰہی کا اس قدر تحمل نہیں جس قدر حضورؐ کو ہے۔ اگر اتنا دیدار آپ کو ہو جائے تو آپ فنا ہو جائیں۔ سچ کہا ہے ؎

اگر یک سر موئے برتر پرم
فروغِ تجلّی بسوزد پرم

آپ کے لئے زیادہ قرب نہ ہونا ہی رحمت ہے اور مطلق قرب نعمت نہیں۔ غرض دنیا میں یتیم بھی ہیں۔ بیوہ عورتیں بھی ہیں اور ان لوگوں پر رحم کر کے اُن کی اعانت کرنا دینی کام ہے اور بہت بڑے اجر کا باعث ہے اور زخم تو سخت تکلیف کی چیز ہے۔ ذرا کہیں کانٹا چبھ جاتا ہے تو سارا بدن بے چین ہو جاتا ہے۔ زخمی بھی قابل رحم ہیں۔ مسلمان وہ ہے جو دوسرے مسلمان کی مصیبت سے بے چین ہو جائے کہ فرماتے ہیں ؎

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند
کہ در آفرینش زیک جوہر اند

چو عضوے بدرد آورد روزگار
دگر عضوہا را نماند قرار

چو از محنت دیگراں بے غمی
نشاید کہ نامت نہند آدمی

تو ادنیٰ ادنیٰ مصیبت میں یہی حال سب کا ہونا چاہیے۔ چہ جائیکہ بڑی مصیبت میں اور اسی جلسہ تک بس نہ کیجئے بلکہ اس کے بعد بھی اس کا سلسلہ قائم رکھئے اور دوسروں کو ترغیب دیجئے۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ اس غم کو خوشی میں بدل دیں۔ اور مسلمانوں میں چونکہ باہم اجتماعی شان مرعی ہے اسی لئے

آپ کو چاہیئے کہ اس میں سب کو شریک کریں اور جس سے جتنا ہو سکے اس میں کمی نہ کریں۔ تو ایک حق یہ ہے اس مصیبت کا جو بواسطہ دوسرے کی مصیبت کے، اور حقیقت میں ایسی مصیبت بواسطہ کا علاج بھی اپنی ہی مصیبت کا علاج ہے کیونکہ دوسرے کی تکلیف سے دل کڑھتا ہے تو اس کی اعانت کرکے اپنی ہی طبیعت کو راحت پہنچائی۔ یہ احکام ہیں مصیبت کے متعلق جن کا مجموعہ پانچ حکم ہوئے۔ جن میں سے ایک کی تو میں نے خوب تفصیل کر دی۔ دوسروں کو بھی مختصر بیان کرکے ختم کرتا ہوں۔ ان میں ایک اس کا بھی بیان کیا تھا کہ صبر کرو۔

اطاعتِ حکام

سو صبر کہتے ہیں استقلال کو تو ایسا نہ کرنا چاہیے جیسا کہ آج کل لوگ ہر ہر واقعہ سے بے استقلالی ظاہر کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً زیادہ شور و غل کرنا زیادہ پریشانی ظاہر کرنا جس سے معلوم ہو کہ ان کو بہت رنج ہے۔ صاحبو! شریعت نے ہم کو اس قدر شور و غل کی اجازت نہیں دی بلکہ یہ حکم ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا ــــــ

اے ایمان والو! صبر کرو اور مقابلے میں مضبوط رہو ــــــ

نیز شور و غل خلاف احتیاط بھی ہے۔ بعض اوقات اس سے حکام کو غلط شبہات ہو جاتے ہیں۔ تو کوئی بات خلافِ احتیاط مت کرو۔ دیکھو! حکام کی کتنی بڑی مہربانی ہے کہ ہم کو ہمارے بھائیوں کے ساتھ ہمدردی کرنے سے روکا نہیں۔ ہم کو چندہ بھیجنے کی اجازت دے دی۔ اگر حکام منع کر دیتے

تو ہم کو اطاعت ضروری تھی۔ بدون اطاعت چارہ نہ تھا مگر دل پر ایک عظیم صدمہ ہوتا کہ ہم اپنے بھائیوں کی امداد نہیں کر سکتے۔ تو جب حکام نے ہم کو اجازت دے دی ہے اس کا ہمیں شکر گزار ہونا چاہیے اور اس احسان کی قدر کرنی چاہیے اور ایسی کوئی بات ظاہر نہ کرنی چاہیئے جس سے حکام کو تشویش ہو۔ شریعت نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے کہ محسن کا شکریہ ادا کرو۔ جب کوئی تمہارے ساتھ بھلائی کرے تم بھی اس کے ساتھ بھلائی کرو۔

آج کل بعض نام کے مولویوں نے مطلق حکام کی اطاعت اس آیت سے نکالی ہے۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ
مِنْکُمْ۔ الآیۃ۔

کیونکہ اس آیت میں صیغہ امر مطلق اولی الامر کے لئے وارد ہے اور اولی الامر کو عام لے لیا ہے مگر یہ محض خوشامد ہے۔ اس آیت میں ہر حاکم ہرگز داخل نہیں ہو سکتا۔ اولی الامر سے مراد خلفائے اسلام ہیں۔ منکم اس کی کھلی دلیل ہے البتہ دوسرے حکام کی اطاعت ایک دوسری دلیل شرعی سے ضروری ہے وہ یہ کہ یہ لوگ محسن ہیں کیونکہ ہمارے امن و آسائش کے ذمہ دار ہیں۔ ہمارے دین کی باتوں میں دخل نہیں دیتے۔ اس احسان کے صلہ میں ہمارے ذمہ ضروری ہے کہ ہم بھی ان کو تشویش میں نہ ڈالیں اور دنیوی امور میں بہ پابندی احکام شرعیہ ان کی اطاعت کریں۔

ایک حدیث سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ

جب غزوہ بدر میں مسلمانوں کو غلبہ ہوا اور بہت سے کفار مارے گئے اور بہت سے قید ہو کر آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَوْ کَانَ مُطْعِمُ بْنُ عَدِیٍّ حَیًّا وَکَلَّمَنِیْ فِیْ هٰؤُلَاءِ النَّتْنٰی لَتَرَکْتُهُمْ لَهٗ

کہ اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتے اور ان گندہ کفار کی بابت گفتگو کرتے تو میں ان کو اُن کی خاطر چھوڑ دیتا۔

بعض روایتوں میں آیا ہے کَانَ یَشْکُرُ لَهٗ کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی شکر گزاری کے لئے ایسا فرماتے تھے کیونکہ جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے طائف تشریف لے گئے کہ شاید وہاں کے باشندے مسلمان ہو جائیں اور وہاں تکالیف سے نجات ملے مگر وہاں کے لوگوں نے آپ کے ساتھ نہایت گستاخانہ سلوک کیا تو آپ بددل ہو کر پھر مکہ معظمہ واپس تشریف لائے اور مطعم بن عدی کو اطلاع فرمائی کہ اگر اہل مکہ مجھے امن دیں تو شہر میں آؤں ورنہ کسی دوسری جگہ چلا جاؤں۔ اس وقت مطعم بن عدی نے اہل مکہ سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو میں نے پناہ دی ہے۔ خبردار، کوئی اُن کو ہاتھ نہ لگائے۔ چنانچہ اس وقت سے ہجرت مدینہ تک حضورؐ مطعم بن عدی کی پناہ کی وجہ سے مکہ میں تشریف فرما رہے۔ ان کی اس ہمدردی کا ہمیشہ حضورؐ شکریہ ظاہر فرماتے تھے۔ اسی کے صلہ میں یہ ارشاد فرمایا تھا۔

اس وقت بعینہٖ یہی حالت ہے ہمارے ان احکام کے ساتھ کہ جن

طرح مطعم بن عدی نے حضورؐ کی حمایت کی تھی اور آپ اُن کے شکر گزار اور ممنون تھے اسی طرح حکامِ وقت ہمارے محافظ ہیں اور ہمارے امن کے ذمہ دار ہیں ہم کو بھی ان کا شکر گزار رہنا چاہیے۔ جس کا ادنیٰ اثر یہ ہونا چاہیے کہ کوئی ایسی شورش نہ کریں جس سے حکام تشویش میں پڑ جائیں۔ دیکھو شریعت نے جہاں مصیبت زدہ کے ساتھ ہمدردی کا حکم کیا ہے صبر کا بھی حکم دیا ہے تو یہ تمام جوش و خروش خلاف شرع ہے۔ اور جہاں تک میں اندازہ کرتا ہوں یہ شورش اکثر بے دینوں میں ہے جن کو دین کا علم بہت کم ہے۔ دینداروں میں عام امن وسکون ہے۔

غور سے معلوم ہوا کہ یہ نئی روشنی والے اس شورش کے اندر بھی یورپ کی تقلید کرتے ہیں۔ یہ طریقہ یورپ ہی کا ہے کہ جو کام کرتے ہیں بڑھا چڑھا کر لوگوں کو دکھلا کر کرتے ہیں۔ اگر کسی قوم سے مخالفت ہوگی تو اہل یورپ اُس کی بنائی ہوئی چیزیں استعمال نہیں کریں گے اور جو پہلے سے گھر میں ہوں اُن کو جلا پھونک دیتے ہیں۔ چنانچہ پچھلے دنوں اٹلی کی مخالفت میں ہمارے نوجوان تعلیم یافتوں نے بہت سے کپڑے ٹوپیاں وغیرہ جلادیں کیونکہ وہ مال اٹلی کا بنا ہوا تھا۔ ہم کو تو یہ بات پسند نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اہل شریعت میں تہذیب نہیں، اس وقت تو شریعت سے بعید ہونے والوں کی تہذیب معلوم ہوگئی۔ دوسرے ٹوپی وغیرہ کا جلانا اضاعت مال ہے جو شرعاً و عقلاً کسی طرح جائز نہیں۔

اسی طرح اخبار نویسوں نے بھی بہت زیادہ لوگوں کو پریشان کر دیا ہے

ایسے ایسے مضامین لکھتے ہیں جس سے خواہ مخواہ دیکھنے والے کو جوش آئے کیونکہ ان لوگوں کو تجارت مقصود ہے۔ ایسے مضامین سے اُن کے اخبار کی اشاعت خوب ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ اہل دنیا ہیں، اہل دین کا طریقہ تو رضا برقضا ہے ؎

دلا آرامے کہ داری دل درو بند — دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

وہ کتاب و سنت کو دیکھتے ہیں، اُن کو تو کوئی تجارت مقصود نہیں جو خواہ مخواہ جوش و خروش ظاہر کریں۔ یہ سب باتیں صبر و متانت کے خلاف ہیں، اور شریعت میں ایک تاکید یہ کی گئی ہے کہ مصیبت میں یاس نہ ہو حق تعالیٰ سے امیدوار رہنا چاہیے کیونکہ اسباب سے فوق بھی تو کوئی چیز ہے۔ تو یاس کی بات، تو وہ کہے جس کا دین تقدیر پر نہ ہو محض تدبیر پر ہو۔ یہ سب آداب ہیں صبر یعنی مصیبت کے۔ فقط!

ضروری عرض۔ اشرف علی عرض کرتا ہے کہ نظر اصلاحی کے وقت معلوم ہوا کہ یہ وعظ ناتمام لکھا گیا ہے۔ وعظ میں آیات متلوہ کے سب اجزاء پر کلام ہوا تھا جو اس مسودہ میں نہیں ہے۔ وجہ ناتمام لکھے جانے کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ مرحوم کا بالکل اخیر لکھا ہوا وعظ ہے پھر تاریخ وعظ سے پانچ مہینہ بعد اُن کا انتقال ہو گیا جیسا وعظ ہذا کے شروع صفحوں کے حاشیہ پر بھی لکھا ہوا ہے اور اسی وعظ کی تاریخ کے قبل متصل دو وعظ اور ہوئے تھے یعنی مواساۃ المصابین جزو اول و جزو دوم۔ تو تینوں مسودے جمع ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے یہ ترتیب سب کو صاف کرنا چاہا تو وہ دونوں صاف ہو گئے۔ یہ تیسرا پورا صاف نہ ہونے پایا تھا کہ اُن کا انتقال ہو گیا مگر جتنا بھی ضبط ہوا وہ اپنے مدلول میں کافی وافی ہے وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین ۔

الوقت

HINDUSTANI LIBRARY
ESTD.
ہندستانی لائبریری
Garden Reach, Calcutta

وقت کے حقوق کے متعلق یہ وعظ ۱۲؍ رجب ۱۳۳۱ھ کو بجامع
مسجد تھانہ بھون میں ہوا جو ۳ ½ گھنٹہ میں ختم ہوا۔ بیٹھ کر بیان فرمایا
۴۰۰ کی حاضری تھی۔ عبدالحلیم صاحب لکھنوی نے قلمبند فرمایا

؎

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمد عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ علیہ و علی آلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم۔ وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ یعنی قسم ہے زمانہ کی کہ انسان بڑے خسارہ میں ہے مگر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اور ایک دوسرے کو اعتقاد حق پر قائم رہنے کی فہمائش کرتے رہے اور ایک دوسرے کو پابندی اعمال کی فہمائش کرتے رہے

HINDUSTANI LIBRARY
Estd.
ہندستانی لائبریری
Garden Reach, Calcutta.

مصلحت و حکمت قسم

یہ ایک سورت چھوٹی سی ہے۔ گو الفاظ اس کے کم ہیں مگر اس میں مضمون بہت ضروری اور عام ضرورت کا ہے اور وہ مضمون وقت کے متعلق ہے اور جیسا کہ عام ضرورت کا ہے ویسا ہی جامع بھی ہے اور جامع اس معنی کر ہے کہ کوئی عمل اور کوئی حالت انسان کی ایسی نہیں جو فی الوقت نہ ہو اور اُس وقت کے متعلق کوئی خاص حکم نہ ہو۔ اس واسطے اس وقت اس کو اختیار کیا گیا حق جل شانہٗ نے اس سورت کو شروع کیا ہے ایک قسم کے ساتھ۔ آگے اس کے جواب قسم ہے اور قسم کھائی ہے ایک ایسی چیز کی جس کی کوئی وقعت بھی عام قلوب میں نہیں۔ اُس کی طرف کوئی خاص التفات بھی نہیں مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے جو مخلوق کی قسم کھائی ہے وہ ایسی چیزیں ہیں جو نہایت قابل التفات اور مہتم بالشان ہیں۔

اب رہا یہ کہ حق تعالیٰ نے اپنی قسم کو چھوڑ کر مخلوق کی قسم کیوں کھائی یہ

ایک نہایت عجیب اور حل طلب سوال ہے۔ سو ہم مختصراً یہ کہیں گے کہ خدا کو اختیار ہے جو جی چاہے کرے آپ کون ہوتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی اس سوال کو یوں بدل کر کہے کہ حق تعالیٰ نے ہمیں غیر مخلوق کی قسم کھانے سے کیوں ممانعت کی۔ ممانعت تو اس چیز سے ہوا کرتی ہے جو بری ہو اور جو شے بری ہو حق تعالیٰ سے اس کا صدور کیسے ہو سکتا ہے۔ البتہ اس عنوان سے سوال ہو سکتا ہے بات یہ ہے کہ بعض چیزوں کا قبح لعینہٖ (اپنی ذات کے اعتبار سے) ہوتا ہے اور بعض کا لغیرہٖ (غیر کے اعتبار سے) ہوتا ہے اور جو چیزیں قبیح لعینہٖ ہیں مثلاً زنا سرقہ وغیرہ ان کی اجازت کسی کو نہیں ہوتی اور ان کا صدور حکیم سے بھی نہیں ہو سکتا۔ اور بعض چیزیں قبیح لغیرہٖ ہیں یعنی ان میں کوئی خاص مفسدہ ہے اور وہی مانع ہے اجازت سے۔ جب وہ مرتفع ہو جائے گا قبح بھی مرتفع ہو جائے گا۔

اس کی ایک مثال سمجھ لیجئے کہ مثلاً اذان جمعہ کے وقت بیع و شراء (خرید و فروخت) کرنا کہ اگر جمعہ کی طرف چلتے ہوئے راہ میں بیع و شراء کریں تو جائز ہے۔ مگر افسوس ہمارے قصبہ میں عین جمعہ ہی کے وقت بازار لگتا ہے شاید یہ کسی بڑے بوڑھے کی اچھی نیت تھی کہ گاؤں والے لوگ بھی آ کر نماز جمعہ میں شریک ہو سکیں گے مگر ؎

حفظت شیئا وغابت عنک اشیاء

(ایک چیز کا تو خیال کیا اور بہت سی چیزوں کو نظر انداز کر دیا)

ایک چیز کا تو خیال کر لیا کہ نماز جمعہ میں شریک ہو سکیں گے مگر اس کا خیال نہ

کیا کہ جب تک وہ گاؤں میں ہیں اُس وقت تک اُن پر جمعہ واجب نہیں۔ اگر جمعہ پڑھنے کے لئے یہاں نہ آئیں تو کچھ حرج نہیں۔ اور جب یہاں آگئے، تو اُن پر جمعہ واجب ہو گیا۔ اب اگر نہ پڑھیں تو گنہگار ہوں گے اور اذان جمعہ کے وقت بیع و شراء کرنا بھی حرام ہے اس حرام میں بھی مبتلا ہوں گے۔ خیر اہل علم اس مسئلہ کو تو خوب جانتے ہیں۔

مگر ایک شخص نے مجھ سے ایک اور مسئلہ اس کے متعلق پوچھا کہ کیا اذان جمعہ کے بعد کھانا پینا بھی حرام ہے۔ سو اس مسئلہ پر کسی کو التفات بھی نہیں حالانکہ وہ بھی حرام ہے۔ جس کے بعد اہل علم اس پر ناز نہ کریں کہ ہم کو بیع و شراء سے سابقہ ہی نہیں پڑتا۔ اس لئے ہم اس آیت کے خلاف سے محفوظ ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اذان جمعہ کے بعد جیسا بیع و شراء حرام ہے ویسا ہی کتاب دیکھنا بھی حرام ہے پڑھنا پڑھانا بھی حرام ہے۔

رہا یہ کہ بعض اہل علم کو شاید شبہ ہو کہ قرآن میں تو وَذَرُوا الْبَيْعَ (خرید و فروخت ترک کرو) آیا ہے وَذَرُوا القِرَاءَةَ (پڑھنا ترک کرو) نہیں آیا ہے تو جناب فقہا نے لکھ دیا ہے کہ تخصیص جرایا علی العادۃ (بیع کی تخصیص قرآن پاک میں بیع کی عادت پڑنے کی وجہ سے ہے۔ ورنہ حکم میں تخصیص نہیں حکم عام ہے بیع صرف اس لئے حرام ہے کہ مخل سعی جمعہ ہے۔ تو جو چیز مخل سعی جمعہ ہو گی وہ حرام ہے۔ ہاں جب یہ مانع مرتفع ہو جائے گا حرمت بھی مرتفع ہو جائے گی مثلاً دو شخص چلتے چلتے ایک قلمدان کی بیع کریں تو چونکہ یہ بیع مخل سعی نہیں اس لئے حرام بھی نہ ہو گی۔ یہ قبیح لغیرہ کہلاتی ہے۔

اب سمجھئے کہ مخلوق کی قسم قبیح لغیرہ ہے قبیح لعینہ نہیں وہ قباحت عارضی ایسی ہے کہ اگر مخلوق مخلوق کی قسم کھائے تو قباحت ہے اور اگر خالق مخلوق کی قسم کھائے تو قباحت نہیں اور وہ شرک اور ایہام شرک ہے۔ اس طرح سے کہ اس میں شبہ ہوتا ہے تعظیم مخلوق کا کیونکہ عادۃً قسم معظم چیز کی کھائی جاتی ہے۔ اس لیئے ممانعت ہوگئی ہے قسم کھانے کی۔ جیسے بعض مشرکین قسم کھاتے ہیں دریاؤں کی پہاڑوں کی۔ مقصود اُن کا یہ ہوتا ہے کہ اتنی بڑی چیز کا نام لے کر جھوٹ نہیں بولیں گے۔ اس میں ایہام شرک ہے اور ایہام شرک کا مشتبہ اسی میں ہو سکتا ہے جو خود چھوٹا ہو اور اُس سے دوسری چیز بڑی ہو۔ اور خداوند جل جلالہ چونکہ سب سے بڑا ہے اس لیئے اُس میں یہ شبہ نہیں ہو سکتا۔ چونکہ اس میں ایہام شرک نہیں اس لیئے وہ عارضی قبح اس میں نہیں ہے۔

ایک سوال اور رہ گیا کہ قباحت تو لازم نہیں آتی مگر اپنی قسم چھوڑ کر چھوٹی شئے کی قسم کیوں کھائی۔ بات یہ ہے کہ قسم سے تین غرضیں ہوتی ہیں۔

۱. غالب تو یہ کہ کسی شئے کو معظم بتلانا اور یہ گمان کرنا کہ اگر ہم اس کا نام لے کر جھوٹ بولیں گے تو ہم پر اس کا وبال ہوگا۔

۲. دوسری غرض یہ کہ اُس مقسم بہ جس کے ساتھ قسم کھائی گئی ہے اُکا اپنے سے خاص تعلق ہے اگر جھوٹ بولیں تو ہمارے منافع اس سے منقطع ہو جائیں مثلاً بیٹے کی قسم۔

۳. تیسری غرض یہ کہ مقسم بہ کا کثیر النفع ہونا فی نفسہ بیان کرنا مقصود ہے

کہ بڑے کام آتی ہے۔
ہر چند کہ مخلوق کی قسم کھانے سے تینوں احتمال ہو سکتے ہیں مگر شریعت میں احتیاط بہت کی گئی ہے کہ شبہ شرک تو ہر جگہ ہوتا ہی ہے۔ رہا خداوند جل جلالہ جو کسی مخلوق کی قسم کھاتے ہیں اُس کی حکمت کیا ہے یا بلفظ دیگر آج کل کی مخترع (من گھڑت) اصطلاح کے موافق یوں کہیے کہ اس کی فلاسفی کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پہلی اور دوسری غرض تو وہاں ہے نہیں لیکن تیسری غرض یعنی حکمت مذکورہ ہے اور غرض کی تفسیر حکمت سے اس لیے کی کہ حق تعالیٰ کو کسی کی کیا غرض ہوتی۔ غرض تو مخلوق کو ہوا کرتی ہے وہاں حکمت ہوا کرتی ہے

من نہ کردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

یعنی ہم نے اس لیے مخلوق کو نہیں پیدا کیا کہ ہم اُس سے نفع اٹھائیں یا اُس سے ہماری کوئی غرض اٹکی ہوئی ہو بلکہ محض اس لیے تاکہ مخلوق پر احسان کریں پس خداوند جل جلالہ جس چیز کی قسم کھاتے ہیں اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اے سننے والو! یہ شے کثیر النفع ہے اس کی طرف التفات کرو اور اس سے منتفع ہو۔ مفسدہ کا احتمال تو پہلے ہی رفع ہو چکا تھا اب مصلحت کا سوال بھی ختم ہو چکا۔

ایک رازِ خاص

خداوند جل جلالہ نے بہت کثرت سے مخلوق کی قسم کھائی ہے۔ مثلاً لَا اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَۃِ وَلَا اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَۃِ (قسم کھاتا ہوں

ہیں قیامت کے دن کی اور قسم کھاتا ہوں میں ایسے نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرے) والعصفٰت عصفاً (یعنی قسم ہے اُن ہواؤں کی جو تندی کے ساتھ چلتی ہیں) والفجر (قسم ہے فجر کی) والشمس (قسم ہے سورج کی) ہر جگہ یہی مراد ہے کہ یہ اشیاء کثیر النفع ہیں اُن کی جانب التفات کرو۔

اور حق تعالیٰ کے مخلوق کی قسم کھانے میں ایک راز خاص اور بھی ہے وہ یہ کہ جس مقام پر قسم کھائی ہے اس کے بعد ایک جواب قسم بھی ہوتا ہے تو غور کرنے سے معلوم ہوا کہ مقسم بہ جواب قسم کی جو ایک دعویٰ ہے بمنزلہ دلیل کے ہوتا ہے یعنی خداوند جل جلالہ نے جس چیز کی قسم کھائی ہے اُس کے آگے جواب قسم سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ مقسم بہ اُس دعوے کی دلیل ہے اسے ایک مثال سے سمجھیے۔ مثلاً فرماتے ہیں والمرسلٰت عرفاً الخ (قسم ہے اُن ہواؤں کی جو نفع پہنچانے کے لئے بھیجی جاتی ہیں) اس کے آگے فرماتے ہیں اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَوَاقِعٌ (جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ ضرور ہونے والی ہے) قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ قیامت ضرور آنے والی ہے والنّٰزعٰت غرقاً (قسم ہے اُن فرشتوں کی جو کافروں کی جان سختی سے نکالتے ہیں) یہاں بھی قسم کھا کر فرماتے ہیں قیامت ضرور آنے والی ہے۔

اسی طور پر جا بجا قسمیں کھائی ہیں خاص خاص اشیاء کی۔ یہاں ایک دعویٰ ہے کہ قیامت ضرور آئے گی۔ اب اس کی دلیل کی ضرورت ہے مثلاً ہوا ہے کہ اُس کے اندر ایک تغیر بتلایا ہے اور ہوا ایک ایسی بڑی چیز ہے جو دم بھر میں بڑے بڑے پہاڑوں کو ہلا دیتی ہے، جمے ہوئے درختوں کو اکھاڑ

پھینکتی ہے۔ کیا قدرت اور رحمت ہے جل جلالہٗ کی کہ ہر وقت لاکھوں من ہوا ہمارے سر پر رہتی ہے کیونکہ جوّ (آسمان و زمین کے درمیان خلا) میں تمام ہوا بھری ہوئی ہے۔ جتنی جگہ ہمارے جسم سے رُکی ہوئی ہے صرف وہ ہوا سے خالی ہے اور باقی تمام ہوا ہی ہوا ہے اور ہم کو محیط ہے اور ہم کچلتے نہیں دبتے نہیں مرتے نہیں۔ تو اس تغیر سے معلوم ہوتا ہے، کوئی بڑا قادر ہے، جو ہوا جیسی طاقتور چیزوں کو دم بھر میں اُلٹ پلٹ کر دیتا ہے اُس کو قیامت لانا کیا مشکل ہے۔

یہاں منکرین کے پاس دو مقام ہیں ایک یہ کہ قیامت محال ہے اور یہ خیال تھا فلاسفہ کا۔ اس کے مقابلہ میں امکان ہے۔ دوسرے یہ کیا ضرور ہے کہ ہر ممکن واقعہ ہی ہوا کرے۔ جائز ہے کہ کسی شے کا امکان تو ہو مگر وقوع اُس کا مستبعد ہو اور یہ خیال تھا مشرکین عرب کا۔

فلاسفہ کے مقابلہ میں تو امکان کا اثبات درکار ہے اور رفع استبعاد اثبات امکان کو مستلزم تھا اور فلاسفہ قلیل بھی تھے۔ اس لئے استقلالاً اُن کے شعبہ سے تعرض نہیں کیا اور عوام الناس زیادہ ہیں اس لئے اُنہیں کے مذاق کے موافق دلائل بیان کئے گئے۔ پس یہاں گفتگو اُن لوگوں کے جواب میں ہے جو قیامت کو مستبعد سمجھتے تھے۔ چنانچہ کہا کرتے تھے کہ اِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا (کیا ہم جب مر جائیں گے اور ہو جائیں گے ہم مٹی) کیا ہماری ہڈیاں جب گل سڑ جائیں گے اور ہم بالکل خاک ہو چکیں گے اُس وقت ہم پھر زندہ کئے جائیں گے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید میں اسی

استبعاد کو رفع کیا گیا ہے اور جا بجا مذکور ہے کہ خدا نے جب ابتداءً اپنی مخلوق کو پیدا کر دیا کہ اُس وقت بظاہر زیادہ مشکل تھا۔ گو واقع میں خداوند جل جلالہٗ کو کچھ بھی مشکل نہیں۔ تو اب دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔ پس جہاں کہیں قرآن مجید میں قسمیں وارد ہوئی ہیں اُن قسموں سے اُن کے جواب کا استبعاد رفع ہوتا ہے کہ جو خدا کہ جو ایسی طاقتور ہے دم بھر میں الٹ پلٹ کر دیتا ہے اس کو کیا مشکل اور مستبعد ہے جو سب کو الٹ پلٹ کر دے۔ بہر حال یہ راز تھا خداوند جل جلالہٗ کی قسموں کا۔

اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ جن کی قسمیں کھائی ہیں اُن کے احوال نہایت قابل تدبر و تفکر ہیں۔ گو بظاہر وہ کیسی ہی سرسری اور معمولی ہوں جب حق تعالیٰ نے اُن کی قسم کھائی ہے وہ ضرور قابل اہتمام ہیں۔ اور اس کی دو صورتیں ہیں۔ کہیں تو ایسی چیزوں کی قسم کھائی ہے جو ظاہر میں باوقعت ہیں مثلاً وَالسَّمَاءِ (قسم ہے آسمان کی) وَالْاَرْضِ (قسم ہے زمین کی) اور کہیں ایسی چیزوں کی قسم کھائی ہے جو بظاہر بے وقعت ہیں۔ مثلاً وَالتِّیْنِ یعنے قسم ہے انجیر کی۔ مقصود یہاں بھی یہی ہے کہ انجیر کثیر النفع شے ہے۔ اس کے منافع کی طرف التفات کرو۔ اسی طرح یہاں فرمایا وَالْعَصْرِ یعنے قسم ہے زمانہ کی۔ زمانہ تو انجیر سے بھی نہایت کمتر ہے۔ انجیر جوہر محسوس تو ہے۔ زمانہ تو عرض غیر محسوس ہی ہے۔ اسی وجہ سے متکلمین اور فلاسفہ میں زمانہ کی تحقیق میں اختلاف ہوا ہے۔ فلاسفہ تو کہتے ہیں کہ زمانہ فلک الافلاک کی حرکت کا نام ہے اور متکلمین اُسے امتداد موہوم مانتے ہیں یعنے زمانہ ایک وہمی

اور خیالی شے ہے۔ سو گو وہ (زمانہ) محض موجود انتزاعی ہی ہو مگر ہے ایک ایسی چیز جو قابل اہتمام ہے۔ اس واسطے کہ اس کا تعلق ہے واقعات سے اور ان کے خاص آثار ہوتے ہیں اور وہ قابل اہتمام ہوا کرتے ہیں۔ مگر چونکہ متلبس بالزمان (زمانہ سے متلبس) ہیں اس لیے زمانہ بھی قابل نظر ہوا پس حق تعالیٰ اس زمانہ کی یا بلفظ دیگر وقت کی قسم کھاتے ہیں اور اس دوسرے عنوان کے اعتبار سے میرا یہ بیان صرف پرانے ہی خیال والوں کے مذاق پر منطبق نہ ہوگا بلکہ نئے خیال والوں کے مذاق کے بھی موافق ہوگا۔ یعنے وقت کیسی باوقعت چیز ہے۔ نئے خیال والوں کو میرا ممنون ہونا چاہیئے کہ میں نے وقت کے باوقعت ہونے کو قرآن سے ثابت کر دیا۔ لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ اہل یورپ وقت کی بہت قدر کرتے ہیں اور اہل اسلام کے یہاں وقت کی قدر نہیں۔ میں کہتا ہوں بڑی قدر ہے۔ اگر نہ ہوتی، تو قرآن مجید میں وقت کی قسم کیوں مذکور ہوتی۔ مگر ہم لوگوں نے تو بالکل اسلام پر عمل ہی چھوڑ دیا۔ ذرا آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے کہ اس میں کیا کیا خوبیاں ہیں اور کیسی عمدہ تعلیم ہے۔

اسلام اور یورپ

جو خوبیاں اہل یورپ میں کہی جاتی ہیں وہ دراصل انہوں نے اسلام ہی سے لی ہیں اور ہم اپنے یہاں غور نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ انہیں کی ملک ہیں۔ ہاں اس معنی کر انہیں کی ملک ہیں جیسا کاشتکار ۱۲ برس تک اگر زمیندار کی زمین پر قابض رہے تو یہ قانون ہے کہ وہ زمین موروثی ہو کر کاشتکار

کی بمنزلہ ملک سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح اہل یورپ نے عرصہ سے اُن خوبیوں پر قبضہ کر کے اُن کو اپنا دستور العمل بنا لیا۔ تو ہم یہ سمجھنے لگے کہ یہ موروثی ہو کر انہیں کی ملک ہو گئیں۔

نہایت افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ آج کل اہل یورپ کی تقلید کا اس قدر غلبہ ہو گیا ہے کہ اگر اُن کے منہ سے کوئی بات نکلے اور قرآن میں اُس کے خلاف ہو تو اہل یورپ کے قول کا یقین کر لیا جاتا ہے اور قرآن پر خلاف واقعہ ہونے کا شبہ کیا جاتا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو فرمائیں کہ انسان کی اصل انسان ہے اور ڈاروِن جو ایک ملحد ہے وہ کہے کہ سب سے پہلے ایک مادہ مطلقہ موجود تھا اور پھر تحرک سے اس میں حرارت پیدا ہوئی اور شمس وغیرہ بنا اور اُس کے بعد پھر نباتات بنے پھر حیوانات بنے اُن میں بندر بنا، یکایک جست کر کے انسان بن گیا۔ اسی طور پر وہ تمام حیوانات نباتات ہیں۔ اسی کا قائل ہے کہ ایک مادے سے نکلنے چلے آئے۔ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر تو شبہ کیا جاتا ہے اور ڈاروِن کے کہنے پر یقین کر لیا جاتا ہے یہی ایمان ہے۔ ڈاروِن تو صانع کا قائل نہیں تھا اس لئے ایسی بعید اور بیہودہ تاویلیں کرتا تھا۔ مگر اُن لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ صانع کو مانتے ہیں اور پھر ایسی مہمل تاویلوں سے قرآن پر شبہ کرتے ہیں۔

شاید کوئی یہاں کہے کہ ہم کو تحقیقات جدیدہ سے قرآن پر شبہ اس لئے ہو جاتا ہے کہ حکماء کو تو مشاہدہ ہے اور اسی بناء پر ہم کو قرآن پر شبہ

ہے کہ مشاہدہ کے خلاف کیوں ہے۔

یہ پہلے سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ مشاہدہ کی حقیقت ہی کو نہیں جانتے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ بھی مشاہدہ ہے کہ مادہ خود بخود متحرک ہوکر اس سے ایک صورت پیدا ہوگئی۔ پھر شمس و کواکب ہوئے، نباتات ہوگئی اور نباتات سے حیوانات میں ایک خاص نوع بندر بنے پھر بندر یکایک جست کرکے انسان ہوگیا۔ یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ خود ان مقرین بالفردیت (بندر ہونے کے مقرین یعنی اقرار کرنے والوں) کو بھی بندر نہ بننے دیں آدمی ہی بنا رہیں۔ یہی مشاہدات ہیں انہیں ڈھکوسلوں اور مہمل اور وہمی باتوں کو مشاہدات قرار دے کر خدا و رسول ؐ پر شبہات اور پھر اپنے کو مسلمان کہتے ہیں! افسوس کی بات ہے۔

زمین و سورج کی حرکت

کیا یہ مشاہدہ ہے کہ آفتاب کو سکون ہے زمین کو حرکت ہے۔ نیز ہمیں اس سے بحث نہیں کہ کس کو سکون ہے اور کس کو حرکت۔ کیونکہ یہ قرآن کے مخالف نہیں مگر یہ سوچ لو کہ اتنا بڑا دعویٰ کس بنا پر ہے دلیل کچھ بھی نہیں۔ مگر ہم کہیں گے الشمس تجری (سورج چلتا رہتا ہے) چونکہ قرآن میں وارد ہوا ہے اس لئے آپ آفتاب کو ساکن محض ماننے سے گنہگار ہوں گے۔ زمین کو چاہے آپ ساکن نہ مانیئے متحرک محض مانیئے مگر آفتاب کو بھی متحرک ماننا پڑے گا۔

شاید کسی کو یہ شبہ ہو وَجَعَلْنَا فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ — الخ (یعنے اور ہم نے

زمین میں اس لیئے پہاڑ بنائے کہ زمین ان لوگوں کو لے کر ہلنے نہ لگے) سے تو زمین کا سکون ثابت ہوتا ہے۔ پھر یہ کیوں کہتے ہو کہ حرکت ارض کا ماننا قرآن کے خلاف نہیں۔

جواب یہ ہے کہ اس سے نفی حرکت اضطرابیہ کی مراد ہے حرکت غیر اضطرابیہ کی نفی مراد نہیں۔ غرض اس کی آپ کو اجازت ہے کہ زمین کو اگر جی چاہے متحرک، مانیں کچھ حرج نہیں۔

اسی طرح اس کی خبر دی گئی ہے کہ آسمان موجود ہے۔ یہ کون سے مشاہدہ کے خلاف ہے۔ گو اس نظام طلوع وغروب کے لیے سموٰات کی ضرورت نہ ہو لیکن نظام خاص کی ضرورت نہ ہونا نفی کی تو دلیل نہیں ہو سکتی آسمان دوسری مستقل دلیل سے ثابت ہے۔ اس کی نفی کرنا جائز نہیں۔ یہ کس مشاہدہ سے ثابت ہوا کہ آسمان نہیں ہے بلکہ ہم آپ کے ممنون ہیں کہ آپ نے اس نیلگوں صورت کو حد نظر مان کر آسمان کی نفی کا ہمیں جواب سکھا دیا کیونکہ قرآن مجید میں کہیں یہ نہیں آیا ہے کہ یہ نیلا نیلا جو نظر آتا ہے یہی آسمان ہے۔ پس اگر آپ کہیں گے کہ اگر آسمان کوئی چیز ہے تو نظر کیوں نہیں آتا ہم یہ کہیں گے کہ نظر اس لیے نہیں آتا کہ آپ نے اس سقف نیلی کو حد نظر مان دیا۔ پس جب یہ حد نظر ہے تو آسمان اس کے آگے ہے اور چونکہ نظر کی یہاں تک انتہا ہو جاتی ہے اس لیے آگے کچھ نظر نہیں آتا۔ اب آپ کو آسمان کی نفی کرنے کی بالکل گنجائش نہیں رہی۔

اب اس شبہ کی بالکل گنجائش نہ رہی کہ ہم حکماء کے قول پر قرآن کی

تکذیب نہیں کرتے بلکہ مشاہدہ کی بنا پر جس کی مثال میں یہ پیش کیا کرتے ہیں کہ مشاہدہ سے ثابت ہوا ہے کہ غروب کے وقت آفتاب زمین کے اندر نہیں جاتا۔ اور قرآن مجید میں سکندر ذوالقرنین کے قصہ میں مذکور ہے کہ آفتاب کو کیچڑ اور دلدل میں غروب ہوتے پایا۔ بھلا دیکھو کتنا مشاہدہ کے خلاف ہے۔ آفتاب ایک جرم عظیم ہے۔ زمین سے کتنے ہی حصے بڑا ہے کہیں زمین کی دلدل اور کیچڑ میں غروب ہو سکتا ہے۔

لیکن اگر عقل ہو گی تو اس میں جواب نظر آجائے گا۔ یعنی قرآن مجید میں وجدہا الخ وارد ہوا ہے۔ یعنی اس کو بادی النظر میں ایسا پایا۔ یعنے اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کیچڑ میں دھنس رہا ہے۔ یہ نہیں فرمایا غربت فی حمئۃ (کیچڑ میں ڈوب گیا۔) جہاز پر سوار ہو کر دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب سمندر میں سے نکلتا ہے اور اسی میں ڈوب رہا ہے۔ اسی طور پر ہم روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں آفتاب کے طلوع و غروب کا۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ زمین ہی سے نکلا اور زمین ہی میں گھس گیا۔ پھر مشاہدہ کے خلاف کیا ہوا۔ اب فرمائیے مشاہدہ سے کہاں تعارض ہے۔ تعارض کہیں بھی نہیں۔ پھر افسوس ہے کہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور قرآن اگر فیثاغورس کے قول کے مخالف ہو تو قرآن پر خلاف مشاہدہ کا شبہ کرتے ہیں، فیثاغورس کے قول پر خلاف واقعہ ہونے کا شبہ نہیں ہوتا۔

اصول و فروع کا فرق

اسلام کی عظمت قلوب سے جاتی رہی۔ غرض یہ ہے کہ نئے مذاق

میں یہ خرابی ہو گئی ہے کہ سائنس والے جو کہہ دیں اُس پر تو آمنّا وصدّقنا (اس پر ہم ایمان لائے اور ہم نے اس کو سچ مان لیا) اور قرآن پر شبہات مگر وقت کے باوقعت ہونے میں تو فلسفہ اور قرآن دونوں متفق ہو گئے کہ اُس کی قسم کھانے سے خود اُس کی وقعت پر دلالت ہو گئی۔ اب اس کو قاعدہ پر بھی منطبق کرنا چاہتا ہوں کہ مقسم بہ دلیل ہوتی ہے جواب قسم کی سو یہاں جواب قسم میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔ انسان بڑے خسارہ میں ہے۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ یعنی خسارہ سے وہ مستثنیٰ ہیں جو ایمان لائے اور عمل صالح کئے اور ایک دوسرے کو حق اور استقلال کے لئے کہتے اور سنتے رہے۔ یہاں چار چیزیں ذکر فرمائیں۔

۱۔ ایمان۔

۲۔ اعمال صالحہ۔

۳۔ تواصی بالحق (اعتقاد حق پر ایک دوسرے کو قائم رہنے کی فہمائش کرتے رہنا)

۴۔ تواصی بالصبر (ایک دوسرے کو پابندی اعمال کی فہمائش کرتے رہنا)

سبحان اللہ! کیسی جامع تعلیم ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان جن امور کا مکلّف ہوا ہے وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک اصول۔ ایک فروع۔ اول عقائد ہیں دوسرے اعمال اصول و فروع اس لئے کہلاتے ہیں کہ اصل مدار ایمان کا عقائد ہیں پھر اس کا مکمل اعمال۔ مثلاً ایک شخص ہے کہ وہ گورنمنٹ کے

شاہانہ اقتدار کو مانتا ہے مگر ہمیشہ قانون کے خلاف کرتا ہے۔ چوری بھی کرتا ہے جوا بھی کھیلتا ہے اور بدتہذیب بھی ہے۔ تو ایسے شخص کے قلب میں چونکہ گورنمنٹ کا اقتدار ہے اس لئے اُسے بغاوت کی سزا نہ ہوگی اور ہمیشہ کے لئے مردود نظر نہ ہوگا۔ بلکہ صرف اختتام سزائے معین تک اور اس کے بعد پھر وہ گورنمنٹ کی محبوب رعایا میں داخل ہو جائے گا برخلاف اُس شخص کے کہ جو نہایت مہذب و متین ہو اور افعال قبیحہ خلاف قانون سے بھی بچتا ہو مگر گورنمنٹ کے اقتدار شاہانہ کو تسلیم نہ کرتا ہو اس کو بغاوت کی یہ سزا ہوگی کہ عبور دریائے شور کر دیا جائے گا یا پھانسی دے دیا جائے گا۔ اور ہمیشہ کے لئے معتوب رہے گا۔

اے صاحبو! سمجھ لیجئے کہ اسی طرح اسلامی قانون بھی ہے کہ جس کے عقائد اچھے نہیں وہ باغی ہے اگرچہ نماز روزہ کرے اور کیسا ہی شائستہ ہو ہمیشہ کے لئے مردود بارگاہِ ایزدی ہوگا۔ اگر توبہ نہ کرے برخلاف اس شخص کے کہ جو نماز روزہ کچھ نہیں کرتا اور ہر قسم کے معاصی میں مبتلا رہتا ہے مگر عقائد اچھے ہیں تو اُس کو وہی میعادی سزا خلافِ قانون عمل کرنے کی ہوگی اگر توبہ نہ کرے لیکن باغیوں میں شمار نہ ہوگا اور اختتام سزا کے بعد پھر وہی حق تعالیٰ کی محبوب رعایا یعنی جنتیوں میں داخل ہو جائے گا۔

مگر یہاں پر بعضے شبہ کیا کرتے ہیں کہ جب کسی غیر مسلم میں اخلاق و اعمال شائستہ ہوں تو کیا وجہ ہے کہ وہ ناجی نہیں۔ میں کہتا ہوں گورنمنٹ پر بھی یہی اعتراض کیا ہوتا کہ کیا وجہ ہے جب ایک باغی مہذب ہے بقیہ جرائم قانونی

سے بھی محفوظ ہے پھر کیوں اس کو سزا ہوتی ہے۔ اُس کے سزا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ باغی ہے تو اُس کے کمالات ہیچ در ہیچ ہیں۔ پس اسلامی قانون میں بھی ایسا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جتنے شبہے اسلام پر ہیں اپنے معاملات میں غور کریں تو سب کا جواب نکل آئے گا مگر غور کون کرے دین تو آنکھوں میں کھٹکتا ہے ـــــ افسوس کیسی آفت ہے، کیسا طوفان بے تمیزی برپا ہے اور پھر اپنے کو مسلمان کہتے ہیں۔

صاحبو۔ کیا یہی اسلام ہے۔ اس تقریر سے اصول وفروع کا فرق معلوم ہو گیا ہوگا کہ اصول قلب کے متعلق ہیں اور فروع اعمال کے متعلق۔ پھر ان دونوں عقائد واعمال میں ایک تقسیم اور ہے۔ ایک تو خود اختیار کرنا ایک دوسروں کو تعلیم کرنا جس کو ہمدردی کہتے ہیں۔ یہاں سے ایک اعتراض کا جواب بھی ہو گیا۔ وہ یہ ہے کہ جب مولوی لوگ نصیحت کرتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ مولوی لوگ بڑے متعصب ہوتے ہیں۔ ہمیشہ پیچھے پڑے رہتے ہیں اسی بات کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ

کیا تمہارے تجاوز عن الحد (حد سے گزر جانے) کی وجہ سے ہم اپنی نصیحتیں ہٹا لیں گے۔ خوب کہا ہے ؎

حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است وبس

دربند آں مباش کہ نشنید یا شنید

(تمہارا کام بس دعا مانگے جانا ہے اس کی فکر میں مت رہو کہ

کہ انہوں نے سنی یا نہیں۔ یا تمہارا کام نصیحت کئے جانا ہے، کوئی سُنے یا نہیں اس کی فکر میں مت پڑو۔)

یعنی کہے جاؤ کوئی سُنے یا نہ سُنے۔ ہمدردی کا مقتضا تو یہی ہے کہ جو اپنے لئے پسند کرے دوسروں کے لیے بھی پسند کرے۔ اب یہیں سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ نہی عن المنکر (بُری باتوں سے روکنا) وامر بالمعروف (اچھی باتوں کا حکم کرنا) شرعاً وعرفاً کہ حقیقت اُن کی ہمدردی ہے فرض ہے۔ اب کل چار چیزیں ہوئیں۔

ایک اصول کو اختیار کرنا —— ایک اُن کی ترغیب دینا۔

ایک فروع کو اختیار کرنا —— ایک اُن کی ترغیب دینا۔

یہی قرآن شریف میں بھی مذکور ہے۔ میں نے اصول و فروع کی ترغیب کو تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَالصَّبْرِ سے سمجھا ہے۔ صبر کے معنیٰ ہیں حبس النفس علی ما تکرہ یعنے نفس کو ایسی چیز کا پابند کرنا جو ناگوار ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کے اعمال کا نفس کو پابند کرنا۔ اس میں نماز روزہ حج زکوٰۃ سب داخل ہیں۔ تواصوا باب تفاعل سے ہے جس کی خاصیت مشارکت ہے۔ اب معنے یہ ہوگئے کہ ہر شخص دوسرے کو کہے۔ چھوٹا بڑے کو بڑا چھوٹے کو۔ اس میں بڑے لوگوں کے کان کھولے گئے ہیں کہ تم چھوٹوں کو اور چھوٹوں کو بھی حق ہے بڑوں کے کہنے کا۔ اب بڑوں کو چھوٹوں کے کہنے کا بُرا ماننے کی گنجائش نہیں بلکہ حق بات قبول کرنا چاہیئے۔

مقام و اخلاقِ محمدیؐ

جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کہ آپ سے سوائے خدا کے کون اشرف و اعلیٰ ہوگا۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

یا صاحب الجمال ویا سیّد البشر — من وجہک المنیر لقد نور القمر

(اے صاحب جمال اور اے تمام لوگوں کے سردار یعنی اے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم آپ کے رُخ روشن سے چاند منور ہو گیا۔)

لا یُمکِنِ الثَّنَاءُ کَمَا کَانَ حَقُّہٗ — بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

(آپؐ کے لائق تعریف کرنا ممکن نہیں۔ قصہ مختصر ہے خدا کے بعد آپ ہی بزرگ ہیں۔)

اس مصرعہ پر (بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر) بہت عمدہ عمدہ تضمینیں ہیں ؎

شاباش آں صدف کہ چنیں پرورد گہر — آباء ز مکرم و ابناء عزیز تر

(اس صدف کو شاباش کہ ایسا گہر پالا۔ آباو اجداد اس سے مکرم اور بیٹے عزیز تر ہیں۔)

صَلُّوْا عَلَیْہِ مَا طَلَعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ — بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

(یعنے جب تک سورج اور چاند طلوع ہوں یعنی قیامت تک آپ پر درود بھیجو۔ قصہ مختصر خدا کے بعد آپ ہی بزرگ ہیں)

حضورؐ کی شان یہی ہے۔ ع

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اور کسی نے خوب کہا ہے۔ ع

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(جو کمالات تمام انبیاء علیہم السلام میں پائے جاتے ہیں، وہ سب کے سب تنہا آپؐ میں موجود ہیں)

باوجود اتنے کمالات اور خوبیوں کے آپؐ کی حالت یہ تھی کہ اگر چھوٹے سے چھوٹے صحابہ بھی مشورہ دیتے تھے تو آپؐ قبول فرما لیتے تھے۔ مثلاً حدیبیہ کا واقعہ ہے کہ باوجود آپؐ کے فرمانے کے لوگ احرام نہیں کھولتے تھے حضورؐ ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ کیا کروں، لوگ احرام ہی نہیں کھولتے۔ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ سب سے پہلے آپ احرام کھول کر قربانی کر دیجئے۔ پھر سب احرام کھول دیں گے چنانچہ آپ نے قربانی کر دی۔ پھر کیا تھا تمام صحابہ ٹوٹ پڑے اور احرام کھول کر قربانی کرنے لگے۔

اس سے بڑھ کے یہ کہ ایک مرتبہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم انصار کے ایک باغ میں تشریف فرما تھے۔ وہاں ابوہریرہؓ بھی پہنچے۔ آپ نے فرمایا کہ اے ابوہریرہؓ! جاؤ اور جو تمہیں ملے بشارت دو کہ جو لا الٰہ الا اللہ پڑھتا ہوگا، وہ جنت میں داخل ہوگا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ تو بڑی بات ہے۔ میرے کہنے کا کون یقین کرے گا۔ آپ نے فرمایا کہ میری نعلین مبارک لے جاؤ اور یہ دکھا کر کہو۔ حضرت ابوہریرہؓ بہت خوشی خوشی آرہے تھے کہ سب سے پہلے راستہ میں حضرت عمر

رضی اللہ تعالیٰ عنہ ملے اور پوچھا کہ اے ابوہریرہؓ یہ نعلین کیسی ہیں۔ عرض کیا کہ یہ جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کی ہیں۔ مجھ کو دے کر بھیجا ہے کہ جو شخص تمہیں ملے اور یقین کے ساتھ لا الہ الا اللہ کہے اُسے جنّت کی بشارت دو۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زور سے دھکا دیا اور فرمایا کہ لوٹ جاؤ کیسی بشارت۔ یہ روتے روتے گئے اور سارا بیان کیا۔ اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی حاضر ہوئے۔ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اے عمرؓ! تم نے ایسا کیوں کیا۔ عرض کیا کہ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں کیا آپ نے حضرت ابوہریرہ کو نعلین دے کر بھیجا تھا کہ جو لا الہ الا اللہ کہے اُسے جنّت کی بشارت دو۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں! عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ اس پر بھروسہ کر کے نماز روزہ نہ چھوڑ بیٹھیں۔ اس لئے بہتر ہے چند روز اور ان لوگوں کو اسی حالت میں چھوڑ دیا جائے۔ آپؐ نے فرمایا، بہتر ہے اور چند روز اسی حالت میں رہنے دو۔

یہ تو بھلا خیر دوستوں سے برتاؤ تھا آپؐ کا تو دشمنوں سے بھی یہی برتاؤ تھا اور آپ کی تو بڑی شان ہے آپ کے غلاموں کا یہی برتاؤ تھا

؎ شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا — دلِ دشمناں ہم نہ کردند تنگ

(ہم نے اہل اللہ کے قصے سُنے ہیں کہ اُنہوں نے دشمنوں کے دل کو بھی رنجیدہ و ناگوار نہیں کیا)۔

ترا کے میسّر شود ایں مقام — کہ با دوستانت خلاف است و جنگ

(تم کو یہ مرتبہ کیوں کر حاصل ہو سکتا ہے اس لیئے کہ دوستوں کے ساتھ تمہارا اختلاف و لڑائی ہے دشمن تو رہے درکنار)

مقامِ اولیاء

ایک شخص امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا اور پوچھا کہ کیا آپ کے والد کا انتقال ہو گیا ہے؟ آپ نے فرمایا، ہاں! پھر پوچھا، آپ کی والدہ زندہ ہیں؟ فرمایا، ہاں زندہ ہیں۔ کہنے لگا کہ میں نے سُنا ہے کہ آپ کی والدہ بڑی حسینہ جمیلہ ہیں۔ اس لئے میں اُن سے نکاح کرنے آیا ہوں آپ اُن کا نکاح میرے ساتھ کر دیجئے۔ فرمایا کہ وہ عاقل بالغ ہیں انہیں اپنے نکاح کا اختیار ہے۔ میں جبر نہیں کر سکتا البتہ اُن سے پوچھ سکتا ہوں پوچھنے جاتے تھے۔ اتفاق سے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اُس شخص کی گردن الگ تھی۔ فرمایا کہ ابو حنیفہ کے صبر نے اُسے قتل کر دیا ؎

ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد — تا دلِ صاحب دلی نامد بدرد

(کسی قوم کو اللہ تعالیٰ نے رسوا نہیں کیا جب تک کہ اُس نے کسی اہل اللہ کے دل کو درد نہیں پہنچایا۔)

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد — میلش اندر طعنۂ پاکاں برد

(جب اللہ تعالیٰ کسی کی پردہ دری اور رسوائی چاہتے ہیں، تو اُس کا میلان نیک لوگوں کے طعن میں پیدا کرتے ہیں۔)

چوں خدا خواہد کہ پوشد عیب کس — کم زند در عیب معیوباں نفس

(جب اللہ تعالیٰ کو کسی کی عیب پوشی منظور ہوتی ہے، تو وہ

شخص عیب دار لوگوں کے عیب میں بھی کلام نہیں کرتا)

بس تجربہ کردیم دریں دیرِ مکافات
با دُرد کشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد

(اس دیرِ مکافات یعنی دنیا میں ہم نے بہت تجربہ کیا ہے کہ جس نے عاشقانِ الٰہی سے مزاحمت کی وہ خستہ وبرباد ہوگیا۔)

یہ لوگ خدا کے محبوب ہوتے ہیں اُن سے گستاخی کرنا سزا سے خالی نہیں جاتا۔ امام ابو حنیفہؒ کے صبر کو ملاحظہ کیجئے کہ اُس شخص نے کیسی سخت گستاخی کی اور آپ کس نرمی اور تحمل سے جواب دیتے رہے۔

امام صاحبؒ کی ایک حکایت یاد آئی کہ ایک مرتبہ ایک لڑکے کو کودتا ہوا دیکھ کر فرمایا کہ میاں لڑکے سنبھل کر چلو کہیں پھسل کر گر نہ پڑنا اس لڑکے نے کہا کہ آپ اپنی خبر لیجئے کہ کہیں آپ نہ پھسل جائیں کہ تمام عالم گمراہ ہو جائے۔ اور میرا کیا ہے میں اگر پھسل بھی جاؤں گا تو فقط میرے ہی تھوڑی سی چوٹ آئے گی دوسروں کو کچھ ضرر نہ پہنچے گا۔ امام صاحبؒ روئے اور فرمایا کہ اے میاں لڑکے ہمارے پاس آؤ اور علم حاصل کرو۔ وہاں تو یہ خیال تھا کہ بھلا اس لڑکے کی کیا مجال جو کہتا۔ یہ سب اُدھر ہی کا کہلوایا ہوا کہتا ہے ؎

دو دہاں داریم گویا ہمچو نے
یک دہاں پنہاں ست در لبہائے وے

(بانسری کی طرح ہم گویا دو منہ رکھتے ہیں۔ ایک منہ اس کے

لبوں میں پوشیدہ ہے۔)

یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما
ہائے وہوئے درفگندہ درسما

(ایک منہ تمہاری طرف نالاں ہے۔ ہائے وہو عالم میں ڈالے ہوئے ہے۔)

جیسے بانسری ہوتی ہے کہ جس وقت آواز نکلتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ نے بول رہی ہے مگر واقع میں وہ نے کی آواز نہیں بلکہ پھونکنے والے کی آواز ہے کیونکہ اگر نہ پھونکے تو نے نہیں بول سکتی۔ اسی طرح جن کی نظر نافذ ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہے اُدھر ہی سے ہے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں

اگر عزّ و جاہ است وگر ذل و قید
من از حق شناسم نہ از عمرو زید

(یعنی اگر عزت و مرتبہ ملتا ہے اور اگر ذلت و رسوائی پیش آتی ہے تو اس کو ہم حق تعالیٰ شانہٗ ہی کی طرف سے جانتے ہیں نہ عمرو زید کی جانب سے کیونکہ موثر حقیقی حق سبحانہٗ ہی ہیں۔ مخلوق تو محض آلہ کار ہے۔)

اور جن کی نظر ناتمام ہے وہ غلطیاں کرتے ہیں۔

ایک جاہل صوفی تھے۔ راستہ گلیوں میں ہمہ اوست (سب وہی ہے) کا نعرہ لگاتے پھرتے تھے۔ اتفاق سے ایک ہاتھی آتا تھا۔ اس کے فیلبان نے ہٹو بچو بہت کہا مگر یہ نہ ہٹے۔ اور ہمہ اوست کہتے رہے یہاں تک کہ

کچل کر مر گئے۔ ایک بزرگ نے سُنا اور کہا کہ اُس نے اس ہاتھی کو تو ہمہ اوست میں سمجھا اور اُس آواز کو کیوں نہ ہمہ اوست میں داخل سمجھا۔ خوب کہا ہے ؎

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ اُستادِ ازل گفت ہماں می گویم

(یعنی اپنی طرف سے باختیار خود کچھ نہیں کہتے بلکہ جو استادِ ازل یعنی حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وہی ہم کہتے ہیں۔)

بس عارفین یہی سمجھتے ہیں کہ سب کچھ وہیں سے ہے۔ اسی وجہ سے کسی مصیبت سے پریشان نہیں ہوتے ؎

از خدا دان خلافِ دشمن و دوست
کہ دلِ ہر دو در تصرّفِ اوست

(خدا تعالیٰ کی جانب سے خلافِ دشمن و دوست کو سمجھو اس لیے کہ دونوں کے دل اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔)

تو جن کی نگاہ حقیقت بیں ہے وہ کسی کا بُرا نہیں مانتے۔ حضورؐ کی انصاف پسندی یہ تھی کہ احبار کی بات بھی قبول فرما لیتے تھے۔

اتفاق کی جڑ

آج کل اتفاق کے حُسن پر باوجودیکہ اتفاق ہے مگر پھر نہیں ہوتا وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اور لوگ میرے تابع رہیں اگر یہ ہوتا کہ ہر ایک دوسرے کے تابع بنے تو اتفاق ہونا مشکل نہیں تھا۔

سلف میں سے دو شخص سفر میں جارہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ تم سردار ہو گے یا خادم؟ انہوں نے کہا کہ خادم۔ پھر پہلے شخص نے کہا اگر اچھا جب میں سردار ہوں تو میں جو کچھ کہوں اُسے ماننا ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ ہاں مانوں گا۔ یہ طے ہونے کے بعد دونوں سردار خادم سفر میں روانہ ہوئے۔ منزل پر پہنچ کر سردار نے خادم سے کہا کہ تم الگ بیٹھے رہو، میں سب کام کروں گا۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے میں تو خادم ہوں اُنہوں نے کہا کہ میں سردار ہوں میرا کہا تم کو ماننا پڑے گا۔ تمام راہ سفر میں سردار صاحب کام کرتے چلے گئے۔ سبحان اللہ! سید القوم خادمھم (قوم کا سردار قوم کی خدمت کرنے والا ہوتا ہے) کے یہی معنی ہیں۔ اتفاق کے لئے یہی لازم ہے کہ جو کچھ آپس میں طے ہو گیا اُس کے خلاف نہیں کرتے لیکن اب اتفاق کے معنی ہی بدل گئے۔

ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ آج کل کے لیڈر جو اتفاق اتفاق پکارتے ہیں اُنہیں اس کی جڑ معلوم نہیں۔ اس کی جڑ ہے تواضع اور تواضع کا غذ پر نام کے ساتھ حقیر، ذلیل، نیازمند، خاکسار کے لکھنے سے نہیں ہوتی ؎

میم و واؤ میم و نون تشریف نیست
لفظ مومن جز پئے تعریف نیست

(یعنی لفظ مومن کے اجزاء میم و واؤ اور میم و نون میں کوئی بزرگی نہیں ہے۔ یہ تو صرف شناخت و امتیاز کے لئے ہے

اور جو کچھ بزرگی ہے وہ اس کے مدلول میں ہے کہ وہ صفت کمال ہے۔)

اور آج کل تو وہ کاغذی تواضع بھی گم ہوگئی۔ کاغذی نام بھی ایسے ایسے متکبرانہ ایجاد کیے ہیں۔ پریذیڈنٹ، سیکرٹری، ممبر، محراب، رکن یعنے ستون وغیرہ وغیرہ۔ ہاں یہ نام ہیں تکبر سے خالی مہتمم، منتظم وغیرہ۔ مگر آج کل تو زیادہ مقصود نمائش ہے۔ اسی لیے اکثر انجمنوں میں بجائے اس کے کہ کام کرنے والوں کی اہلیت پر نظر ہوتی، تمول اور شہرت پر نظر ہے۔

کانپور میں ایک جلسہ ہوا۔ اس کے سیکریٹری صاحب نے کسی اپنے دوست سے کہا کہ میں ایک رائے پیش کروں گا۔ تم کہنا میں بھی تائید کرتا ہوں چنانچہ جلسہ میں سیکرٹری صاحب نے رائے پیش کی۔ اتفاق سے وہ دوست صاحب گو امیر تھے مگر جاہل تھے۔ باوجود رٹنے کے بھی اُن کو لفظ تائید یاد نہ رہا۔ مجبوراً کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ میں بھی آپ کی رائے کی تاردید کرتا ہوں۔ سیکرٹری نے اشارہ سے منع کیا تو کہا میں بھی تردید کرتا ہوں پھر اُنہوں نے اشارہ سے بتلایا تو یہ کہہ کر کہ میں بھی تاکید کرتا ہوں بیٹھ گئے ہے۔

ایک صاحب رئیس دیہاتی گنوار جاہل آنریری مجسٹریٹ مقرر ہوئے کام تو جانتے نہ تھے ایک دوسرے آنریری مجسٹریٹ کے یہاں کام سیکھنے پہنچے۔ اتفاق سے جس وقت پہنچے تو دو درخواستیں پیش ہوئیں۔ اس میں پہلی منظور کرنے کے قابل تھی، اور دوسری منظور کرنے کے قابل نہیں تھی۔ اُنہوں نے پہلی کو دیکھ کر کہا منظور، اور دوسری کو نامنظور۔ بس آپ نے کہا کہ یہی آنریری

مجسٹریٹی ہے تو یہ کیا مشکل ہے۔ آئے اور اجلاس کیا۔ درخواستیں پیش ہوئیں پہلی کو کہا منجور (منظور) دوسری کو نامنجور (نامنظور) اسی طرح تمام درخواستوں پر منجور نامنجور کہتے رہے۔ یہ آنریری مجسٹریٹ تھے۔

جب ایسے ایسے جاہل سید القوم (قوم کے سردار) بنیں تو وہ عایت مصالح کیا کریں گے اور اتفاق کیسے ہوگا۔ دوسروں کو اپنا ہمسر سمجھو اور کمتر نہ سمجھو تو اتفاق ہو اور یہ تواضع سے ہو سکتا ہے۔

تواضع کی شناخت

تواضع بزرگوں کی صحبت سے ہے ؎

قال را بگذار مرد حال شو　　　پیش مردے کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑو حال پیدا کرو۔ یہ حال جب پیدا ہوگا کہ کسی مرد کامل کے قدموں میں جاکر پڑو۔)

کسی کی جوتیاں اٹھاکر سر پر رکھو تو تواضع ہو پس حتی الامکان کوشش کرو تواضع کے پیدا ہونے کی۔ کیونکہ یہ شخص بظاہر متواضع ہو بھی گیا تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ جب کبھی کوئی بات پیش آجاتی ہے اُس وقت ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ تواضع عارضی تھی۔ تو بات یہ ہے کہ اچھی طرح نفس کی صفائی نہیں ہوئی تھی اور مقتضی تواضع نہیں پیدا ہوا تھا۔ یہ بزرگوں کی صحبت سے ہوتا ہے کیونکہ وہ اُن امراض روحانی کے طبیب ہوتے ہیں۔ اچھی طرح اس کے سبب کے ازالہ کی کوشش کرتے ہیں۔

خود اختیار کی ہوئی تواضع تو ایسی ہے جیسا کہ ایک بلی کو بادشاہ نے

سکھلوایا تھا کہ اگر اُن کے سر پر شمعدان رکھ دیا جاتا تھا تو وہ خاموش بیٹھی رہتی تھی۔ بادشاہ بہت خوش تھے کہ بلّی نے بالکل اپنی خصلت چھوڑ دی۔ وزیر نے کہا حضور اس سے اس کی خصلت نہیں چھوٹی بلکہ کوئی بات ایسی نہیں پیش آئی جس سے اُس کی خصلت کا چھوٹنا یا نہ چھوٹنا ظاہر ہوتا۔ اس کے سامنے چوہا چھوڑوا کر دیکھئے۔ پھر دیکھیں یہ کیسے اسی طرح بیٹھی رہتی ہے چنانچہ اُن کے سامنے چوہا چھوڑا گیا۔ وہ شمعدان پھینک کر دوڑی چوہے کے پکڑنے کو۔

اُس تواضع کی بھی ایسی ہی مثال ہے جو کسی بزرگ کی تربیت اور صحبت سے حاصل نہ کی جائے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ تمہاری تواضع کی ایسی ہی مثال ہے کہ گوبر ہے کہ پانی کی تہ میں بیٹھ گیا ہے۔ بظاہر نظر پانی نہایت صاف شفاف نظر آتا ہے لیکن اگر ذرا بھی ہل جائے تو تمام گوبر ظاہر ہو جائے ؎

دریائے فراواں نشود تیرہ بسنگ

عارف کہ برنجد تنک آب است ہنوز

(یعنی بڑا دریا پتھر سے گدلا نہیں ہوتا۔ جو عارف کہ رنجیدہ ہو وہ ہنوز تھوڑے پانی کے مشابہ ہے کہ ذراسی چیز کے پڑنے سے گدلا ہو جاتا ہے۔)

تو آپ کی تواضع مصنوعی تواضع ہے کہ ابھی اگر کوئی ذرا خلاف مرضی بات کہہ دے۔ پھر دیکھئے آپ کیسا بھڑکتے ہیں۔

مولانا شہید علیہ الرحمۃ کا ایک شخص نے امتحان کیا تھا۔ اُس نے سُنا تھا کہ بڑے تیز ہیں۔ دہلی کی جامع مسجد میں مولانا تشریف رکھتے تھے۔ وہ آیا اور مجمع میں باآواز بلند پوچھا کہ میں نے سُنا ہے کہ آپ حرامی ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ تم سے کس نے کہا یہ غلط ہے۔ میری ماں کے نکاح کے گواہ اب تک زندہ ہیں۔ اگر یقین نہ ہو تو پوچھوا دوں۔ وہ شخص قدموں پر گر پڑا اور کہنے لگا کہ میں تو امتحان کرتا تھا کہ آپ کی تیزی تکبر سے تو نہیں ہے۔ معلوم ہو گیا کہ سارا غصہ اور تیزی اللہ ہی کے لئے ہے اپنے نفس کے لئے نہیں۔

مولانا شہیدؒ سے کسی نے پوچھا کہ شاہ صاحب کے ہوتے ہوئے سید صاحب سے آپ کیوں بیعت ہوئے۔ فرمایا کہ جس کو جس سے مناسبت ہوتی ہے اُسی سے فیض ہوتا ہے۔ سید صاحب جب کافیہ پڑھتے تھے تو ایک دن اتفاق سے اس کے حرف نظر نہ آئے۔ کاغذ بالکل صاف نظر آتے تھے اور دوسرے طالب علموں کو دکھایا تو اُن کو نظر آتے تھے۔ بہت حیران ہوئے۔ صبح کو شاہ صاحب کے پاس آئے اور تمام ماجرہ بیان کیا شاہ صاحبؒ نے فرمایا تم کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ تم ذکر و شغل کرو۔ ع

ہر کسے را بہر کارے ساختند

مولانا شہید بہت بڑے عالم تھے اور بہت مشہور تھے۔ بڑے بڑے امراء قدموں پر سر رکھتے تھے اور سید صاحب ایسے مشہور آدمی نہ تھے۔ مگر مولانا شہید کی حالت یہ تھی کہ سید صاحب کی سواری کے ساتھ اُن کی جوتیاں لئے دوڑے جا رہے ہیں۔ لوگ ہر طرف سے سلام کر رہے ہیں۔ اُن کے

جواب بھی دیتے جا رہے ہیں ——— حضرت یوں نفس مرتا ہے اور اسی کو تواضع کہتے ہیں۔ اسی لئے مولانا فرماتے ہیں ؎

قال را بگزار مرد حال شو پیش مردے کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑو اپنے اندر حال پیدا کرو۔ یہ حال اس وقت پیدا ہوگا کہ کسی مرد کامل کے قدموں میں جا کر پڑو۔)

یہ نہیں کہ چند روز ذکر و شغل کر لیا۔ ذرا نفس دب گیا۔ اس کے بعد جب گئے پھر وہ شرارتیں کرنے لگا۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامی

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

(جب تک بہت سے مجاہدات و ریاضات نہ کئے جائیں اس وقت تک نفس کا تصفیہ نہیں ہو سکتا ہے پختگی کے لئے بہت سے مقامات و سفر طے کرنے کی ضرورت ہے۔)

مولانا فرماتے ہیں ان سفروں کے بعد بھی نفس پر اعتماد نہ کرو ؎

نفس اژدر ہاست او کے مردہ است

از غم بے آلتی افسردہ است

(نفس اژدہا ہے وہ کب مردہ ہوتا ہے بے آلتی کے غم کے سبب سے افسردہ ہو جاتا ہے۔)

حکایت ہے کہ کوئی شخص شہر میں ٹھٹھرے ہوئے اژدہے کو مردہ سمجھ کر لایا تھا۔ جب آفتاب کی گرمی پہنچی۔ اس میں ذرا جان آئی اور ذرا

ذرا سر کنے لگا۔ بس پھر کیا تھا، وہ سپیرا بھی اور تماشائی سب بھاگ گئے۔ نفس کی بھی یہی حالت ہے۔ چار دن کے ذکر شغل سے ذرا دب جائے، تو اُسے مردہ نہ سمجھو۔

ہمارے حضرت الحزم سوء الظن کی تفسیر میں فرماتے تھے کہ ہوشیاری بدگمانی ہے یعنے اپنے نفس سے ہمیشہ بدگمان رہو۔ ذرا دب جائے تو یہ نہ سمجھو کہ متواضع ہو گیا۔ تمام امراض دور ہو گئے۔

اب ایک بات جملہ معترضہ کے طور پر کہتا ہوں کہ جب معلوم ہو گیا کہ تواضع کا سبب اہل اللہ کی صحبت ہے اور اُن کے انکسار و سادگی سے اُن کے ساتھ لوگوں کے یہ گمان ہیں کہ بد تہذیب ہیں متعصب ہیں، تو بھلا نفع کیونکر ہو۔ سو بات یہ ہے کہ ؎

نباشد اہل باطن درپے آرائش ظاہر
بہ نقاش احتیاجے نیست دیوار گلستاں را

(اہل باطن ظاہری ٹیپ ٹاپ کے درپے نہیں ہوتے دیوار گلستاں کو نقاش کی احتیاج نہیں ہے۔)

ز عشق ناتمام ما جمال یار مستغنی ست
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

(ہمارے عشق ناقص سے جمال یار بے پروا ہے۔ رُخ زیبا کو آب و رنگ اور خط و خال کی کیا حاجت ہے۔ یعنی محبوب حقیقی کا جمال ہمارے عشق ناقص سے بے نیاز ہے۔)

متنبی کہتا ہے ؎

حُسْنُ الْحَضَارَةِ مَجْلُوْبٌ بِتَطْرِيَةٍ

وَفِي الْبَدَاوَةِ حُسْنٌ غَيْرُ مَجْلُوْبٍ

(شہروں میں بناؤ سنگار کا حسن ہے اور دیہات میں سادگی کا حسن ہے۔)

دلفریبان نباتی ہمہ زیور بستند　　دلبر ماست کہ با حسن خدا داد آمد

(یعنے نباتی دلفریب یعنی گلاب و سنبل و ریحان وغیرہ پھولوں سے آراستہ پیراستہ ہیں ہمارے محبوب میں حسن خدا داد ہے۔ اس کو زیور متعارف کی ضرورت نہیں۔)

زیر بارند درختاں کہ ثمرہا دارند　　اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد

(جو درخت پھل دار ہیں وہ زیر بار ہیں۔ سرو بہت اچھا ہے کہ بند غم سے آزاد ہے۔)

وہ آزاد ہیں انہیں کیا حاجت ہے کوٹ کی پتلون کی، انہیں کیا حاجت ہے میز کی کرسی کی، انہیں کیا حاجت ہے کوٹھی کی بنگلہ کی۔ صاحبو! میں رائے دیتا ہوں کہ اپنے لڑکوں کو جہاں اور تعلیم دیجئے وہاں اہل اللہ کی صحبت میں بھی چند روز رکھئے تاکہ اخلاق حمیدہ ان میں پیدا ہوں۔

کمالِ محمدیؐ

اب مطلب کی طرف عود کرتا ہوں کہ حضرات اہل اللہ نے اپنے کو تواضع کر کے یہاں تک پہنچا لیا کہ انہیں کوئی بات ناگوار نہیں ہوتی۔ یہ نہیں

کہ وہ بے حس ہوتے ہیں بلکہ بہت زیادہ لطیف المزاج ہوتے ہیں، لیکن متحمل مزاج ہوتے ہیں۔ میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکایات بیان کر رہا تھا۔ کہ اپنے دوستوں ہی کا مشورہ نہیں قبول فرما لیتے تھے بلکہ مخالفوں کی بات کو بھی مان لیتے تھے۔

مقام بدر میں ایک جماعت تاجروں کی شام سے مکہ معظمہ مال لے کر جا رہی تھی۔ آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ جا کر اُن کا مقابلہ کریں۔ صحابہ نے مشورہ دیا مقابلہ کرنے کا۔ اس کا چرچا ہو گیا۔ رفتہ رفتہ مکہ تک یہ خبر پہنچی وہاں سے اُنہوں نے ایک جماعت مسلح کو مقابلہ کے لیے بھیجا۔ وہ جماعت آئی اور اُس نے مقابلہ کیا اور شکست اٹھائی۔ ستر سردار مارے گئے اور اتنے ہی قید کئے گئے۔ قرآن مجید میں اسی کے متعلق مذکور ہے۔

وَاِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحْدَی الطَّائِفَتَیْنِ اَنَّھَا لَکُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَۃِ تَکُوْنُ لَکُمْ وَیُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَیَقْطَعَ دَابِرَ الْکَافِرِیْنَ۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا کہ دو جماعتوں (تجار و محاربین) میں سے تمہیں ایک جماعت ملے گی اور تم چاہتے تھے کہ جماعت تجار ملے۔ لیکن اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ حق کو غالب کرے اور کفار کی بیخ کنی کرے۔ جب اس جماعت محاربین سے جہاد ہو چکا اور ستر سردار قید میں آئے۔ حضرت عباس رضی بھی اُنہیں اساری (قیدیوں) میں تھے۔ تو حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے مشورہ کرنے لگے کہ اب اُس جماعت تجار سے مقابلہ کریں۔ حضرت

عباسؓ جو قیدیوں میں تھے بول اٹھے کہ حضورؐ ایسا نہ کیجئے گا کیونکہ اللہ تعالٰے نے احدی الطائفتین یعنے ایک گروہ کا وعدہ فرمایا تھا سو وہ پورا ہو چکا۔ اب اگر آپ حملہ کریں گے تو ضرور ناکام ہوں گے۔ حضورؐ نے یہ سُن کر اپنی رائے کو بدل دیا اور پھر اُس جماعت پر حملہ نہ کیا۔

دیکھئے حضورؐ نے ایسا خیال نہیں فرمایا کہ ہمارا ایک مفتوح قیدی ہم کو مشورہ دے رہا ہے ہم کیوں قبول کریں۔ بلکہ چونکہ بات معقول تھی اس لئے فوراً قبول فرمالیا۔

لوگ یہاں یہ کہیں گے کہ حضورؐ نبی تھے اور قرآن کو نہیں سمجھے۔ میں قسم کھا کے کہوں گا کہ حضرت عباسؓ جو سمجھے وہ بھی حضورؐ کی صحبت کی برکت سے سمجھے اور یہ جو علم حاصل ہوا محض حضورؐ کا فیض تھا اور حضورؐ کو بھی علم تھا مگر التفات نہ تھا کیونکہ اُس وقت حضورؐ صحابہ کے مشورہ کی طرف متوجہ تھے۔

نیاوردم از خانہ چیزے نخست
تو دادی ہمہ چیز من چیز تست

(گھر سے ہم کوئی چیز نہیں لائے۔ ہمارے پاس جتنی چیزیں ہیں وہ سب آپ کی عطا کی ہوئی ہیں۔)

اسی کا ترجمہ ہے ؎

بابا کے یہاں سے کون لایا جس نے پایا یہاں سے پایا

وہ تو حضورؐ ہی کے یہاں سے ملا ہے جو کچھ جس کے پاس ہے، مگر بات یہ ہے کہ اختلاف استعداد کی وجہ سے مختلف پیرایوں میں اُن کا ظہور ہوا ہے ؎

جملہ یک نور است لیکن رنگ ہائے مختلف
اختلافی درمیان این و آں انداختہ

(وہی ایک نور ہے لیکن الوان مختلف ہیں جس کی وجہ سے ایک دوسرے میں اختلاف ہو گیا ہے)

وہی ایک کمال محمدی ہے جو مختلف پیرایوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ کہیں فیض کی شکل میں، کہیں وجد کی شکل میں، کہیں قبض کی شکل میں، کہیں بسط کی شکل میں، کہیں جذب کی شکل میں۔ غرض سب کمالاتِ محمدیہ ہی ہیں جن کا مختلف پیرایوں میں ظہور ہو رہا ہے۔ جیسا توحید افعالی کے باب میں کہا گیا ہے ؎

گر بعلم آئیم ما ایوان اوست   ور بجہل آئیم ما زندان اوست

(اگر علم تک ہماری رسائی ہو جائے تو یہ اُن کا ایوان ہے اور اگر ہم جہل میں مبتلا رہیں تو یہ اُن کا ہی زندان ہے یعنے حق تعالیٰ ہی کا تصرف ہے۔)

گر بخواب آئیم مستان وئیم   ور بہ بیداری بدستان وئیم

(اگر ہم سو رہیں تو انہیں کے بے ہوش گئے ہوئے ہیں اور اگر جاگ اٹھیں تو بھی انہیں کی گفتگو میں ہیں۔)

یہ تو ایک ایک حالت کی نسبت تھا اور کہیں تزاحم بھی ہوتا ہے ؎

در تردد ہر کہ او آشفتہ است   حق بگوش او معما گفتہ است

(جو شخص کسی تردد میں پریشان ہو رہا ہے۔ گویا حق تعالیٰ نے اُس کے کان میں کوئی معمہ کہہ دیا ہے۔)

یعنی اُس کے کان میں کیا معمّا کہہ دیا ہے ؎

بگوشِ گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است

بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالاں است

پھول سے کیا کہہ دیا ہے کہ ہنس رہا ہے۔ بلبل سے کیا کہہ دیا ہے کہ رو رہی ہے۔

غرض یہ ہے کہ یہ انہیں کے تصرفات ہیں جو سب میں ظاہر ہو رہے ہیں اسی طرح صحابہ میں بھی یہ تو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا چنانچہ ایک کاتب وحی سے آپ نے یہ آیت لکھوائی تھی۔

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ

پھر ہم نے اس نطفہ کو خون کا لوتھڑا بنایا۔ پھر ہم نے اس خون کے لوتھڑے کو گوشت کی بوٹی بنا دیا۔ پھر ہم نے اس بوٹی کو ہڈیاں بنا دیا۔ پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا پھر ہم نے اس کو ایک دوسری ہی طرح کی مخلوق بنا دیا۔

اتنا لکھنے کے بعد اُن کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ (سو کیسی بڑی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے) آپؐ نے فرمایا۔ اُكْتُبْ هٰكَذَا اُنْزِلَ (لکھ لو اسی طرح اتاری گئی ہے) سبحان اللہ! کیا فیض صحبت ہے جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کا

کہ وحی کے الفاظ بھی القا ہو جاتے تھے۔ اب یہ شبہ نہ رہا کہ حضرت عباس رضؓ نے کیسے سمجھ لیا اور جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم نے کیوں نہ سمجھا یہاں سے ایک طالب علموں کے کام کی بات ہے۔ وہ یہ کہ اگر کہیں کوئی بات مطالعہ میں سمجھ میں نہ آوے اور استاد کے سامنے آتے ہی سمجھ میں آجائے تو اُسے استاد کی برکت سمجھے۔ اسی طور پر استاد کے بھی اگر کوئی بات پڑھانے سے پہلے سمجھ میں آجائے تو طالب علموں کی برکت سمجھیں اسی طور پر مجلس وعظ میں بھی کوئی ایسا ہے جو وعظ کے مضامین کھینچ رہا ہے خلاصہ یہ کہ ان چار صفتوں کا حاصل ہے۔

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

(یعنی ایک دوسرے کو اعتقاد حق پر قائم رہنے کی فہمائش کرتے رہیں اور ایک دوسرے کو پابندی اعمال کی فہمائش کرتے رہیں)

یہ تو مضمون ہوا اس کے متعلق، اب میں وعظ کو مختصر کرنا چاہتا ہوں تمہید گو بہت بڑھ گئی مگر بحمداللہ بہت ضروری مضامین بیان ہو گئے۔

قسم کی اہمیت

میں نے کہا تھا کہ قسم جس چیز کی کھائی جاتی ہے وہ اپنے آگے سے مضمون کی دلیل ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں وَالْعَصْرِ یعنے قسم ہے زمانہ کی۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ زمانہ کی حالت دیکھ لو۔ کوئی خسارہ میں ہے کوئی نفع میں مقصود البیان میرا اس وقت یہ ہے کہ یہ مہینہ رجب کا ہے۔ اس میں ایک تاریخ آتی ہے ستائیسویں۔ اس میں لوگ روزہ رکھنے

کا اہتمام کرتے ہیں۔ اور رجب کے بعد شعبان ہے۔ یہ بھی ایک ایسا وقت ہے جس کے متعلق احکام ہیں۔ اس کے بعد رمضان اور اس کے احکام تو بالکل ظاہر باہر ہیں۔ اسی طرح محرم تک اتفاقی بات ہے کہ رجب چھوڑ کر اس کے بعد کے مسلسل چھ مہینے ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے متعلق کچھ نہ کچھ احکام ہیں۔ یوں تو کوئی بھی ایسا نہیں جس کے متعلق کچھ احکام نہ ہوں مگر یہاں احکام روزمرّہ بیان کرنا مقصود نہیں کیونکہ وہ ہر شخص جانتا ہے یہاں صرف وہی اعمال بیان کیے جائیں گے جن کے متعلق کچھ خاص احکام ہیں جو اور ایام کے لئے نہیں اور ان میں اکثر لوگ غلطی بھی کرتے ہیں۔

چنانچہ شعبان کے متعلق پندرھویں کا روزہ رکھنا اور مُردوں کو ثواب بخشنا ہے بالتخصیص حلوے کے اور انتیسویں شعبان کو چاند دیکھنا اور رمضان کے احکام بالکل ظاہر باہر ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے۔ اور شوال کے متعلق پہلی تاریخ کو افطار کرنا اور چھ روزے رکھنا۔ ان میں سلسلہ وار رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس مہینے میں پورے ہو جانا چاہئیں۔ یوں کوئی اپنی سہولت کے لئے سلسلہ وار رکھے تو کچھ حرج نہیں۔ بہر حال دونوں طرح اجازت ہے۔ جس میں سہولت ہو۔ ان روزوں کی حدیث شریف میں بڑی فضیلت آئی ہے۔ حدیث میں ہے کہ جس نے یہ روزے رکھے گویا اُس نے سال بھر روزہ رکھا۔

اس میں راز یہ ہے کہ ایک نیکی کے بدلے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور رمضان کے روزے پورے ایک مہینہ کے ہیں۔ اس لئے دس مہینہ

کے تو یہ ہوئے اور چھ روزے یہ شوال کے جن میں ہر روزہ برابر دس روزہ کے ہو کر ساٹھ ہوئے اور ساٹھ دن کے دو مہینے ہوئے۔ تو یہ دو مہینے اور وہ دس مہینے ملا کر بارہ مہینے ہو گئے۔ اب سال بھر روزے رکھنا سمجھ میں آ گیا ہوگا۔

اب اگر کوئی کہے کہ شوال ہی میں ان چھ روزوں کے پورا کرنے کی کیا ضرورت، دوسرا رمضان آنے سے پہلے پہلے پورا کر لینا چاہیئے۔ تو بات یہ ہے کہ وقت کی بھی تو خصوصیت ہوتی ہے۔ ذی قعدہ اشہر حج (حج کے مہینوں) میں سے ہے۔ اشہر حج میں سے ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اس میں اگر کوئی حج کرنے لگے تو ادا ہو جائے بلکہ معنی یہ ہیں کہ احرام بلا کراہت باندھ سکتے ہیں اور اشہر حج سے پہلے احرام باندھنا مکروہ ہے۔

دوسرا حکم اس کے متعلق یہ ہے کہ یہ اشہر حرام میں سے ہے یعنی اس میں قتل و قتال حرام تھا۔ اور اب اس حکم کے بقا میں اختلاف ہے۔ ایک حکم یہ کہ لوگ اس کو منحوس سمجھتے ہیں۔ اسی سے اس کا نام خالی رکھا ہے مگر تعجب ہے کیونکہ یہ تو نہایت مبارک مہینہ ہے کہ اس کے اِدھر اُدھر عید ہے اور کوئی مہینہ تو ایسا ہے بھی نہیں۔ اسے تو یوں کہنا چاہیئے تھا۔ ع

صد شکر کہ ہستیم میانِ دو کریم

(سینکڑوں شکر کہ ہم دو کریموں کے درمیان میں ہیں)، ہاں اگر خالی کے معنی یہ ہیں کہ خالی عن النحوسۃ (نحوست سے خالی)، مگر میں تو اس تسمیہ

کے عدم جواز پر فتویٰ دیتا ہوں کیونکہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عشا کو عتمہ کہنے سے منع فرمایا تھا حالانکہ ایام جاہلیت ہی سے لوگ عتمہ کہتے تھے۔ اور یہاں تو اسلامی نام ہونے کے باوجود اس کو خالی کہا جاتا ہے۔ پھر کیسے خالی کہنے کی اجازت ہو سکتی ہے۔ اور ذی الحج کے متعلق حج کرنا قربانی کرنا ہے اور محرم میں نویں دسویں کو روزہ ہے اور اگر گنجائش ہو تو خرچ میں کچھ وسعت کی جاوے۔ مثلاً جو دال پکاتا ہے گوشت پکاوے۔ اسی طرح حسب حیثیت سب اپنے اپنے گھر خرچ میں وسعت کریں۔ ایک حکم یہ ہے کہ بدعات سے بچا جاوے۔ تو چھ مہینے متصل ایسے ہیں کہ ان کے متعلق کچھ احکام ہیں

ذکرِ رسولؐ

اور کچھ ایسے ہیں جن کے متعلق کوئی احکام نہیں۔ مثلاً ربیع الاوّل کہ کوئی حکم اس کے متعلق نہیں۔ بعض لوگوں نے مولود کو اس میں ضروری کر لیا ہے اور اگر کوئی منع کرتا ہے تو کہتے ہیں ذکر رسولؐ سے منع کرتے ہیں۔ اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی نماز پڑھے نجس کپڑوں سے تو اسے منع کریں گے کہ نماز نہ ہوگی بلکہ گناہ ہوگا۔ نیکی برباد گناہ لازم ــــــ! نعوذ باللہ، جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے ذکر سے کون منع کرتا ہے۔ یہ تو تہمت ہے بلکہ بے طریقہ ہونے کی وجہ سے منع کرتے ہیں۔ اس کا معیار ہمارے پاس صحابہ کا طریقہ ہے۔ چنانچہ اُس زمانہ میں ذکر شریف ہوتا تھا نہ مٹھائی کی قید تھی نہ اس طور پر فرش وفروش وروشنی وغیرہ کا اہتمام تھا نہ کوئی خاص

زمانہ مقرر تھا نہ کوئی قیام کرتا تھا بلکہ صرف شوق و محبت سے ذکر کرتے تھے
جیسے حکایت ہے ؎

دید مجنوں را یکے صحرا نورد | در بیابانِ غمش بنشستہ فرد

کسی نے مجنوں کو جنگل میں دیکھا کہ تنہا بیٹھا ہے ؎

ریگ کاغذ بود و انگشتاں قلم | می نمودی بہر کس نامہ رقم

انگلیوں سے مٹی پر لکھ رہا تھا ؎

گفت اے مجنونِ شیدا چیست ایں | می نویسی نامہ بہر کیست ایں

پوچھا کسے خط لکھ رہے ہو ؎

گفت مشقِ نامِ لیلےٰ می کنم | خاطرِ خود را تسلی می کنم

کہا دوست کے نام کی مشق کرتا ہوں اور اپنے دل کی تسلی کر رہا ہوں
جب ہر وقت یہ لوگ ذکرِ رسول ؐ میں لگے رہتے ہیں تو وہاں کیسی گیارہویں
کیسی بارہویں۔ بڑے پیر کی گیارہویں کے متعلق بھی کچھ بیان کرنا مگر چونکہ
اب وقت تنگ ہے اس لئے پھر کبھی دیکھا جاوے گا۔ دوسرے
مولود پر قیاس کر سکتے ہیں۔ تو یہ لوگ ہر وقت ذکرِ رسول ؐ میں لگے رہتے ہیں
کیونکہ جتنے احکام شریعت کے ہیں سب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم
کے فرمائے ہوئے ہیں۔ ہر ایک کا ذکر رسول ؐ ہی کا ذکر ہے۔ اور پھر
کبھی جی نہیں بھرتا ؎

دل آرام در بر دل آرام جو | لب از تشنگی خشک بر طرف جو

محبوب پہلو میں بیٹھا ہے اور محبوب کو ڈھونڈ رہے ہیں نہر

کے کنارے پر ہیں اور ہونٹ پیاس سے سوکھے ہوئے ہیں۔)

نہ گویم کہ بر آب قادر نیند　　　کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

(ہم یہ تو نہیں کہتے کہ پانی پر اُن کو قدرت نہیں بلکہ دریائے نیل کے کنارے پر جلندھر کے بیمار کی طرح مریض ہیں۔)

اُن کا جی تو کبھی رسولؐ سے بھر نہیں سکتا ہے۔

مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ سے کسی نے پوچھا کہ ذکر مولد کیسا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہم تو ہر وقت کرتے ہیں۔ پوچھا یہ کیسے؟ فرمایا — لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پیدا نہ ہوتے تو کلمہ کیسے پڑھتے۔

لوگوں نے یہ روایت سن لی ہے کہ ابو لہب کی ایک لونڈی نے ابو لہب کو پیدائش رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کی خبر دی۔ تو اُس نے خوش ہوکر اُسے آزاد کر دیا۔ اس کی وجہ سے اس کے عذاب میں تخفیف ہوگئی۔ میں کہتا ہوں دیکھو بدون ایمان و اطاعت وہ فرحت کافی تو نہ ہوئی۔

اسی طرح تبرکات کی زیارت مثلاً موئے مبارک کہ وہ بھی خاص اسی مہینے میں نکالا جاتا ہے۔ تبرکات اور اُن کی تعظیم میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ مگر اس کی خرابیوں کو کیا کیا جائے۔ مثلاً عورتیں جمع ہوتی ہیں ایک ہجوم ہوتا ہے نماز کی بھی کسی کو فکر نہیں ہوتی۔ کیا نماز ذکر رسولؐ نہیں، روزہ ذکر رسول نہیں سب ذکر رسولؐ ہے اور مقدم ہے کیونکہ فرمایا ہوا ہے جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کا۔ ع

عبارا تنا شتے و حسنک واحد

(عنوانات مختلف ہیں معنون ایک ہی حسن ہے)۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش

من انداز قدت را مے شناسم

(یعنی جس رنگ کا جوڑا چاہو پہن لو ہم تمہارے پاؤں کی رفتار سے پہچان لیں گے)

جتنے احکام جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے فرمائے ہوئے ہیں اُن کا بجالانا آپ ہی کا ذکر کرنا ہے۔ خواہ وہ صوم کی صورت میں ہو یا صلوٰۃ کی خواہ حج کی صورت میں ہو یا زکوٰۃ کی۔

شرک فی النبوۃ

صاحبو—— بات یہ ہے کہ لوگوں نے مولود شریف تو اپنی طرف سے مخترع کیا اور غضب یہ کیا کہ اُس کا نام عید اکبر رکھا۔ غضب کی بات ہے کہ رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم تو فرماتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے دو عیدیں دی ہیں اور انہوں نے تیسری اور ایجاد کر دی۔ اچھا خاصا معارضہ ہو گیا۔ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ اس میں شوکت اسلام کی ظاہر ہوتی ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی نے تعزیرات ہند کی سزاؤں کو چھاپتے وقت مضاعف (دو چند) کر دیا کہ جس جرم میں چھ مہینے کی قید تھی وہاں برس روز لکھ دیا اور بارہ برس ہونے پر یہ جواب دے دیا کہ کیا حرج ہے اس میں

گورنمنٹ کا رعب زیادہ ہوگا اور اس سے سلطنت میں استحکام ہوگا۔ اب بتلائیے اُس نے جو سزاؤں میں اضافہ کیا مقبول ہوگا یا نہیں۔ مردود ہوگا بلکہ اس شخص پر مقدمہ قائم ہو جائے گا کہ تم اپنے کو شریک سلطنت سمجھتے ہو کہ قانون وضع کرتے ہو۔ بس تو پھر اگر کوئی احکام شریعت میں کچھ اضافہ کرے یا بدل دے تو وہ مجرم ہے یا نہیں ——!

صاحبو۔ —— یہ شرک فی النبوۃ (نبوت میں اپنے آپ کو شریک کرنا) ہے کیوں کہ ایسی مصلحتوں کا دیکھنا نبی کا کام ہے۔ یہ وجہ ہے اس کے جرم ہونے کی۔ اب تو قانونی نظیر سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اس لئے بدعات سے منع کیا جاتا ہے کہ یہ شرک فی النبوۃ ہے۔ شیطان بدعت سے بہت خوش ہوتا ہے کیونکہ یہ سمجھتا ہے کہ گناہ جو شخص کرتا ہے اُس کو گناہ تو سمجھتا ہے مگر بدعت کو تو دین سمجھ کر کرتا ہے اور عمر بھر مبتلا رہتا ہے جب یہ آیت نازل ہوئی کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ —— الخ (ہم نے آج تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا) تو ایک یہودی کہنے لگا کہ ہم پر یہ آیت نازل ہو تو ہم تو اس دن عید مناتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ کچھ دیوانہ ہوا ہے ہمیں عید علیحدہ منانے کی کیا ضرورت، یہ تو خود عید کا دن ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو یوم عرفہ تھا۔ سب عرفات میں تھے۔

اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ حضور یوم دوشنبہ میں روزہ رکھتے تھے صحابہ رضی اللہ عنہما نے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ اس دن میں روزہ کیوں رکھتے ہیں

تو حضورؐ نے فرمایا کہ ذَالِکَ الْیَوْمُ الَّذِیْ وُلِدْتُّ فِیْہِ یعنے یہ وہ دن ہے جس میں میں پیدا ہوا ہوں۔ تو جب ایک عبادت یعنی روزہ رکھنا یوم ولادت ہونے کی وجہ سے حضورؐ سے ثابت ہے تو ہم اس عبادت پر دوسری عبادتوں کو بھی قیاس کر کے اسی سے ثابت کر سکتے ہیں۔

ہمیں اس میں کلام ہے کہ روزہ اس لئے رکھا تھا کہ یہ یوم ولادت ہے ممکن ہے روزہ اس لئے رکھا ہو کہ وہ پہلے سے یوم الفضیلت ہے اور یوم ولادت ہونا اسی فضیلت کے سبب تجویز کیا گیا ہو۔ اور اس پر کہ روزہ کا سبب اس یوم کا کسی دوسری وجہ سے افضل ہونا ہے ایک دلیل بھی ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس روز میں نامۂ اعمال پیش ہوتے ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ میرا عمل روزہ کی حالت میں پیش ہو۔ تو معلوم ہوا کہ یوم دوشنبہ پہلے سے ذی فضیلت ہے اور اسی وجہ سے اس میں آپؐ کی ولادت بھی متحقق ہوئی۔

جیسے دسویں محرم کی کہ اس میں حضرت حسینؓ کی شہادت ہوئی لیکن وہ دن شہادت کی وجہ سے افضل نہیں ہوا بلکہ اس کے ذی فضیلت ہونے کی وجہ سے اس میں آپ کی شہادت واقع ہوئی۔ اور اگر ثابت بھی ہو جائے کہ فضیلت اسی وجہ سے ہے تو زیادہ سے زیادہ اسی قدر تم بھی کر لو، جو حضورؐ سے ثابت ہے۔ اور اگر قیاس ایسا ہی عام ہے تو چاہیئے کہ مکہ والے ہر دوشنبہ کو حج بھی کر لیا کریں کہ جب روزہ ثابت ہے حج کو بھی قیاس کر لیں۔ حضرات قیاس کرنا آپ کا کام نہیں ہے۔ اگر قیاس ایسا سستا ہے

تو غیر مقلدوں کو ہرگز بُرا نہ کہو۔ غیر مقلد صرف اسی کو نہیں کہتے جو اپنے کو غیر مقلد کہے بلکہ آج بلا ضرورت شرعیہ جو لوگ قرآن و حدیث سے استخراج کی کوشش کرتے ہیں یہ سب غیر مقلد ہیں اور لطف یہ کہ سب سے زیادہ یہی لوگ غیر مقلدوں کے دشمن ہیں۔ غرض جو شخص اعمال ظاہرہ کے اثبات میں کذافی الهدایہ (اسی طرح ہدایہ میں ہے) کذافی الدر مختار (ایسے ہی در مختار میں ہے) نہ کہے وہ غیر مقلد ہے۔

نمبر ——— ۱ غرض یہ ایک عجیب سلسلہ ہے کہ بارہ مہینوں میں سے چھ مہینوں کے متعلق کچھ احکام ہیں اور چھ کے متعلق کوئی حکم نہیں مجھے اس کا بیان کرنا مقصود تھا کہ رجب کے متعلق بتادوں کہ کوئی خاص حکم نہیں۔ لوگ ۲۷ رجب کو روزہ کا اہتمام کرتے ہیں اور اس روزہ کا نام ہزاری روزہ رکھا ہے یعنی ہزار روزہ کا ثواب اُس ایک روزہ کے رکھنے سے ملتا ہے۔ اس دن میں روزہ ہی ثابت نہیں تو ہزار روزوں کا ثواب کدھر سے ثابت ہوا اور اگر کوئی اس واسطے رکھے کہ اس تاریخ کی شب میں حضورؐ کو معراج ہوئی ہے تو بات یہ ہے کہ جب حضورؐ نے خود روزہ نہیں رکھا تو یہ کیوں رکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس نفل روزہ کے ثواب کو اتنا بڑھانا، جو فرض سے بھی بڑھ جائے اور پھر اپنی رائے سے اشرک فی النبوۃ ہے۔

شاید کوئی یہ کہے کہ اس باب میں روایات ہیں تو خوب سمجھ لو وہ سب روایات غیر ثابت ہیں۔ علماء نے اُن کی سند میں کلام کیا ہے۔

نظام الاوقات

اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ بعض اوقات کو دخل ہے بعض احکام میں کہ وہ احکام مختص ہوتے ہیں انہیں اوقات کے ساتھ۔ اگر کوئی اس اختصاص پر یہ شبہ کرے کہ شب قدر تو ایک مرتبہ ہوتی ہے اور ایک ہی ہوتی ہے اور اوقات میں ہے تفاوت۔ مثلاً کہیں آفتاب ایک گھنٹہ پہلے غروب ہوتا ہے کہیں دو گھنٹہ پہلے حتیٰ کہ چھ چھ گھنٹہ کا بلکہ اس سے بھی زیادہ کا فرق ہو جاتا ہے۔ تو اس حالت میں بعض جگہ رات ہو گی اور بعض جگہ دن اور شب قدر رات کے ساتھ مختص ہے اور ایک ہی ہے تو جہاں رات ہے وہاں تو شب قدر ہو جائے گی اور جہاں دن ہے، وہاں ہو ہی نہیں سکتی۔

جواب یہ ہے کہ اس کا وقت ہر جگہ کے لئے جُدا جُدا ہے۔ مثلاً عدالت کے کھلنے کا وقت ۱۰ بجے ہے تو ہر جگہ کے ۱۰ بجے وہاں کی عدالت کھلے گی۔ کلکتہ میں وہاں کے ٹائم سے اور لندن میں وہاں کے ٹائم سے غرض یہ کہ انسان کا نظام الاوقات یہ ہوا کہ اپنے اوقات کو دیکھے کہ کس وقت میں کیا حکم ہے۔ جو وقت آتا ہے اپنے ساتھ ایک حکم لاتا ہے

شعر

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی
شاید کہ نگاہے کُند آگاہ نباشی

(یعنی حق تعالیٰ شانہٗ سے ایک پل بھر بھی غافل نہ ہو ممکن ہے کہ کسی وقت وہ تم پر توجہ فرمائیں اور تم بے خبر ہو۔)

انسان کو چاہیے کہ ایک لمحہ غافل نہ رہے۔ اس پر کسی طالب علم کو شبہ ہوگا کہ قرآن مجید میں ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا وَّ سَبِّحُوْہُ بُکْرَۃً وَّ اَصِیْلًا۔

یعنے اے ایمان والو! تم اللہ کو خوب کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح و تقدیس کرتے رہو۔

اس میں تو صبح و شام ذکر کرنے کو بتلایا ہے نہ کہ ہر لحظہ۔ تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ صرف صبح اور شام ذکر کرو اور باقی اوقات میں خالی رہو بلکہ محاورہ ہے کہ جس کام کو ہر وقت کرانا مقصود ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ رات دن کرتے رہو۔ ذکر ضدین سے مقصود استیعاب اس جنس کا ہوتا ہے اور ذکر صرف یہی نہیں ہے کہ بس تھوڑی دیر اللہ اللہ کر لیا بلکہ لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً (یعنے زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو بلا شبہ وہ بڑی بے حیائی کی بات ہے) پر عمل کرنا بھی ذکر ہے۔ کیونکہ یہ بھی فرمایا ہوا ہے اللہ تعالیٰ کا۔

اس پر عمل کرنے کو یوں سمجھو کہ لَا تَقْرَبُوا کے معنی یہ ہیں کہ زنا کرنا تو بہت بری بات ہے تم اس کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ یعنے جو چیزیں دواعی زنا ہیں اُن کی طرف بھی متوجہ نہ ہو مثلاً نگاہ کو بھی ادھر متوجہ نہ کرو قلب کو بھی ادھر متوجہ نہ کرو۔ اسی طرح ہر وقت اُس وقت کے احکام عامہ و خاصہ کا اہتمام رکھو۔ اس پروگرام کے منضبط ہو جانے کے بعد اب

بتلایئے کہ غیبت کا کون سا وقت ہے۔ جھوٹ بولنے کا کون سا وقت ہے۔ ہارمونیم بجانے کا کون سا وقت ہے۔ گراموفون سننے کا کون سا وقت ہے۔

اعتدالِ شریعت

ہاں البتہ شریعت تنگ نہیں ہے۔ اجازت ہے کہ ورزش کیجئے، اجازت ہے کہ ہنسیئے بولیے، بات کیجیے۔ یہاں تک اجازت ہے کہ اگر وظیفہ پڑھتے پڑھتے تھک جاؤ تو چھوڑ دو۔ باہر بیٹھ کر ہنس لو بول لو مگر کوئی ناجائز بات مت کرو۔ شریعت میں یہ تعلیم نہیں کہ بیوی کو طلاق دے دو۔ بچوں کو عاق کر دو اور بس ایک کونہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے لگو۔

ایک صاحب قنوج میں کہنے لگے شریعت کا خلاصہ یہ ہے کہ خوشی کی بات پر خوش نہ ہو، رنج کی بات پر رنج نہ کرو ــــــ استغفر اللہ! بھلا شریعت ایسی کیوں ہوتی۔

اس کی ایسی ہی مثال ہے کہ کسی نے کہا کہ صاحب جج بڑے خلیق ہیں۔ اس کے بعد ایک شخص گیا ملنے کے لئے عدالت میں اور اتفاق سے اس وقت صاحب جج کسی خونی کو پھانسی کا حکم سنا رہے تھے۔ پس یہ بھاگا وہاں سے۔ پوچھا ملے تھے؟ کہا، ہاں! پوچھا پھر کیا ہوا؟ کہا کہ صاحب ہم باز آئے ایسی خوش خلقی سے۔ وہ تو پھانسی کا حکم سنا رہے تھے۔ اگر بدخلق ہوتے تو نہ معلوم کیا کرتے۔ اس نے کہا، ارے دیوانے! صاحب

جج کو اُن کے بنگلہ پر جا کر دیکھ کہ کیسے خلیق ہیں کہ ہر ایک سے محبت و اخلاق سے پیش آتے ہیں۔ احکامِ شرعیہ کی نسبت تو یہ کہنا بے تکلف صحیح ہے ؎

بہارِ عالمِ حسنش دل و جاں تازہ می دارد
برنگ اصحابِ صورت را ببو اربابِ معنی را

(اُس کے عالمِ حسن کی بہار دل و جان کو تازہ رکھتی ہے۔ ظاہر پرستوں کے دل و جان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جان کو بُو سے)

شریعت کو ذرا غور سے دیکھو کہ کیسی شفیق ہے۔ تو شریعت یہ نہیں سکھاتی کہ حجرہ میں دروازہ بند ہو کر بیٹھ جاؤ۔

ایک شخص تھے صحابہ میں سے کہ وہ کبھی نہ ہنستے تھے نہ کبھی بولتے تھے تو کسی شخص نے حضرت عائشہؓ کے سامنے کہا فلاں جل جلہ یعنے فلاں شخص بڑا متین ہے، تو حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ھُوَ ھَزلٌ کُلُّہٗ یعنے وہ ہزل محض ہے۔

آج کل بزرگی اسی کو سمجھا جاتا ہے کہ بس منہ پھولا کر ایک کونہ میں بیٹھ گئے۔ نہ کسی سے بولنا نہ چالنا، کبھی تیوری کے بل ہی نہیں اُترتے۔ یہ بزرگی ہے؟ ہرگز نہیں! بزرگی تو وہ ہے جس میں انبیاء کی سی شان پیدا ہو حدیث میں آیا ہے کہ جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز پڑھ کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ اس میں اِدھر اُدھر کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ یہ نہیں تھا کہ

منہ چھُوا کر ایک کونہ میں بیٹھ جایا کرتے تھے۔

بزہد و ورع کوش و صدق و صفا — ولیکن میفزائے بر مصطفےٰ

(زہد و تقویٰ اور صدق و صفا میں کوشش کرو لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے مت بڑھو۔)

تقویٰ اختیار کرو مگر نہ اتنا کہ جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم سے بڑھ جائے۔

ایک مرتبہ صحابہؓ کے مجمع میں سے ایک صحابی سب کو ہنسا رہے تھے تو جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم نے آکر اُن کے پہلو میں مزاحاً انگلی چبھو دی۔ اُنہوں نے کہا کہ میں تو آپ سے بدلہ لوں گا آپ نے مجھے کیوں مارا۔ آپ نے فرمایا بدلہ لے لو۔ اُنہوں نے کہا کہ میرے بدن پر تو کرتہ نہ تھا آپ بھی کرتہ اتار دیجئے۔ آپ نے کرتہ اٹھا دیا۔ بس پھر کیا تھا، اُنہوں نے بوسہ دیا اور لپٹ گئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ میرا مطلب یہی تھا بس وہ پورا ہو گیا اور معاذ اللہ بھلا میں آپ سے بدلہ لیتا۔

غرض بہت سی روایات ہیں جن سے جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مزاح کرنا ثابت ہے اور گوشہ نشینی جو اس قدر غلو کے ساتھ ہو کہیں ثابت نہیں۔ جو لوگ ایسے بزرگ ہوں وہ بزرگ نہیں بلکہ بُزدگ ہیں (بفتح اول وسکون ثانی وفتح ثالث وسکون رابع) یعنے حروف میں تو برابر ہیں اور معنی اور ہیں۔ سبحان اللہ ہمارے حضرات میں یہی خوبی ہے۔ بالکل سنت کے موافق عمل ہے۔ پھر لوگ انہیں بدنام کرتے ہیں۔ خیر اس کا انصاف توقیامت

کے حوالہ ہے۔

غرض شریعت نے جس طور پر انضباط اوقات کر دیا ہے اس میں نہ افراط کرو نہ تفریط۔ ضبط اوقات میں تجربہ کیا ہوگا کہ قلب میں فرحت زیادہ ہوتی ہے۔ جو لوگ برکات شرعیہ کو محسوس کرتے ہیں اُن کا تو کیا کہنا، وہ لوگ بھی جو صرف ضابطہ کی پابندی کرتے ہیں، اپنے ٹھیک وقت پر نماز سے فراغت کر لینے پر اپنے قلوب میں فرحت کو محسوس کرتے ہیں۔ صاحبو۔! وقت کی قدر کرنا چاہئے۔

الحمدللہ! وقت کے متعلق بہت ضروری مضامین بیان ہو گئے۔ اب وقت تنگ ہے صرف ایک حکایت پر وعظ کو ختم کرتا ہوں۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ایک برف فروش سے مجھ کو بہت عبرت ہوئی۔ وہ کہتا جا رہا تھا کہ اے لوگو! مجھ پر رحم کرو کہ میرے پاس ایسا سرمایہ ہے کہ ہر لمحہ تھوڑا تھوڑا ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کی ہماری بھی حالت ہے کہ ہر لمحہ برف کی طرح تھوڑی تھوڑی ختم ہوتی جاتی ہے، اسے گھلنے سے پہلے جلدی بیچنے کی فکر کرو کس کے ہاتھ؟ جس نے یہ فرمایا۔

اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ۔ الخ

(یعنے بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے اُن کی جانوں اور مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ اُن کو جنت ملے گی)

اور اس عمر کو ضائع مت کرو۔

عمر عزیز قابل سوز و گداز نیست

(براہ کرم ورق نہ موڑیں)

ایں رشتہ را مسوز کہ چنداں دراز نیست

(پیاری عمر ضائع و برباد کرنے کے لائق نہیں اس کو ضائع مت کرو کیونکہ اس کا سلسلہ اتنا دراز نہیں کہ اس کو فضولیات میں برباد کیا جائے۔)

بس اب میں وعظ کو ختم کر چکا۔ اب اللہ سے دعا کیجیے کہ ہم کو فہم عطا کرے اور عمل کی توفیق دے۔ آمین!

ہندستانی لائبریری
گارڈن ریچ روڈ۔ مٹیا برج۔ کلکتہ

حقوق المعاشرت

HINDUSTANI LIBRARY:
Estd. 19..
ہندستانی لائبریری
Garden Reach, Calcutta.

طرز معاشرت کے متعلق یہ وعظ ۸؍ ربیع الاوّل سنہ ۱۳۹۹ھ کو بجامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر ارشاد فرمایا جسے مولوی نور حسین صاحب پنجابی نے قلمبند کیا۔

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہٗ ورسولہ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یٰۤاَھۡلَ الۡکِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِیۡ دِیۡنِکُمۡ غَیۡرَ الۡحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوۡۤا اَھۡوَآءَ قَوۡمٍ قَدۡ ضَلُّوۡا مِنۡ قَبۡلُ وَاَضَلُّوۡا عَنۡ سَوَآءِ السَّبِیۡلِ ۔

ہندستانی لائبریری
گارڈن ریچ روڈ ٹیابرج۔ کلکتہ

تمہید

پہلے میں نے ایک وعظ میں کچھ حقوق کے متعلق بیان کیا تھا کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر کتنے حقوق ہیں اور وہ چند ہیں۔

۱۔ سلام ۲۔ اجابت الداعی

ہر دو معنی کے اعتبار سے یعنی دعوت قبول کرنا اور بلائے تو جواب دینا۔ چھینکنے کے وقت الحمد للہ کہے تو جواب دینا۔ بیمار ہو تو بیمار پرسی کرنا۔ مر جائے تو جنازے میں شریک ہونا۔ یہ تو حاضر ہونے کی حالت میں ہیں اور بعض ایسے حقوق ہیں، جو غائب ہونے کے وقت کے ہیں۔ مثلاً اُس کی غیبت کو دفع کرنا۔ اُس پر کوئی بہتان باندھے اس کو دُور کرنا وغیرہ۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ ان حقوق کے ضروری آداب کسی موقع پر بیان کروں گا۔ سو ان حقوق کے متعلق بعض ضروری آداب کو آج بیان کرتا ہوں۔

افراط و تفریط

جاننا چاہیئے کہ اخلاق و معاشرت کے بھی کچھ حدود و قوانین ہیں۔ مثل احکام نماز روزے وغیرہ کے کہ جن کی کمی بیشی سے افراط و تفریط میں مبتلا ہو کر اداۓ حقوق سے آدمی قاصر رہتا ہے۔ پس جس طرح چار رکعت والی نماز پانچ رکعت یا تین رکعت پڑھنے سے ادا نہیں ہوتی اور عصر کی نماز ظہر کے وقت پڑھنے سے نہیں ہوتی یا جیسے رکوع میں قرائت جائز نہیں بلکہ الٹا گناہ ہے یا جیسے روزہ عصر تک روزہ نہیں ہوتا اور نیز عشاء تک روزہ رکھنے سے معصیت لازم آتی ہے۔ اسی طرح حقوق معاشرت و اخلاق کے بھی حدود ہیں کہ ان میں کمی بیشی کرنے سے قبیح کا ارتکاب لازم آتا ہے۔ اس لئے ان کے آداب اور حدود کو جاننا ضروری ہے۔

آج کل باہمی برتاؤ کے طرز سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ احکام معاشرت سے اکثر کو ناواقفی ہے گویا اس کو دین ہی نہیں سمجھتے۔ اس لئے اپنی رائے میں جو آیا کر لیا۔ اس لئے اُن کے احکام کی تحقیق بھی نہیں کرتے اور بعض جاننے والے معاشرت اور اخلاق میں کمی اور تفریط کو تو بُرا جانتے ہیں مگر افراط کو بُرا نہیں جانتے بلکہ مطلقاً کثرت کو مطلوب اور محبوب سمجھتے ہیں حالانکہ اوپر غلو کے مذموم ہونے سے معلوم ہو چکا ہے کہ جس طرح کمی بُری ہے، اسی طرح زیادتی بھی بُری ہے۔

مثلاً سلام ہے کہ لوگ اس میں کتنی زیادتی کرتے ہیں کہ ذکر، قرآن، خطبہ اذان وغیرہ سب میں آتے جاتے سلام کرتے ہیں۔ مثلاً مشہور ہے اوچھے نے

سکھا سلام ہے نہ صبح دیکھے نہ شام۔ اس قسم کے افراط بھی دین میں پسندیدہ نہیں بلکہ حدود سے تجاوز اور غلو فی الدین ہے جس کو اس آیت لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ میں منع فرمایا گیا ہے۔ اس کی مثال نسخے کی سی سمجھنا چاہئے۔

مثلاً طبیب نسخے میں ۶ ماشہ کوئی دوا لکھے تو اگر یہ خیال کرکے کہ یہ چیز جب طبیب نے لکھی ہے تو مفید ضرور ہے۔ زیادہ ڈالنے سے اور زیادہ فائدہ ہوگا، کوئی شخص وزن بڑھا دے تو وہ دوا ہرگز مفید نہ رہے گی۔ کیونکہ نفع مقدار خاص کے ساتھ مشروط تھا۔ اسی طرح شریعت جب طب روحانی ہے تو اس کے احکام کی مثال نسخے کی سی سمجھنا چاہئے تو اس میں کمی بیشی کرنے سے ضرور نقصان ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

تلک حدود اللہ فلا تعتدوھا

آداب و حقوق کے بیان کرنے کا وعدہ میں نے کیا تھا۔ اس لئے آج اس کا ایفاء کرتا ہوں کیونکہ یہ بھی ضروری ہے اور ایفائے وعدہ بطور دین کے واجب الذمہ ہو جاتا ہے اور لوگ اس میں بھی سستی کرتے ہیں اور اس کی پروا نہیں کرتے لیکن بعض اوقات بعض ایسے حقوق کا جو کہ دراصل کم درجہ کے ہیں یعنی بڑے حقوق سے زیادہ شرع نے اہتمام کیا ہے کیونکہ ضروری حقوق کو تو خود ہی لوگ ضروری سمجھ کر ادا کر دیں گے مگر جن حقوق کو ہلکا سمجھ رہے ہیں، ان میں ضرور وہ کوتاہی کریں گے، اس لئے ان پر خاص تنبیہ کی جاتی ہے۔

اور یہی نکتہ ہے قرآن میں وصیت کو دین پر ذکر میں مقدم کرنے کا۔ چنانچہ ارشاد ہے من بعد وصیۃ یوصی بھا او دین۔ حالانکہ شرعاً تجہیز و تکفین

کے بعد سب سے مقدم دین ہے اور اس کے بعد وصیت مگر ذکر میں اللہ تعالیٰ نے وصیت کو اس لئے مقدم فرمایا کہ لوگ وصیت کے باب میں تساہل زیادہ کرتے ہیں اور قرض تو سب ہی کے نزدیک ضروری چیز ہے پھر اس مطالبہ ہیں جبر کرنے والے بھی موجود ہیں اور وصیت فی نفسہٖ تبرع ہے اس میں جبر کرنے کا کسی کا حق نہ تھا اس لئے وصیت کو ذکر میں مقدم کر کے تنبیہ کر دی کہ دیکھو اس کا بہت بہت خیال رکھنا۔

آدابِ سلام

خیر یہ ایفائے وعدہ کا ذکر بطور جملہ معترضہ کے ہو گیا تھا۔ اب آداب اُن حقوق کے بیان کئے جاتے ہیں۔

ایک سلام ہے کہ یہ کفایہ کے طور پر سنت ہے مگر اُس میں یہ بے احتیاطیاں کی جاتی ہیں کہ ایک تو یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ وقت سلام کا ہے یا نہیں بعض اوقات سلام ممنوع بھی ہے مثلاً عبادت کے وقت خواہ وہ ذکر ہو یا قرآن یا نماز سلام ممنوع ہے۔ کیونکہ ایسے وقت سلام کرنا خدا تعالےٰ کی طرف سے ہٹا کر اپنی طرف مشغول کرنا ہے اس کی مثال ہے جیسے کوئی شخص حاکم کے پاس بیٹھا ہو اُس سے باتیں کر رہا ہو اور ایک دوسرا شخص اُس کو اپنی طرف مشغول کرنا چاہے، کیا یہ خلاف ادب نہ ہوگا۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ جو شخص مشغول خدا کو اپنی طرف مشغول کرنا چاہتا ہے اور کہا لہ مقت فی الوقت۔ ہاں اگر ضرورت شدید آپڑے، تو اس وقت ذکر کو چھوڑ کر دوسرا کام کرنا یہ اور بات ہے۔ مثلاً نابینا کنوئیں میں

گرنے لگے تو ایسے وقت میں نماز بھی توڑ کر اس کو بچانا ضروری ہے اور یاد رکھنا چاہیئے کہ جب علت اس منع کی قلب کا مشغول بغیر حق ہونا ہے، تو اس سے معلوم کرنا چاہیئے کہ جیسے ذکر کے وقت سلام ممنوع ہے ایسی ہی کوئی حرکت جس سے دل بٹ جائے ممنوع ہے۔ مثلاً اس کو آگاہ کرنے کے لئے کھنکھارنا، کھانسنا یا اس کی عین پشت کے پیچھے بیٹھ جانا کہ اس سے دوسرے آدمی کی طبیعت پریشان ہوتی ہے۔ اپنے اوپر قیاس کر کے دیکھ لینا چاہیئے۔ ع

آنچہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں مپسند

بعض لوگ پیٹھ پیچھے بیٹھنے کو ادب سمجھتے ہیں حالانکہ ادب ویسی چیز میں کبھی نہیں ہو سکتا جس میں تکلیف ہو وہ تو بے ادبی ہوئی ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد   کسے را باکسے کارے نباشد

جو لوگ ایسا کرتے ہیں، اگر کوئی شخص ان کے پیچھے اسی طرح آ کر بیٹھ جائے تب حقیقت معلوم ہو جائے۔ بعض نے ان مضامین کے بیان کرنے پر اعتراض کیا کہ تمہارے مزاج میں تو انگریزی انتظام ہے۔ افسوس! درمختار تو کوئی انگریزی کتاب نہیں۔ آج تو اس میں سلام کے یہ آداب مذکورہ لکھے ہیں۔

اسی طرح ذکر کے وقت دوسرے آدمی کو انتظار میں تکتے رہتے ہیں اس سے بھی طبیعت پریشان ہوتی ہے بلکہ اگر انتظار کرنا ہو تو ایسی جگہ انتظار کرنا چاہیئے کہ ذاکر اس شخص کو نہ دیکھے تاکہ اس کا قلب پریشان نہ ہو

اور یہ شخص اس کو دیکھ سکے۔

اسی طرح بعض لوگ اور جگہ موجود ہونے کے باوجود عین پیٹھ پیچھے نیت باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سو اول تو یہ مشابہ شرک ہے دوسرے کسی آدمی کو مقید و محبوس کر دینا کہ جب تک یہ سلام نہ پھیریں، وہ غریب کہیں جا بھی نہیں سکتا، کون سی عقل کی بات ہے۔

بعضے بخیالِ فیض لینے کے پیچھے بیٹھ جاتے ہیں۔ سو یاد رہے فیض تکلیف دینے کی حالت میں نہیں ہو سکتا۔ یہ سخت غلطی ہے کہ تکلیف بھی دیں اور فیض کی بھی تمنا رکھیں۔ یہ واقعی بعضا ادب بھی تکلیف دہ ہی ہوتا ہے۔ تو ایسا ادب خود چھوڑ دینا چاہئے۔

دیکھیے حضرات صحابہ کرام رض خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے نہیں اٹھتے تھے۔ چونکہ اُن کو معلوم ہو گیا تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس سے کراہت و ناگواری ہے۔ ادب یہی ہے کہ اپنے بزرگ کی رضا و خوشنودی کی کوشش کرے۔ حتیٰ کہ اگر تصریح یا قرینے سے یہ معلوم ہو جائے کہ راہ میں اُن کے ساتھ ہمارے چلنے سے تکلیف ہوتی ہے تو ساتھ بھی نہ جانا چاہئے۔ اسی طرح جوتا اٹھانے سے اگر تکلیف ہو، تو جوتا بھی نہ اٹھائے۔

جناب مولانا فتح محمد صاحب مرحوم و مغفور کی حکایت ہے کہ جمعہ کے بعد مسجد سے باہر کو تشریف لے جا رہے تھے کہ ایک شخص نے آگے جوتا لینا چاہا۔ مولوی صاحب نے تو اضحا نہ دیا۔ اس نے اصرار کیا۔ مولوی

صاحب نے زور سے پکڑ لیا۔ تو اُس شخص نے ایک ہاتھ سے تو مولوی صاحب کا ہاتھ دبایا اور دوسرے ہاتھ سے زور سے جھٹکا دے کر جوتا چھین لیا۔ دیکھئے کہ اس شخص نے ایک ذرا سے خیالی ادب کے لئے اُن بزرگ کو کیسی اذیت اور تکلیف دی اور اس ادب سے بڑھ کر بے ادبی ہو گئی ———،

یہ سب ناسمجھی کی باتیں ہیں اور یہ باتیں ہلکی نہیں ہیں اور گو یہ نماز روزہ کی طرح ارکان و شعائر اسلام سے نہیں لیکن اس حیثیت سے کہ اخلاق کا تعلق دوسروں سے ہے اور اس طور پر یہ حقوق العباد سے ہیں۔ اس لئے ان میں خرابی اور افراط و تفریط کرنے سے نماز روزہ کی کوتاہی سے بھی زیادہ ان میں مواخذہ کا اندیشہ ہے کیونکہ عبادات تو اللہ تعالیٰ کے حقوق ہیں۔ ان میں اگر کچھ کمی ہو تو اللہ تعالیٰ چونکہ کریم ہیں عفو کی امید بعید نہیں مگر حقوق العباد صاحب حق کے ہیں، معاف کرنے سے معاف ہوتے ہیں اس لئے ان کی رعایت بھی ضروری ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کا وہ قصہ جس میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا رات کو قبرستان کی طرف تشریف لے جانا اور حضرت کی پشت پیچھے جانا مذکور ہے آداب معاشرت کے مہتم بالشان ہونے کے لئے کافی دلیل ہے۔

وہ قصہ یہ ہے کہ ایک رات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کے مکان سے قبرستان کو تشریف لے گئے۔ اُنہوں نے سمجھا کہ شاید کسی اور بیوی کے ہاں تشریف لے جا رہے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کو یہ معلوم نہ ہوا کہ جاگتی ہیں کیونکہ علم محیط صرف خدائے تعالیٰ ہی کو ہے۔ اس لیئے آنحضرت بخیال اس کے کہ حضرت عائشہ کی آنکھ نہ کھل جائے آہستہ سے اٹھے اور آہستہ سے دروازہ کھولا اور آہستہ سے بند کیا (ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے کہ سونے والوں کو تکلیف نہ ہو) اور قبرستان کی طرف تشریف لے گئے۔ حضرت عائشہ چونکہ جاگتی تھیں اور اُن کا خیال تھا کہ شاید کسی اور بیوی کے ہاں تشریف لے گئے ہیں۔ یہ بات اُن کو بوجہ غایت تعلق و محبت گوارا نہ ہوئی اور دبے پاؤں پیچھے پیچھے ہولیں۔

آپ کی شانِ محبوبیت تو اس درجہ تھی کہ حضرت عائشہ کو یا آدمیوں کو تعلق عشق ہوتا ہو تو کیا عجیب ہے جب کہ حیوانات تک آنحضرت کی محبت سے بے قرار تھے۔ حج میں جب آنحضرت نے سو اونٹ ذبح کیے ہیں جن میں تریسٹھ اونٹ اپنے ہاتھ سے ذبح کیئے تھے (اس سے قوت جسمانیہ کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے) اونٹوں کی یہ حالت تھی کہ بے قرار ہو کر اپنی گردنیں جھکاتے تھے اور آپ کی طرف مشتاقانہ بڑھتے تھے کہ ہم کو ذبح کریں۔ حدیث میں ہے طفقن یزدلفن الیہ خوب کہا ہے ؎

ہمہ آہوانِ صحرا سر خود نہادہ برکف
بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

جب حیوانات کو یہ بے قراری ہو تو حضرت عائشہ صدیقہ کو تو خاص تعلق تھا اُن کی بے قراری کیا عجیب ہے۔ غرض کہ حضرت عائشہ رضہ پیچھے پیچھے قبرستان میں پہنچیں۔ آنحضرتؐ نے وہاں اموات کے لیئے دعا فرمائی

اور اُس کے بعد گھر کی طرف لوٹے اور یہ بھی لوٹیں۔ تو اب یہ آگے ہو لیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آگے آدمی دیکھ کر تحقیق کے لیے اس طرف تیز چلنا شروع کیا۔ حضرت عائشہ دوڑیں۔ آنحضرت ؐ نے بھی دوڑ کر آگے بڑھنا چاہا۔ وہ اور دوڑیں اور گھر آکر بستر پر چپکے سے لیٹ گئیں۔ حضرت تشریف لائے تو پوچھا کہ سانس کیوں چڑھا ہوا ہے ---- الی آخر الحدیث۔

بعض لوگوں کو ان آداب کی تعلیم بضرورت ذرا سخت الفاظ سے کی جاتی ہے (کیونکہ تعلیم کے لیے بعض حالات و بعض طبائع کے اعتبار سے ذرا سختی کی ضرورت ہوتی ہے) تو برا مانتے ہیں اور اس کو اخلاق کے خلاف سمجھتے ہیں۔ سو جان لینا چاہیے کہ بے تمیزی کی بات پر تشدد کرنا اور سختی سے تعلیم کرنا اخلاق کے خلاف نہیں ہے۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لقطہ کی نسبت پوچھا کہ اگر کوئی آوارہ بکری ملے تو کیا کیا جائے۔ آپ ؐ نے فرمایا کہ لے لینا چاہیے ورنہ کوئی اور یا کہ بھیڑیا لے گا۔ پھر ایک شخص نے اونٹ کی نسبت بھی یہی سوال کیا، تو آنحضرت ؐ ناخوش ہوئے اور تیزی سے جواب دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ غصہ کرنا بے تمیزی پر جائز ہے ؎

درشتی و نرمی بہم در بہ است چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ است

پس اصل اصول اخلاق کا یہ ہے کہ بلا وجہ کسی کو تکلیف و اذیت نہ پہنچائے۔ بعضے لوگ گھر پر آکر تقاضے پر تقاضا اور آوازیں دینا شروع کر دیتے ہیں یہ بھی تکلیف دینا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُنَادُوۡنَکَ مِنۡ وَّرَآءِ الۡحُجُرٰتِ اَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ

پہلے سے سلام کے آداب بیان ہو رہے تھے تو ایک ادب تو مذکور ہوا کہ طاعت و ذکر میں جو شخص مشغول ہو اُس کو سلام نہ کرے۔ اور ایک ادب یہ ہے کہ جو شخص کسی گناہ میں مشغول ہو اُس کو سلام نہ کرے۔ کیونکہ عاصی کا اکرام جائز نہیں اور ایک ادب یہ ہے کہ حاجت ضروریہ یعنی بول و براز کی حالت میں سلام نہ کرے۔ نیز کھانے پینے کی حالت میں سلام نہ کرنا چاہیے اُس وقت اگر جواب دیا تو احتمال ہے کہ گلے میں پھندا پڑ جاوے۔ اس بیان کے ضمن میں بہت آداب اور احکام آگئے۔

آدابِ مصافحہ و معانقہ

پھر سلام کا متمم مصافحہ ہے۔ اس کے بھی چند ضروری آداب بیان ہوتے ہیں۔ سو جاننا چاہیے کہ مصافحہ اول ملاقات میں بالاتفاق مسنون ہے اور رخصت کے وقت مختلف فیہ اور ان دو کے سوا تیسرا ثابت نہیں۔ پس اس کے لیے بھی ضوابط و حدود مقرر ہوئے۔ اور اس کی کیا تخصیص ہے ہر چیز کے واسطے خاص ضوابط اور شرائط ہیں کہ بدون اُن کے وہ چیز درست نہیں ہوتی۔ مثلاً نماز ہے اگر کوئی چار رکعت کی جگہ پانچ رکعت پڑھنے لگے تو صحیح نہیں ہوگی یا جمعہ حنفیہ کے نزدیک دیہات میں پڑھنے لگے تو نہیں ہوگا یا حج ممبئی جاکر کرے تو نہیں ہوتا اسی طرح ہر امر میں ضابطہ اور قاعدہ ہے۔ چنانچہ مصافحہ و معانقہ کے بھی قاعدے مقرر ہیں۔

مثلاً عیدین اور جمعہ میں جو لوگ محض رسم جان کر مصافحہ یا معانقہ کیا کرتے

ہیں کہیں ثابت نہیں اور عیدین اور جمعہ کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ اس لئے یہ رسم بدعت ہے اس کو ترک کر دینا چاہیئے اور بتلانے والے علماء سے ایسے امور میں مزاحمت نہ کرنا چاہیئے کہ صاحب اس کی کیا وجہ ہے یہ کیوں منع ہے کیونکہ دلائل کا سمجھنا آسان نہیں ہے کہ اس کے لئے خاص علوم کی بھی ضرورت ہے البتہ احکام بے شک آسان ہیں کہ مسئلہ معلوم کر لو اور عمل کر لو۔ باقی دلائل ہر شخص کی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ مگر عوام کے حال پر افسوس ہے کہ باوجود جہل کے علماء سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ان کے دل میں علماء کی وقعت نہیں ورنہ وقعت خود مانع ہوتی ہے مزاحمت سے۔

دیکھو اگر کوئی انجینئر کسی سرکاری عالیشان قیمتی عمارت کے گرانے کا حکم دے اور اس عیب و نقصان کی تفصیل نہ بیان کرے تو وہ عمارت فی الفور گرا دی جاتی ہے ذرا تامل نہیں کیا جاتا کیونکہ اس کو ماہر و معتبر سمجھ کر اس کی اس تجویز کو باوقعت سمجھا جاتا ہے۔ اور بڑے سے بڑا فاضل دل میں یوں جان لیتا ہے کہ جس بات کو انجینئر کی عقل اور نظر معلوم کر سکتی ہے، وہ میری سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ افسوس علماء کو اتنا بھی نہیں سمجھا جاتا جتنا انگریز ڈاکٹر اور انجینئر کو سمجھتے ہیں۔

احکام کا آسان اور دلائل کا مشکل ہونا ایسا ہے جیسا اقلیدس کا یہ دعویٰ سمجھنا تو چنداں دشوار نہیں کہ مثلث کے تین زاویئے مل کر دو قائموں کے برابر ہوتے ہیں مگر اس کی دلیل ہر شخص کو آسان نہیں بجز اس کے جو اس کے مبادی جانتا ہو۔ بعض اس سے بڑھ کر شریعت میں ترمیم کی رائے دیتے ہیں اگر ایسی

رائے دینے والوں کی باتیں مانی جاویں تو شریعت تو تمام مٹ کر رہ جائے اور بجز کفر و دہریت کے اسلام کا نام بھی باقی نہ رہے۔ ان رائے دہندگان کی بالکل ایسی مثال ہے ؎

گربہ میر و سگ وزیر و موش را دیواں کنند

ایں چنیں ارکانِ دولت ملک را ویراں کنند

مسلمان من حیث مسلمان کا مشرب تو احکامِ الٰہیہ میں یہ ہے ؎

زباں تازہ کردن باقرار تو
نینگیختن علت از کارِ تو

افسوس! یہ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ وکیل سے قانون اور دفعہ پوچھی جاوے تو معقول ہے مگر بناءِ قانون دریافت کرنا محض غیر معقول ہے۔ اوّل تو اکثر وکیل جانتے ہی نہ ہوں گے اور جو جانتے ہیں وہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا فرضِ منصبی قانون بتلانا ہے نہ کہ علتِ قانون۔ اگر بناءِ قانون کی تحقیق منظور ہے تو واضعانِ قانون سے جاکر پوچھو۔ اور تبدیلِ قانون کی رائے دینا اور اُس میں بحث و گفتگو کرنا تو صریح انکارِ حکومت ہے۔

افسوس حکومتِ دنیویہ کے قانون میں تو یہ مداخلت ناجائز سمجھی جاوے مگر شریعت کے احکام میں مداخلت کو سہل سمجھا جاوے۔ حکیم، ڈاکٹر، سول سرجن جب کوئی نسخہ تجویز کرتا ہے اُس سے کوئی نہیں پوچھتا کہ یہ نسخہ کیوں تجویز کیا ہے۔ اس کی وجہ اور علت کیا ہے مگر علماء سے علتیں پوچھی جاتی ہیں اور حجتیں نکالی جاتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ وہاں تو اصلاح اور شفا مقصود ہے اور یہاں یہ مقصود ہی نہیں ورنہ اطبائے روحانی کے نسخہ کو بعد تحقیق اُن کے طبیب

ہونے کے بے چون و چرا پی جاتے۔ ان کے دلوں میں خود احکام ہی کی وقعت اور عظمت نہیں بلکہ احکام خداوندی کو کھیل بنا رکھا ہے۔ احکام کا حال رسم و رواج کا سا سمجھتے ہیں کہ ان میں حسب مصلحت تغیر و تبدل ہوا کرتا ہے ؎

سحر را با معجزہ کردہ قیاس   ہر دو را بر مکر بنہادہ اساس

احکام کے دلائل سمجھنا محققین کا کام ہے اور محقق ہونے کے لئے خاص اسباب و آلات کی ضرورت ہے اور جو آدمی درجہ تحقیق تک پہنچنے کی ہمت نہ رکھتا ہو اس کو محققین کی تقلید اور اتباع کرنا چاہیئے اور اگر نہ محقق ہوا نہ مقلد تو عنقریب وہی حالت ہو گی جیسا ارشاد فرمایا ہے۔ وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْ اَصْحَابِ السَّعِيْرِ۔ الخ

اب مصافحہ کے متعلق عرض کرتا ہوں۔ بعض وقت مصافحہ کرنے سے دوسرے آدمی کو بار ہوتا ہے۔ فرض کیجیے ایک ہاتھ میں جوتا ہے دوسرے ہاتھ میں چھتری ہے۔ اب مصافحہ کیسے کرے بجز اس کے کہ جوتے کو رکھے تو خود اس کی تکلیف دینا یہ امر غیر معقول ہے۔ اسی طرح جو آدمی کام میں مشغول ہو اس سے مصافحہ نہ کرنا چاہیئے۔ اس سے تکلیف بھی ہوتی ہے اور حرج بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح جو شخص تیز چلتا ہے اس کو مصافحہ کے لئے مجبور کرنا مناسب نہیں کیونکہ اس میں دوسرے ضروری کام کا حرج ہوتا ہے اس لئے تنگی ہوتی ہے۔ اسی طرح بعض آدمیوں کی عادت ہے کہ مجلس میں پہنچ کر سب آدمیوں سے مصافحہ کرتے ہیں اور اگر وہ لوگ کسی

شغل میں ہوں تو اتنی دیر تک سب بیکار ہو جاتے ہیں اور اس سے تنگی ہوتی ہے۔ اسی طرح اکثر لوگوں کی عادت ہے کہ بعد وعظ واعظ سے ضرور مصافحہ کرتے ہیں۔ سو اول تو یہ بدعت ہے اور پھر تکلیف بھی ہے۔

آداب سفارش

جس بات میں دوسرے کو تکلیف ہو وہ نہ کرنا چاہیے۔ مثلاً اگر قرائن سے معلوم ہو کہ سفارش کرنے سے دوسرے آدمی پر بوجھ ہو گا تو ایسی سفارش نہ کرے۔ بعض دفعہ سفارش پر عمل کرنا اس آدمی کی مصلحت کے خلاف ہوتا ہے اور سفارش کنندہ کے لحاظ اور دل شکنی کی وجہ سے اپنی مصلحتوں کے خلاف پر اس کو مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اور اب سفارش کنندہ تو اس خیال میں مست ہیں کہ ہم نے فلاں کی حاجت روائی کر دی مگر اس کی خبر نہیں کہ بلا وجہ اور ناحق دوسرے آدمی پر بوجھ ڈال کر اس کی مصلحتوں کا خون کیا۔ ایک نیکی کے لیے جو کہ واجب بھی نہ تھی، مفت میں کئی برائیاں ذمہ لیں۔ اکثر لوگ ایک مصلحت تو دیکھ لیتے ہیں کہ ایک آدمی کو نفع پہنچ گیا مگر ان مضرتوں اور کلفتوں کو نہیں دیکھتے جو دوسروں کو پہنچیں۔

حفظت شیئًا وغابت عنك اشياء

اگر سفارش کی ضرورت ہو تو اس میں صاف ظاہر کر دینا چاہیے کہ تمہاری مصلحت کے خلاف نہ ہو تو یہ کام کرو ورنہ خیر تاکہ دوسرے آدمی پر بوجھ نہ پڑے۔

دیکھیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہؓ سے مغیثؓ کی

سفارش کی کہ اُن کو نکاح میں قبول کر لو۔ بریرہؓ چونکہ جانتی تھیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سفارش میں بوجھ نہیں ڈالتے۔ اس لئے انہوں نے پوچھا کہ آپ حکم فرماتے ہیں یا سفارش؟ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ نہیں حکم نہیں دیتا سفارش کرتا ہوں۔ اس پر بریرہؓ کو چونکہ معلوم تھا کہ آپ اس سے ناخوش نہ ہوں گے، انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

تو بس سفارش ایسی ہونی چاہئے کہ دوسرے پر بوجھ نہ پڑے بلکہ صاف کہہ دے کہ اگر خلاف مصلحت نہ ہو تو کرو کچھ زور نہیں ڈالا جاتا ہے کہ صاحب یہ کام آپ کو ضرور کرنا ہوگا۔ افسوس ہم نے سب طریقے اور معاملات اور طرز معاشرت وغیرہ کو بدل دیا ہے۔ کس کس چیز کی اصلاح کی جاوے۔ مثلاً اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل ہے سیدھی۔ ع

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

یہ ایسا وقت ہے کہ ان سب خرابیوں کو دیکھ کر زباں پہ یہ شعر آ جاتا ہے ؎

اے بسرا پردہ یثرب بخواب
خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

آدابِ دعوت

غرض اس بات کا خیال رکھے کہ جو کام کلفت دہ ہو وہ نہ کرے مثلاً دعوت تو کم آدمیوں کی کی اور آ گئے زیادہ۔ یہ مرض بھی کچھ ایسا عام ہو رہا ہے کہ لوگ اکثر شادی بیاہ میں اس کی پروا نہیں کرتے۔ خود اہل خانہ کے ہاں

اتنا سامان بھی نہ ہو۔

ایک ظریف آدمی تھے۔ انہوں نے جو دیکھا کہ شادی بیاہ وغیرہ عام دعوتوں میں ایک ایک دو دو کو ضرور ساتھ لے جاتے ہیں۔ انہوں نے کیا دل لگی کی کہ ایک دفعہ جو دعوت میں گئے تو ایک بچھڑے کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ اور جب کھانا رکھا جانے لگا تو اُنہوں نے بچھڑے کے حصہ کی بھی رکابی رکھوائی۔ لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے اُنہوں نے کہا کہ بھائی اور لوگ اپنی اولاد کو لاتے ہیں میرے کوئی اولاد نہیں۔ میں اس کو عزیز رکھتا ہوں میں اس کو لایا۔ غرض سب شرمندہ ہوئے اور اس رسم کو موقوف کیا گیا۔

حدیث شریف میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دعوت میں ایک آدمی ویسے ہی چلے گئے۔ آپ نے مکان پر پہنچ کر صاحب خانہ سے صاف فرما دیا کہ یہ ایک آدمی ہمارے ساتھ ہو لیا ہے اگر تمہاری اجازت ہو تو آوے ورنہ چلا جاوے۔ صاحب خانہ نے اس کی اجازت دے دی اور وہ شریک ہو گیا۔

رہا یہ شبہ کہ شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لحاظ سے اُس نے اجازت دے دی ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے امور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قدر آزادی دے رکھی تھی کہ جس کا جی چاہتا قبول کرتا تھا اور جس کا جی چاہتا تھا انکار کر دیتا تھا۔ چنانچہ حضرت بریرہؓ کا قصہ آپ نے ابھی سُنا ہے۔ ایک قصہ اس سے بڑھ کر سنیئے۔

مسلم میں ہے کہ ایک دفعہ ایک فارسی شخص نے کہ شوربا عمدہ پکاتا تھا شوربا پکا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی۔ آپ نے فرمایا، بشرطیکہ عائشہ رضؓ کی بھی دعوت کرو تو قبول کرتا ہوں اُس شخص نے عرض کیا کہ نہیں حضرت عائشہ رضؓ کی نہیں۔ اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ہماری بھی نہیں۔ پھر اُس نے اصرار کیا۔ آنحضرتؐ نے پھر یہی فرمایا۔ اُس نے چند بار انکار کیا۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لحاظ کا بوجھ اور دباؤ ہوتا تو وہ انکار کیوں کرتا۔ پھر اپنی خوشی سے اُس نے حضرتؓ عائشہ کی بھی دعوت قبول کی اور آنحضرتؐ نے قبول فرمائی اور یہ جائز ہے کہ دعوت قبول کرنے میں کوئی شرط لگاوے۔

غرض اس قسم کا تکلف اور تکلیف جو آج کل ہم لوگوں میں ہے، اُس زمانہ میں نہیں تھا۔ ہم لوگوں نے اپنی حالت خود بگاڑ رکھی ہے اور مذہب اسلام کو غیر قوموں کی نظروں میں ہلکا بنا دیا ہے۔ وہ ہماری بد حالت کو جو ہم نے خود اپنے افعال سے کر رکھی ہے، دیکھ کر غلطی سے مذہب اسلام کو ناقص سمجھنے لگے ہیں۔ اور دراصل ہم ہی نے اسلام کو بدنام کر رکھا ہے اور جس طرح بعض مواقع مذکورہ میں مصافحہ کے موجب اذیت میں، اسی طرح کھانے وغیرہ کے وقت مصافحہ کرنا بھی سراسر خلافِ تہذیب ہے۔ ہاتھ تو سالن میں سن رہا ہے ان کو مصافحہ کی پڑی ہے۔

بعض ایسی بے تمیزی کرتے ہیں کہ ہاتھ میں قارورہ پیشاب کا ہے بس اُس کو رکھا اور مصافحہ کرنے لگے۔ یہ بالکل نظافت کے خلاف ہے

اگرچہ ہاتھ میں کچھ نہ لگا ہو۔

اصل اس کی حدیث من مس فرجہ فلیتوضا ہے۔ امام شافعی صاحب اس حدیث سے مس فرج کو ناقض وضو قرار دے کر وضو کا حکم فرماتے ہیں مگر ہمارے ائمہ اس کو نظافت پر محمول فرماتے ہیں اور کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ یہ ہاتھ اب قابل نماز کے نہیں۔ استحباباً وضو لغوی یعنی ہاتھ دھونا یا وضو شرعی کر لیا جاوے۔

اقسام دعوت

منجملہ حقوق اسلام ایک حق اجابۃ الداعی بہر دو معنی ہے۔ یعنے ایک معنی یہ کہ مسلمان بھائی کے پکارنے پر جواب دے۔ اس کے بھی آداب ہیں۔ چنانچہ امام یوسفؒ کو امام صاحبؒ نے یہ وصیت فرمائی ہے کہ اگر کوئی تم کو پیچھے سے پکارے تو جواب مت دو۔ کیونکہ اس نے تمہاری اہانت کی ہے۔ اس نے تم کو حیوان چار پاؤں کی طرح پیچھے سے آواز دی ہے۔

کَمَثَلِ الَّذِی یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً

اور یہ جواب نہ دینا تکبر نہیں ہے بلکہ ایک شخص کی اصلاح ہے اور واقع میں پیچھے سے آواز دینا نفنی بے تمیزی کی بات ہے کہ کام تو ہمارا اور دو کیں اس کو۔ یہ خلاف تہذیب ہے۔ خود آگے بڑھ کر سامنے کی طرف سے آکر بولنا چاہیے۔

دوسرے معنی اجابت الداعی کے دعوت قبول کرنے کے ہیں اس

کے بھی آداب ہیں۔ بعض آدمی تکبر کی وجہ سے دعوت غریب کی قبول نہیں
کرتے۔ یہ تکبر مذموم اور قبیح ہے۔

ایک حکایت یاد آئی۔ ایک مولوی صاحب کی دعوت ایک بے
چارے غریب نے کی۔ مولوی صاحب اس کے ساتھ دعوت کھانے جا
رہے تھے۔ رستہ میں ایک رئیس صاحب سے ملاقات ہوئی۔ رئیس
صاحب نے پوچھا مولوی صاحب کہاں تشریف لے چلے۔ مولوی صاحب
نے جواب دیا کہ اس سقے نے دعوت کی ہے اس کے یہاں جا رہا ہوں
رئیس صاحب ملامت کرنے لگے کہ مولوی صاحب آپ نے تو بالکل
ہی بات ڈبو دی اور ایسی ذلت اختیار کی۔ مولوی صاحب نے ایک لطیفہ
کیا۔ اس سقے سے فرمایا کہ بھائی اگر ان کو بھی دعوت میں لے چلو تو چلتا ہوں
ورنہ میں بھی نہیں چلتا۔ اب وہ سقہ امیر صاحب کے گرد ہوا اور منت سماجت
کرنے لگا۔ اول اول تو بہت عذر کئے مگر خوشامد عجیب چیز ہے۔ پھر اور لوگ
بھی جمع ہو گئے اور مجبور کرنے لگے۔ لا محالہ جانا پڑا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ
غریب لوگ جس تعظیم و تکریم اور محبت سے پیش آتے ہیں وہ امیروں و
نوابوں کے یہاں خواب میں بھی نہیں دکھلائی دیئے تو قائل ہو گئے کہ واقعی راحت
عزت اور محبت جو غریبوں سے ملنے میں ہے وہ امیروں سے ملنے میں قیامت
تک نہیں۔ اور حقیقت میں غریبی میں جو پریشانی کی حد تک نہ ہو جس قدر دینی
اور دنیوی راحت ہے وہ ثروت میں نہیں اور فضیلت الگ حدیث میں
ہے کہ آنحضرتؐ دعا فرماتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّ اَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ۔

پس مال کی اتنی ضرورت ہے کہ فاقہ نہ ہو اور پریشانی نہ ہو۔ غرض یہ کہ غریب لوگ اگر دعوت کریں تو صاحب ثروت کو جاہ و تکبر کی راہ سے انکار نہیں چاہیے۔ باقی یہ کہ ہر جگہ کی دعوت بلا امتیاز اخلاق عدم اخلاق قبول کرے۔ گو زیادہ تحقیق و تفتیش اور کھود کرید کی ضرورت نہیں مگر تاہم جن لوگوں کے ہاں بظن غالب اکثر آمدنی حرام ہے اُن کی دعوت قبول کرنا جائز نہیں۔ جیسا آج کل موروثی زمینوں کی کثرت ہے۔ اسی طرح رشوت کی سو ایسے لوگوں کے ہاں دعوت قبول نہ کرے۔ ہاں اگر غالب مالِ حلال ہو تو جائز ہے۔ لیکن اگر زجر کے لئے نہ کھاوے تو زیادہ بہتر ہے۔

اسی طرح اگر مجمع معصیت میں دعوت ہو قبول نہ کرے اور اگر اُس کے جانے کے بعد فعل معصیت شروع ہے۔ مثلاً راگ باجا جو اکثر شادیوں میں ہوتا ہے تو اگر خاص اس جگہ ہے جہاں پر یہ بیٹھا ہوا ہے تو چھوڑ کر چلا آوے اور اگر فاصلہ سے ہے تو اگر یہ شخص مقتدائے دین ہے تب بھی اس کو وہاں سے اٹھ آنا چاہیے اور اگر مقتدائے دین نہیں تو خیر کھانا کھا کر چلا آوے۔

اسی طرح جو رسوم خلاف شریعت اکثر شادیوں میں ہوا کرتی ہیں ان ہی سے وہ مجمع مجمعِ معصیت ہو جاتا ہے وہاں نہ بیٹھے۔ اور رسوم تو الگ ہیں خود آج کل برات ہی مجمع معصیت ہے اگر کوئی اور خرابی نہ ہو

تو یہ خرابی تو ضرور ہی براتوں میں ہوتی ہے کہ براتی مقدارِ دعوت سے زائد جاتے ہیں۔ جس سے بے چارے میزبان کو سخت دقت کا سامنا ہوتا ہے کہیں قرض لیتا ہے کہیں اور کچھ فکر کرتا ہے۔ غرض بہت خرابی ہوتی ہے۔ پھر ایسے شخص کی نسبت حدیث شریف میں یہ الفاظ ہیں کہ دخل سارقا وخرج مغیرًا۔ ایسی ہی شادی غمی کے موقع پر جو اکثر لوگ تفاخر کے طور پر دعوت کرتے ہیں اُن کی دعوت بھی قبول نہ کرنا چاہیئے۔ اسی طرح جو دعوت دین اور طاعت کا عوض ہو وہ بھی درست اور جائز نہیں جیسے تیجہ وغیرہ میں قرآن اور کلمہ درود پڑھ کر اس کے عوض دعوت اور الائچی دانہ اور چنے وغیرہ ملتے ہیں ؎

زیاں می کنند مرد تفسیر داں　　　که علم و عمل می فروشد بناں

اسی طرح وعظ کی خاص دعوت یا اُجرت بھی ایسی ہی ہے جس کے دل میں کچھ بھی دین کی غیرت اور عزت ہو گی وہ خود ایسی باتوں سے پرہیز کرے گا۔ البتہ واعظ اگر مسافر ہو اور مسافرت کے طور پر کھا لیوے تو یہ اور بات ہے مگر پھر بھی جہاں پر وعظ ہو اُس جگہ سے نہ کھاوے ایسا ہی مرید ہونے کے موقع پر پیر کی دعوت کرنا کیونکہ یہ بالکل صورت مبادلہ کی ہے۔

آداب ہدیہ

اسی طرح نذر ہدیہ وقتِ بیعت اور علاوہ اس کے کہ یہ ہدیہ بیعت کے وقت کا مبادلہ کی صورت ہے اس میں کئی اور بھی خرابیاں ہیں۔ مثلاً

بعض نادار غربا جو بیعت ہونا چاہتے ہیں وہ بوجہ شرم کے رک جاویں گے اسی طرح ذلت کی دعوت بھی قبول نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ ذلت سے بچنا شریعت میں محمود ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ

لا ینبغی للمومن ان یذل نفسہ

ذلت کی دعوت آج کل زیادہ تر ایک ہے یعنی جو کہ مُردوں کے ایصال ثواب کے لیئے دعوت کی جاتی ہے اور طالب علموں اور ملاؤں وغیرہ کو بلایا جاتا ہے۔ بس یہ دعوت ہے کہ اس کے کھانے والے عام لوگوں میں حقیر سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ کانپور میں ایک دفعہ ایک دعوت میں جاتے ہوئے طالب علموں کی نسبت سُنا کہ خدا خیر کرے کس کے گھر چڑھائی ہوئی ہے اور اس قسم کی دعوت طعام ذلت ہے اس سے بچنا چاہیئے۔

علامہ شامی نے لکھا ہے کہ اہل علم کو اُس دعوت سے بچنا چاہیئے جس میں ذلت ہو۔ وجہ یہ کہ اہل علم کی ذلت خود علم کی ذلت ہے۔ قبول کرنے کے لائق صرف وہ دعوت ہے جو محض محبت سے ہو، حلال کھانا ہو نہ اس میں رسم کی پابندی ہو نہ تفاخر اور نہ ریا ہو نہ ذلت ہو بلکہ اس کی بنا محض محبت ہی محبت ہو۔ ایسی ہی ہدیہ میں بھی ہونا چاہیئے۔ بس اس قسم کی دعوت اور ہدیہ مسنون ہے اس کا قبول کرنا سنت ہے کیونکہ صرف محبت سے ہے۔ تہادوا تحابوا حدیث شریف ہے۔ باقی رسم کے طور پر جو کچھ دیا جاتا ہے مثلاً شادی کے جوڑے وغیرہ اس میں محبت

کا نام بھی نہیں۔ ہاں اگر محض محبت سے بلا قید و پابندی رسوم ہو تو جائز ہے بلکہ ایسا ہدیہ کھانے سے دل میں نور پیدا ہوتا ہے۔

آداب عیادت

منجملہ اُن حقوق کے جو ایک مسلمان کے دوسرے پر ہیں ایک عیادت یعنی بیمار پرسی ہے اس کے بھی آداب ہیں۔ ان میں بھی افراط و تفریط ہو رہی ہے۔ چنانچہ بعض آدمی تو سرے سے بیمار کو پوچھنے ہی نہیں جاتے یہ تفریط ہے۔ اور بعض جو پوچھنے جاتے ہیں تو بجائے اس کے کہ بیمار کو اُن سے راحت ہوتی یہ اور الٹے موجب تکلیف بنتے ہیں مثلاً وہاں جا کر زیادہ دیر تک بیٹھا رہے۔ یہ تکلیف کی بات ہے۔ بیمار آدمی کو مختلف حوائج اور ضروریات ہوتے ہیں اور وہ بے چارہ اُن کا لحاظ کرتا اور تکلیف اٹھاتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے مَنْ عَادَ مِنْکُمْ مَرِیْضًا فَلْیُخَفِّفْ جُلُوْسَہٗ۔

البتہ تیمارداری اور چیز ہے اس میں بیمار کے پاس ہر وقت بیٹھنا خدمت کے لئے ہے۔ خدمت ہر کسی پر ضروری نہیں۔ مگر دفع اذیت اور راحت سب پر ضروری ہے۔ بعض آدمیوں کی عادت ہے کہ بیمار آدمی کے پاس بیٹھ کر فضول قصے ہانکا کرتے ہیں یا خود اُس بیمار ہی سے بیماری کا سارا قصہ پوچھتے ہیں۔ ایسی باتوں سے بیمار کو تکلیف ہوتی ہے ان سے بچنا چاہیئے۔ ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد

آداب تعزیت

ایک ان حقوق میں سے تعزیت و شرکت جنازہ ہے۔ اس کے بھی آداب ہیں مثلاً کندھا دینا، قبر میں اتارنا، کچھ پڑھ کر ثواب بخشنا مگر شریعت کے موافق اُس کو نفع پہنچے ورنہ بے کار ہے۔ مثلاً بعض لوگ ایصال ثواب کے لئے میت کے تمام پارچات پوشیدنی دیتے ہیں اور تمام ورثاء سے اجازت نہیں لیتے یا ورثاء نابالغ ہوتے ہیں، جن کی اجازت قبل از بلوغ معتبر نہیں۔ سو یہ تصرف میت کے ترکہ میں جو کہ سب ورثاء میں مشترک ہے ناجائز ہے۔ ہاں بعد تقسیم ترکہ جس کا جی چاہے اپنے حصہ میں سے دے سکتا ہے۔ اور ایسے کپڑے وغیرہ اشیائے استعمالی اکثر مساجد اور مدارس میں آتے ہیں۔ لہذا مدرسہ اور مسجد والوں کے ذمہ ضروری ہے کہ امور مذکورہ کی تحقیق کر لیا کریں۔ وعظ ختم ہوا ــــــ!

خلاصۂ وعظ

تمام وعظ کا خلاصہ یہ ہوا کہ معاشرت باہمی میں اس کا خیال رہے کہ مردہ اور زندہ سب کو راحت اور نفع پہنچے اور کسی کو مضرت اور تکلیف نہ ہو اور ان امور میں سلیقہ صحبت اہل اللہ سے حاصل ہوتا ہے مگر بعضے لوگ خود بزرگوں کے ہاں جانے میں ایسی بے احتیاطی کرتے ہیں کہ ان کو تکلیف ہوتی ہے۔

مثلاً جانے کے وقت اپنی فرصت کا تو لحاظ رکھتے ہیں مگر یہ نہیں

سوچتے کہ آیا یہ وقت اُن کی فرصت کا بھی ہے یا نہیں۔ چاہے وہ وقت اُن کے آرام کا ہو مگر اُن کو اُسی وقت جا کر تکلیف دی جاتی ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اتنی دیر بیٹھتے ہیں کہ اُن کے آرام کا سارا وقت ختم ہو جاتا ہے ان جانے والے بزرگ کا تو کوئی نقصان نہ ہوا، مگر اگلے آدمی کو جو اذیت پہنچی وہ کس مد میں ہے۔ سو یہ نہایت بے تمیزی اور حماقت ہے۔ اگر اتفاق سے ایسے وقت جانا ہو تو نہایت اختصار کرنا چاہیے تھوڑا بیٹھے

ایک شخص حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس عین دوپہر کے وقت آتے تھے اور حضرت کی نیند ضائع ہوتی مگر حضرت اپنی خوش اخلاقی سے کچھ نہ فرماتے۔ ایک روز حضرت حافظ ضامن صاحب شہید علیہ الرحمۃ کو تاب نہ رہی اور اس شخص کو سختی سے ڈانٹا اور کہا کہ بیچارے درویش رات کو جاگتے ہیں دوپہر کا وقت تھوڑا سا سونے کا ہوتا ہے، وہ تم خراب کرتے ہو۔ یہ کس قدر بے انصافی ہے آخر کچھ لحاظ چاہیے۔

حضرت حافظ صاحب کی یہ تیزی بضرورت تھی۔ بعض اوقات اصلاح اخلاق بجز سیاست اور سختی کے نہیں ہوتی۔ اور کسی کے پاس جانے میں ایک اس کا خیال رکھے کہ اطلاع کر کے جاوے اور عام بیٹھک میں اگرچہ بلا اطلاع جانا جائز ہے اور لا تدخلوا بیوتا ——— الخ سے مستثنیٰ ہے مگر خاص خلوت کے وقتوں میں وہاں بھی نہ جانا چاہیے شاید تکلیف ہو یا گرانی ہو۔

حاصل یہ کہ ہر وقت ہر حالت میں اس کا خیال بہت رکھے کہ کسی

کو اپنے سے تکلیف اور گرانی نہ ہو۔

الصّلاح والاِصلاح

HINDUSTANI LIBRARY.
Estd. 19[illegible]
ہندستانی لائبریری
Garden Reach, Calcutta.

ضرورت تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے متعلق یہ وعظ مورخہ
۳۰ رجب سنہ ۱۳۴۱ھ یوم جمعہ بعد مغرب دلدار خاں صاحب
کے مکان اشرف منزل کرنیل گنج کانپور میں بیٹھ کر فرمایا۔ جو
۳ گھنٹہ میں ختم ہوا۔ ۲۰۰۰ کی حاضری تھی۔ اسے مولوی احمد عبدالحلیم
صاحب نے قلمبند فرمایا

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالی علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ امابعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ وَمَا ھٰذِہِ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا اِلَّا لَھْوٌ وَّلَعِبٌ ط وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ ط لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ۔ (یعنے نہیں ہے دنیا کی زندگی مگر لہو ولعب یعنی فضول وبیکار اور بلا شک دار آخرت ہی حیات ہے یعنی زندگی تو واقع میں آخرت ہی کی زندگی ہے۔ اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔)

ہندوستانی لائبریری
گارڈن ریچ روڈ۔ مٹیابرج۔ کلکتہ

رحمتِ حق

ہر چند کہ یہ مضمون جو ان آیات میں مذکور ہے کسی خاص وقت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر وقت میں اس کی ضرورت ہے مگر اس وقت ایک خاص محرک اس کے بیان کا پایا گیا ہے اس لئے اس وقت اس کو اختیار کیا گیا ہے۔

وہ محرک یہ ہے کہ اس وقت ایک دار (یعنی مکان) کی بناء مکمل ہوئی ہے اور اس آیت میں جو مضمون ہے وہ بھی ایک دار ہی کے متعلق ہے اور اس پر تنبیہ کی اس لئے ضرورت ہوئی کہ تنبیہ ہمیشہ ایسے ہی امور پر کی جاتی ہے جن پر حاجت ہوتی ہے اور حاجت کا مدار حالت پر ہوتا ہے یعنی جیسی حالت ہو گی ویسی ہی حاجت ہو گی اور حالت مشاہدہ پر معلوم ہو سکتی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہماری وہ حالت کیا ہے جس کی اصلاح اور

علاج پر تنبیہ کی ضرورت ہے۔ سو وہ حالت یہ ہے کہ ہم کو غیر معمولی امور میں اشتغال غالب ہے اور اس حالت کا نہایت مضر ہونا ظاہر ہے کیونکہ جب غیر ضروری امور میں اشتغال ہوگا تو لازم ہے کہ ضروری امور میں لاپرواہی ہوگی اور ضروری امور میں لاپرواہی کا انجام بجز خسارہ کے اور کیا ہوگا۔ اس آیت میں ہم کو یہی تعلیم کی گئی ہے کہ ضروری امور کی طرف رغبت کرو اور غیر ضروری امور سے زیادہ دل نہ لگاؤ۔

سبحان اللہ حق تعالیٰ کی ہم پر کیا رحمت ورافت ہے کہ اُن کو ہر وقت ہماری اصلاح کی طرف توجہ ہے۔ چنانچہ ان آیات میں ہمارے اس مرض کا اور ساتھ ہی ساتھ اس کے علاج کا ذکر کیا گیا ہے اور سبحان اللہ! یہ کیسی رحمت ہے کہ صرف غیر ضروری امور پر تنبیہ فرما کر محض اُن کے بچنے ہی کا امر نہیں فرما دیا بلکہ وہ امور بھی بتا دیئے ہیں جن کے اختیار کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ کسی چیز سے بچانا ایک تو یہ ہے کہ مخاطب کو اُس کی ضد کی طرف متوجہ کر دیا جاوے۔ اور ایک یہ ہے کہ اس فعل کی صرف بُرائی بیان کر دی جاوے۔

مثلاً ایک طبیب کسی بد پرہیزی کرنے والے کو جو سنکھیا کھاتا ہے یا افیون کھاتا ہے یہ بتا دے کہ یہ اشیا نہ کھایا کرو اور یہ نہ بتائے کہ پھر اُس کے چھوڑنے کے بعد یہ مریض کیا کھاوے تو تعلیم ناقص ہے کامل طبیب وہ ہے جو سنکھیا و افیون سے ممانعت کر کے کوئی ایسی شے بتلادے جس میں ضرر تو کچھ نہ ہو اور افیون و سنکھیا کے منافع موجود ہوں

چنانچہ یہاں حق تعالیٰ کی یہ رحمت نمایاں ہے کہ اُس بدپرہیزی کی مضرت بتانے کے ساتھ وہ ضروری چیز بھی بتلادی جسے اختیار کرنا چاہیئے۔ کیونکہ مصلح کا فرض ہے کہ مضر پر توجہ دلا کر اس کے بعد نافع پر بھی تنبیہ کر دے۔ اس واسطے کہ انسان کا ذہن کبھی خالی نہیں رہا کرتا وہ کوئی نہ کوئی مشغلہ اپنے واسطے ضرور تلاش کر لیتا ہے اور وہ مشغلہ نافع ہوتا ہے یا مضر، یا نہ نافع ہوتا ہے نہ مضر بلکہ عبث ہوتا ہے۔ اس واسطے کہ عبث اُس کو کہتے ہیں جو نہ نافع ہو نہ مضر یعنی لغو اور مالا یعنی (بے فائدہ) تو اگر اصلاح میں صرف اسی پر اکتفا کیا جاوے کہ یہ کام نہ کرو یا نہ کھاؤ۔ اور نافع پر تنبیہ نہ کی جاوے یعنی یہ نہ بتایا جاوے کہ پھر کیا کرو اور کیا کھاؤ تو اس صورت میں بھی ممکن ہے کہ مخاطب اسی طبعی عادت کے سبب اس مضر چیز کے ترک کے ساتھ کسی لغو میں مبتلا ہو جاوے۔ پھر اس حالت کا انجام یہ ہوگا کہ پہلے تو وہ عبث و مالایعنی میں مبتلا ہوگا اور تجربہ کی بناء پر پھر شدہ شدہ کسی مضر میں مبتلا ہو جائے گا اس لئے کہ اِبْتِلَاءٌ بِمَا لَا يَعْنِي (یعنی فضولیات میں مبتلا ہونا) کا اکثر انجام اِبْتِلَاءٌ بِمَا يَضُرُّهُ (مبتلا ہونا ایسے امور میں جو اس کو ضرر رساں ہیں)، ہی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مالایعنی شدہ شدہ امر مضر تک پہنچا دیتا ہے۔

اسی واسطے رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ (یعنے لایعنی امور کا ترک کر دینا آدمی کے حسنِ اسلام سے ہے)، اور لایعنی کے معنی ابھی مذکور ہوئے ہیں کہ

عبث ولغو کو لایعنی کہتے ہیں یعنی جو چیز نہ نافع ہو نہ مضر وہ لایعنی ہے۔ اسی کے ترک کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حسن اسلام فرمایا ہے اور یہ نہیں فرمایا مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَا یَضُرُّہٗ کہ مضر کا ترک کر دینا حسن اسلام سے ہے حالانکہ مضر کا ترک کر دینا یقیناً حسن اسلام ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے مایضرہ کے مالایعنی فرما کر یہ بتلا دیا کہ جو عبث ہے وہ واقع میں مضر ہی ہے۔ تو گویا ترک نافع کی دو صورتیں ہوئیں۔ ایک ارتکاب مضر اور ایک خلو عن الشغل المفید (شغل مفید سے خالی ہونا)

فطرتِ نفس

یہ دوسری قسم اپنے مآل کے اعتبار سے پہلی ہی قسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فقط مضر کا ترک کر دینا کافی نہیں ہے بلکہ نافع میں مشغول ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ مشغلہ ہی ایک ایسی چیز ہے جو دوسرے مشغلہ سے روک سکتا ہے۔ ورنہ بغیر مشغلہ کے مضر سے رکا رہنا ناپائیدار ہو گا۔ کیونکہ چند روز تک تو نفس صبر کرتا ہے۔ اس کے بعد پھر کسی نہ کسی مشغلہ کی طرف متوجہ کر دیتا ہے اور وہ اکثر مضر ہی ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ تم نفس کو مشغول کر لو قبل اس کے کہ وہ تم کو مشغول کر لے۔ یعنی اگر تم نے نفس کو کسی کام میں نہ لگایا، تو وہ خود تمہارے لئے کوئی دھندا نکال لے گا۔ وہ دھندا کیا ہے؟ اولاً

وساوس وخطرات پھر ثانیاً معاصی ومنکرات اور نفس کی یہ اُدھیڑ بُن اُسی وقت تک ہوتی ہے جب تک وہ کچھ نہیں کرتا ورنہ کام میں لگ جانے کے بعد خطرات نہیں آتے۔

دیکھئے ایک کارڈ لکھتے وقت کیا حال ہوتا ہے۔ اُس وقت تک ایک بھی خطرہ نہیں آوے گا تو اس کا راز کیا ہے۔ راز یہ ہے کہ نفس کسی وقت بیکار نہیں رہنے پاتا۔ اگر اس کے لئے کوئی مشغلہ نہ تجویز کیا جاوے تو وہ خود اپنے لئے کوئی شغل تجویز کر لیتا ہے۔ پس کارڈ لکھنے وقت چونکہ اپنے نفس کو ایک شغل میں لگا دیا ہے اس لئے کسی اور چیز کی طرف اُس کو توجہ نہیں ہوتی۔ اور نماز وغیرہ میں جو وساوس آتے ہیں تو اکثر اُس کا سبب یہی ہے کہ ہم لوگ نفس کو شغل صلوٰۃ میں نہیں لگاتے ورنہ وساوس ہرگز نہ آئیں یا بہت کم آئیں۔

غرض جب یہ نفس بدون کسی شغل کے چھوڑا جاتا ہے تو یہ خود اپنا کوئی مشغلہ تجویز کر لیتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ نفس جو مشغلہ اپنے لئے خود تجویز کرے گا وہ شر ہی ہو گا کیونکہ نفس کا اصلی میلان شر ہی کی جانب ہے۔ دلیل اس کی قرآن مجید کی آیت ہے۔

وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَّحِيمٌ۔

اور میں اپنے نفس کو بری اور پاک نہیں بتلاتا کیونکہ نفس (ہر ایک کا) بُری بات بتلاتا ہے بجز اُس (نفس) کے جس پر میرا

پروردگار رحم کرے۔ بلاشبہ میرا رب بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا ہے۔)

اس میں حضرت یوسف علی نبینا و علیہ السلام کے قول کی حکایت ہے دیکھئے انہوں نے یوں نہیں فرمایا کہ

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ وَاَمَّارَۃٌ بِالْخَیْرِ ـــــــ

(بلاشبہ نفس ہی برائی کا حکم کرنے والا ہے اور نیکی کا حکم کرنے والا ہے)

یعنی نفس کی دو قسمیں نہیں بتائیں ایک امارہ بالسوء اور ایک امارہ بالخیر بلکہ یہ بتایا کہ نفس کی ایک ہی قسم ہے کہ وہ امارہ بالسوء ہے یعنے نفس ہمیشہ برائی ہی کا حکم کرنے والا ہے۔ مگر جب خدا تعالیٰ رحم فرمائیں یعنے جب خدا کی رحمت متوجہ ہوتی ہے تو اُس وقت اس عارض قوی کی وجہ سے نفس برائی کا حکم نہیں کرتا۔ اور جب یہ رحمت متوجہ نہیں ہوتی تو پھر بدستور اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے یعنی برائی کا امر کرنے لگتا ہے بہرحال استثناد سے نفس کی کوئی جداگانہ قسم بتانا مقصود نہیں ہے بلکہ امر بالسّوء کے اوقات میں سے ایک وقت کو مستثنیٰ کرنا مقصود ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ فِیْ کُلِّ وَقْتٍ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ وَمَا مَصْدَرِیَّۃٌ اَیْ وَقْتَ رَحْمَتِہٖ تَعَالٰی عَلَیْھَا۔

(بلاشبہ نفس بری بات کا حکم کرنے والا ہر وقت ہے مگر اللہ

تعالیٰ کے اس پر رحم کرنے کے وقت میں۔ یہاں ما مصدریہ ہے)

شاید کسی کے ذہن میں یہاں پر یہ سوال پیدا ہو کہ اگر اس مضمون کو یوں تعبیر کرتے کہ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالْخَيْرِ اِلَّا مَا اُمِرَ بِالسُّوْءِ (بلاشبہ نفس نیکی کا حکم کرنے والا ہے) تو کیا حرج تھا۔

جواب یہ ہے کہ اس صورت میں یہ معنیٰ نہ پیدا ہوتے جواب ہوئے کیونکہ محاورہ یہ ہے کہ مغلوب حالت کو غالب حالت سے استثناء کیا کرتے ہیں۔ مثلاً اگر زیادہ جماعت نے کھانا کھا لیا تو یوں کہتے ہیں کہ سب لوگوں نے کھانا کھا لیا، مگر زید و عمر نے۔ اس جملہ سے یہ سمجھا گیا کہ جماعت کثیر کھانا کھا چکی اور قلیل یعنے دو شخص باقی رہ گئے۔ اور اگر اسی کو یوں تعبیر کریں کہ فلاں فلاں نے کھانا نہیں کھایا مگر سب نے۔ تو محاورہ کے اعتبار سے یہ صحیح نہ ہوگا کیونکہ مستثنیٰ مغلوب نہ تھا بلکہ مستثنیٰ منہ پر غالب تھا۔ تو معلوم ہو گیا کہ غالب حالت سے مغلوب حالت کو استثناء کیا جاتا ہے اگر کھانے والے زیادہ ہیں تو انہیں مستثنیٰ منہ بنائیں گے اور اگر نہ کھانے والے زیادہ ہیں تو انہیں مستثنیٰ منہ بنائیں گے۔ بہرحال غالب حالت کا اعتبار استثناء میں ضروری ہے۔

جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب سمجھئے کہ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ برائی کا حکم کرنے والا ہے، یہاں پر مستثنیٰ منہ ہے اور اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ مستثنیٰ ہے اس لئے بقاعدہ مذکورہ غالب حالت یعنی امر بالسوء کو مستثنیٰ منہ اور مغلوب یعنی عدم امر بالسوء کو مستثنیٰ بنانا چاہیئے۔ سو قرآن میں ایسا ہی ہے۔ کیونکہ

غالب صفت نفس کی امارہ بالسوء ہی ہے۔

واقعی قرآن کے سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ زبان کا ذوق بھی ہو اور عادات و محاورات میں بھی کامل دخل ہو۔ محض علوم عقلیہ سے قرآن حل نہیں ہوسکتا بلکہ عرف و عادات کو حکم بنا کر تب قرآن کو دیکھنا چاہیے، ورنہ غلطی ہو جانے کا قوی احتمال بلکہ یقین ہے کیونکہ قرآن کا نزول عرف و محاورات کی رعایت کے ساتھ ہوا ہے۔

بہرحال نفس کی حالت غالبہ امر بالسوء ہے اس لیے جب اس کو کام میں نہ لگایا جاوے گا تو یہ اپنے لئے خود مشغلہ تجویز کرلے گا اور جو مشغلہ یہ خود اپنے لئے تجویز کرے گا چونکہ اس میں غلبہ ہے شر کا اس لئے وہ اکثر برا ہی ہوگا اور مضر ہی کو تجویز کرے گا۔

اسی واسطے مالایعنی کے ترک کو جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم نے حسن اسلام فرمایا کیونکہ مضر کو تو ہر شخص مضر سمجھتا ہی ہے خفا صرف لایعنی میں ہے۔ پس مقصود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہے کہ مضر کے چھوڑنے کے بعد لایعنی سے بھی بچے۔ اور وہ تجربہ سے موقوف ہے اس پر کہ مالایعنی میں نفس کو لگا دے۔ پس اس ترک کے لئے یہ فعل بھی لازم ہے۔

بہرحال نفس کا میلان الی الشر (برائی کی طرف مائل ہونا) تو قرآن سے ثابت ہے اور یہ تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ نفس جب خالی ہوگا تو معصیت ہی تجویز کرے گا اور جب یہ بیکار ہوگا تو کسی نہ کسی بلا ہی میں مبتلا ہوگا۔ تو ان دونوں مقدموں سے اس کی ضرورت ثابت ہوگئی

کہ ترکِ مضر کے بعد اشتغال بالنافع ضروری ہے۔ سو قرآن مجید کی تعلیم کا یہی حاصل ہے۔

تحفظِ نفس

اب سوال یہ رہ گیا کہ نفس کو کسی خیر میں ہر وقت کیسے مشغول رکھا جا سکتا ہے جو وہ اس بلا لایعنی یا مضر سے بچے۔ اور وہ کون سا دھندا ہے جس میں ہر وقت لگایا جا سکے۔ کیونکہ جتنے دھندے ہیں اُن میں ہر کام موقت ہے مثلاً کھانا پینا، سونا اور نماز اور دوسری عبادات سب موقت ہی ہیں جو کام بھی ہے وہ خاص وقت میں ہے۔ تمام اوقات کو کوئی شغل محیط نہیں اور نفس کو بچانے کے لئے ضرورت ہے شغل غیر موقت کی جو ہر دم ہو سکے کیونکہ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں ذرا بھی خالی ہوا اور بیہودگی میں مبتلا ہوا تو وہ کام کونسا ہے جو ہر وقت کیا جا سکے۔

صاحب! شریعت میں ایک ایسا شغل بھی ہے اور وہ بہت ہی سہل کام ہے اور بحمد اللہ قرآن میں اُسے بھی بتلا دیا گیا ہے۔ وہ کیا ہے؟ وہ ذکر ہے۔ سو نماز، روزہ، حج سب کو تو موقت بتلایا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں تو توقیت صلوٰۃ کی تصریح ہے خَمْسُ صَلَوَاتٍ (پانچ نمازیں) اور قرآن میں گو تصریح نہیں مگر اشارہ ہے اور روزہ کو تو قرآن ہی میں موقت کر دیا گیا ہے اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ (گنتی کے چند دن) اور اسی طرح حج میں بھی اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ (چند معلوم مہینے) فرمایا گیا مگر ذکر کو کہیں موقت نہیں کیا گیا۔ نہ قرآن میں اور نہ حدیث میں بلکہ ارشاد ہے اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا (اپنے رب کا بہت

ہی ذکر کرو) اور ارشاد ہے وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ (اپنے رب کے نام کو یاد کرو)

اگر کوئی کہے کہ ذکر بھی تو موقت ہے۔ دیکھئے قرآن مجید میں اس کا بھی وقت بتایا گیا ہے چنانچہ اُذْکُرُوا اللّٰہَ (اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو) کے بعد ارشاد ہے سَبِّحُوْہُ بُکْرَۃً وَّ اَصِیْلاً۔ یعنے صبح وشام تسبیح کرو۔

جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض بھی محاورہ نہ جاننے ہی سے پیدا ہوا۔ محاورہ یہ ہے کہ جب ایک جنس کی دو نوعوں کو جمع کیا جاتا ہے تو مراد اُس سے احاطہ واستیعاب اُس جنس کا ہوتا ہے مثلاً یہ کہیں کہ میں نے تلخ وشیریں چکھا ہے اور ابتدا وانتہا دیکھی ہے اور چھوٹا بڑا مجھے جانتا ہے وغیرہ وغیرہ تو اس سے بالبداہتہ استیعاب ہی مراد ہوتا ہے اسی طرح یہاں صبح وشام سے بھی یہی مراد ہے کہ رات دن برابر ذکر کرو یعنے کوئی وقت بھی ذکر سے خالی نہ ہو تو بُکْرَۃً وَّ اَصِیْلاً کے معنی فِیْ کُلِّ وَقْتٍ (ہر وقت میں) ہوئے۔

اب یہ بات رہ گئی کہ ہر وقت کیسے ذکر ہو۔ تو ہر وقت ذکر ہونے کی صورت یہ ہے کہ محل ذکر میں تعمیم لی جاوے یعنی خواہ قلب سے ہو خواہ زبان سے ہو۔ سو تعمیم محل کے بعد دوام ممکن ہو گیا اور پھر اگر کوئی کہے کہ قلب سے ذکر کے کیا معنی اور کیا اس کا شریعت میں کچھ ثبوت ہے تو میں کہتا ہوں کہ حدیث نے اس اشکال کو بھی صاف کر دیا ہے کیوں کہ حدیث شریف میں ہے کہ

براہ کرم ورق نہ موڑیں

كَانَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ اللّٰهَ فِي كُلِّ اَحْيَانِهٖ

کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہر وقت ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے اور کُلِّ اَحْیَانِہٖ (ہر وقت) میں اوقات بول و براز و قضائے حاجات بھی شامل ہیں اور ظاہر ہے کہ بول و براز کے موقع پر زبان سے ذکر و تلاوت مکروہ ہے۔ پس کل احیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم ایسے احوال اور ایسے مواقع میں قلب سے ذکر کیا کرتے تھے

دوسرے یہ کہ اُذْكُرُوا اللّٰهَ (اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو) میں یا وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ (اپنے رب کے نام کی یاد کرو) میں حق تعالیٰ نے ذکر کو کسی قید کے ساتھ مقید نہیں کیا ہے خواہ لسان ہو یا اور کچھ۔ نیز ذکر باعتبار لغت کے عام بھی ہے۔ ذکر قلبی و ذکر لسانی دونوں کو۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ذکر کے اصل معنی ذکر قلبی ہی کے ہیں اور جہاں کہیں ذکر لسانی مراد ہے، وہاں قرائن سے اس پر محمول کیا گیا ہے۔ کیونکہ ذکر کے معنی ہیں یاد اب دیکھ لیجئے کہ یاد کس کا شغل ہے زبان کا یا قلب کا۔ پس اب ذکر قلبی کے لئے تو ثبوت کی ضرورت نہ رہی۔ البتہ ذکر کا لسانی ہونا محتاج دلیل ہو گیا۔

میں نے یہ مضمون خصوصیت سے اس لئے بیان کر دیا کہ بعض خشک لوگوں کو ذکر قلبی میں کلام ہے۔ بہر حال یہ ہے وہ کام جو ہر وقت کے کرنے کا ہے۔ اگر زبان تھک جائے تو قلب سے ذکر کرو اور اگر زبان سے بھی برکت حاصل کرنا ہو تو زبان سے بھی کرو۔ بس اُن کی یاد

ہونی چاہیئے۔ پھر خواہ الفاظ کے واسطے سے ہو خواہ مذکور کے تصور سے مقصود تو یہ ہے کہ غفلت نہ ہو جو طریق تمہیں سہل معلوم ہو، اُس طریق سے کرو۔

اقسامِ ذکر

ذکر کے متعلق بعض اہلِ علم کو ایک اور شبہ ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ انہوں نے وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ (اپنے رب کے نام کو یاد کرو) میں لفظ اسم کو زائد کہا ہے۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو زائد ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس کی سہل توجیہ یہ ہے کہ ذاکر دو قسم کے ہیں ایک مبتدی اور ایک منتہی۔ تو اسمِ ربک میں مبتدی کی حالت کا اعتبار کیا گیا ہے کیونکہ مبتدی کی اور حالت ہے اور منتہی کی اور اس لیے یوں کیوں نہ کہا جاوے کہ مبتدی کے لیئے وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ ہے اور منتہی کے لیئے وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا ہے کیونکہ مبتدی کے لیئے یہی ذکر کا درجہ بہت ہے کہ محبوب کا نام اُس کی زبان پر آجاوے یا قلب میں یہ نام آجائے۔ ذکر لفظی کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک ذکر لفظی زبان سے ایک قلب سے۔ ایک ذاکر منطوق ہے اور ایک متصور، منطوق تو ظاہر ہے متصور مثال سے سمجھ لیجئے۔

مثلاً اگر کوئی شخص اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو ہر ہر عالم کے مربی ہیں) کے معنی نہ جانتا ہو اور وہ اُس کے ایک ایک لفظ کا دل میں خیال کرے اور زبان سے نہ ادا کرے، تو یہ

محض الفاظ کا تصور ہوگا اور معنی سے اسے کچھ بھی علاقہ نہ ہوگا کیونکہ وہ معنی ہی نہیں جانتا۔ اس درجہ کو حدیث النفس اور کلام قلب کہتے ہیں۔ شاعر اسی کو کہتا ہے ؎

اِنَّ الْکَلَامَ لَفِی الْفُؤَادِ وَاِنَّمَا
جُعِلَ اللِّسَانُ عَلَی الْفُؤَادِ دَلِیْلًا

(کلام قلب میں ہوتا ہے اور زبان کو اس پر دلیل رہنما بنا دیا گیا ہے۔)

سو الفاظ متخیلہ کا درجہ بھی کلام لفظی ہی کا درجہ ہے کیونکہ ان میں ترکیب و تعاقب سب کچھ ہوتا ہے۔ بہر حال ذکر ہونا چاہیے۔ اب ذکر کی اقسام چند ہو گئیں۔ ایک لسانی ایک قلبی اور ذکر قلبی کی خود دو قسمیں ہیں۔ ایک ذکر قلبی لفظی، ایک ذکر قلبی نفسی اور ان اقسام میں سے ذکر لسانی بھی غیر موقت نہیں بلکہ بعض احوال کے لحاظ سے وہ بھی موقت ہے کیونکہ نیند کے غلبہ میں اور بول و براز و جماع و مواقع قاذورات میں زبان سے ذکر کرنے کی ممانعت ہے البتہ ذکر قلبی کی کسی حال میں بھی ممانعت نہیں ہر وقت اجازت ہے یہ بے شک محیط کل اور ہر جہت سے غیر موقت ہے۔ پس ذکر قلبی ہی اپنے دونوں قسموں کے ساتھ ایک ایسا مشغلہ ہے جو ہر وقت ہو سکتا ہے یہاں تک کہ سونے کے وقت بھی ہو سکتا ہے گو سونے کے بعد نہ ہو۔ سو اس حالت میں انسان مکلف ہی نہیں۔ اس لئے اس کے متعلق سوال ہی نہیں ہو سکتا۔ کھاتے وقت بھی ہو سکتا ہے بلکہ بعض وقت یہ ذکر لسانی سے بڑھا

ہوا ہے۔ مثلاً جہاں ریا کا شبہ ہو۔ ایک شخص ہے کہ زبان سے تو ذکر کرتا ہے مگر قلب متوجہ نہیں ہوتا تو اس کے لیئے یہ بہتر ہے کہ قلب سے ذکر کرے اور زبان سے نہ کرے تو ایسے شخص کے اعتبار سے محض ذکر قلبی ہی افضل ہے۔

مگر مہربانی کرکے اس مسئلہ کو نماز کی قرأت میں متعدی نہ کر لیجیئے۔ کیونکہ نماز کی قرأت و تکبیرات و تسبیح و تشہد وغیرہ اگر کوئی شخص قلب میں پڑھ لے اور زبان سے ادا نہ کرے تو نماز نہ ہوگی ہاں گونگا البتہ معذور ہے اُس کی نماز محض تصوّر ہی سے ہو جاوے گی۔

تین چار سال کی بات ہے کہ ایک بزرگ (صورۃً بزرگ، نہ معنیً) قنوج میں تشریف لائے تھے۔ بیچارے نرے جاہل۔ جو لوگ اُن کے پاس مرید ہونے آتے، اوّل تعلیم اُن کی یہ ہوتی تھی کہ نماز میں قرأت دل ہی دل میں پڑھا کرو اور یہ بھی ہدایت کر دیتے تھے کہ یہ بات کسی پر ظاہر مت کرنا۔ چنانچہ بہت سے لوگ اُن کے بہکانے میں آ گئے۔

میں کہتا ہوں کہ اس سے تو وہ نماز نہ پڑھتے تو بہتر ہوتا کیونکہ اپنے کو بے نمازی سمجھتے اور شاید کبھی قضا کر لیتے اور اب تو بیچاروں نے محنت بھی کی اور پھر نماز نہ ہوئی اور نہ قضا کی طرف التفات۔ بڑی مدّت کے بعد کسی ترکیب سے بعضے لوگوں کو اس کا پتہ لگا تو اُن کی غلطی پر عام لوگوں کو متنبہ کیا گیا۔ اور اُن کو وہاں سے نکالا گیا۔ اسی لیئے طریق باطن میں بہت ضرورت ہے شریعت کی ورنہ ممکن ہے کسی کو کوئی یہ رائے دے دے

کہ جب ذکر قلبی افضل ہے، ذکر لسانی سے تو پھر نماز کو بھی دل میں کیوں نہ پڑھ لیا کریں۔ یاد رکھو اس طرح نماز نہ ہوگی۔

غرض ذکر قلبی کی فضیلت سے وہ مواقع مستثنےٰ ہیں جہاں احکامِ دینیہ مثلاً نماز وغیرہ یا احکام دنیویہ مثلاً طلاق، نکاح، عتاق وغیرہ کا تعلق ہے کہ یہ امور ذکر قلب سے صحیح نہیں ہو سکتے۔ مثلاً دل ہی دل میں نکاح کر لے تو نکاح نہیں ہوگا۔ ایسے ہی دل ہی دل میں طلاق دے تو طلاق بھی نہ پڑیگی اور مراد اس سے وہ صورت نہیں کہ چپکے چپکے زبان پر طلاق آگیا اور اس سے زبان کو حرکت بھی ہوئی گو کسی نے نہ سنا ہو۔ اس صورت میں تو طلاق پڑ جاوے گی کیونکہ یہ تو تلفظ باللسان ہی ہے گو بالجہر نہ سہی۔ باقی اگر فقط دل میں طلاق کو سوچ لیا، زبان بالکل نہیں ہلی تو اس سے طلاق نہیں پڑیگی۔ کیونکہ یہ عقود تکلم باللسان کے ساتھ متعلق ہیں۔ پس اس کی استثناء کے بعد جو اور امور رہ گئے ہیں جن میں تکلم شرط نہیں ہے اُن کے متعلق یہ قاعدہ عام ہے کہ وہاں ذکر قلب بھی معتبر ہے بلکہ بعض کے لئے اور بعض جہات سے یہ افضل ہے اور سب سے افضل یہ ہے کہ ذکرِ قلب اور ذکر لسانی دونوں کو جمع کیا جائے۔

درجاتِ ذکر

اس اعتبار سے ذکر کے تین درجے ہوئے۔ ایک تو وہ جس میں صرف زبان کو حرکت دی جائے اور قلب متوجہ نہ ہو۔ یہ درجہ سب سے کم ہے۔ دوسرا درجہ وہ جس میں زبان کو حرکت نہ دی جائے صرف قلب سے

ذکر کیا جائے۔ یہ پہلے درجہ سے بڑھ کر ہے۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ زبان کو بھی حرکت دی جائے اور قلب کو بھی متوجہ کیا جائے۔ یہ سب سے بڑھ کر اور افضل ہے۔

لیکن میں یہ پھر کہتا ہوں کہ بعض حالتوں میں دوسرا درجہ تیسرے درجہ سے بھی افضل ہو جاتا ہے یعنی کسی وقت وہ ذکر جو محض قلب سے ہو افضل ہوتا ہے اُس ذکر سے جو قلب و زبان، دونوں سے ہو۔ وہ کیسے؟ وہ اس طرح جیسے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے جن کے ہم غلام ہیں اور جن کے ارشاد ہی سے سیدھا راستہ نظر آتا ہے۔ سو یہ مسئلہ خود حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے بتلا دیا ہے جیسا عنقریب آتا ہے اور مسئلہ بتلانے کے ساتھ خود حضور ہی نے اس کی حکمت بھی بتا دی ہے۔ گو حکمت، یا علت کا بتانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض منصبی نہ تھا۔ آپؐ کا منصب صرف حکم کا بتلانا ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تبرع و احسان ہے کہ کہیں کہیں حکمت بھی نمونہ کے طور پر بتا دیتے ہیں جیسے کوئی آقا اپنے نوکر کو کوئی کام بتا دے اور نوکر کا تحیر دیکھ کر اس تجویز کی حکمت بھی بتا دے تو گو یہ آقا کا فرض نہ تھا کہ وہ حکمتیں بتا دے کیونکہ نوکر کو حکمت سے کیا واسطہ۔ اس کے ذمہ تو تعمیل حکم ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر وہ نوکر کس بات کا ہے۔ مگر یہ اس کا تبرع و احسان ہے کہ کسی کام کی اُسے حکمت بھی بتا دے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ بھی بیان حکمت لازم نہیں۔ اس لئے جہاں کہیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حکمت بتائی ہے وہ بطور نمونہ کے

ہے جس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ ہمارے احکام میں حکمتیں ضرور ہیں۔ چنانچہ دیکھو بعض بعض نمونہ کے طور پر تم کو بتا دی گئی ہیں مگر سب حکمتیں تم کو نہیں بتلائی گئیں۔ پس جہاں کوئی حکمت شرعی تمہیں نہیں معلوم ہوئی، وہاں بھی سمجھ لو کہ حکمت ضرور ہے۔ چنانچہ جن احکام کی حکمتیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے نہیں بتلائیں اُن کو اہل اللہ نے بڑی مقدار میں حل کر دیا ہے۔

غرض احکام کا دارومدار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر رہا ہے چاہے حکمت معلوم ہو یا نہ ہو۔ بہرحال سرسری نظر میں یہ ایک نیا دعوٰی ہے کہ ذکر قلب بعض اوقات مطلوبیت اور افضلیت میں مجموعہ ذکر لسانی وقلبی سے بھی بڑھ کر ہے۔ مگر اس کا مدلول نص ہونا ابھی ظاہر ہوا جاتا ہے۔ سنیئے حدیث شریف میں ہے۔

اِذَا غَلَبَ اَحَدَکُمُ النُّعَاسُ وَھُوَ یَذْکُرُ اللّٰہَ فَلْیَرْقُدْ (اَوْ کَمَا قَالَ)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس وقت تک نیند نہ آوے اس وقت تک تو نفلیں تسبیح اور ذکر وغیرہ سب کچھ کرو۔ اور جب نیند کا غلبہ ہونے لگے تو سو رہو۔ فَلْیَرْقُدْ (تو سو رہو) امر کا صیغہ ہے، جو وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس حالت میں ذکر لسانی بند کر دینا ضروری ہے۔ آگے اس کی حکمت بیان فرماتے ہیں۔

لَعَلَّہٗ یَسْتَغْفِرُ فَیَسُبُّ نَفْسَہٗ

وہ ذکر اللہ کرتا ہے اُس وقت تو ہٹ جاتا ہے اور جب
خالی رہتا ہے تو وسوسے ڈالتا ہے۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ اگر نفس کو مشغول نہ کرو گے تو یہ خود مشغلہ تجویز
کرے گا۔ اور اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ نماز کا تو کوئی رکن بھی ذکر سے خالی نہیں
قرأت، تسبیح، تکبیر، تشہد، غرض سب ذکر ہی ذکر ہے مگر باوجود اس کثرت کے
ساتھ اُس کے مشتمل علی المذکر (ذکر کو مشتمل) ہونے کے سب سے زیادہ
وسوسے نماز ہی میں پیدا ہوتے ہیں۔ تو ہم یہ کیسے مان لیں کہ جب کسی کام
میں مشغول ہوں تو وسوسہ نہیں آتا۔ اس مادہ جزئیہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ
یہ قاعدہ صحیح نہیں کہ

"جب نفس کو کسی کام میں مشغول نہ کرو گے تب ہی وہ کسی کام
میں لگ جاوے گا"

بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ کم بخت تو کام کے اندر بھی اپنا کام چلاتا
رہتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ذکر کہتے ہیں یاد کو خواہ وہ تنہا قلب سے
ہو خواہ زبان بھی اس میں شریک ہو مگر محض زبان سے نہ ہو۔ اگر محض زبان
سے یاد ہے تو وہ واقع میں ذکر نہیں بلکہ وہ تو صورت ذکر ہے۔ اب شبہ
جاتا رہا کیونکہ دیکھ لیجئے کہ جہاں اور جس شخص کو وساوس آتے ہیں وہاں
واقع میں ذکر کا وجود نہیں بلکہ محض ذکر کی صورت ہی صورت ہوتی ہے۔
قلب اُس کی طرف مشغول نہیں ہوتا۔ چنانچہ جس نماز میں وساوس آتے ہیں

اُس میں قلب نماز میں پورا مشغول نہیں ہوتا ورنہ اَلنَّفْسُ لَا تَتَوَجَّهُ إِلٰى شَيْئَيْنِ فِي آنٍ وَاحِدٍ (ایک آن میں نفس دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا) کے قاعدہ سے پوری مشغولی کے ساتھ وساوس آ نہیں سکتے۔

اب اس پر ایک اور شبہ رہا۔ وہ یہ کہ جب قلب متوجہ نہیں ہوتا تو پھر ادا کیسے ہوتا ہے کیونکہ فعل اختیاری تو بدون ارادۂ قلب کے ہو ہی نہیں سکتا اور ارادہ کے لئے توجہ لازم ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہ کلیہ صحیح ہے مگر اس کے معنی یہ ہیں کہ جب بالکل توجہ نہ ہو تو فعل نہیں ہو سکتا لیکن یہ ممکن ہے کہ شروع توجہ سے کیا ہو مگر استمرار میں توجہ نہ رہی ہو۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جیسے دو آدمی ساتھ ساتھ چلیں اور باتیں کرتے ہوئے راستہ طے کریں۔ تو باتیں کرتے وقت توجہ فقط باتوں کی طرف رہے گی چلنے کی طرف نہ رہے گی مگر مشی پھر بھی واقع ہوتی ہے۔ جیسے گھڑی کی کوک کہ ابتداء میں حرکت چابی کو دینی پڑتی ہے پھر اُس کی رفتار کے استمرار و بقاء کے لئے کوکنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اسی طرح مشی ممتد کے ساتھ قصد متجدد کی ضرورت نہیں۔ وہی پہلا قصد کافی ہے اور وہی ساری مشی میں موثر ہے۔ یا جیسے ہارمونیم باجہ کہ جب ایک دفعہ کوئی اُسے بجانے بیٹھ گیا تو ہر قرعہ پر جدید قصد کی ضرورت نہیں بلکہ ابتداءً ایک دفعہ قصد کر لیا اور بجانا شروع کر دیا، اس کے بعد خود بخود ہاتھ وہیں پڑتا ہے جہاں ضرورت ہوتی ہے۔ اب وہ ارادہ تو کیا کرتا اُسے بعض دفعہ ایسی محویت ہو جاتی ہے کہ ہاتھ چلنے کی بھی خبر نہیں

ہوتی اور جیسے قاری ہے کہ قرأت میں اگر ہر ہر لفظ پر نیا قصد کرے، تو اس کا لہجہ بے تکلف اور بے ساختہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بارہا تجربہ ہوا ہوگا کہ جب کسی نے بنا کر پڑھا وہیں اس کا لہجہ بگڑ گیا بلکہ بے ساختہ اور بے ارادہ پڑھنے سے نہایت اچھا پڑھا جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی فعل اختیاری کی جب، عادت اور مشق ہو جائے تو پھر ابتداء کے لئے تو قصد کی ضرورت ہوتی ہے، استمرار کے لئے قصد متجدد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چنانچہ ان تمام مثالوں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ فعل اختیاری کے صدور کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہر ہر آن میں اس پر توجہ ہو۔ بس ابتداء کے لئے توجہ ضروری ہے۔

پس اب نماز اور وساوس کے جمع ہونے میں کوئی اشکال نہیں رہا کیونکہ ابتدائی توجہ سے نماز شروع ہو گئی اور وہ ہو رہی ہے اور درمیان میں وساوس کی طرف توجہ مبذول ہو گئی اس لئے وساوس بھی آ رہے ہیں کیونکہ توجہ نماز کے ہر جزو کے ساتھ متعلق نہیں ہے۔ وہاں تو تکبیر تحریمہ سے السلام علیکم ورحمۃ اللہ تک کسی توجہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاتھ پاؤں اس کام کے لئے اس قدر منجھے ہوئے ہیں کہ جب موقع رکوع کا آتا ہے خود رکوع کر لیتے ہیں اور سجدہ کا وقت ہوتا ہے خود ہی سجدہ کر لیتے ہیں۔ پس یہ شبہ حل ہو گیا کہ نماز جس میں سب سے زیادہ ذکر ہے یہ کیوں مانع نہیں ہوتی وساوس کو

حاصل جواب کا یہ ہوا کہ یہ مانع کیسے ہو۔ وہاں تو یاد اور توجہ ہی نہیں ورنہ یہ ممکن نہیں کہ توجہ کامل ہو اور پھر وساوس آ دیں۔ جب چاہو آزما لو۔

صاحب تم ذرا ایک خط لکھنے بیٹھو اور پھر دیکھو کیسے وساوس آتے ہیں۔ میں نے بعض دفعہ ایسا کیا ہے کہ قرآن پڑھنے بیٹھا ہوں اور یہ چاہا کہ پڑھنے میں خط بھی لکھ لوں تو نہیں ہو سکا۔ شاید الحمد اور قل ہو اللہ کی دوسری بات ہو کیونکہ وہ تو خوب یاد ہے۔ وہاں شاید توجہ کی ضرورت نہ ہو۔ باقی اور جگہ یا تو پڑھنے میں اٹکے گا یا لکھنے میں بھٹکے گا۔ اب تمام شبہات دور ہو کر وہ دعوے اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ نفس بے شغل بھی نہیں رہ سکتا اور دو شغل میں بھی نہیں لگ سکتا۔ اس لئے فقط مضر سے بچنا کافی نہیں ہے بلکہ نافع میں مشغول ہونے کی ضرورت ہے۔

حق تعالیٰ نے ان دو جملوں میں بھی رعایت کی ہے کہ پہلے تو یہ مرض بیان فرمایا کہ انسان غیر ضروری امور میں مشغول ہے اور غیر ضروری امور کی سب سے بڑی فرد یہ ہے کہ دنیا میں اس کو انہماک ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اس کی مذمت بیان فرما دی اور اس کے بعد امر ضروری یعنی آخرت کا ذکر کر دیا کہ ذکر آخرت میں مشغول ہونا چاہیئے تاکہ اس انہماک کا ازالہ ہو سو غیر ضروری کے ترک کرانے کی دو صورتیں تھیں ایک تو یہ کہ اس کی مذمت کر دی جاوے اور اس سے ہٹایا جاوے۔ مگر ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ اس سے نفع نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مشغلہ ضروری بتانا بھی ضروری ہے۔ ورنہ یہ شخص اس غیر ضروری کو چھوڑ کے دوسرے غیر ضروری میں مبتلا ہو گا۔

چند غلط فہمیاں

دوسری صورت یہ ہے کہ غیر ضروری سے ہٹایا جاوے اور ضروری

کی طرف متوجہ کیا جاوے یہی دوسرا طریقہ جو اسلم و احسن ہے یہاں اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ

کہ نہیں ہے حیوٰۃ دنیا مگر لہو و لعب یعنی فضول و بیکار ہے۔ دیکھئے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا کہ حیات دنیا کی مذمت کر دیں۔ آگے فرماتے ہیں۔

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ

اور بے شک دار آخرت ہی حیات ہے۔ یعنی زندگی تو واقع میں آخرت ہی کی زندگی ہے۔ دنیا کی کیا زندگی۔ یہ تو اس کے سامنے بالکل ہیچ ہے۔ تو مذمت دنیا کے بعد آخرت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ اس اسلوب ہی سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ یہ مرض ایسا ہے جس کا مریض دائم المرض ہے جس کو آج کل کے جاہلانہ محاورہ میں دائم المریض کہتے ہیں۔

آج کل یہ بھی ایک فیشن ہو گیا ہے کہ جس لفظ پر دیکھو الف لام داخل کر دیتے ہیں۔ چنانچہ قریب المرگ ہے۔ ایک مولوی صاحب فرمایا کرتے ہیں کہ اب تک تو الف لام چار ہی قسم کا تھا یعنے استغراقی، جنسی، عہد ذہنی، عہد خارجی۔ مگر آج کل ایک پانچویں قسم الف لام نیچریت کی ایجاد ہوئی ہے یعنی فیشن کے لوگ کتاب کا نام بھی رکھیں گے تو الف لام ضرور داخل کریں گے مثلاً ــــ المامون ــــ الفاروق ــــ اگر لفظ مامون و فاروق نام رکھ دیتے تو کیا حرج تھا۔ ایسے ہی الجزائر، الجراد، غرض ہر چیز میں الف

عالم - ایسے ہی قریب المرگ، دائم المریض کا الف لام کہ اس کے کوئی معنی ہی نہیں - اور الف لام سے قطع نظر کر کے دائم المریض کی تو ترکیب ہی سمجھ میں نہیں آتی - ہمیشہ کے بیمار کو دائم المرض کہہ سکتے ہیں نہ کہ دائم المریض - اگر مریض ہی کا لفظ لانا ضروری تھا تو دائمی مریض کہہ لیتے - البتہ دائم المریض کے معنی یہ تو ہو سکتے ہیں کہ جس کے پاس ہمیشہ مریض رہیں جس طرح دائم المرض کے معنی یہ ہیں کہ جس کو ہمیشہ مرض رہے - پس اس معنی کہ دائم المریض حکیم یا ڈاکٹر کو کہہ سکتے ہیں نہ کہ مریض کو۔

بہر حال جو دائم المرض ہوگا اس کو دوا بھی دائمی ہی دی جاوے گی تو جب یہ مرض حب دنیا ہمیشہ کا ہے تو ہمیشہ اس کی دوا استعمال کرتے رہنا چاہیے - یہاں تک کہ اگر اتفاق سے بزرگ بھی ہو جائیں تو اس وقت بھی اس مرض سے اور اس کے علاج سے بے فکر نہ ہونا چاہیے - کیونکہ اپنے نزدیک بزرگ بن جانے سے واقع میں بزرگ نہیں ہو سکتا مگر اب تو یہ حالت ہے کہ جہاں ذرا بھی کوئی درجہ مقصود کا حاصل ہو گیا مثلاً معصیت سے نفرت ہو گئی یا نفل میں دل لگنے لگا یا وساوس و خطرات بند ہو گئے تو بس گمان ہو گیا کہ اب میں کامل ہو گیا ہوں - پھر کیا تھا سب مجاہدے اور ریاضت چھوڑ بیٹھا - اسی لئے ضرورت ہے ہر وقت شیخ کی ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را

عیسےٰ نتواں گشت بہ تصدیق خرے چند

(کسی صاحب نظر کو اپنا جوہر دکھاؤ - چند احمقوں کی تصدیق سے عیسیٰ

علیہ السلام جیسے انہیں ہوئے۔)

یعنی کسی کامل سے تشخیص کراؤ کہ یہ حالت کمال کی ہے یا نہیں ورنہ وہ حالت ہو گی جیسے دق والے کو اگر ایک دن بخار نہیں آیا تو وہ یہ سمجھے کہ میں اچھا ہو گیا اور علاج چھوڑ بیٹھے۔ یاد رکھو! مرض کا نکس (یعنی لوٹنا) بدا سے (یعنی شروع ہونے سے) بھی اشد ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری بے احتیاطی سے مرض پھر لوٹے اور علاج مشکل ہو جائے۔ تو جس طرح بعض مریض ظاہری ذرا بخار نہ آنے کو صحت سمجھ لیتا ہے اسی طرح بعض اہل طریق بھی جہاں تھوڑی سی سنسناہٹ بدن میں پیدا ہوئی اور سمجھ گئے کہ بس ہم کامل ہو گئے۔ پھر تسبیح بھی چھوٹ گئی اور مجاہدہ بھی گیا اور یہ گمان ہو گیا کہ بس اب تو ہم منتہی ہو گئے ہیں۔ اب کسی ریاضت کی حاجت نہیں رہی اور ہم اُس کے مصداق ہو گئے۔ خلوت و چلہ برو لازم نماند۔ حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ابھی تم تو جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے بلکہ اُس سے بھی بدتر ہو گئے۔ کیونکہ جیسے ابتدائے مرض سے عود مرض سخت ہوتا ہے اسی طرح تمہاری یہ حالت اشد ہے۔ پہلی محجوبی کی حالت سے جس پر یہ حالت پیش آئے وہ خود غور کر کے دیکھ لے کہ اس وقت بہ نسبت پہلے کے طبیعت کی کیا کیفیت ہے۔

حالت یہ ہوتی ہے کہ طاعت سے دل گھبرانے لگتا ہے۔ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے سے وحشت سی ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ سے اباء و اعراض و انکار پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ حالت یہاں تک ترقی کرتی ہے

کہ اس کے بعد شدہ شدہ حق تعالیٰ سے عداوت پیدا ہو جاتی ہے۔ خدا کو اپنے سے اور اپنے کو خدا سے ناخوش پاتا ہے۔ بس یہ سرحد ہے کفر کی (نعوذ باللہ منہ)

حضرت سلطان نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب فوائد الفوائد میں لکھا ہے کہ حجابات کے سات درجے ہیں۔ ان میں ایک درجہ عداوت ہے۔ اوّلاً طبعی اور عداوت طبعی کے بعد پھر آخری درجہ کفر ہے اختیاری اور ادنیٰ درجہ حجاب کا معمولات کا اختلال ہے کہ خدا کے ساتھ جو برتاؤ اور تعلق چلا آرہا ہے اس میں کمی کر دے۔ یہ ادنیٰ حجاب ہے اور اسی سے بڑھتے بڑھتے حجابات کثیرہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اس ادنیٰ سے بھی بچنا چاہیئے۔

اسی واسطے حدیث میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

يَا عَبْدَ اللّٰهِ لَا تَكُنْ مِثْلَ فُلَانٍ كَانَ يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ ثُمَّ تَرَكَهَا۔

کہ اے عبداللہ! ایسے مت ہو جانا جیسے فلاں شخص تھے کہ اوّل تہجد کی نماز پڑھتا تھا پھر چھوڑ دی۔

باقی یہ سمجھنا کہ مجھے کمال حاصل ہو گیا یہ تو صاف اعجاب اور کبر کا شعبہ ہے۔ صاحب تھوڑی سی سنسناہٹ پیدا ہو جانے سے کمال حاصل نہیں ہو جاتا۔ اسے کسی شیخ کی تشخیص پر چھوڑ دو۔ اپنی رائے سے کچھ مت سمجھو سہ

(اپنے نفس کو ضبط کرو اُن لوگوں کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ کو
صبح و شام پکارتے ہیں)

یعنی اپنے نفس کو ضبط کر کے اور گھونٹ کر بیٹھے۔ یہاں حق تعالیٰ نے صبر کا لفظ ارشاد فرمایا ہے اور صبر کے معنی ہیں حَبْسُ النَّفْسِ عَلٰی مَا تَکْرَھُہٗ یعنے نفس کو ایسی بات کا پابند کرنا جو اُس کو ناگوار ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجمع سے گھبراتے تھے مگر لوگوں کی مصلحت کے لئے مجبوراً بیٹھتے تھے۔ صاحبو! ہمیں تو دوستوں میں بیٹھ کر حظ آتا ہے مگر اہل اللہ کو پریشانی ہوتی ہے کیونکہ اُن کی نظر تو اور ہی طرف ہے جس کو جامی فرماتے ہیں ؎

خوشا وقتے و خرم روزگارے
کہ یارے برخورد از وصل یارے

(کیا اچھا وقت اور کیا اچھا زمانہ ہے کہ محب اپنے محبوب
کے وصال سے متمتع ہو۔)

اور اُن کی یہ شان ہوتی ہے ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم
گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ اُن کو محبوب کے چہرۂ
انور کو نہ دیکھنے دوں اور کانوں کو بھی اُس کی باتیں نہ سننے دوں)

اُن کو تو خود اپنا نفس بھی حجاب معلوم ہوتا ہے تو دوست تو کیوں نہ موجب

پریشانی ہوں گے۔ لوگ اُن کو تعظیم وتکریم کی شان میں دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ بڑے چین میں ہیں مگر کوئی انہیں کے دل سے پوچھے کہ اُن پر کیا گزرتی ہے

اے نزا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست
حال شیر انے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

(تمہارے پاؤں میں کانٹا بھی نہیں لگا ہے۔ تم ان لوگوں کی حالت کو کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلوار چل رہی ہے۔)

کسی کو کیا خبر ہے کہ وہ کس طرح ان مصائب کو یعنی مخلوق کی مجالست و مخالطت کو برداشت کرتے ہیں۔

در نیابد حال پختہ ہیچ خام
پس سخن کوتاہ باید والسلام

(کامل کی باتیں ناقص کی سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔ سلامتی اسی میں ہے کہ کلام کو کوتاہ کریں۔)

غرض اُن کو اپنے اوپر قیاس مت کرو کہ جس طرح تمہیں دوستوں میں بیٹھ کر حظ آتا ہے اسی طرح انہیں بھی آتا ہوگا۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(پاک لوگوں کو اپنے اوپر قیاس مت کرو۔ اگرچہ سے شیر (درندہ) شیر (معنی دودھ) لکھنے میں ایک ہی طرح ہیں مگر معنوں میں زمین آسمان کا فرق ہے)

انہیں بے حد انقباض ہوتا ہے دوستوں سے۔ اور وہ اس سے اس قدر پریشان ہوتے ہیں کہ آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ مگر باوجود اس کے

وہ ظاہر ہیں سب سے بول بھی رہے ہیں اور ہنس بھی رہے ہیں۔ اس پریشانی اور ضحک کے اجتماع پر ایک قصہ یاد آیا۔

لکھا ہے کہ حضرت عیسے علیہ السلام ہنستے بہت تھے اور حضرت یحیےٰ علیہ السلام روتے بہت تھے۔ ایک بار دونوں میں مناظرہ ہوا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے آپ رحمت سے مایوس ہو گئے ہیں جو اس قدر روتے ہیں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ شاید آپ عذاب سے بے خوف ہو گئے ہیں جو اس قدر ہنستے ہیں۔ حق تعالےٰ کی طرف سے ایک فرشتہ فیصلہ کے لیے آیا اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اے یحییٰ آپ خلوت میں تو ایسے رہیئے جیسے اس وقت ہیں اور جلوت میں ایسے رہیئے جیسے عیسیٰ ہیں۔ اور اے عیسیٰ آپ جلوت میں تو ایسے ہی رہیئے جیسے اس وقت ہیں اور خلوت میں ایسے رہیئے جیسے یحییٰ۔ آپ کو خلوت میں ہنسنے کی کیا ضرورت ہے یہ تو نڈر اور بے خوف کا کام ہے اور اے یحییٰ اگر آپ جلوت میں بھی ایسے ہی روتے رہیں گے، تو میرے بندے نا امید ہو جائیں گے۔

تو وہ اس لئے ہنستے ہیں تاکہ مخلوق نا امید نہ ہو جائے۔ اُن کی ہنسی لوگوں کی مصلحت کے لئے ہوتی ہے کہ انہیں نفع پہنچے اور تاکہ وہ دل شکستہ نہ ہوں تو صاحبو! اُن کی عبادت اس قسم کی ہوتی ہے کہ لوگ اُسے لذت اور حظ نفس سمجھتے ہیں حالانکہ حقیقت میں وہ مجاہدات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم نے تبسم سے زیادہ ضحک کبھی نہیں فرمایا

اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کے دل پر چوٹ لگی ہوتی ہے اور غم کا اثر ہوتا ہے وہ جب بھی ہنسے گا کوشش اور قصد سے ہنسے گا اور قصد کی ہنسی قابو میں ہوتی ہے۔ اس لیے آپ کی ہنسی تبسم سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ شب و روز دیکھ لو اگر کسی کو ذرا رنج ہوتا ہے تو یہ حالت ہوتی ہے کہ جہاں کسی نے اس سے ہنسی کی بات کی فوراً غصہ آجاتا ہے لیکن اگر رنج کا سبب قابل اخفا ہوتا ہے تو اس کو اس خیال سے ہنسی کی صورت بنانی پڑتی ہے کہ اگر نہ ہنسوں گا تو راز کھل جائے گا۔ اس لیے زبردستی منہ چڑانا پڑتا ہے غرض بڑی مصیبت سے ہنسی آتی ہے۔

بس یہی حال اہل فکر کا ہوتا ہے اور ایک ہم بے فکرے ہیں کہ ذرا سے اشارے میں محلہ کو سر پر اٹھا لیتے ہیں معمولی سی ہنسی کی بات پر لوٹ جاتے ہیں اور ایک حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ہنسنا ہے کہ فقط تبسم فرماتے تھے اور وہ بھی امت کی مصلحت کے لیے۔ اور آپ ہنستے بھی کیسے آپ تو امت کے لیے طَوِیْلُ الْاَحْزَانِ دَائِمُ الْفِکْرِ (بہت ہی غمگین دائم الفکر) رہتے تھے، جو ہر وقت فکر میں ہوگا اسے کیونکہ ہنسی آئے گی ؎

چوں چنیں کارے ست اندر راہ ترا
خواب چوں می آید اے ابلہ ترا

(جب تجھ کو طریق میں ایسا بڑا کام درپیش ہے تو اے بیوقوف تجھ کو نیند کیوں کر آتی ہے۔)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ ان

کے سامنے جماعت بے فکروں کی نکلی۔ ہنستے ہوئے جا رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ تم کو پلصراط پر چڑھنا تو معلوم ہے اور اترنے کی خبر نہیں پھر کیسے ہنسی آتی ہے (مطلب یہ تھا کہ بفحوائے اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا۔ ہر شخص کو جہنم کے اوپر سے گزرنا ضرور ہے اور یہ خبر نہیں کہ پھر پار ہوں گے یا دو چار ہوں گے۔ اس حالت میں تمہارا ہنسنا حیرت انگیز ہے۔ واقعی خوب کہا ہے) ایسی بے ساختہ ہنسی تو اسی کو آتی ہے جس کے قلب میں بے فکری ہو۔

غرض ہمیں ہر وقت اپنی حالت کو سوچتے رہنا چاہیے اور کبھی اپنے متعلق کمال کا گمان نہ ہونا چاہیے جس سے عبادت میں کمی کر دی جاوے اور بالفرض اگر کمال کو حاصل بھی فرض کر لیا جائے تب بھی بے فکری کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر خلوت و چلہ لازم نہیں رہا تو عبادت سے تو خالی نہیں رہنا چاہیئے۔ بلکہ اس درجہ پر پہنچ کر تو عبادت زیادہ دقیق و لطیف ہو جاتی ہے جس کی رعایت میں خاص اہتمام کی حاجت ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ عبادت کا ترک ہر وقت مضر ہے اور کمال کا اعتقاد بھی مضر ہے کہ یہ عبادات ترک کرا دیتا ہے۔ اسی واسطے یہ مضمون یعنی فکر اصلاح و تکمیل دین ہر وقت کی ضرورت کا ہے۔

ہر چند کہ اس کا بیان ضرورت کی قدر بھی کافی تھا کیونکہ سب کے نزدیک مسلّم ہے زیادہ تطویل کی ضرورت نہ تھی۔ مگر اس کے متعلق زیادہ بیان کرنے کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ جس مکان میں اس وقت بیان

ہو رہا ہے۔ اس وقت اس کی تکمیل ہو چکی ہے اور اس کے مالک کا سکونت کے لئے اس میں آ جانے کا ارادہ ہے۔ اور یہ حالت مظنہ تھا اس کے ساتھ زیادہ قلب کے شغل کا جو ایک قسم کا انہماک ہے دار دنیا کے ساتھ۔ اس لئے ضرورت تھی کہ اس انہماک کی مذمت اور شغل آخرت کی ضرورت کا کسی قدر خاص اہتمام سے بیان کیا جاوے۔ یہ وجہ ہو گئی کسی قدر تطویل کی۔

تعمیر و آرائش مکان

بہر حال اس آیت میں دار دنیا اور دار آخرت کے ساتھ جو معاملہ کیا جاوے اس کا ذکر ہے جس کے عموم میں خاص مکان بھی آ گیا۔ اور ایک اور ایک آیت میں خاص مکان یعنی مساکن کا معاملہ بھی ذکر فرمایا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی مساکن کے ساتھ اتنا محظوظ ہونا کہ آخرت سے غافل کر دے نیز مذموم ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۔

یعنی فرما دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور کنبے والے اور وہ مال جس کو تم نے محنت سے حاصل کیا ہے اور وہ تجارت جس کے گھاٹے کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے اور وہ گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو زیادہ محبوب ہیں

تمہارے نزدیک خدا اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اُس کے راستہ میں جہاد کرنے سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنے حکم کو لاوے۔

یہ محل وعید میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں یہ سب چیزیں جو مذکور ہوئی ہیں خدا سے اور اُس کے احکام سے زیادہ محبوب ہیں تو حکم ثانی کا انتظار کرو۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی کتنی رحمت ہے کہ محض حبِ مساکن پر وعید نہیں ہے اور نہ رضا بالمساکن پر وعید ہے یعنی مکان کو پسند کرنے پر بھی وعید نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اچھا اور پسندیدہ مکان بنانے کی اجازت ہے۔ اب وعید کاہے پر صرف اَحَبَّ اِلَیْکُمْ پر کہ وہ خدا سے زیادہ محبوب ہوں تب محل وعید ہیں۔ اس میں بھی مطلق محبوب ہونے پر وعید نہیں تو مکان کا مرضی پر ہونا محل وعید ہے نہ محبوب ہونا بلکہ اَحَبَّ مِنَ اللّٰہِ ہونا (اللہ تعالےٰ سے زیادہ محبوب ہونا) محل وعید ہے۔

اب اگر کوئی شخص بقدر ضرورت مکان بنوالے جس میں اسراف و تفاخر نہ ہو تو کوئی حرج نہیں اور یہ ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے کہ اُس کو کتنا مکان ضروری ہے کیونکہ لوگوں کے درجات مختلف ہیں اور انہیں درجات کے لحاظ سے ضروریات بھی مختلف ہیں۔ کسی کو ایک حجرہ آسائش و راحت کے لئے کافی ہو جاتا ہے اور کسی کو ایک بڑا مکان بھی مشکل سے کافی ہوتا ہے بہر حال عمدہ، پختہ اور بڑا مکان بنانا شرعاً مَاذُوْنٌ فِیْہِ (اس میں اجازت

دی گئی ہے۔ چنانچہ اس کے عدم جواز کا کسی کا بھی مذہب نہیں ہے ایک شخص کو زیادہ سردی لگتی ہے وہ لحاف اوڑھتا ہے اور ایک شخص کا جاڑا ہلکی رضائی میں چلا جاتا ہے۔ دونوں کا اسراف الگ الگ ہے۔ بہرحال ہر شخص اپنی ضرورت کو خود ہی سمجھ سکتا ہے۔ ہاں ضرورت سے آگے ایک درجہ آرائش کا ہے وہ بھی جائز ہے بشرطیکہ اس میں اسراف اور حدود شرعیہ سے تجاوز نہ ہو اور نہ قصد فخر و عجب کا اختلاط ہو کیونکہ یہ درجہ نمائش کا ہے جو ناجائز ہے۔

اسراف کی تفصیل

اسراف کے معنی یہ ہیں کہ منہی عنہ کا ارتکاب نہ ہو اور جو خرچ بھی ہو وہ معصیت میں خرچ نہ ہو۔ اس میں بھی تھوڑی سی تفصیل ہے۔ بعض دفعہ ایک ہی شے ایک شخص کے اعتبار سے اسراف ہو سکتی ہے اور دوسرے شخص کے اعتبار سے اسراف نہیں ہوتی

مثلاً ایک شخص کو دس روپے گز کا کپڑا پہننے کی وسعت ہے اور ایک شخص کو ایک روپیہ گز کے کپڑے کی بھی وسعت نہیں۔ پھر اگر دس روپیہ گز کا کپڑا خریدے گا تو ضرور قرضدار ہوگا۔ اب دونوں نے یہ کپڑا خریدا تو جس کو وسعت ہے اُس کے لئے تو کچھ حرج نہیں نہ اُس پر اسراف کا الزام اور جس نے قرض لیا وہ بے ضرورت گردن پھنسانے سے گنہگار ہوگا مسرف شمار ہوگا کیونکہ بلاضرورت مقروض ہونا گناہ ہے۔

دیکھئے دس روپے گز کا کپڑا خریدنا ایک ہی فعل ہے مگر ایک کے

لیئے گناہ نہیں ہے اور ایک کے لیئے گناہ ہے۔ بات یہ ہے کہ واقع میں تو وہ فعل مباح ہے مگر ایک عارض کی وجہ سے اس کے لیئے موجب گناہ بن گیا۔ اور وہ عارض کیا تھا، بلا ضرورت قرض لینا۔ اگر یہ اس قدر قیمتی لباس نہ پہنتا تو بے ضرورت قرض کی معصیت میں مبتلا نہ ہوتا۔ اس لیئے اس کے لیئے اتنا اچھا اور قیمتی پہننا بھی گناہ ہے کیونکہ مقدمہ گناہ بھی گناہ ہوتا ہے تو بہر حال ہر چیز میں تین درجے ہیں۔

ایک آسائش ایک آرائش ایک نمائش

تو آسائش تو ہر ایک کے لیئے مستحب ہے اور آرائش یا زیبائش میں اگر معصیت کا مثلاً بلا ضرورت قرض وغیرہ کا ارتکاب نہ کرنا پڑے تو یہ بھی مباح ہے گو اس کا ترک اولیٰ ہے۔ اور نمائش جس میں ریا و کبر و عجب و فخر ہوتا ہے یہ حرام ہے۔ اب اس کا فیصلہ ہر شخص کے تدین پر ہے کہ اس کی نیت کیا ہے۔ اگر دل میں غور کر کے یہ دیکھے کہ یہ کام میں نے نمائش کے لیئے کیا ہے تو تاویل کر کے اس کو آرائش میں داخل نہ کرے مگر اس کے ساتھ دوسرے کے فعل کو بھی خواہ مخواہ معصیت میں داخل نہ کرے کہ ہر ایک کے فعل کو نمائش پر محمول کرنے لگے بلکہ حسن ظن رکھے۔

تو خلاصہ یہ ہوا کہ مساکن مرضیہ اگر احب من اللہ (اللہ تعالیٰ سے زیادہ محبوب) ہوں۔ تب محل وعید ہیں ورنہ نہیں۔ سو مدار وعید مساکن مرضیہ نہیں۔ پس قید ترضونہا (وہ گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو) بیان فرما کر پھر اس پر وعید کا مدار نہ رکھ کر اپنے پسند کا مکان بنانے کی اجازت مستنبط ہوتی ہے

اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ پھر اُس سے محبت کرنے کی بھی اجازت ہے یعنی اُس کی جانب میلانِ قلب کی بھی اجازت ہے بشرطیکہ وہ محبت خدا و رسول کی محبت سے بڑھ کر نہ ہو۔ اگر زیادہ ہو گی تو گنہگار ہو گا۔ خلاصہ یہ کہ مساکن کے متعلق یہ آداب ہیں جنہیں میں بقدر ضرورت اس کے قبل کے وعظ میں جو اسی مکان کے دوسرے حصہ میں ہوا تھا بیان کر چکا ہوں۔

لہو و لعب کی تشریح

حق تعالیٰ نے اس آیت مقصود بالبیان میں بھی دارِ آخرت کے مقابلہ میں حیاتِ دنیا کو بیان کیا ہے اور مقصود یہ ہے کہ دارِ آخرت پر حیاتِ دنیا کو ترجیح نہ ہونی چاہیے۔ تو لفظی مناسبت تو اس مضمون کے اختیار کرنے کی ظاہر ہی ہے کہ افتتاحِ دار کے لیے یہ وعظ ہوا ہے اور ان آیات میں بھی دارِ آخرت کا تذکرہ ہے مگر معنی کے اعتبار سے اُن میں ایک عام مضمون کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ آخرت سے بے فکری نہ ہونی چاہیے اور گو اس کے لئے یوں بھی فرما سکتے تھے کہ اُطْلُبُوا الْآخِرَةَ وَاتْرُكُوا الدُّنْيَا کہ آخرت کی جستجو کرو اور دنیا کو چھوڑ دو۔ مگر اس طرح نہیں بیان کیا کیوں کہ حق تعالیٰ کو اس مضمون کے ساتھ ساتھ دونوں کی حالت کا دکھلانا بھی مقصود ہے جس سے اشارہ اس امر کی طرف بھی کرنا ہے کہ اس حالت کے بعد ہر شخص خود ہی فیصلہ کر لے کہ دونوں میں کون توجہ کے قابل ہے اور کون ترک کے قابل۔ اسی لئے امر و نہی کے صیغہ سے نہیں بیان کیا۔ بلکہ بصورتِ اخبار یوں فرمایا کہ وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ

اور نہیں ہے حیات دنیا مگر لہو اور لعب۔

یہاں حق تعالیٰ نے دنیا کے لئے دو لفظ اختیار کئے ہیں ایک لہو دوسرا لعب۔ اور دونوں کے مفہوم میں لغۃً کچھ فرق ہے وہ یہ کہ لہو کہتے ہیں شغل کو اور لعب کہتے ہیں عبث کو۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا ایسی چیز ہے کہ اس میں دو صفتیں ہیں۔ ایک تو لہو ہونے کی کہ یہ لوگوں کو اپنی طرف لبھاتی اور مشغول کرتی ہے اور دوسرے لعب یعنی عبث ہونے کی کہ اس میں مشغول ہونا عبث یعنی بے نتیجہ ہے۔ اس پر کوئی معتد بہ ثمرہ مرتب نہیں ہوتا جیسا بچوں کا کھیل کہ اس پر بھی کوئی ثمرہ مرتب نہیں ہوتا۔

اس سے ایک اور دقیق علم کی طرف بھی اشارہ ہے۔ وہ یہ کہ تمام حیات دنیا مذموم نہیں بلکہ وہ حیات دنیا مذموم ہے جس میں محض لہو و لعب ہو یعنے جو بے نتیجہ ہو اور اس کا کوئی معتد بہ ثمرہ نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیائے صوری کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس پر ثمرہ مرتب ہو اور ایک وہ کہ جس پر ثمرہ مرتب نہ ہو وہ مذموم ہے اور جس پر ثمرہ مرتب ہو، وہ واقع میں دنیا ہی نہیں۔

یہاں سے اصلاح ہے غالی فی الزہد (زہد میں غلو کرنے والے) اور زاہد خشک کی۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز مذموم ہے عمدہ کپڑا، اچھا کھانا ٹھنڈا پانی سب مذموم ہے۔ بعض لوگ اسی خیال سے نکاح بھی نہیں کرتے کہ عورت بھی دنیا ہے اور بعض کر بھی لیتے ہیں تو نان نفقہ نہیں دیتے اور اُن کے حقوق ادا نہیں کرتے کیونکہ وہ بیوی کی طرف التفات کرنے کو

التفات الی الدنیا (دنیا کی طرف توجہ کرنا) سمجھتے ہیں۔

میں ایک مرتبہ گھر میں کے معالجہ کے لئے میرٹھ گیا۔ تو وہاں ایک عورت نے مجھ سے بیعت کی درخواست کی، تو ایک دوسری عورت نے اُس عورت کو یہ رائے دی کہ تو ہمارے پیر سے بیعت کرنا جو ایسے بزرگ ہیں کہ پچاس برس سے بیوی سے بولے بھی نہیں۔ اور جس مولوی سے تو مرید ہونا چاہتی ہے وہ تو بیوی کو علاج کے لئے ساتھ لئے پھرتا ہے اور جاہل نے یہ خیال نہ کیا کہ یہ پیر صاحب تو پچاس برس سے حقوق العباد تلف کرنے کی وجہ سے خدا کی نافرمانی میں گرفتار ہو رہے ہیں۔ یہ بزرگ کیسے ہو سکتے ہیں۔

غرض اس آیت سے ایسے زاہدانِ خشک کی بھی اصلاح ہو گئی کہ دنیا اُسے ہی نہیں کہتے جسے تم دنیا سمجھے ہو۔ یعنی روپیہ پیسہ وغیرہ بلکہ دنیا تو درحقیقت لہو ولعب کا نام ہے۔ جہاں یہ نہ ہو وہاں دنیا بھی نہ ہو گی اور جہاں یہ ہو وہاں دنیا ہو گی، گو ظاہری سامان کچھ نہ ہو۔ اور اصل بات یہ ہے کہ یہاں دنیا مقابل آخرت کے ہے اور دنیا کا اطلاق دو معنی پر آتا ہے ایک تو دین کے مقابلہ پر دنیا بولی جاتی ہے جس کے معنی بے دینی کے ہوتے ہیں اور ایک آخرت کے مقابلہ میں بولی جاتی ہے جس کے معنے حیات دنیا کے ہوتے ہیں۔ اور قرآن وحدیث میں دنیا کا استعمال دونوں معنی میں آیا ہے۔

سو آیت میں دو قسمیں ہیں، مذموم یعنی لہو ولعب وغیر مذموم یعنے

اموال امتاع وغیرہ۔ پس وہ علی الاطلاق مذموم نہیں اور مذموم وہ ہے جو دین کے مقابلہ میں ہو جیسے حُبُّ الدُّنْیَا رَأْسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ کہ دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے۔ یہاں دنیا مقابلہ میں دین کے بولی گئی ہے اور مطلب یہ ہے کہ بے دینی کی باتوں سے محبت نہ کرنا چاہیئے اور یہ معنی نہیں کہ بیوی بچوں سے بھی محبت نہ کرے کیونکہ یہ سب بے دینی کی چیزیں تھوڑا ہی ہیں بلکہ یہ تو نکاح کا نتیجہ ہیں جو دین ہے۔ غرض دنیا وہ مذموم ہے، جو دین میں مضر ہو ؎

چیست دنیا از خدا غافل بدن　　　نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

یعنے دنیا کسے کہتے ہیں خدا سے غافل ہونے کو نہ کہ مال، دولت اور بیوی بچوں کو۔ آگے ایسی ہی دنیا والوں کو کہتے ہیں ؎

اہل دنیا چہ کہین و چہ مہین　　　لعنۃ اللہ علیہم اجمعین

(دنیا دار خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے سب پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔)

یہاں پر ایک سوال ہے وہ یہ کہ سب اہل دنیا پر لعنت کیسے کر دی ـــــ؟ جواب یہ ہے اصل میں یہ ترجمہ ہے ایک حدیث کا جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

اَلدُّنْیَا مَلْعُوْنَۃٌ وَّ مَلْعُوْنٌ مَا فِیْھَا اِلَّا ذِکْرُ اللّٰہِ وَمَا وَالَاہُ اَوْ عَالِمٌ اَوْ مُتَعَلِّمٌ۔

(یعنے دنیا خدا کی رحمت سے دور ہے اور جو کچھ دنیا میں ہے

وہ بھی خدا کی رحمت سے دور ہے مگر خدا کا ذکر اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والی چیز اور عالم یا متعلم۔)

یعنی ذکر اللہ اور اس کے مقدمات و متعلقات اور عالم و متعلم کو تو خدا کی رحمت سے بعد نہیں ہے۔ باقی سب رحمت سے بعید ہیں اور واقع میں یہ استثناء منقطع ہے متصل نہیں ہے کیونکہ دنیا کے مفہوم میں ذکر اللہ اور عالم و متعلم پہلے ہی سے داخل نہیں۔ تو لعنت یعنی بعد عن الرحمۃ (رحمت سے دوری) کا حکم خاص ان پر کرتے ہیں جن کو دین سے تعلق نہ ہو۔ چنانچہ قرینہ اس کا وہ شعر ہے جو بعد میں کہتے ہیں ؎

اہل دنیا کافران مطلق اند

روز و شب در زق زق و در بق بق اند

(صرف کفار اہل دنیا ہیں۔ رات دن زق زق بق بق میں گرفتار رہتے ہیں۔)

اس پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ یہ تو لعنت سے بھی بڑھ کر ہے کہ یہاں سب اہل دنیا کو کافر ہی کہہ دیا۔ مگر ایک بزرگ نے اس کی خوب توجیہ فرمائی۔ جس کے بعد یہ قرینہ ہو گیا بعد عن الرحمۃ کے محل کا۔ وہ توجیہ یہ فرمائی کہ اہل دنیا مبتدا اور کافران مطلق خبر نہیں ہے بلکہ اہل دنیا خبر مقدم ہے اور کافران مطلق مبتدائے موخر ہے یعنی جو کافران مطلق ہیں وہی اہل دنیا ہیں۔ مومن اہل دنیا سے ہو نہیں کیونکہ ابھی حدیث سے معلوم ہو گیا ہے کہ خدا کے ذکر کے ساتھ تعلق رکھنے والے ملعون نہیں ہیں۔ تو کون مومن ایسا ہو گا

جو خدا کے ذکر سے کچھ بھی علاقہ نہ رکھتا ہو گا۔ غرض وہی دنیا مذموم ہے جو آخرت بمعنی دین کے مقابلہ میں ہو۔

باقی اسباب دنیا تو اس میں حدیث نے دو قسمیں کر دی ہیں۔ ایک وہ جو آخرت میں کچھ دخل اور اس سے تعلق رکھتی ہوں اور ایک وہ جو آخرت میں اصلاً دخل نہ رکھتی ہوں۔ تو جو دنیا آخرت میں دخل نہیں رکھتی یہ حقیقت میں دنیائے محضہ اور مذموم ہے۔ اور اسی کو لہو و لعب فرمایا گیا ہے۔ تو حق تعالےٰ نے اس مقام پر فیصلہ فرما دیا ہے کہ ایسی دنیا متوجہ ہونے کے قابل نہیں بلکہ توجہ کے قابل تو آخرت ہے۔ اسی کو ارشاد فرماتے ہیں

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ

کہ حیات آخرت ہی سراپا حیات ہے جس میں حصر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔

بہرحال یہ عرض تھا ہمارے اندر جس کا حق تعالیٰ نے کس خوبی سے فیصلہ فرما دیا ہے کہ دنیا و آخرت دونوں کے حالات یعنی لہو و لعب ہونا اور حیات کاملہ ہونا بتا دیئے۔ تاکہ دونوں کے حالات سننے کے بعد ہر عاقل نہایت آسانی سے خود ہی فیصلہ کر سکے کہ ان میں سے کون توجہ کے قابل ہے اور کون عدم توجہ کے قابل۔ اور یہ حالت بتلا کر یہ بھی بتلا دیا کہ جس طرح بعض کام جن کی صورت دنیا ہے اور وہ دخل رکھتے ہیں، آخرت میں واقع میں دنیا نہیں ہیں کیونکہ وہ لہو و لعب نہیں۔

نمائش وریا کا اثر

اسی طرح اس کے مقابلہ وآخرت کا کام جو صورت میں آخرت کے ہیں اور واقع میں دنیا کے لیے ہیں وہ آخرت نہیں ہیں ؎

کلید درِ دوزخ است آں نماز　　　　کہ در چشم مردم گزاری دراز

یعنی وہ نماز دوزخ کی کنجی ہے جس سے دوزخ کا دروازہ کھل جائیگا جو ریا اور شہرت کے واسطے پڑھی جاوے کیونکہ لہو ولعب کے معنی اوپر معلوم ہو چکے ہیں کہ لعب وہ شغل ہے جو ثمرہ سے خالی ہو۔ اور یہ نماز بھی فی الواقع ثمرہ سے خالی ہے۔ تو یہ دنیا ہوئی آخرت یعنی دین نہیں ہوئی۔ حدیث شریف میں ہے کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ ایک شہید کو بلائیں گے۔

فَیُسْئَلُ عَنْہُ مَاذَا فَعَلْتَ فَیَقُوْلُ قَاتَلْتُ فِیْ سَبِیْلِکَ حَتّٰی اسْتُشْہِدْتُ فَیُقَالُ لَا بَلْ اِنَّمَا قَاتَلْتَ لِیُقَالَ اِنَّکَ لَجَرِیْئٌ فَقَدْ قِیْلَ یُؤْمَرُ بِہٖ فَیُلْقٰی فِی النَّارِ اَوْ کَمَا قَالَ۔

اس سے پوچھیں گے کہ تم نے ہمارے لئے کیا کام کیا۔ وہ کہے گا اے میرے رب! میں نے آپ کے راستہ میں جہاد کیا تھا یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔ ارشاد ہو گا نہیں تم نے جہاد اس لئے نہیں کیا تھا بلکہ اس لئے کیا تاکہ لوگ یوں کہیں کہ بھئی بڑا ہی بہادر ہے تو یہ کہہ دیا گیا۔ یعنی جس

کے لئے تم نے جہاد کیا وہ تمہیں حاصل ہو چکا۔ پس اس کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

اسی طرح ایک سخی کو بلائیں گے اور اُس کا بھی یہی حشر ہوگا کہ ہمارے لئے تم نے سخاوت نہیں کی بلکہ اس لئے تم نے سخاوت کی تھی لِيُقَالَ اِنَّكَ جَوَادٌ فَقَدْ قِيْلَ تاکہ لوگ یہ کہیں کہ بڑا سخی ہے تو بہت تعریف ہو چکی۔ اسی طرح ایک عالم کو بلائیں گے۔ سوال ہوگا تم نے کیا کیا۔ عرض کرے گا کہ میں نے آپ کی رضا کے لئے وعظ کہا اور یہ کیا وہ کیا۔ ارشاد ہوگا نہیں اس لئے یہ کام نہیں کیا بلکہ اس لئے لِيُقَالَ اِنَّكَ لَقَادِرٌ کہ یہ کہا جاوے کہ یہ بڑے عالم ہیں۔ تو آپ کی بھی بہت تعریف ہو چکی، اب یہاں کیا رکھا ہے۔

تو دیکھئے شہادت، سخاوت، علم دین کی خدمت جو اس طریقہ مذکورہ فی الحدیث (حدیث میں مذکور) سے ہو وہ بھی دنیا ہی ہے اگرچہ صورت اُس کی آخرت کی ہے۔

چنانچہ ایک خرچ کرنا کفار کا تھا کہ اپنے نزدیک نیک کام سمجھ کر کرتے تھے مگر پھر بھی اُن کی مذمت کی گئی کیونکہ وہ محض صورت دین تھی اور حقیقت میں وہ انفاق دین نہ تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔

یعنی کفار اپنے اموال اس لئے خرچ کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو خدا کے

راستہ سے باز رکھیں اور ایک خرچ اہل ایمان کا تھا کہ لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا۔ تاکہ خدا ہی کا نام بلند ہو۔ جیسے ارشاد ہے

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ۔

کہ جو لوگ خدا کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی ایسی مثال ہے جیسے ایک دانہ زمین میں ڈالا گیا، ہو جس سے سات بالیاں اگی ہوں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ گویا ایک سے سات سو ہو گئے دیکھئے حالانکہ اہل ایمان اور اہل کفر دونوں خرچ کرتے ہیں اور دونوں کا انفاق بھی حیات دنیا ہی میں ہوتا ہے اور دونوں کا مقصد بھی بزعم منفق اعانت دین ہی ہوتا ہے جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں فعل میں اشتراک ہے۔ مگر چونکہ یہ دین مقبول ہے اس لئے اس کے لئے انفاق بھی دین ہے اور وہ دین باطل ہے اس کے لئے انفاق دنیا ہوا۔ گو صورۃً اتحاد و اشتراک ہے مگر حقیقۃً دونوں میں بڑا فرق ہے اور اسی فرق کی وجہ سے ایک دنیا ہے اور ایک دین۔

اسی طرح ہر عمل کی یہی کیفیت ہے کہ محض صورۃً دین ہونے سے وہ دین نہیں بن سکتا اور نہ صورۃً دنیا ہونے سے دنیا بنتا ہے۔ پس اس کی بڑی ضرورت ہے کہ نظر و غور کر کے دیکھا جائے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں آیا وہ دین کے لئے خلوص اور خوش نیتی سے کر رہے ہیں یا ایسا نہیں۔ اگر خلوص سے کر رہے ہیں تو وہ مقبول ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔

خلوص کی ضرورت

اب اس کے بعد دو قسم کی طبیعت کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو دین کے واسطے کرتے ہیں جس کا مذموم ہونا ظاہر ہے اور ایک وہ ہیں جو دین کا کام اس لئے بالکل چھوڑے بیٹھے ہیں کہ نیت تو آخرت کی ہے ہی نہیں پھر بلا نیت کر کے کیا کریں۔ چنانچہ یہی سمجھ کر بہت سے جاہل لوگوں نے نماز چھوڑ دی کہ جیسی مطلوب ہے ویسی تو ہو ہی نہیں سکتی تو پڑھنے سے کیا فائدہ۔ بعض نے روزہ چھوڑ دیا کہ جیسا ہونا چاہئے ویسا تو ہو نہیں سکتا پھر رکھنے سے کیا فائدہ۔

اے صاحبو! یہ بڑی غلطی ہے۔ روزہ و نماز حقیقی کے حاصل کرنے کی تدبیر بھی یہی ہے کہ پہلے روزہ و نماز صوری کو اختیار کرو گو خلوص نہ ہو مگر شرط یہ ہے کہ اس کی ضد بھی نہ ہو خلو کا درجہ ہو اسی سے خلوص ہو جاتا ہے اور کرتے کرتے نیت بھی درست ہو جاتی ہے اور یہ نفس کا حیلہ و بہانہ ہے کہ جب کامل عمل نہیں ہوتا تو ناقص کیوں کریں۔ سبحان اللہ! کیا دنیا کے جتنے کام کامل ہوتے ہیں وہ اول ہی دن سے کامل ہو جاتے ہیں ہرگز نہیں بلکہ مدت کے بعد عمدہ کام کرنا آتا ہے۔ یہی حال اعمال آخرت کا بھی ہے کہ کرتے کرتے ہی کمال حاصل ہو جائے گا۔ پس ناقص عمل بھی بیکار نہیں بلکہ یہ ذریعہ ہے کامل کا۔ پس اعمال صالحہ میں خلوص کا قصد تو کرو لیکن اگر آج حاصل نہ ہو تو عمل نہ چھوڑ بیٹھو بلکہ کئے جاؤ اور قصد بھی برابر رکھو انشاء اللہ ایک دن ضرور حاصل ہو جائے گا۔

اس کے بعد کوتاہی اعمال کے اعتبار سے ایک اور تقسیم ہے وہ یہ کہ ایک کوتاہی تو یہ تھی کہ اعمال ہیں نفس کے حیلہ وبہانہ سے خود ہی مشغول نہیں ہوتے اور دوسرے کوتاہی یہ ہے کہ جو لوگ خود اعمال میں مشغول بھی ہیں انہیں دوسروں کی فکر نہیں ہے۔ وہ اپنے نوکروں اپنے متعلقین کو بلکہ اپنے بچوں کو نماز پر مجبور نہیں کرتے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (نیکیوں کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا) کا باب ہی آج کل مفقود ہے۔ یاد رکھو جیسے طاعت خود واجب ہے ویسے ہی دوسروں کی طاعت کے سعی بھی واجب ہے۔ مگر یہ سعی بقدر استطاعت واجب ہے۔ جہاں زبان کی استطاعت ہو وہاں زبان سے کرے جہاں ہاتھ پاؤں سے کر سکے ہاتھ پاؤں سے کرے۔ روپے پیسے سے کرے۔ خلاصہ یہ کہ محض اپنا عمل درست کر لینا کافی نہیں ہے

فکرِ اصلاح

دیکھئے قرآن میں جہاں اس اُمت کے فضائل بیان کیئے گئے ہیں۔ اُن میں بطور خصوصیت کے اصلاح غیر کو بھی ذکر کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔

(تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ حکم کرتے ہو نیکیوں کا اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ تعالےٰ پر ایمان لائے ہو۔)

اس آیت میں اس اُمت کی تین فضیلتیں بیان فرمائی ہیں جن میں فضیلت ایمان باللہ کی تو ہر شخص کے پاس اپنے لیئے ہے اور باقی دو فضیلتیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی یہ دوسروں کے نفع کے لیئے ہیں کیونکہ اس سے دوسرے پر نفع کا اثر پہنچتا ہے۔ اور مقتضا قواعد کا یہ تھا کہ یہاں تو مومن باللہ کو مقدم فرماتے کیونکہ وہ اساس اعمال ہے مگر مؤخر کرنے میں غالباً یہ نکتہ ہے کہ عوارض پر نظر کر کے اصلاح غیر کا اہتمام زیادہ مقصود ہے کیونکہ اپنی ضرورت کا اہتمام تو ہر شخص خود ہی کر لے گا۔ ورنہ فی نفسہ اپنی اصلاح غیر کی اصلاح سے مقدم ہے۔ مگر اس تقدیم کے یہ معنی نہیں کہ اگر اپنی اصلاح نہ کرے تو دوسرے کی اصلاح بھی واجب نہیں بلکہ یہ تو محض عملی ترتیب ہے کہ پہلے اپنی اصلاح کرنا چاہیئے۔ پھر دوسرے کی کرے یہ نہیں کہ اگر مقدم کام نہ کیا ہو تو مؤخر کو بھی نہ کرے کیونکہ دراصل یہ دو کام الگ الگ ہیں ایک دوسرے کا موقوف علیہ نہیں۔ ایک کو بھی ترک کرے گا تو اُس ایک کے ترک کا گناہ ہو گا اور دوسرے کو ترک کرے گا تو دوسرے کے ترک کا گناہ ہو گا اور دونوں کو ترک کرے گا تو دونوں کے ترک کا گناہ ہو گا۔

تو یہ غلطی ہے کہ اپنی اصلاح نہ ہوئی ہو تو دوسروں کو بھی تنبیہ نہ کرے بعضے اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ ۔۔۔۔۔

(لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو اور اپنے نفسوں کو بھلاتے ہو۔)

وہ اس سے یہی سمجھے کہ اگر اپنی اصلاح نہ کرے تو دوسرے کی اصلاح بھی نہ کرے۔ کیونکہ ہمزہ تامرون پر انکار کے لئے داخل ہوا ہے۔ تو امر بالبر (نیکی کا حکم) منکر ہوا۔ یعنی جس حالت میں تم اپنے نفسوں کو بھولے ہوئے ہو لوگوں کو امر بالبر کیوں کرتے ہو۔ مگر یہ محض غلط ہے بلکہ ہمزہ مجموعہ پر داخل ہوا ہے اور انکار مجموعہ کے دوسرے جزو کے اعتبار سے ہے کہ اپنے کو اصلاح میں بھلانا نہیں چاہئے ——— اس آیت کا تو یہ جواب ہو گیا۔

اب ایک دوسری آیت کا مطلب بھی سنئے جس سے ان لوگوں نے اس پر استدلال کیا ہے کہ بے عمل کو وعظ و نصیحت نہ چاہئے۔ وہ یہ ہے کہ

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ۔

کہ تم وہ باتیں کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ خدا کے نزدیک نہایت مبغوض ہے کہ جو کام خود نہ کرو اسے کہو۔

دراصل یہ لوگ محض ترجمہ دیکھنے سے دھوکے میں پڑ گئے۔ ترجمہ سے یہ سمجھے کہ مطلب یہ ہے جو کام خود نہ کرے وہ دوسروں کو بھی کرنے کو نہ کہے حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ تفسیر میں اسباب نزول سے آیات کے صحیح مطلب کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ اس کا سبب نزول یہ ہے کہ بعض لوگوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ کون سی عبادت سب سے

زیادہ خدا کو پسند ہے تو ہم دل و جان سے اُس کو خوب بجا لائیں۔ اس پر ارشاد ہوا کہ جِھَادٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا) خدا کو بہت پسند ہے۔ بس یہ سُن کر بعضوں کا خون خشک ہو گیا۔ اُن لوگوں کے بارہ میں یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ ایسی باتوں کا دعوے یا وعدہ کیوں کرتے ہو جنہیں تم پورا نہیں کر سکتے۔ تو یہاں پر لِمَ تَقُوْلُوْنَ (کیوں کہتے ہو تم) سے لِمَ تَنْصَحُوْنَ غَیْرَکُمْ (کس لئے نصیحت کرتے ہو اپنے غیر کو) یا قول امری و انشائی مراد نہیں ہے بلکہ قول خبری و ادعائی مراد ہے۔

حاصل یہ کہ یہ آیت دعوےٰ کے باب میں ہے دعوت کے باب میں نہیں۔ اس کے شانِ نزول معلوم ہو جانے کے بعد سمجھ میں آگیا ہو گا کہ اس آیت کا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ممانعت سے کچھ بھی مس نہیں۔ غرض واجب تو دوسرے کی بھی اصلاح ہے مگر اپنی اصلاح اس پر ضرورت میں مقدم ہے اور باوجود اس کے حق تعالےٰ نے اصلاح غیر کو مہمل نہیں چھوڑا بلکہ جابجا نہایت اہتمام سے بلا قید تقدیم اصلاح خود کے اس کا امر فرمایا ہے اور وجہ اس کے اہتمام کی یہ ہے کہ اپنی اصلاح کو تو ہر شخص ضروری سمجھتا ہے اور دوسرے کی اصلاح کا کچھ ایسا اہتمام نہیں کرتا۔ اس لئے دوسرے کی اصلاح کے لئے زیادہ اس کے اہتمام کی ضرورت ہوئی۔ اور اسی لئے آیت کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ (تم بہترین اُمّت ہو) میں اس کو اصلاح نفس سے پہلے ذکر کیا تاکہ اپنی اصلاح کے بعد دوسرے کی اصلاح سے بے فکر نہ ہو جاویں۔

اصلاح غیر کے مدارج

البتہ اصلاح غیر کے بقدر استطاعت مدارج ہیں۔ چنانچہ ایک درجہ یہ ہے کہ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا۔ اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے بچاؤ۔ اس درجہ کا حاصل اپنے خاص متعلقین کی اصلاح ہے۔ افسوس اس باب میں بھی ہم سے کتنی کوتاہی ہو رہی ہے۔ خود تو نماز پڑھ بھی لیتے ہیں، مگر کبھی بیوی بچوں کو، نوکروں کو اور متعلقین کو نہیں کہتے۔ بچے اگر امتحان میں فیل ہو جائیں تو رنج ہوتا ہے مگر نماز قضا کر دیں تو کچھ بھی پروا نہیں ہوتی۔ حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ سات برس کے بچے کو نماز پڑھنے کا حکم دو اور دس برس کے بچے کو اگر کہنے سے نہ پڑھے تو مار کے پڑھاؤ۔ اگر کوئی دس برس کا بچہ سرپرست کی غفلت سے بے نمازی ہوگا تو اس کا سرپرست گنہگار ہوگا۔ تو اگر اصلاح غیر کی ضرورت نہ ہوتی تو قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ (آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے بچاؤ) میں اَھْلِیْکُمْ کے کیا معنی ہوں گے۔

دوسرا درجہ یہ ہے۔ وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ۔ کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونا چاہیے جس کا کام صرف یہی ہو کہ لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ اس درجہ کا حاصل تبلیغ عام ہے اور ایک جگہ ہے کہ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (ایک دوسرے کو حق کی فرمائش

کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو پابندی کی فرمائش کرتے رہتے ہیں اس میں بھی تخصیص نہیں اہل وعیال کی۔ یہ تو قرآن میں اس امر ونہی کی تاکید ہے اسی طرح حدیث تاکید ہے۔ ارشاد ہے کُلُّکُمْ رَاعٍ وَّکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ۔ یعنی ہر ایک تم میں سے نگہبان ہے اور ہر ایک تم میں سے اپنی رعیت کے بارہ میں پوچھا جاوے گا۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ دوسرے کی اصلاح بھی ضروری ہے۔ اگر دوسرے کی اصلاح ضروری نہیں ہے تو پھر آخر ان آیات اور احادیث کے کیا معنی ہیں۔

غرض یہ مسئلہ اتنا بدیہی ہے کہ اب زیادہ تفصیل سے شرم آتی ہے مگر کیا کروں اس وقت ایک واقعہ ایسا پیش آیا ہے جس کی خبریں اخباروں میں آپ کو بھی معلوم ہیں کہ ہمارے مسلمان بھائیوں کو دوسری قومیں مرتد بنارہی ہیں۔ اس کے متعلق مجھے ایک آیت یاد آئی۔

وَدُّوْا لَوْ تَکْفُرُوْنَ کَمَا کَفَرُوْا فَتَکُوْنُوْنَ سَوَاءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْھُمْ اَوْلِیَاءَ حَتّٰی یُھَاجِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ط

اس کے ترجمہ سے اس وقت کی حالت کا اندازہ کرکے آپ کو عبرت ہوگی۔ ترجمہ یہ ہے کہ کفار تو دل سے پسند کرتے ہیں کہ تم بھی کافر ہوجاؤ تاکہ سب برابر ہوجاویں۔

جیسے ایک کبڑے سے کسی نے پوچھا تھا کہ تو اپنا اچھا ہونا چاہتا ہے یا دوسروں کا کبڑا ہونا۔ کہنے لگا کہ دوسروں کا کبڑا ہونا تاکہ میں بھی دوسروں کو اس نظر سے دیکھ لوں جس نظر سے لوگوں نے مجھ کو دیکھا ہے۔

تو کفار تو یہ چاہتے ہیں کہ تم سب اُن کے برابر ہو جاؤ۔ آگے مسلمانوں کو ارشاد ہے کہ فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ اَوْلِيَاءَ۔ اُن سے دوستی اور اتحاد مت کرو۔ کیونکہ جب اُن کی یہ حالت ہے کہ وہ دل سے تمہارا کافر ہونا پسند کرتے ہیں تو لامحالا وہ تم سے مل کے اسی کی کوشش کریں گے۔ افسوس! مسلمانوں کو تو اُن سے ملتے ہوئے اس کا خطرہ بھی نہیں ہوتا کہ اُن کو مسلمان بنا دیں اور وہ ہر وقت دل میں یہی خیال رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو کافر بنا دیں۔

صاحبو ــــ برائے خدا تم اُن سے دوستی اور اتحاد مت کرو۔ ہاں بخوشی سی اتنی رعایت کر دیا کرو کہ وہ تمہارے اخلاق کے گرویدہ ہو کر اسلام کا اثر قبول کریں۔ مگر افسوس وہ تو رات دن اس کوشش میں منہمک ہیں کہ پرانے مسلمانوں کو بھی کافر بنا دیں اور ہمیں اس کی بھی پروا نہیں کہ ہمارے جو بھائی پہلے سے مسلمان ہیں اُن کو ہی اسلام کے اندر رکھنے کی کوشش کریں۔ صحابہ نے تو کس جانفشانی سے اسلام پھیلایا تھا آج ہم اپنی غفلت سے اُسے مٹا رہے ہیں۔

بعض اہل کفر کا مسلمانوں پر یہ بھی اعتراض ہے کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے۔ اب ہمارا زور ہے ہم اُس زور سے کام لے رہے ہیں۔ مگر یہ بالکل ہی غلط ہے۔ دراصل شمشیر کا استعمال مزاحمت کے روکنے اور مدافعت کے واسطے تھا یعنے حفاظت اسلام کے لئے تھا نہ کہ اشاعت اسلام کے لئے۔ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا خوب ہی جواب دیا ہے

کہ بزورِ شمشیر اسلام پھیلانے کے لئے شمشیر زنوں کی بھی تو ضرورت ہے تو وہ شمشیر زن کس شمشیر کے زور سے جمع ہوئے جنہوں نے بزورِ شمشیر اسلام پھیلایا۔ دراصل اسلام پھیلا ہے اخلاق سے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اخلاق سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے۔ چنانچہ سیر و تواریخ اس اس پر شاہد ہیں۔ اگر ہم بھی ویسے ہی پکے مسلمان ہو جائیں تو سچ جانیئے کفار ہمیں بھی دیکھ دیکھ کر مسلمان ہونے لگیں۔

مسلمان اور کافر کا فرق

مگر اب تو ہمارے اخلاق اس درجہ گر گئے ہیں کہ انہیں مثال میں پیش کر کے کفار کو نفرت دلائی جاتی ہے۔ ایک شخص نے کسی کافر سے کہا تھا کہ مسلمان ہو جاؤ۔ اس نے کہا کہ میں ایسا مسلمان تو ہو نہیں سکتا جیسے بایزید ہیں کیونکہ اس پر قدرت نہیں اور ایسا مسلمان ہونا جیسے تم ہو، میں پسند نہیں کرتا اس سے تو میں کافر ہی اچھا۔!

صاحبو! اس کافر کا یہ کہنا تو بالکل ہی لغو ہے۔ کافر تو مسلمان سے کسی طرح اچھا ہو ہی نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ ظالم مسلمان رحم دل کافر سے بھی بدرجہا یقیناً بہتر ہے اور رحم دل کافر کو مسلمان سے بہتر وہی کہے گا جسے دنیا کا بھی قانون معلوم نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ فرض کرو ایک شخص اعلیٰ درجہ کا ڈگری یافتہ ہے اور نہایت مہذب ہے مگر ہے حکومت کا باغی۔ اور ایک جاہل جرائم پیشہ اور چور ہے کہ سزا بھی پاتا ہے اور پکڑا بھی جاتا ہے مگر حکومت کا باغی

نہیں بلکہ مطیع و فرمانبردار ہے۔ میں اہل تمدن سے پوچھتا ہوں کہ بتلائیں قانون کے اعتبار سے اور گورنمنٹ کی نظر میں کون شخص بڑھا ہوا ہے اور کون گھٹا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جاہل گو اس میں سارے عیب ہیں مگر ایک وصف فرمانبرداری اس میں ایسا ہے کہ تھوڑے دنوں میں وہ سزا کے بعد پھر ویسا کا ویسا ہی مقبول و مقرب ہو جاوے گا جیسا کہ جرم سے پہلے تھا اور یہ تعلیم یافتہ جس میں ہزاروں خوبیاں ہیں بغاوت کی وجہ سے ہیچ در ہیچ ہے کیونکہ یہ ایسا عیب ہے کہ سب خوبیاں اس کے سامنے ہیچ ہیں اسی لئے یہ ہمیشہ مبغوض اور معتوب رہے گا۔

پس یہی فرق ظالم مسلمان اور رحم دل کافر میں خدا کے نزدیک ہے تو اب اگر کوئی شخص مسلمان ہو کر ایسا کہے کہ ظالم مسلمان سے رحم دل کافر اچھا ہے تو معلوم ہوتا ہے وہ اسلام کو حق نہیں سمجھتا۔ حیرت کی بات ہے کہ اسلام کو حق سمجھنے کے بعد یہ شبہ کرے کہ مسلمان سے کافر افضل ہو سکتا ہے۔ بہرحال جب یہ مسلمان خدا کے نزدیک افضل ہے تو اس کافر کی یہ غلطی تھی جو اس نے اپنے کفر کو اس کے اسلام پر ترجیح دی۔ مگر میں یہ کہتا ہوں کہ ہماری حالت ایسی کیوں ہے کہ دوسرا شخص ہمارے متعلق زبان پر یہ حرف لا سکے۔ غرض ہماری حالت ایسی گری ہوئی ہے کہ کفار بھی ہم پر طعن کرتے ہیں۔

چنانچہ اس حالت کا حاصل یہ ہے کہ اگر اخلاق بھی سیکھیں گے، تو وہ بھی کفار سے لئے ہوئے جیسے حریت، مساوات، ایثار، ہمدردی،

یہ سب الفاظ یورپ ہی سے سیکھے ہیں۔ باقی جو دراصل ہمارے اخلاق ہیں ان کی تو گویا ضرورت ہی نہیں کہ داڑھی رکھیں، نماز پڑھیں، روزہ رکھیں استطاعت ہو تو زکوٰۃ دیں اور حج کریں۔ اور معاملات، و معاشرات کو درست کریں۔

اس پر مجھے اکبر الہ آبادی کا ایک شعر یاد آیا جو اس واقعہ پر کہا گیا ہے کہ جب انگریزی پڑھنے کو منع کیا گیا تھا تو جواب میں یہ کہا گیا تھا کہ واہ اس میں تو اسلام کی شان بڑھے گی کہ مسجد کے دروازہ پر جج اور کلکٹر دکھائی دیں گے۔ حالانکہ یہ سب حساب شیخ چلی کا سا تھا جس کو ایک بقال نے مزدوری پر گھی کا گھڑا سپرد کیا۔ اب وہ گھڑا سر پر رکھ کر اس کے ساتھ ہو لئے اور یہ سوچنے لگے کہ مزدوری کا پیسہ ملے گا تو اس سے ایک انڈا خریدوں گا اور کسی کی مرغی کے نیچے رکھ دوں گا۔ اس سے بچہ نکلے گا۔ پھر اس سے انڈے حاصل ہوں گے۔ پھر اس کو ان انڈوں پر بٹھا دوں گا تو بہت سے بچے نکلیں گے۔ تین چار بار ایسا ہی کروں گا۔ جب زیادہ ہو جاویں گے تو سب کو بیچ کر بکریاں خریدوں گا۔ پھر گھوڑا، پھر ہاتھی لوں گا اور پھر شادی کروں گا اور بچے ہوں گے۔ جب بچہ پیسہ مانگے گا تو میں کہوں گا ہشت...... آخر کا فقرہ آپ نے اتنے زور سے سوچا کہ گردن کو جھٹکا لگا اور گھی کا گھڑا سر سے گر گیا۔ مالک نے کہا یہ کیا کیا؟ آپ کہتے ہیں میاں جاؤ بھی میرا تو سارا کنبہ تباہ ہو گیا تمہیں اتنے سے گھی کی پڑی ہے۔

تو بہر حال اسی طرح انگریزی سے اُنہوں نے حساب لگا یا تھا مگر نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام سے اور بیزار ہو گیا۔ سو اس معنی میں انہوں نے یہ شعر کہا ہے ؎

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے!
تو خوشی پھر اس کی کیا ہے کوئی جنٹ کوئی ننج ہے

غرض یہ سب یورپ کی تقلید ہے کہ ایثار، ہمدردی، مساوات وغیرہ الفاظ یاد کر لیئے اور وہ بھی محض نقل ہی نقل ہے اُن جیسے وہ بھی نہیں اور نماز روزہ، حج، زکوٰۃ اور داڑھی کی تو کچھ فکر ہی نہیں۔

اے صاحب! اسلام پر اسلام کے طور سے نظر کرو۔ واللہ! اگر ہم ویسے ہی مسلمان ہوتے جیسا اسلام چاہتا ہے تو ہمارے اقوال، افعال و احوال ہی کفار کے لیئے ہادی ہو جاتے اور اگر ہادی نہ بھی ہوتے تو کم از کم اُن کی عداوت تو ہم سے کم ہو جاتی۔ ہمارے اسلاف کے تو یہ کارنامے تھے کہ غیر قومیں اُن میں خود بخود جذب ہوتی تھیں۔ اگر تم غیر قوموں کو اپنے اندر جذب نہیں کر سکتے تو کم از کم اپنے بھائیوں کو تو اُن میں جذب ہونے اور گرنے سے تھام لو۔ بس اب تو وہ حالت ہے ؎

اے آنکہ باقبال تو در عالم نیست
گیرم کہ غمت نیست غم ما ہم نیست

(اے شخص! دنیا میں تیرے اقبال کے مقابلہ میں کسی کا اقبال نہیں ہے۔ فرض کیا کہ تجھ کو فکر نہیں ہے۔ کیا ہماری فکر بھی

نہیں ہے۔)

تبلیغ کی ضرورت

ہم نے مانا کہ تمہیں غیر قوموں سے خود اپنا اندیشہ نہیں مگر اپنے بھائیوں کا تو غم ہونا چاہیئے کہ غیر قومیں ان کو تباہ کر رہی ہیں۔ اس معاملہ میں ایک بڑی کوتاہی یہ بھی معلوم ہوئی کہ برسوں سے حق بات اپنے بھائیوں تک پہنچائی ہی نہیں گئی۔ چنانچہ سننے میں آیا ہے کہ جب مبلغین محل ارتداد میں پہنچے تو اُن لوگوں نے یہ کہا کہ ہم نے دس بارہ برس میں آج عالم کی صورت دیکھی ہے۔ اگرچہ ہم ساری دنیا کی اصلاح کے ذمہ دار نہیں ہیں مگر پھر بھی ہمیں چاہیئے کہ جتنا ہم سے ہو سکے کوشش تو کریں کیونکہ اس کی ہم سے پوچھ ہوگی اور کامیابی یا ناکامی پر ہمیں توجہ نہ کرنا چاہیئے کیونکہ ہم سے اس کی پوچھ نہیں ہوگی۔

جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم بھی چاہتے تھے کہ دنیا میں ایک بھی کافر نہ رہے اور حق تعالیٰ نے آپ کو خاص طور پر اسی کام کے لئے بھیجا تھا۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ــــــ

(اور ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بشیر (بشارت دینے والا) اور نذیر (ڈرانے والا) بنا کر بھیجا ہے۔

مگر باوجود اس کے صاف فرما دیا گیا کہ آپ سے یہ سوال نہیں ہوگا کہ تمہارے زمانہ کے کچھ لوگ دوزخی کیوں ہوئے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ لَعَلَّكَ

بَاخِعٌ نَّفْسَكَ شاید آپ (ان کفار کے پیچھے) اپنی جان کھپا دیں گے اور ایک جگہ لَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ۔ حاصل یہ کہ آپ ان کے ایمان نہ لانے پر غمگین نہ ہوں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گو آپ کا یہ فرض منصبی نہ تھا کہ آپ اس قدر بلیغ کوشش فرما دیں۔ مگر آپ اپنی طبعی رحمت و شفقت کے تقاضا سے یہ چاہتے تھے کہ ایک بھی دوزخی نہ رہے اور جب اس میں کامیابی نہیں ہوتی تھی تو آپ کو صدمہ ہوتا تھا اس صدمہ کے دفعہ کرنے کے لئے یہ ارشاد ہوا ہے کہ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ نہ آپ اپنی جان کھپائیں۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا

اگر آپ کا رب چاہتا تو سب کو ہدایت ہو جاتی۔

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ۔

کیا آپ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کر سکتے ہیں؟ استفہام انکار کے لئے ہے۔ یعنی آپ کا کام کوشش کرنا ہے اور کوشش پر پھر خدا جسے توفیق دے گا ایمان لے آوے گا۔ آپ مجبور کیوں کرتے ہیں۔ کوئی شخص بغیر خدا کے حکم کے مومن نہیں ہو سکتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوشش کے معنی یہ نہیں کہ ثمرہ ضرور مرتب ہو مثلاً مرتدین کو تبلیغ کریں تو وہ ارتداد سے بچ ہی جاویں بلکہ کوشش کے معنی یہ ہیں کہ جو کام تمہارے قبضہ میں ہے وہ کر ڈالو۔ اُن کو سمجھاؤ بجھاؤ اسلام کے محاسن بتلاؤ۔ بس اس طرح کوشش کرو اگر خدانخواستہ پھر بھی

ناکامی ہو تو رنج مت کرو۔ کیونکہ تم اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے۔ یہ بھی ایک مرض ہے نفس کا کہ اس کو اپنی بات کا رائگاں جانا ناگوار ہوتا ہے۔ اس وقت میں اسی کا علاج کر رہا ہوں اور ان آیتوں کا حاصل بھی یہی ہے۔ خلاصہ یہ کہ کوشش کے اعتبار سے تین حالتیں ہیں۔

ایک تو یہ کہ کوشش ہی نہ کرے۔

ایک یہ کہ ایسی کوشش کرے کہ اگر ناکامی ہو تو گھل گھل کر جان دے دے

یہ دونوں درجے غیر محمود اور ناپسندیدہ ہیں۔ اس میں دو راز ہیں۔ ایک یہ کہ دوسرے کے فعل پر قدرت نہیں۔ اس پر رنجیدہ ہونے کے یہ معنی ہوئے کہ یہ ہمارے قبضہ کی بات تھی مگر نہیں ہوئی۔ اور دوسرا امر ذرا باریک ہے وہ یہ کہ یہ بتاؤ کہ دین کس کا ہے۔ خدا کا ۔۔۔! تو اس کی حفاظت خدا کا وعدہ ہے۔ پھر تمہارے رنج کا منشا یہ ہے کہ اگر ناکامی کی یہی رفتار رہی، تو خدا نخواستہ ایک دن اسلام مٹ جاوے گا۔ اور وعدہ صحیح نہ رہے گا۔ تو یہ منشا ہی غلط ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تم کو

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ

(ہم نے ذکر یعنی قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں)

پر اعتماد نہیں رہا۔ یاد رکھو کہ یہ کبھی مٹ نہیں سکتا۔ کیونکہ اس کے محافظ تو خود وہ ہیں جو تمہارے بھی محافظ ہیں۔

اب شاید یہ کہو گے کہ پھر ہمیں کوشش کرنے کو کیوں کہا گیا۔ سو اس لئے کہا گیا تاکہ تم کو ثواب ہو اور اجر ملے۔ تمہارا تعلق دین سے ظاہر ہو۔ محبت کے

آثار نمایاں ہوں - یہ تو اُن کی کمال عنایت و رحمت ہے کہ انہوں نے تمہارے ثواب کے لئے ایک بہانہ بتلا دیا ہے باقی ثمرہ تو اُن ہی کا تصرف ہے ؎

کارِ زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

(مشک افشانی محبوب کے زلف کا فعل ہے لیکن عشاق نے
مصلحت کی بناء پر چین کے ہرنوں کی طرف منسوب کر دی ہے)

بس تمہاری نیک نامی کے واسطے بظاہر تمہارے متعلق یہ کام کر دیا ہے کہ تم ذرا سی کوشش کر کے مقبول ہو جاؤ گے ورنہ کام تو وہ خود کرتے ہیں - وہی محافظ ہیں - اس لئے غم کبھی نہ کرنا چاہیے -

ان دو رازوں کے علاوہ تیسری خرابی اس کاوش میں یہ ہے کہ اس غم کی وجہ سے طبیعت سُست ہو جاتی ہے اور اس سے رفتہ رفتہ کوشش سے معطل و بیکار ہو جاتا ہے - تو منشاء تھا غم کا یعنی ناکامی، وہ اور اچھی طرح واقع ہوتی ہے - اور شریعت کا مقتضا یہ ہے کہ مسلمان سُست نہ ہونے پائیں - اس لئے زیادہ رنج مناسب نہیں اور گو رنج کے موقع پر رنج کو منع کرنے سے ظاہر میں شبہ ہوتا ہے کہ یہ تو شفقت کی کمی کی تعلیم معلوم ہوتی ہے مگر راز اس میں یہ ہے کہ جب ایسی چیزوں کا غم کرو گے جو تمہارے قبضہ میں نہیں ہیں تو خواہ مخواہ سُست ہو جاؤ گے اور اس سے اصل کام میں خلل واقع ہوگا - تو خلل کو گوارا کرنا یہ ہے شفقت کی کمی -

اور کام کو جاری رکھنا تو عین شفقت ہے۔ غرض اعتدال کے ساتھ کام کئے جاؤ۔

طریق تبلیغ

اس کام کو اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں اس طرح بیان فرمایا ہے اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ - سبحان اللہ! کام بھی بتلا دیا اور کام کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا کہ لوگوں کو خوبصورتی اور نرمی ولطافت سے اللہ کی سبیل کی طرف بلاؤ اور راہ راست پر لاؤ۔ یہ ہے وہ کام جو بذریعہ وعظ کے یا مکاتب و مدارس کے ذریعہ سے ہونا چاہئے یعنی مبلغین ان ناواقف مسلمانوں کو اسلام کے محاسن اور احکام جاکر سنائیں اور رفتہ رفتہ کچھ مکاتب و مدارس وہاں پر قائم کر دیئے جائیں۔ ان میں سے جو طریقہ زیادہ مفید معلوم ہو اُسے اختیار کرنا چاہئے۔ بس یہ تو ہمارا کام ہے اُسے پورا کرنے کے بعد نتیجہ خدا کے سپرد کر دو۔

ناکامی کے متعلق تو کہہ چکا اب کامیابی کے متعلق بھی کہتا ہوں کہ اگر خوش قسمتی سے کامیاب ہو جاؤ تو ناز مت کرو۔ جیسے ہم سے یہ غلطی بھی ہوتی ہے اور اس وقت ہماری حالت اس شعر کے مصداق ہوتی ہے ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

یعنی ہماری جو حالت ہے وہ اعتدال سے باہر ہے۔ نہ ناکامی

میں حدود پر رہتے ہیں نہ کامیابی میں۔ پس سنئے کہ قرآن مجید میں مطلق کامیابی
کی حالت کے متعلق دو ارشاد ہیں۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَبِرَحْمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ
فَلْیَفْرَحُوْا (کہہ دیجئے اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت سے خوش ہونا چاہیے)
اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے فضل پر خوش ہونا چاہیے۔

اور ایک جگہ یہ ارشاد ہے لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ
بہت مت خوش ہو خدا پسند نہیں کرتا، زیادہ خوش ہونے والوں کو۔ اس
سے معلوم ہوتا ہے کہ خوش نہ ہونا چاہیے۔ پس ان دونوں میں بظاہر تعارض
معلوم ہوتا ہے مگر دراصل اس میں تعارض نہیں بلکہ یہ دو حالتیں جدا جدا
ہیں جن کے متعلق تنبیہ کی گئی ہے۔

ایک خوشی اضطراری ہے جس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً تمہاری
ایک ہمیانی روپے یا اشرفیوں کی کھوئی گئی۔ جس سے آپ بہت پریشان
ہیں۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے بہت دق ہو چکے ہیں کہیں پتہ نہیں چلتا کہ
دفعۃً کسی نے ہاتھ میں لاکر دے دی۔ ایک خوشی تو اس وقت ہے
یہ اضطراری اور بے اختیاری خوشی ہوگی۔

ایک یہ صورت ہے کہ ہمیانی گم ہونے پر تم نے نوکروں کو خوب
مارا پیٹا۔ اب خدا جانے وہ ان کو ملی یا نہیں مگر بیچاروں نے ڈر کے
مارے لاکر دے دی۔ ایک خوشی اس پر ہے یہ اختیاری خوشی ہے
اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ پہلی خوشی جو آپ کو ہوگی وہ اترانے کی
نہ ہوگی اور دوسری خوشی اترانے کی اور ناز و تکبر کی ہوگی کہ دیکھا ہم

نے کیسی اچھی تدبیر کی ورنہ یہ ہمیانی کیسے ملتی۔ تو ان دونوں میں پہلی خوشی محمود ہے اور دوسری مذموم اسی طرح تبلیغ کی کامیابی پر اضطراری خوشی کا تو مضائقہ نہیں باقی اپنی تدابیر اور مساعی کو سوچ سوچ کر خوش ہونا کہ ہم نے یوں کہا تو اچھا اثر ہوا۔ یہ مذموم ہے۔ بہر حال ہم کو کوشش کرنی چاہئے اور نتیجہ خدا کے سپرد کرنا چاہئے اور ناکامی پر مغموم نہ ہونا چاہئے اور کامیابی پر اترانا نہیں چاہئے کام شروع کر دو۔ اس کے سب راستے خود کھل جاویں گے بقول مولانا رومی ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید
خیرہ یوسف وار مے باید دوید

(اگرچہ عالم میں نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے مگر یوسف علیہ السلام کی طرح دوڑنا یعنی کوشش تو کرنی چاہئے۔)

یعنے جب زلیخا نے یوسف علیہ السلام کو قصر مسبع میں بند کیا تھا تو اس وقت وہ زلیخا کے پاس سے بھاگے تھے۔ حالانکہ محل کے سات دروازے تھے اور ساتوں دروازوں میں زلیخا نے قفل ڈلوا دیئے تھے اور یہ بھی آپ کو معلوم تھا مگر چونکہ نبی تھے اس لئے آپ نے یہ سمجھا کہ گو دروازے مقفل ہیں مگر جتنا میرا کام ہے وہ تو میں کروں۔ کم سے کم دروازے تک تو بھاگوں۔ چنانچہ بھاگے۔ اب جس دروازے کے پاس پہنچتے تھے قفل خود بخود ٹوٹ کر گر پڑتا تھا۔ اسی طرح ساتوں دروازے کھل گئے اور یہ بچ گئے۔ مولانا اسی کو یاد دلاتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید
خیرہ یوسف وار مے باید دوید

(اگرچہ عالم میں نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے مگر یوسف علیہ السلام کی طرح کوشش تو کرنی چاہیئے۔)

تو بس تم بھی دوڑو اور یوں سمجھو کہ نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اُسی کے فضل سے سب کچھ ہوگا۔ پھر اگر کوشش کی اور تمہاری کوشش سے لوگ ازدواد سے بچ گئے تو ناز مت کرنا بلکہ شکر کرنا۔

غرض یہ دونوں درجے مطلوب نہیں یعنی ایک یہ کہ کوشش ہی نہ کرے دوسرا یہ کہ کوشش پر کامیابی کو لزوماً مرتب سمجھے۔ جیسے سوداؔ نے اُن لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے خود بھی کام نہیں کرتے اور کام کرنے والوں کو یہ الزام دیتے ہیں کہ میاں تم نے کیسا کام کیا جو نتیجہ مفید نہ نکلا۔

سوداؔ قمار عشق میں شیریں سے کوہ کن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے رُوسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

قدرت و استطاعت

مگر اس کوشش کے لئے ایک شرط بھی ہے یعنی استطاعت۔ اور یہ سب کچھ میں انہی کاموں کے لئے بیان کر رہا ہوں جو اسباب ظاہرہ کی رُو سے اپنی قدرت میں ہوں۔ یہ سب کوشش اور کوشش پر اجر اور دوسرے

کام ایسے ہی کاموں کے لیئے ہیں اور ایک وہ کام ہیں جو اسباب ظاہرہ کی رو سے اپنی قدرت و استطاعت سے باہر ہیں۔ ان کے لئے کوشش کرنا فضول ہے، نہ ماموربہ اور نہ ایسی کوشش پر کچھ اجر۔

مثلاً کوئی شخص سورج کو قبضہ میں کرنے کے لیئے آسمان کی طرف کودا کرے اور یہ سمجھے کہ اگر کبھی گر کے مروں گا تو شہید مروں گا تو یہ محض خبط ہے کیونکہ یہ فعل اُس کی قدرت و استطاعت سے باہر ہے۔ اس لئے اس سے بجائے اجر کے بازپرس ہوگی۔

حدیث شریف میں ہے کہ لَا یَنْبَغِیْ لِلْمُؤْمِنِ اَنْ یُّذِلَّ نَفْسَہٗ یعنے مومن کو مناسب نہیں کہ اپنے نفس کو ذلیل کرے۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مومن اپنے کو کس طرح ذلیل کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یَتَحَمَّلُ مِنَ الْبَلَاءِ مَا لَا یُطِیْقُہٗ۔ ایسی بلا اپنے ذمہ لے لے جس کی تحمل کی طاقت نہیں ہے۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ جہاں جہاں خطرہ ارتداد رونما ہے۔ کوشش سے پہلے یہ دیکھے کہ وہاں جانا اور تبلیغ کرنا حساً و قانوناً آپ کی قدرت میں ہے یا نہیں۔ اسی طرح یہ بھی دیکھو کہ اس میں چندہ دینا حساً یا قانوناً کوئی جرم تو نہیں جب ان باتوں کا اطمینان ہو جاوے تو پھر یہ متعارف تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں اور اس کے بعد نتیجہ سے کچھ بحث نہ کرنا چاہیئے کیونکہ وہ دوسرے کا فعل ہے اور قادر بقدرت غیر قادر نہیں ہوتا۔ ایسی غیر مقدور چیز کے پیچھے پڑنا محض غلو ہے جس کی اسلام کو حاجت نہیں۔ اب دو چار ہزار کے

ارتداد کی خبر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر پندرہ بیس لاکھ بھی خدانخواستہ مرتد ہو جاویں تو اسلام میں کچھ کمی نہیں آسکتی ہے ؎

چراغے را کہ ایزد بر فروزد　　　　ہر آنکس تف زند ریشش بسوزد

(جو چراغ اللہ تعالیٰ روشن کریں جو شخص اس کو پھونک سے بجھائے اس کی داڑھی جلے۔)

اگر کوئی کوشش کے متعلق یہ کہے کہ جب اللہ میاں ہی دین کی حفاظت کریں گے تو ہمیں کوشش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہاں تو پھر قرآن بھی حفظ مت کیا کرو کیونکہ انہوں نے اس کی حفاظت کا تو خاص طور پر وعدہ کیا ہے۔ اللہ میاں کی حفاظت کا مطلب یہی تو ہے کہ ہمیں حفظ کرنے کا حکم دیا ہے تو ہمیں اس پر عمل کرنا چاہئے۔ پس یہ سب حفاظت میں داخل ہے۔

اس حفظ کرنے پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ بعض فرقوں میں حفظ قرآن کی توفیق نہیں ہوتی ان میں سے کانپور میں ایک شخص کا یہ مقولہ سنا تھا کہ ہم اس واسطے قرآن حفظ نہیں کرتے تاکہ ہم اور اللہ میاں برابر نہ ہو جائیں میں نے کہا کہ وہ تمہارا ہی خدا ہو گا جس کے برابر ہر حافظ ہو سکے ہمارے خدا کے برابر تو کوئی نہیں ہو سکتا چاہے کوئی کتنا ہی کمال حاصل کرے پھر اگر اس خیال سے حفظ قرآن ترک کیا گیا ہے تو علم کو بھی ترک کیا ہوتا تاکہ مساوات لازم نہ آوے۔ مہمل اور لغو باتیں ——— ! اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ نعوذ باللہ۔ اللہ میاں ہمارے سے بڑا بنانے سے بنے ہوئے ہیں

بلکہ حق تعالیٰ کی اس صفت پر نظر کر کے تو اور زیادہ حفظ کا اہتمام کرنا چاہئے تاکہ تخلق باخلاق الٰہیہ (اللہ تعالیٰ جیسی عادتیں اختیار کرنا) نصیب ہو۔ چنانچہ اللہ میاں نے اپنی تقلید واتباع کا بعض افعال میں حکم بھی دیا ہے۔ فرماتے ہیں

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔

یعنے اللہ اور اس کے فرشتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں پس اے مومنو تم بھی درود بھیجو۔

اب یہاں کہو کیا کہتے ہو کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ جب اللہ میاں درود بھیجتے ہیں تو ہم کیوں بھیجیں۔ اس میں تو برابری ہو گی بلکہ یہی کہو گے کہ اب تو ہمیں اور زیادہ صلوٰۃ وسلام کا ورد کرنا چاہئے۔ جب اللہ میاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اتنی عظمت فرماتے ہیں تو ہم کس شمار میں ہیں۔

اس پر مجھے وطن کا اپنے بچپن کا ایک قصہ یاد آیا۔ ہمارے والد باوجود ثروت ودولت کے منکسر المزاج بہت تھے۔ ایک مرتبہ برسات میں گھر پر تھے کہ وہ خود ہی چھت پر گھانس چھیلنے کو جانے لگے اور مجھ سے فرمایا تم بھی چلو تائی صاحبہ نے فرمایا، جوان بیٹے سے ایسا کام نہیں لیا کرتے۔ انہوں نے مان لیا اور تنہا خود چھت پر چڑھ گئے۔ اس وقت تائی صاحبہ نے کہا کہ جب تمہارے باپ گھاس چھیلنے گئے ہیں تو اب تمہیں بھی جانا چاہئے۔

تو اسی طرح یہاں سمجھو کہ محافظت اسلام کا کام جب اللہ میاں خود کرتے ہیں تو بندہ کو ضرور کرنا چاہئے۔ اور اگر اس شخص کی بیہودہ بات مان

لی جائے تو لازم آوے گا کہ کوئی اچھی بات نہ کریں کیونکہ وہ تو اللہ میاں بھی کرتے ہیں۔ بس سب بُرائیاں ہی بُرائیاں کرنا چاہئیں کیونکہ وہ اللہ میاں نہیں کرتے۔ نعوذ باللہ! خدا کی پناہ ہے ایسی جہالت سے۔ بس یہ تو بندہ کو سمجھنا چاہیئے کہ جب ہمارا کام وہ خود بھی کرتے ہیں تو ہم خود کیوں نہ کریں مگر یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہم نہ کریں گے تو یہ کام اٹکا پڑا رہے گا۔ ہرگز نہیں وہ فرماتے ہیں۔

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ

یعنی اگر تم اسلام کی حفاظت وخدمت نہ کروگے تو وہ تمہاری جگہ ایک دوسری قوم کو قائم کردیں گے، جو تمہاری سی (نافرمان) نہ ہوگی۔

نعوذ باللہ! حق تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں۔

ہماری کوتاہیاں

باقی اس عالم امتحان میں اُن کی عادت یہ ہے کہ وہ ہمارے کام کسی ظاہری واسطہ سے کیا کرتے ہیں اور یہ ہماری سعادت ہے کہ ہم اُن کاموں کا واسطہ بنیں۔

بہرحال اس وقت یہ فتنے اسلام کے مٹانے کے دوسری قوموں کی طرف سے پیش آرہے ہیں جس کی سب مسلمانوں کو مجتمع ہوکر مدافعت کی کوشش کرنا چاہیے۔ یہاں کانپور میں بھی چند باحمیت مسلمانوں نے اس کام کا ارادہ کیا ہے مگر اس کے لئے سامان وسرمایہ کی ضرورت ہے تاکہ

مبلغین اس سرمایہ سے وہاں جاویں اور اسلام سے اعدائے دین کی تہمتوں کو ہٹادیں۔ اور چونکہ اس قسم کے کام میں عادۃ اللہ یہ ہے کہ اکثر غربا ہی کے ہاتھوں کی برکت سے انجام پاتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اگر چندہ کیا جاوے تو اس میں اُن کو بھی شریک کریں۔ نیز جو لوگ خود جاکر تبلیغ نہیں کرسکتے وہ اپنے پیسے ہی کو اپنا قائم مقام کردیں اور اس میں قلیل وکثیر سے مت شرماوے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی دیکھ بھال نہیں ہے کہ کس کے روپے زیادہ ہیں۔ وہاں تو نیت اور خلوص کی دیکھ بھال ہے ممکن ہے کہ تمہارے خلوص کی بدولت ایسی کامیابی ہوجاوے کہ آئندہ اس کوشش ہی کی ضرورت نہ رہے مگر میرے نزدیک یہ کام اتنا ضروری ہے کہ بطور حفظ ماتقدم کے اُسے ہمیشہ جاری رکھنا چاہئے کیونکہ مسلمانوں میں بعض جگہ اس قدر جہالت بڑھی ہوئی ہے کہ مُردے تک بلا نماز جنازہ کے دفن کردیتے ہیں حالانکہ وہ ایسے نام کے مسلمان نہیں ہوتے جیسے یہ لوگ ہیں جن میں ارتداد کا اندیشہ ہے تاہم احکام کی تبلیغ اور تعلیم نہ ہونے سے اُنہیں بھی کچھ خبر نہیں۔

مجھے نام کے مسلمانوں پر یہیں نواح کانپور میں موضع گجنیر کا ایک واقعہ یاد آیا۔ میں نے وہاں جاکر خود دیکھا کہ وہ برائے نام ہی مسلمان ہیں میں نے اُن سے پوچھا کہ میاں تم کون لوگ ہو، مسلمان ہو؟ کہنے لگے ہم کیوں ہوتے مسلمان۔ میں نے کہا، اچھا تو ہندو ہو؟ کہنے لگے ہم کیوں ہوتے ہندو

ع
از مذہب من گبر و مسلماں گلہ دارند

(میرے مذہب سے گبر و مسلماں گلہ رکھتے ہیں) میں نے کہا آخر پھر کیا ہو کہنے لگے ہم نومسلم ہیں۔ گویا اُن کے خیال میں نومسلم ہندو اور مسلمان کے درمیان میں تیسری قسم ہے۔

ایک مرتبہ ہم لوگ وہاں کے زمیندار سے ملے اور انہیں شربت دیا گیا تو نہیں پیا کہ مسلمان کے ہاتھ کا شربت پینے میں ہم اپنی برادری میں بدنام ہو جاویں گے۔

ایک مرتبہ ایک مبلغ کو وہاں ایک گاؤں میں بھیجا چونکہ ان لوگوں سے روٹی دینے تک کی امید نہ تھی اس لئے ان مبلغ سے کہا گیا کہ بھئی ستو باندھ کر لے جاؤ تو اُن لوگوں نے ستو گھولنے کے لئے اپنے برتن تک نہ دیئے۔ اُن بیچاروں نے رومال پر ستو رکھ کر اُن پر پانی چھڑک کر تب کھایا۔

دراصل یہ ہماری کوتاہی ہے کہ ہم لوگوں کو نومسلموں کی تعلیم کا اہتمام ہی نہیں ہے۔ شہروں میں مدرسے بھی ہیں یتیم خانے بھی ہیں سب کچھ ہے مگر کوئی نومسلم خانہ نہیں ہے۔ اگر کبھی کسی کو مسلمان بھی کیا تو بڑی بڑائی یہ کی کہ اُسے ایک پرچہ لکھ کر دے دیا کہ بھئی مانگ اور کھا۔ اگر ایسا ہوتا کہ کم از کم چھ مہینے تو اُس کو اپنے پاس رکھتے اور ضروری عقائد اور ضروری اعمال نماز روزہ وغیرہ سکھاتے تو کیسا اچھا ہوتا مگر اس کا ذرا بھی اہتمام نہیں۔ اب تو بس مسلمان بنا کر سانڈ کی طرح چھوڑ دیتے ہیں اسی طرح کے یہ لوگ بھی معلوم ہوتے ہیں کہ ان کو بھی کسی نے یوں ہی

مسلمان بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ اُن کو کبھی تعلیم و تلقین نہیں کی گئی اور نہ اُس کے بعد پھر کوئی اُن کا پرسان حال ہوا نہ کوئی واعظ اُن کے پاس گیا۔ کیونکہ ہم لوگ جہاں پلاؤ قورمہ کی امید ہوتی ہے وہاں تو خوب دوڑ کر جاتے ہیں اور ایسی جگہ جہاں ستو گھول کر کھانا پڑے جانے کی ہماری ہمت نہیں ہوتی۔

بہر حال انتظام کے ساتھ ایک جماعت قائم کر کے وہاں ہم کو جانا چاہیے اور کام کرنا چاہیے۔ اگر یہ طریقہ تبلیغ و اشاعت کا ہندوستان میں جاری ہو جاوے تو پھر اُسے امریکہ و یورپ تک وسعت دینی چاہیے اور وہاں بھی اپنے مبلغین بھیجنا چاہئیں مگر پہلے ہی دن اونچے نہ اڑو۔ اوّل ہندوستان کی تو خبر لو۔ بہر حال یہ بہت ضروری کام ہے۔

اب اس میں چند کوتاہیاں اور بھی ہوتی ہیں اُن کا مختصر بیان کیا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ بسا اوقات جو مبلغ ہوتے ہیں خود اُن کی حالت درست نہیں ہوتی اور اس سے بھی بڑے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے کیونکہ جب اُستاد ہی ناقص ہو گا تو شاگرد تو اور بھی انقص ہو گا۔ تو سب سے پہلے مبلغ کو اپنے عمل کی اصلاح ضروری ہے تاکہ اُن پر اثر اچھا پڑے۔

یہ خطا تو اہل علم کی تھی اب ایک خطا اور کوتاہی عوام کی ہے۔ وہ یہ کہ ان کا کام سرمایہ جمع کرنا تھا۔ پھر مولوی اُس سرمایہ سے سفر کرتے۔ اور پھر چونکہ اُن کے ساتھ اپنی ضروریات بھی تھیں۔ مثلاً وہاں تبلیغ کے لئے جائیں تو اپنے پیٹ کو کہاں رکھ کر آویں بیوی بچوں کو کیا کریں۔ اس لئے ضرورت تھی سرمایہ سے اُن کی مدد کی جاتی تاکہ یہ بے فکری سے کام کر سکیں

مگر عوام کو اس کا احساس ہی نہیں۔

ایک صاحب مجھ سے ملے اور کہنے لگے ارے صاحب یہ ساری خطا مولویوں کی ہے کہ انہوں نے ان لوگوں کی کبھی خبر نہ لی۔ میں نے کہا پہلے تو تمہاری خطا ہے کہ تم نے سرمایہ جمع کر کے اُن کو نہیں دیا۔ آخر مولوی کام کریں تو بیچارے کہاں سے کریں۔ اس میں سرمایہ ہی تو بلی کی میاؤں ہے لیکن عوام کے ساتھ اس میں تھوڑا سا قصور مبلغین کا بھی ہے۔ وہ یہ کہ جہاں سرمایہ کا انتظام بھی ہوا ہے وہاں بے دریغ روپیہ اڑا دیتے ہیں مثلاً خود اپنے پیسے سے بجائے تھرڈ میں بھی سفر نہ کریں گے مگر چندہ کا پیسہ ایسا مفت کا ہے کہ اب سیکنڈ سے کم نہیں بیٹھ سکتے۔

بہرحال ان سب کوتاہیوں سے احتیاط کر کے سرمایہ ضرور جمع کرنا چاہیئے۔ سرمایہ ہی اصلی چیز ہے۔ بدون اس کے نری تجویز ایسی بیکار ہے جیسے ایک دفعہ بہت سے چوہے جمع ہوئے۔ اُنہوں نے سوچنا شروع کیا کہ کوئی تدبیر ایسی ہو سکتی ہے کہ بلی کو پکڑ لیں کیونکہ یہ ہم کو بہت جانی نقصان پہنچاتی ہے۔ چنانچہ مشورہ ہونے لگا۔ اُنہوں نے کہا کہ سب مل کے ایک ایک عضو کو پکڑ لیں۔ ایک نے کہا میں ہاتھ پکڑ لوں گا۔ ایک بولا میں ٹانگ پکڑ لوں گا۔ کسی نے گردن پکڑنے کو کہا وعلیٰ ہذا۔ وہاں ایک بڈھا چوہا بھی تھا وہ کچھ نہیں بولا۔ جب اُس سے پوچھا گیا کہ تم کیوں نہیں بولتے اُس نے کہا کہ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ سب کچھ تو تم پکڑ لو گے مگر اس کی میاؤں کو کون پکڑے گا جس وقت وہ میاؤں کرے گی تم سب بھاگ جاؤ گے

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ایک اور قصہ ہے کہ ایک قصائی مر گیا تھا۔ اُس کی بیوی برادری کے سامنے اپنے خاوند کو یاد کر کے رونے لگی کہ ہائے اب اس کی دکان کون چلائے گا۔ تو ایک صاحب بولے میں چلاؤں گا میں۔ ہائے اُس کے کپڑوں کو کون پہنے گا۔ وہی بولا میں پہنوں گا میں۔ کہا اُس کی چھریاں کون لے گا۔ وہ بولا میں لوں گا میں۔ اُس نے کہا، ہائے اس کا قرضہ کون ادا کرے گا۔ تو کہنے لگا بولو، بھئی! اب کس کی باری ہے۔ کیا سب کام میں اکیلا ہی کروں۔

نیز مثال ہے کہ دو رفیق سفر میں ہمراہ ہوئے۔ کہیں منزل پر ٹھہرے تو ایک رفیق نے کہا کہ بھئی کنوئیں سے پانی میں بھروں، لکڑی تم جنگل سے لے آؤ۔ اُس نے کہا بھائی مجھ سے کچھ نہ ہو گا۔ خیر اُس نے خود ہی دونوں کام کر لیے۔ اب کہا مسالہ تم پیس لو کھانا میں پکا لوں گا۔ کہنے لگا یہ بھی مجھ سے نہ ہو گا۔ اُس نے یہ بھی کر لیا۔ اب جب کھانا پک گیا تو اُس نے کہا اچھا آؤ کھا تو لو۔ کہنے لگے اب ہر بات میں تمہاری کہاں تک مخالفت کروں۔ لاؤ کھا تو لوں۔

تو ایسے ہی جنٹلمین بھی چاہتے ہیں کہ سب کام تو مولوی کر لائیں اور یہ خالی حکومت کرنے کو بیٹھے رہیں۔ دیکھو سارا کام سرمایہ کا ہے اور سرمایہ جمع کرنا مولویوں کا کام نہیں بلکہ اس شخص کا کام ہے جو پچاس روپے اپنے پاس سے دے تب پانچ روپے چندے کی تحریک دوسروں

سے کریں۔ غرض مولویوں کا کام سرمایہ جمع کرنا نہیں۔ مولویوں کا کام وعظ کہنا ہے اور رؤسا کا کام ہے چندہ جمع کرنا ہے۔ پھر دونوں مل کر کام میں لگیں۔ کام تو اسی طرح ہوتا ہے باقی باتیں بنانا سب کو آتی ہیں۔

سب سے پہلے بڑے لوگوں کو سرمایہ جمع کرنے کے لئے اٹھنا چاہئے لیکن اُن کے چندہ جمع کرنے میں ایک اور مصیبت ہے۔ وہ یہ کہ چندہ جمع کرنے کون کھڑے ہوئے، منصف صاحب، جج صاحب، ڈپٹی کلکٹر صاحب، تحصیلدار صاحب، تھانیدار صاحب، تو لوگ انہیں مارے ڈر کے چندہ دیں گے کہ کہیں یہ عدالت میں کسر نہ نکالیں، مقدمہ نہ خراب کردیں۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ جتنا آزادی میں خوشی سے دیتے اب اُن کے دباؤ سے بہت زیادہ دیں گے۔ یاد رکھو اس طرح سے چندہ لینا بالکل حرام ہے۔ مناسب یہ ہے کہ رؤسا میں جو اہل حکومت ہیں وہ چندہ نہ کریں بلکہ ذی وجاہت لوگ جن کا حکومت میں بالکل دخل نہیں ہے، چندہ کریں۔ ہاں اگر ایسا ہو کہ کوئی شخص ان اہل حکومت سے اتنا بے تکلف ہو کہ صاف انکار بھی کرسکے تو ایسے لوگوں کا چندہ اہل حکومت بھی لے لیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

ایک کوتاہی بعض مبلغین کی (جیسا اوپر مذکور ہوا اور اب مکرر ایک اور مضمون کی تمہید کے لئے بیان کرتا ہوں) یہ ہے کہ وہ چندہ میں اسراف بہت کرتے ہیں۔ سیکنڈ کلاس میں سفر کرتے ہیں اور جو کام خط سے نکل سکتا ہے اس کے لئے تار پر تار جا رہے ہیں۔ اسٹیشن پر برف

لیمینیڈ پی رہے ہیں۔ چائے بسکٹ بھی اڑ رہا ہے۔ چاہے اپنے پاس سے ایک دفعہ بھی ایسے کاموں میں پیسہ خرچ نہ کرتے۔ مگر چندہ کا پیسہ ایسی بیدردی سے تباہ کرتے ہیں۔ واللہ مولویوں کی نسبت ایسے واقعات سن کر بہت رنج ہوتا ہے کہ یا اللہ ان پر علم کا کیسا الٹا اثر ہوا۔ علماء کو اس سے بہت ہی احتراز کرنا چاہیئے۔ یہ طریقے تو لیڈروں ہی کے واسطے چھوڑ دینے چاہیئیں۔

اب اس پر ایک تفریع کرتا ہوں کہ جب یہ معلوم ہوگیا کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو چندہ کے روپے کا درد نہیں رکھتے تو اب مسلمانوں کو دو کام اور بھی کرنا چاہیئیں۔

ایک تو یہ کہ یہ چندہ ایسے شخص کے پاس جمع کرنا چاہیئے جس پر خیانت کا احتمال نہ ہو۔

دوسرے یہ کہ چندہ کا صرف ایسے شخص کے مشورہ سے ہونا چاہیئے جو متقی اور عالم ہو مسائل فقہیہ شرعیہ کا ماہر ہو۔ اور وہ ایسا ہو کہ سب اسی کے تابع ہوں۔

یہ بات اصول شرع واسلام سے ہے کہ کام دراصل ایک ہی شخص کی رائے سے ہوتا ہے اور اپنی اعانت کے لئے وہ دوسروں کی رائے بھی لے لیتا ہے۔ اس مشورہ سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ معاملہ کے سب پہلو اسے مستحضر ہو جاتے ہیں۔ جب سب پہلو نظر میں آجاویں تو اس کا کام یہ ہے کہ ان میں سے جو پہلو خود انتخاب کرے اسی کا حکم

دے دے۔ یہ بھی طریق مشروع و معقول ہے۔

مگر اب یہ حالت ہو رہی ہے کہ اگر کسی کام کے لئے انتخاب کریں گے تو اُسے جو مالدار ہو اور اُس کے ذریعہ سے چندہ خوب آسکتا ہو۔ ایسے شخص کو چندہ جمع کرنے کے کام پر مقرر کرنا تو مضائقہ نہیں مگر سارے کام اُسی کے سپرد کر دینا خواہ وہ نرا جاہل ہی ہو حماقت اور بیوقوفی ہے۔ انتخاب اس شخص کا کرنا چاہیئے جو طامع نہ ہو، کسی سے ڈرتا نہ ہو، عالم ہو متقی ہو۔

چنانچہ میں نے اُس جماعت کو جو یہاں کام کرنے کے لئے آمادہ ہوئی ہے یہی رائے دی ہے۔ اب اُن میں آپس میں میرا یہ مشورہ پیش ہوگا پھر جیسا طے ہو عمل کیا جاوے گا لیکن جب تک کوئی مستقل تحویلدار منتخب ہو کام تو بند رکھنا چاہیئے۔ اس کے متعلق میں نے یہ رائے پیش کی ہے کہ اُس وقت تک کے لئے ڈاکٹر عبدالصمد صاحب کو تحویلدار مقرر کر دیا جاوے۔ چنانچہ انہوں نے چندہ جمع کرنے کا اہتمام شروع کر دیا ہے میں نے اُن سے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ رسیدیں بھی چھپوا لی جاویں اور جب تک رسیدیں چھپ کر تیار نہ ہوں محصل چندہ سادہ کاغذ پر یادداشت لکھ کر اہل عطا کو دے دیا کرے اور کہہ دے کہ فلاں تاریخ تک باقاعدہ چھپی ہوئی رسیدیں آجاویں گی۔ اُس وقت آکر اسے بدل لے جانا۔ یہ سب تو میری تنہا رائے ہے۔ اب یہاں کارکنوں کی جو مرضی ہو وہ کریں پھر اس کے بعد جو کام جتنا جس سے ہو سکے وہ اس کام میں شرکت کرے

اگر کسی کے پاس علم اور روپیہ بھی نہیں ہے تو زبان تو ہے اُسی سے کام کرو یعنی لوگوں کو اس کام کی رغبت دلاؤ ؎

لَا خَیْلَ عِنْدَكَ تُهْدِیْهَا وَلَا مَالُ
فَلْیُسْعِدِ النُّطْقُ اِنْ لَمْ یُسْعِدِ الْحَالُ

(گھوڑے اور مال تو تمہارے پاس نہیں ہیں کہ اُن کو ہدیہ میں پیش کیا جا سکے تو زبان ہی سے خدمت کرو۔)

غرض پہلے تو جان سے خدمت کرو یعنی وہاں جا کر تبلیغ کرو۔ اگر یہ نہ کر سکو تو روپیہ پیسہ کو اپنا قائم مقام بنا کر مال سے خدمت کرو۔ اگر اس کی بھی وسعت نہ ہو تو زبان سے خدمت کرو۔ وہ یہ کہ اپنے اہل وسعت دوستوں اور عزیزوں سے کہو۔ اگر اُن سے بھی کہنے کی ہمت نہ ہو تو پھر اللہ میاں سے کہو یعنے دُعا کرو کہ اے اللہ! مسلمانوں پر فضل فرمایئے اور اسلام کی نصرت فرمایئے۔ حق کو حق اور باطل کو باطل ظاہر کر دیجئے۔

اگرچہ میں نے یہ کام بتایا سب مضامین سے آخر میں ہے، مگر ہے یہ سب سے بڑا۔ اور یہ نہ سمجھنا کہ جب یہ سب سے بڑا ہے تو پھر اس کے ہوتے ہوئے اور سب کام چھوڑ دیئے جاویں۔ جیسا بعض جوشیلے لوگ ایک ہی طرف چل دیتے ہیں۔ سو میں کہتا ہوں کہ اگر یہی بات ہے تو ایک جاہل شاہ صاحب کی بات بھی ماننا پڑے گی جو نماز نہ پڑھتے تھے اور دلیل میں یہ آیت پیش کرتے تھے وَلَذِکْرُ

اللہِ اَکْبَرُ (اور البتہ اللہ کا ذکر بہت بڑا ہے) تو بس کہنے لگے کہ اب ہم اللہ اللہ ہی کیا کریں گے۔ نہ نماز کی ضرورت رہی نہ روزہ کی۔ میں نے کہا کسی کام کے بڑا ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اور چھوٹے کاموں سے پہلو تہی کر لو۔

دیکھو تمہارے تین بیٹوں میں سے ایک اگر زیادہ کام کا ہے، تو کیا دو کا گلا گھونٹ دو گے ہرگز نہیں۔ پس وَلَذِکْرُ اللہِ اَکْبَرُ کے معنی یہ ہیں کہ اس سے قرآن و نماز کی فضیلت ثابت کی گئی ہے لِاَنَّہٗ ذِکْرُ اللہِ (اس کے لئے کہ وہ اللہ کا ذکر ہے) اس لئے کہ یہ بھی ذکر اللہ ہیں۔ وَلَذِکْرُ اللہِ اَکْبَرُ اور اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے تو نماز سب سے بڑی چیز ہوئی۔ بس اب آگے شاہ صاحب کے چلنے کی جگہ ہی نہیں رہی۔ کیونکہ اب تو اس کی تفسیر میں دو احتمال ہو گئے۔ ایک یہ کہ ذکر اللہ سے مراد نماز ہی ہو جیسا اوپر ذکر ہوا۔ دوسرے یہ کہ محض ذکر متعارف یعنی اللہ اللہ کرنا مراد ہوا۔ اب ذکر اللہ سے مراد جزماً صرف اللہ اللہ ہی کرنا نہیں رہا بلکہ اس میں نماز کا احتمال بھی پیدا ہو گیا اور دوسرے دلائل سے یہ صرف احتمال ہی نہیں رہا بلکہ واقع میں بھی ایسا ہی ہے۔

دُعا اور تدبیر

اسی طرح دُعا کے متعلق بعضوں کو ایسی ہی غلطی ہو رہی ہے۔ سو اس کو بھی سمجھو۔ اس کے بڑا ہونے کے معنی بھی یہی ہیں کہ اور تدابیر سے مانع نہیں ہے کیونکہ دُعا میں وہ تدابیر بھی داخل ہیں۔ ایک دعائے قولی

ہے ایک دعائے فعلی ہے اور اگر واقع میں یہی معنی ہیں جو تم سمجھتے ہو
تو پھر نکاح بھی نہ کرو اور کہہ دو ہم کو شاہ صاحب کی دعا پر اعتماد ہے۔
اولاد کی تو ہم کو بڑی تمنا ہے مگر نکاح نہیں کریں گے۔ بس یوں ہی کسی طرح
دعا سے اولاد ہو جاوے گی۔ کیونکہ اگر نکاح سے اولاد ہوئی تو پھر خدا
کی قدرت ہی کیا ہوئی۔ صاحب اپنی دعا کے بھروسے کبھی تم نے ایسا بھی
کیا ہے کہ جتنی تدبیریں ہو سکیں سب کرو اور پھر دعا بھی کرو اور محض تدبیر
پر بھروسہ نہ کرو۔ بھروسہ دعا ہی پر کرو۔ اس کی نظیر میں مولانا فرماتے ہیں ؎

گفت پیغمبر بآوازے بلند — بر توکل زانوئے اشتر بہ بند
گر توکل مے کنی در کار کن — کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

(پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو (جو اونٹ پر سوار ہو
کر آیا تھا اور دروازۂ مسجد پر اس کو بٹھایا تھا) بآواز بلند فرمایا
(صرف توکل مت کرو) بلکہ توکل کے ساتھ اونٹ کا زانو بھی
رسی سے باندھ دو۔ پس اگر توکل کرو تو کام کے اندر توکل کرو
پھر اسباب کے اندر اثر بخشنے میں اور ان پر مسبب ہونے
پر، اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرو۔)

یہ مضمون مذکورہ حدیث شریف کا ہے کہ ایک اعرابی نے پوچھا
جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم سے کہ اونٹ باندھ کر توکل کروں
یا خدا کے بھروسہ پر کھلا رہنے دوں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا اعقل ثم توکل کہ باندھ پھر خدا پر بھروسہ کر۔ تو یہ ہے توکل اب

اس میں رسی پر نظر کرنا الحاد اور بد دینی ہے۔ اور محض خدا کے بھروسہ پر اسباب کا قطع کرنا حماقت وجہل ہے اور دونوں کا جمع کرنا عقل اور توکل ہے۔ یہ ہے حقیقت توکل کی۔

اب خلاصہ وعظ کا ذکر کر کے ختم کرتا ہوں۔ وہ خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جہاں دنیا کی مذمت اور آخرت کی فضیلت بیان فرمائی ہے اس کا مقصود یہ ہے کہ اپنی آخرت کی فکر کرو اور آخرت کی فکر یہ ہے کہ اپنے اور اپنے اہل و عیال کی اور اپنے بھائیوں کی سب کی اصلاح کرو اب میں ختم کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ سے دعا فرمایئے کہ وہ ہمیں فہم و عقل کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین!

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی وَسَلَّمَ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ آخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

ہندستانی لائبریری
گارڈن ریچ روڈ۔ مٹیابرج۔ کلکتہ

العشر

وجوبِ عُشر کے متعلق یہ وعظ ۲۹ ر رجب ۱۳۳۱ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں ہوا، جو ۲½ گھنٹہ میں ختم ہوا۔ حاضری ۴۰ کے قریب تھی۔ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے اسے قلمبند کیا۔

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل
علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا
من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ
ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد
ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہٗ ورسولہ صلے اللّٰہ تعالیٰ
علیہ وعلیٰ الہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم۔ اما بعد۔ فاعوذ
باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم
وَھُوَ الَّذِیْ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ
مُخْتَلِفًا اُکُلُہٗ وَالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِھًا وَّغَیْرَ
مُتَشَابِہٍ کُلُوْا مِنْ ثَمَرِہٖ اِذَا اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّہٗ یَوْمَ
حَصَادِہٖ وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ۔

ہندستانی لائبریری
گارڈن ریچ روڈ۔ ٹیا برج۔ کلکتہ

HINDUSTANI LIBRARY
Estd. 1939
ہندستانی لائبریری
Garden Reach, Calcutta.

شرعی قیود

مجھ کو اس وقت بہت مختصر اور ضروری مضمون بیان کرنا ہے۔ ہر چند کہ مضمون دو ہیں مگر گویا ایک ہی ہیں۔ کیونکہ ایک کو دوسرے کے ساتھ ارتباط و مناسبت ہے پس دونوں مل کر واحد کے حکم میں ہیں۔

حاصل مضمون کا یہ ہے کہ اس وقت اکثر لوگ زمین کی پیداوار غلہ اور اناج اپنے گھر میں لے آئے ہیں اور لوگ اس سے منتفع ہو رہے ہیں اور ان کے متعلق کچھ شرعی احکام ہیں، جن کا معلوم کرنا اور علم کے بعد عمل کرنا ہر مسلمان کے ذمہ جو ان کا مخاطب ہو ضروری ہے۔ دوسرے اس وقت باغوں کو پھل آ رہا ہے اور اس کے متعلق بھی احکام شرعی ہیں، کیونکہ شرعی احکام ایسے وسیع ہیں کہ اُن کے احاطہ سے کوئی حالت اور کوئی کام باہر نہیں۔ کوئی بڑا کام ہو یا چھوٹا ہر ایک کے متعلق شریعت کا کوئی حکم ضرور ہے خواہ اباحت ہو یا کراہت، حلت ہو یا حرمت، وجوب ہو یا

فرضیت۔ غرض انسان آزاد نہیں کیا گیا کہ اپنی رائے سے جو چاہے کرے یا جو چاہے سمجھ لے۔

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی

کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اُس کو آزاد چھوڑ دیا جائے گا۔ نہیں نہیں! بلکہ وہ علم اور عمل دونوں کے لحاظ سے مقید ہے خواہ وہ قید اطلاق ہی ہو مگر قید ضرور ہے اور یہ میں نے اس لئے کہہ دیا (کہ خواہ وہ قید اطلاق ہی ہو) تاکہ لوگ ڈریں نہیں کہ ہمارا بال بال بندھا ہوا ہے تو ہم کو کیا خاک راحت ہو سکتی ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ شرعی قیود سے آپ کی راحت سلب نہیں ہوتی کیونکہ بجز فواحش اور معاصی کے دیگر امور شرعیہ میں حکم اباحت واطلاق ہی ہے، فرائض وواجبات معدودے چند ہیں زیادہ حصہ مباحات کا ہے۔ اس لئے میں نے کہہ دیا کہ خواہ وہ قید اطلاق ہی ہو تاکہ سامعین کو ضیق نہ ہو۔ اگر زیادہ احکام میں حرمت و وجوب کا حکم ہوتا تو واقعی ضیق ہوتی۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ شریعت میں زیادہ حصہ مباحات ومندوبات ومستحبات کا ہے جن کا حاصل اطلاق ہے۔ شریعت کا مقصود بندوں کو ضیق میں ڈالنا نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ خدا کے بندے اور غلام بن کر رہو۔ جہاں وہ آزادی دیں آزاد رہو اور جہاں پابند کر دیں پابند ہو جاؤ۔

مثلاً کھانے پینے میں چند چیزوں کی ممانعت ہے غیر کا مال نہ کھاؤ، رشوت وسود نہ لو، مردار اور خبیث چیزیں نہ کھاؤ۔ اس کے

بعد طیبات سب حلال ہیں جو قاعدے کے موافق حاصل کی جائیں اور استعمال میں لائی جائیں۔ اگر موازنہ کیا جائے تو وسعت کا حصہ زیادہ ملے گا۔

اسی طرح لباس میں حریر مردوں کو حرام ہے اور کفار و فساق اور عورتوں کے ساتھ تشبہ ممنوع ہے اس کے بعد سب قسم کے لباس جائز ہیں بشرطیکہ اسراف اور تکبر کو دخل نہ دیا جائے۔ اسی لئے حضرت ابن عباس کا مقولہ ہے کُلْ مَا شِئْتَ وَالْبَسْ مَا شِئْتَ مَا اَخْطَأَتْکَ اِثْنَتَانِ اَلْاِسْرَافُ وَالْمَخِیْلَۃُ۔ اسراف میں سب ممنوع لباس آ گئے کیونکہ ان سب میں حد سے تجاوز ہے یہی قید ترک اسراف و خیلاء کی سب جگہ ہے مگر بعض لوگ شیخ سعدی کے شعر ؎

در عمل کوش ہرچہ خواہی پوش　　　تاج بر سر نہ و علم بر دوش

کو عام لیتے ہیں کہ جو چاہو پہنو۔ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ ہرگز مراد نہیں کیونکہ اس مطلب سے تو خود سعدیؒ متروک ہو جائیں گے نہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام۔ جس شخص کا کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے خلاف ہو خود اُس کے لینے کے دینے پڑ جائیں گے حضورؐ کے احکام باطل نہیں ہو سکتے۔ اس لئے سعدیؒ کے شعر کو عموم پر محمول کرنا غلط ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ عمل کی درستی کے ساتھ خواہ لباس فقیری ہو یا لباس امیری سب جائز ہے بشرطیکہ شرعاً مباح ہو۔ پس سعدی کا مقصود مباحات میں وسعت دینا ہے نہ کہ محرمات میں چنانچہ

آگے دوسرے مصرع میں اس کی تفسیر موجود ہے کہ خواہ امیرانہ لباس پہنو یا غریبانہ دونوں جائز ہیں۔ اب اس شعر کا حاصل وہی ہے، جو ابن عباسؓ کے قول کا حاصل ہے۔ مَا اَخْطَاكَ اثْنَتَانِ الْاِسْرَافُ وَالْمَخِيْلَةُ۔

بہرحال میرا مقصود یہ ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں آزادی کے احکام زیادہ ہیں۔ مگر وہ آزادی بھی شریعت ہی کی طرف سے ہے ہماری اپنی طرف سے نہیں کیونکہ واقع میں انسان اپنی فہم و عمل میں آزاد نہیں ہے بلکہ شریعت کے احکام کا مقید ہے اگرچہ وہ قید اطلاق ہی ہو۔

اصطلاحات شرعیہ و دلالت لفظیہ

پس اس وقت جو دو حالتیں درپیش ہیں ایک کھیتی سے انتفاع دوسرے باغ سے انتفاع، ان کے متعلق بھی شریعت کے کچھ احکام ہیں۔ اس وقت میں وہ احکام بیان کرنا چاہتا ہوں اور سہولت و اختصار کے لیے میں اس مضمون کا وہ عنوان بھی بتلا دینا چاہتا ہوں جو شریعت میں اس کے لیے موضوع ہے کیونکہ شریعت نے مختلف احکام کے لیے اپنی اصطلاح میں خاص خاص نام مقرر کیے ہیں جس کا فائدہ یہ ہے کہ اگر یہ اصطلاح نہ ہوتی تو نماز کے بتلانے کے لیے ایک لمبی عبارت بولنا پڑتی۔ مثلاً یوں کہتے کہ وہ عبادت کرو جس کے لیے وضو شرط ہے اور قبلہ کی طرف منہ کرکے اللہ اکبر کہنے سے شروع ہوتی اور قیام و رکوع

وسجود وقعود خاص طریقہ سے ادا کر کے السلام علیکم ورحمۃ اللہ پر ختم ہوتی ہے پس شریعت کا یہی بڑا احسان ہے کہ اس نے احکام کے واسطے اصطلاحات مقرر کر دیں کہ اب لمبی عبارت بولنا نہیں پڑتی۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ نماز پڑھو وقت جا رہا ہے۔

مجھ کو اس مختصر عنوان اور مطول عنوان پر ایک واقعہ یاد آیا۔ ہمارے استاد مولانا فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن سے میں نے ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں، وہ ایک مرتبہ مظفر نگر تشریف لے گئے اور ایک بیمار طالب علم کے متعلق اپنے نائب مدرس کو وصیت کر گئے کہ ان کا خیال رکھنا پھر مولانا نے بذریعہ خط کے ان صاحب سے پوچھا کہ ان طالب علم کے درد سر کا کیا حال ہے۔ اس پر ان صاحب سے پوچھا، تمہارے درد سر کا کیا حال ہے۔ اس نے ہاتھ کی انگلیاں دو تین بار ملا کر کھول کر کہہ دیا کہ میرا سر اس طرح کرتا ہے۔ اب آپ خط میں لکھتے ہیں کہ اس کے درد سر کا یہ حال ہے کہ رؤس اصابع خمسہ کو ملائیے پھر ان کو حالت انبساط کی طرف لے جائیے پھر حالت انقباض کی طرف لائیے اور اسی طرح کئی بار کیجئے۔ مگر لکھ کر کچھ خوش نہ ہوئے ایک ظریف شاعر کو مشورہ کے لئے سنایا۔ انہوں نے کہا حضرت اتنا لکھ دیا ہوتا کہ اس کا سر پلپر پلپر کرتا ہے۔

واقعی غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وضع الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک رحمت ہے اور بہت بڑا انعام ہے اگر دلالت لفظیہ نہ

ہوتی تو مصیبت ہو جاتی۔

چنانچہ ایک شخص کی حکایت مشہور ہے کہ اُس کو الفاظ کی آمد کم تھی۔ اکثر باتوں کو اشارہ سے بتلایا کرتا تھا۔ اتفاق سے ایک دن وہ ہرن گیارہ درہم کو خرید کر لایا۔ کسی نے پوچھا کتنے میں لائے تو عدد کے الفاظ تو یاد نہ رہے اپنے ہرن کا رسہ بائیں ہاتھ میں پکڑ کے داہنے ہاتھ کی پانچ انگلیاں کھڑی کیں۔ پھر منہ میں رسہ تھام کر پانچ انگلیاں دو کھڑی کیں۔ اب ایک رہ گیا اس کے لیے زبان باہر نکال دی۔ وہ ہرن بھاگ گیا۔

اگر الفاظ موضوع نہ ہوتے تو بڑی مصیبت ہوتی۔ دور کیوں جایئے اگر شہروں کے اور آدمیوں کے نام مقرر نہ ہوتے اور کسی آدمی کے آنے کی خبر دینا چاہتے تو اُس کا سارا حلیہ بیان کرنا پڑتا اور اگر حلیہ کے الفاظ بھی موضوع نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ کہہ سکتے۔ پس لغات والفاظ بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے اور یہ انعام ہمارے اوپر ہر وقت ہے جس سے ہم بالکل غافل ہیں۔ شاید ہی کوئی شخص ہوگا جس کو اس نعمت پر شکر کرنے کی توفیق ہوتی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس نعمت پر ہم کو متوجہ فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ

اسی طرح شرعی الفاظ بھی ہیں کہ اُن میں بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا ظہور ہے بلکہ دوسرے الفاظ سے ان میں رحمت کا ظہور زیادہ ہے

کیونکہ ہم اگر کسی آدمی کو نماز یا روزہ یا زکوٰۃ کی ترغیب دیں تو ہم کو ثواب ملتا ہے۔ مگر یہ ترغیب، الفاظ ہی پر تو موقوف ہے۔ اگر الفاظ نہ ہوتے تو بتانا اور رغبت دلانا دشوار ہو جاتا۔ پھر ثواب کیسے ملتا۔ دوسرے الفاظ کے نہ ہونے سے تو صرف دنیوی تکلیف ہوتی اور الفاظ شرعیہ کے نہ ہونے سے ثواب آخرت سے محرومی ہو جاتی۔ اس لیے ان میں رحمت کا ظہور زیادہ ہے۔ اسی لیے جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اکثر احکام شرعیہ کے لیے خاص خاص اصطلاحیں مقرر فرمادیں تاکہ فہم وتفہیم میں آسانی ہو۔ چنانچہ اس مضمون کے لیے بھی جس کا اس وقت بیان ہوگا شریعت نے ایک اصطلاح مقرر کی ہے اس کو یاد رکھو کیونکہ اب میں اسی عنوان کو اختیار کرکے احکام بیان کروں گا۔

عقل اور روزی

پس سنئے کہ شریعت میں اس حق کو جو پیداوار زمین پر مقرر کیا گیا ہے عشر کہتے ہیں۔ اگرچہ یہ لفظ اصطلاح شرح میں دسویں حصہ اور بیسویں حصہ دونوں کو شامل ہے مگر یہ اصطلاح و لغت کا فرق ہے کہ جو لفظ لغۃً خاص تھا اور اصطلاح شریعت میں اس کو عام کر دیا گیا جیسے حضرات چشتیہ کی اصطلاح میں ایک وظیفہ کا نام بارہ تسبیح ہے حالانکہ اس میں تیرہ تسبیحیں ہیں۔ ممکن ہے کہ شروع میں بارہ ہی تسبیحیں ہوں گی۔ اب تیرہ ہیں اور نام وہی ہے۔

اب سمجھئے کہ زکوٰۃ مال کی طرح زمین کی پیداوار میں عشر واجب ہے

جس کے دو محل ہیں ایک حبوب دوسرے ثمرات۔ ان کے علاوہ بعض اشیاء اور بھی ہیں جن میں عشر واجب ہے جیسے دواؤں کی کھیتی جب کہ استقلالاً آمدنی کے لئے بطور کھیت کے بویا ہو ورنہ قدرے قلیل میں نہیں مگر دواؤں کی مستقل کاشت ہمارے دیار میں بہت کم ہے۔ یہاں محل عشر عادۃً دو ہی ہیں، ایک تو حبات دوسرے جنات ہیں یعنے باغات۔ اس کے متعلق حکم یہ ہے وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ط اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرو ان کے کاٹنے اور پھل توڑنے کے وقت۔

مقصود تو مجھے صرف اسی جملہ کا بیان کرنا تھا۔ مگر پوری آیت میں نے تبرکاً پڑھ دی ہے کیونکہ آیت کو ناقص پڑھنا خلاف اولیٰ ہے، بے ادبی ہے۔ بہر حال اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے ایک تو ان نباتات کی فہرست شمار فرمائی ہے جن میں عشر واجب ہے۔ پھر ادائے عشر کا حکم فرمایا ہے اور اس کو شروع اس عنوان سے کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے، پھر خدا کے نام پر خرچ کرتے ہوئے اور اس کا حق نکالتے ہوئے جان کیوں نکلتی ہے۔ حبوب وثمرات کی پیداوار ایسی ہے کہ اس میں تو آدمی کو مجازاً بھی پیدا کرنے والا نہیں کہتے۔ نقود و جائداد ومال واسباب میں تو مجازاً انسان کو پیدا کرنے والا کہتے ہیں۔ مثلاً یوں کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے بہت جائداد پیدا کی ہے۔ اس میں تو زکوٰۃ نکالتے ہوئے اس لئے جان نکلتی ہے کہ آدمی اپنے کو اس کا گویا پیدا کرنے والا سمجھتا ہے ـــــــ!

چنانچہ قارون ملعون کو بھی یہی شبہ ہوا تھا۔ جب مسلمانوں نے اس سے کہا، وَاَحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ کہ جیسا خدا تعالیٰ نے تجھ پر احسان کیا ہے تو بھی مخلوق پر احسان کر اور مال کی زکوٰۃ دے۔ تو وہ جواب میں کہتا ہے اِنَّمَا اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِىْ کہ اس مال کو تو میں نے اپنے سلیقہ سے پیدا کیا ہے۔

بعض لوگوں نے اس علم کی تفسیر کیمیا سے کی ہے مگر اس کی ضرورت نہیں کیونکہ بعض آدمیوں کو اپنی تدبیر و سلیقہ سے بھی تجارت میں نفع ہوتا ہے مگر کبھی وہ تدبیر الٹی بھی ہو جاتی ہے۔ انسان کی تدبیر و سلیقہ مؤثر حقیقی کسی طرح نہیں ہے محض امارت و علامت ہے۔ اس سے غرور میں پڑ جانا حماقت ہی حماقت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قارون کے جواب میں فرماتے ہیں۔

اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ط

یعنے یہ جو اپنے علم وغیرہ پر غرہ کرتا ہے پاگل ہوا ہے۔ کیا اس کو خبر نہیں کہ ہم نے اس سے پہلے کتنے مالدار و مضبوط اور قوی لوگ ہلاک کر دیئے ہیں۔ جواب کا حاصل یہ ہوا کہ اگر یہ مال کے پیدا کرنے پر قادر ہے تو اس کے تھامنے اور روکنے پر بھی قادر ہونا چاہیئے مگر تھامنے پر کوئی قادر نہیں۔ مال کو تو کیا تھامتے خود اپنے کو نہیں تھام سکتے۔ اور اس کے لئے ہمارے پاس بڑی دلیل ہے۔ وہ یہ کہ قارون سے زیادہ قوی اور مضبوط لوگ اپنے مال کو تھامنے پر قادر نہیں تھے۔ بلکہ اپنی جان کو بھی

نہ تھام سکے۔ جب موت کا وقت آیا سارا جمع کیا ہوا مال دوسروں کے لئے چھوڑ کر چل دیئے۔ پس قارون کی حماقت ہے کہ وہ اپنے مال وغیرہ کو اپنی لیاقت وسلیقہ کا ثمرہ سمجھتا ہے۔ درحقیقت دینے والا خدا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ جب انسان کسب کرتا ہے تو اُس میں اللہ تعالیٰ اثر دے دیتے ہیں۔ اس کے کسب کو بالذات کوئی دخل نہیں۔ اگر خدا تعالیٰ کی مشیت مساعد نہ ہو تو پھر انسان کچھ نہیں کر سکتا چنانچہ رات دن کا مشاہدہ ہے کہ بڑے بڑے علم وعقل والے تنگدست ہوتے ہیں اور جاہل بے وقوف تجارت وزراعت میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اسی کے متعلق شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

اگر روزی بدانش درفزودے ز ناداں تنگ تر روزی بودے

بناداں آنچناں روزی رساند کہ دانا اندراں حیراں بماند

یعنے اگر عقل پر روزی کا مدار ہوتا تو بے وقوف تو بھوکوں مرجاتے مگر مشاہدہ یہ ہے کہ بعض دفعہ بلکہ زیادہ تر نادانوں کو اس قدر مال ودولت مل جاتا ہے کہ عقلمند کو اس میں حیرت ہو جاتی ہے۔ خود اپنے یہاں دیکھ لو کہ جو قصبہ عقلا کا مشہور ہے، جیسے تھانہ بھون وہاں زیادہ لوگ غریب مفلس ہیں اور جن قصبوں کو بیوقوفوں کی بستی کہا جاتا ہے وہاں اکثر لوگ دنیا میں خوشحال اور بڑے بڑے عہدوں پر ہیں۔

مولانا نے مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک بدوی اونٹ پر سوار تھا۔ تجارت کا مال لا رہا تھا مگر اتنا بے وقوف تھا کہ ایک گون

خالی ہو گیا تو آپ نے وزن برابر کرنے کے لئے اس کے مقابل دوسرے گون کو بالو سے بھر دیا۔ ایک شخص نے راستہ میں اس کی یہ حرکت دیکھ کر کہا کہ میاں اونٹ کو بوجھ سے کیوں مارتے ہو۔ ایک گون کا سامان دونوں گونوں میں بھر لو۔ اونٹ کو بھی راحت ہو گی اور تمہاری منزل بھی جلد قطع ہو جائے گی۔ یہ تدبیر سُن کر آپ بہت خوش ہوئے اور تدبیر بتانیوالے کا بہت شکریہ ادا کیا اور بالو کو پھینک کر ایک گون کے سامان کو دو گونوں میں تقسیم کیا۔ اس کے بعد مشورہ دینے والے کے حال پر رحم کیا اس کو پیادہ پا دیکھ کر اپنے ساتھ اونٹ پر سوار کیا۔ مگر اس کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ جُوتا بھی ٹوٹا ہوا ہے۔ بدوی کو حیرت ہوئی کہ میں تو بے وقوف اور مال دار اور یہ شخص اتنا عاقل اور تنگ دست۔ پھر خیال ہوا کہ شاید سفر میں کپڑے ساتھ نہ ہوں گے۔ گھر سے نکلے ہوئے مدت زیادہ ہو گئی ہو گی۔ اس واسطے یہ حال ہے اور اپنے گھر پر یہ بھی میری طرح بلکہ مجھ سے زیادہ مالدار ہو گا۔ دریافت کرنا چاہیے۔

چنانچہ گفتگو شروع ہوئی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے بدوی نے مسافر سے دریافت کیا کہ تمہاری مالی حالت کیسی ہے؟ کتنے اونٹ ہیں کتنے گھوڑے ہیں، نقد کتنا ہے؟ مسافر نے ہر بات کا نفی میں جواب دیا کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ یہ سُن کر بدوی بولا کہ معلوم ہوتا ہے تیری عقل منحوس ہے کہ تجھ کو افلاس میں مبتلا کر رکھا ہے۔ میں ایسے منحوس

کو اپنے اونٹ پر بھی بٹھلانا نہیں چاہتا کہ کہیں وہ نحوست مجھ کو نہ لگ جائے۔ یہ کہہ کر اونٹ پر سے اتار دیا۔ پھر کہنے لگا کہ ایسے منحوس کی رائے پر عمل بھی کرنا پسند نہیں کرتا۔ کہیں تمہاری عقلی تدبیر میرے حق میں منحوس نہ ہو جائے۔ مجھے میری حماقت ہی مبارک رہے۔ یہ کہہ کر دونوں گونوں کا سامان ایک میں کر لیا اور دوسرے کو بالو سے بھر کر اونٹ پر سوار ہو گیا۔

حضرت اس معاملہ کو دیکھ کر بہت سے عاقل پریشان ہو گئے اور بعضوں نے ایمان تک کھو دیا ہے کہ یہ کیا بات ہے کہ احمق مالدار اور عاقل تنگ دست۔ اسی کو ایک شاعر کہتا ہے ؎

کَمْ عَاقِلٍ عَاقِلٍ اَعْیَتْ مَذَاهِبُهٗ
وَجَاهِلٍ جَاهِلٍ تَلْقَاهُ مَرْزُوْقًا

هٰذَا الَّذِیْ تَرَكَ الْاَوْهَامَ حَائِرَةً
وَصَیَّرَ الْعَالِمَ النِّحْرِیْرَ زِنْدِیْقًا

(بہت سے عاقل ہیں جو رائے و تدابیر سوچتے سوچتے عاجز آ گئے اور بہت سے جاہل ہیں جو آسانی سے روزی حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ مراد بعض جاہل وہ ہیں کہ تمام اوہام کو جنہوں نے ترک کر دیا اور بہت سے تجربہ کار عالم زندیق ہو گئے)

مگر جو صاحب بصیرت ہیں وہ اس پر راضی ہیں۔ چنانچہ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے ؎

رَضِینَا قِسْمَۃَ الْجَبَّارِ فِینَا
لَنَا عِلْمٌ وَ لِلْجُہَّالِ مَالٌ!

فَاِنَّ الْمَالَ یَفْنیٰ عَنْقَرِیبٍ
وَاِنَّ الْعِلْمَ بَاقٍ لَا یَزَالُ

(ہم اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم سے جو اُس نے ہمارے لئے کی ہے راضی ہیں کہ ہمارے لئے علم اور جاہلوں کے لئے مال کیونکہ مال بہت جلد ختم ہو جانے والی شے اور علم کبھی زائل نہ ہوگا۔)

اہمیت علم و معرفت

حق تعالیٰ کی بڑی حکمت ہے کہ کسی کو عقل دی کسی کو مال۔ جن لوگوں کو عقل کی قدر نہیں وہ اس تقسیم سے راضی نہیں اور جن کو اس کی قدر ہے وہ دل و جان سے اس تقسیم پر راضی ہیں۔

ایک بزرگ کی حکایت ہے جس کو اس لئے بیان کرتا ہوں تاکہ اندازہ ہو جائے کہ بعض لوگوں کو اپنے علم و معرفت اور عقل کی اس لئے قدر نہیں ہوتی کہ نعمت مفت میں حاصل ہے۔ اگر یہ نعمت سلب کر لی جائے تو قدر عافیت معلوم ہو جائے۔ اسی لئے مشہور ہے، قدر عافیت بعد زوال۔ ایک بزرگ تھے بڑے عارف بڑے کامل، مگر تنگ دست تھے۔ فقر و فاقہ بہت تھا ––––––،

اس پر مجھے شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کا فقر یاد آگیا کہ شیخ کا

خرقہ جو زیارت کے لئے ہر سال نکلتا ہے وہ اُن کے شیخؒ کا عطیہ تھا چالیس سال تک شیخؒ کے بدن پر رہا۔ چالیس سال تک دوسرا خرقہ نہیں پہنا کیونکہ میسر نہ تھا۔ بس اسی کو دھو کر پہن لیا۔ کہیں سے پھٹ گیا تو پیوند لگا لیا۔ آج اس میں نہ معلوم کتنے پیوند لگے ہوئے ہیں۔ ایک بزرگ نے شیخ پر تعریض کی تھی کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اپنا زہد ظاہر کرنے کے لئے ایک ہی کپڑا برسوں پہنے رہتے ہیں۔ اور پیوند پہ پیوند لگاتے رہتے ہیں۔ اس پر شیخؒ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم مجھے دوسرا کپڑا میسر نہیں آیا۔ اس لئے اس کو نہیں بدلا۔

شاید آپ لوگوں کو تعجب ہوا ہو گا کہ اس زمانہ کے مرید کیسے تھے جنہوں نے اپنے پیر کی خدمت نہ کی کہ ایک خرقہ کے سوا ان کو دوسرا خرقہ میسر نہیں آیا۔ مگر صاحبو! بات یہ ہے کہ اُس زمانے کے پیر آج کل کے پیروں جیسے نہ تھے۔ حضرت شیخؒ سے سلطان ابراہیم لودھی اور ان کی ہمشیرہ بیعت تھیں مگر شرط یہ کر لی تھی کہ بادشاہ کبھی ہدیہ نہ دے اور کبھی میری زیارت کو نہ آئے۔ کبھی میں خود دہلی آ جاؤں تو ملاقات کا مضائقہ نہیں۔ شیخ تارک الدنیا تھے متروک الدنیا نہ تھے۔ دنیا ان کے قدموں کو لپٹتی تھی اور وہ اس کو دھکے دیتے تھے۔

الحمد للہ آج کل بھی ایسے بزرگ ہوئے ہیں۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ سے بیگم بھوپال نے بیعت کی درخواست کی تو مولانا نے اس شرط سے درخواست منظور کی تھی کہ کبھی ہدیہ نہ دیں اور کبھی گنگوہ نہ آئیں۔ طالب

دنیا پیر تو بڑا خوش ہوتا کہ سونے کی چڑیا پھنسی مگر یہ حضرات دنیا پر لات مارتے تھے۔

غرض وہ بزرگ عارف تھے مگر فقر و فاقہ سے تنگ تھے۔ اسی حالت میں ایک دن آپ کا گزر ایک شہر پر ہوا جس کا دروازہ شہر پناہ دن دہاڑے بند تھا اور پہرہ چوکی لگا ہوا تھا۔ آپ نے اس کا سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ بادشاہ کا باز اڑ گیا ہے اس لیئے حکم دیا ہے کہ شہر پناہ کے سب دروازے بند کر دیئے جائیں تا کہ نکل نہ جائے۔ یہ بزرگ بہت ہنسے کہ عجب بے وقوف بادشاہ ہے۔ بھلا باز کو دروازے سے نکلنے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر آپ نے نماز میں آکر اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا کہ ایسے بے وقوف کو بادشاہی دی اور ایک ہم ہیں کہ باوجود علم و معرفت کے جوتیاں چٹخارتے پھرتے ہیں ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

وہاں سے بطور جواب کے الہام ہوا کہ بہت اچھا کیا تبدیل پر راضی ہو کہ اس بادشاہ کو تمہارا فقر مع علم و معرفت کے دے دیا جائے اور تم کو اس کی بادشاہی مع حماقت و غفلت کے دے دی جائے۔ یہ سن کر کانپ ہی تو گئے اور فوراً سجدہ میں گر پڑے کہ میں اس پر ہرگز راضی نہیں۔ میں اپنی دولت معرفت کو سلطنت ہفت اقلیم کے عوض بھی دینا نہیں چاہتا۔ ارشاد ہوا کہ پھر اس غریب کی ذرا سی برائے نام نعمت پر

آپ کو کیوں رشک آیا۔

صاحبو۔۔۔ یہ علمِ معرفت واللہ ثم واللہ وہ چیز ہے کہ ؎

قیمت خود ہر دو عالم گفتۂ   نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

مگر یہاں اس کی قیمت اس لئے ظاہر نہیں ہوتی کہ یہاں اس کا بازار نہیں ہے۔ ہر چیز کا الگ بازار ہے۔ اناج کی منڈی میں اناج کی قیمت ملتی ہے اور صراف خانہ میں چاندی سونے کی اور جوہری بازار میں ہیرے جواہرات کی۔ اگر کوئی اناج کی منڈی میں ہیرے جواہرات لے کر جائے تو اسے ایک سیر اناج بھی نہ ملے گا بلکہ اس کو جوہری بازار میں جانا چاہئے۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ دہلی میں ایک لڑکا ایک شاعر سے شعر گوئی سیکھتا تھا۔ کبھی کبھی استاد اس کو اپنی کوئی غزل یا قصیدہ لکھواتا اور یہ کہہ دیتا کہ اس غزل کا فلاں شعر ایک ہزار روپے کا ہے اس قصیدہ کا مطلع ایک لاکھ روپے کا ہے۔ شاگرد بڑا خوش ہوتا اور شوق سے استاد کے اشعار لکھتا رہتا۔ ایک دن اس کی ماں نے کہا کہ اتنا بڑا ہو گیا۔ کیا کرتا ہے نہ کچھ کماتا ہے نہ کام کرتا ہے۔ لڑکے نے کہا، اماں جان! تم بے فکر رہو۔ میرے پاس بڑا خزانہ جمع ہو گیا ہے۔ استاد نے مجھے ایسے ایسے اشعار لکھوائے ہیں جن میں کوئی ایک ہزار روپے کا ہے کوئی لاکھ روپیہ کا ہے۔ ماں نے کہا اچھا ہم کو ہزار لاکھ کی تو ضرورت نہیں آج سالن پکانے کے لئے ترکاری کی ضرورت ہے۔ دو پیسے کے آلو

لادے۔ لڑکے نے کہا کہ یہ کونسی بڑی بات ہے۔ ابھی لاتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ بازار گیا اور کنجڑے سے دو پیسے کے آلو مانگے۔ اُس نے پیسے مانگے آپ نے کہا کہ پیسے تو نہیں ہیں۔ ہم تم کو سو روپے کا ایک شعر دیتے ہیں کنجڑا ہنسنے لگا اور کہا جاؤ شعر تو شاعروں کو سناؤ۔ ہمارے پاس تو پیسہ لاؤ گے تو آلو ملیں گے۔ لڑکا بہت مایوس ہوا اور غصہ میں بھرا ہوا استاد کے پاس پہنچا کہ لیجیے اپنی بیاض مجھے آپ کی شاگردی کی ضرورت نہیں آپ نے مجھے بہت دھوکا دیا کہ یہ شعر ہزار کا ہے، دو ہزار کا ہے، لاکھ روپے کا ہے۔ بازار میں تو کوئی اُس کو دو پیسہ میں بھی قبول نہیں کرتا۔ استاد ہنسا اور کہنے لگا، صاحبزادے تم کون سے بازار میں گئے تھے؟ کہا ترکاری کی منڈی میں۔ اُستاد نے کہا، یہی تو تمہاری غلطی ہے۔ وہ بازار اس کی قیمت دینے والا نہیں۔ اس کا بازار دوسرا ہے۔ اچھا آج بادشاہ کے ہاں مشاعرہ ہے۔ بڑے بڑے شعراء قصائد لکھ کر لے جائیں گے تم ہمارا فلاں قصیدہ لے کر جاؤ اور کہہ دو کہ میں نے یہ قصیدہ بنایا ہے پھر دیکھو اس کی قیمت کیا ملتی ہے۔

چنانچہ لڑکا استاد کے کہنے سے دربار شاہی میں پہنچا۔ بڑے بڑے شعراء کے مجمع میں ایک نو عمر بچے کو دیکھ کر بادشاہ نے دریافت کیا کہ یہ بچہ کس لئے آیا ہے۔ لڑکے نے عرض کیا کہ حضور میں بھی ایک قصیدہ لکھ کر لایا ہوں۔ جس کو بارگاہ عالی میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ بادشاہ نے اجازت دی کہ بہت اچھا، پہلے تم ہی اپنا قصیدہ سنا دو۔ اُس نے قصیدہ

پڑھنا شروع کیا تو اُس کی فصاحت و بلاغت سے بادشاہ اور تمام درباری دنگ رہ گئے کہ یہ عمر اور یہ کلام۔ جب ہر شعر پر خوب داد مل چکی تو بادشاہ نے دس ہزار روپیہ نقد اور بیش قیمت جوڑا اور ایک قیمتی گھوڑا مع ساز و سامان کے انعام دیا۔ اب اس کی آنکھیں کھلیں کہ واقعی اُستاد سچا تھا۔ میری ہی نادانی تھی کہ ان جواہرات کو ترکاری کے بازار میں لے گیا۔ دیہاتی گنوار ان کی قدر کیا جانیں۔

صاحبو — یہی مثال ان لوگوں کی ہے جو اپنی باطنی دولت اور علم و معرفت کی قیمت دنیا کے بازار میں ڈھونڈھتے ہیں اور جب اہل دنیا کے بازار میں ان کے کمال کی قدر نہیں ہوتی، تو دل گیر و رنجیدہ ہونے لگتے ہیں۔ ارے ذرا ٹھہرو۔ ایک دوسرا بازار آنے والا ہے وہاں تمہارے اس جوہر کی قیمت ملے گی۔ اور بخدا تمام سلاطین اس وقت تمہاری غلامی کے بھی لائق نہ ہوں گے۔ اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا مِنْهُمْ۔

پس حق تعالیٰ کی یہ تقسیم عین حکمت ہے کہ اہل عقل کو مال کم دیا اور کم عقلوں کو مالدار بنا دیا۔ کیونکہ کم عقل جب اتنی بڑی دولت سے محروم ہیں تو کیا وہ چند روز دنیا میں بھی بہار نہ دیکھ لیں۔ پس قارون کے خیال کی غلطی آپ کو معلوم ہو گئی کہ اُس نے مال و دولت کو اپنی سعی سے پیدا کیا ہوا سمجھا۔ حالانکہ یہ نہ سعی پر ہے نہ علم و سلیقہ پر بلکہ خدا کی عطا پر ہے اور نقد میں تو کسب کے سبب کچھ دھوکا بھی ہوتا ہے

زمین کی پیداوار کو تو عام طور پر کوئی بھی اپنا پیدا کیا ہوا نہیں سمجھتا۔ اس کے اسباب تو ظاہراً بھی غیر اختیاری ہیں۔

حقوق اللہ

اسی کو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو چیز ہماری دی ہوئی ہماری پیدا کی ہوئی ہے۔ اس کو ہمارے نام پر خرچ کرتے ہوئے کیوں جان نکلتی ہے پس ارشاد ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ

خدا ہی تو ہے جس نے باغات پیدا کیے دو قسم کے بعض وہ جو بیلوں پر پھیلتے ہیں (جیسے انگور وغیرہ) اور بعضے وہ جو بیلوں پر نہیں پھیلتے۔ (بلکہ تنے پر کھڑے ہوتے ہیں) اور کھیتی کو پیدا کیا اور کھجور کو جس کے مزے مختلف ہوتے ہیں اور زیتون اور انار کو پیدا کیا جن میں بعضے ملتے جلتے ہیں اور بعضے ملتے جلتے نہیں ہیں۔

اس کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ مجموعہ کے اعتبار سے فرمایا ہے کیونکہ زیتون اور انار کے پتے تو یکساں ہیں مگر پھل مختلف ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ ہر ہر واحد کے اعتبار سے فرمایا ہے کہ زیتون زیتون میں بھی تشابہ اور اختلاف ہوتا ہے اور انار انار میں بھی۔ اس کے بعد ارشاد ہے کہ جب پھل آجائے تو اس کو کھاؤ کام میں لاؤ اور اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کرو پھل کاٹنے کے وقت۔ کیونکہ جب سب کچھ خدا کا پیدا کیا ہوا ہے تو پھر اس کے نام پر خرچ کرتے

ہوئے کیوں جان نکلتی ہے۔

ارے بے وقوفو! اگر یہ کھیتی اور پھل پیدا ہی نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ اس وقت تم اپنے گھر میں کیا لے آتے؟ ابھی کا قصہ ہے کہ ایک گاؤں میں آگ لگ گئی تو ساری کھیتی جل کر خاک سیاہ ہو گئی۔ اسی لئے اسی کو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اَفَرَاَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۝ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝

بتلاؤ تم جو کھیتی کرتے ہو تو کیا تم اس کو پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو اس کو (جلا پھونک کر سکھا کر) ریزہ ریزہ کر دیں۔ پھر حیرت زدہ ہو کر کہنے لگو کہ اب کے تو بڑے خسارہ میں رہے بلکہ محروم ہی رہ گئے

واقعی آدمی کیا کر سکتا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ خصوصاً زراعت میں کہ اس کا معاملہ تو بالکل توکل پر ہے۔ آدمی روپیہ جمع کر سکتا ہے، بیج کا انتظام کر سکتا ہے۔ بالدی لکیرے لگا سکتا ہے مگر ٹڈیوں کا کیا انتظام کر سکتا ہے پالے اور اولے کا کیا بندوبست کر سکتا ہے۔ اسی طرح باغ کا پھر کبھی اندھا ہو جاتا ہے اس کا کیا انتظام کر سکتا ہے۔ غرض کھیت اور باغ کا معاملہ اور مدار بالکل توکل پر ہے۔ اگر تم خدا کے حق میں کوتاہی کرو گے توڑتے رہو کہیں خدا تعالیٰ بھی تمہارے حق میں کمی نہ کر دیں اور جو کچھ صدقہ

براہ کرم ورق نہ موڑیں

زکوٰۃ تم دیتے ہو وہ تو مجازاً خدا کا حق کہلاتا ہے ورنہ حقیقت میں وہ تمہارے ہی نفع کے واسطے مقرر کیا گیا ہے تاکہ دنیا میں تمہارے مال میں برکت ہو اور آخرت میں تم کو ثواب ملے۔ قرآن کریم میں ایک واقعہ بھی ایسے لوگوں کا مذکور ہے، جو خدا کا حق ادا کرنے سے جان چراتے تھے۔

قصہ یہ ہے کہ ایک شخص کھیتی باڑی اور باغ والا تھا۔ اس کی یہ عادت تھی کہ جب کھیت کاٹتا یا باغ کا پھل توڑتا تو غریبوں کیواسطے ایک حصہ الگ کر دیتا جو اللہ واسطے تقسیم کیا جاتا۔ جب غریبوں کو اس کی یہ عادت معلوم ہو گئی تو وقت پر خود ہی اس کے کھیت اور باغ پر جمع ہو جاتے اور وہ خوشی کے ساتھ ان کا حق نکال کر دے دیتا ایک عرصہ کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ تو اس کے لڑکوں نے کہا کہ ہمارا باپ بے وقوف تھا۔ جو مسکینوں کو اپنی محنت کی پیداوار میں سے ایک معقول حصہ دے دیا کرتا تھا۔ ہم ایسا نہیں کریں گے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہم تو محنت کریں مشقت کریں اور بڑی مصیبت کے بعد مصیبت کا پھل دیکھیں اور یہ غریب لوگ بیٹھے بٹھائے ہمارے مال میں حق دار بن جائیں۔

مگر اس زمانہ میں کچھ آنکھ میں شرم و لحاظ بہت تھا۔ اس لئے ان لڑکوں کو یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ اگر غربا حسب عادت جمع ہو گئے منہ توڑ کے جواب دینا بھی ممکن نہیں۔ اس لئے کوئی ایسی صورت کرنا چاہیئے

کہ غریبوں کے آنے سے پہلے ہی باغ اور کھیت کے کاٹنے سے فراغت ہو جائے بالآخر یہ طے پایا کہ صبح کو سویرے چلیں گے تاکہ غریبوں کے آنے سے پہلے خفیہ طور سے غلہ کاٹ کر لے آئیں۔ اس رائے پر سب کا اتفاق ہو گیا۔ مگر ایک لڑکے نے اختلاف کیا۔ اس نے کہا کہ باپ کے طریقہ کو نہ بدلنا چاہیے۔ کیونکہ غرباء کو خیرات دینے سے اپنا ہی بھلا ہے اور اس سے کچھ کمی نہیں آتی۔ آخر ہمارا باپ بھی تو خیرات ہمیشہ کرتا رہا اور کبھی اس کو پریشانی کا سامنا نہیں ہوا لیکن اس ایک کی رائے نہ چلی۔ کثرت رائے پر یہی فیصلہ ہوا کہ سویرے چل کر غریبوں کے آنے سے پہلے باغ اور کھیت کاٹ لینا چاہیے یہ رائے طے کر کے چلے مگر وہاں یہ معاملہ ہوا کہ نیت بدلتے ہی خدا تعالیٰ کا معاملہ بدل گیا اور راتوں رات باغ اور کھیت پر عذاب نازل ہوا کہ ایک آگ آئی اور ساری کھیتی اور باغات کو جلا پھونک کر رکھ گئی۔ جب یہ لوگ وہاں پہنچے اور باغ اور کھیت کو جلا ہوا پایا تو اول تو یہ خیال ہوا کہ شاید راستہ بھول کر کسی دوسرے کھیت پر آگئے ہمارا کھیت یہ نہیں ہے مگر جب صبح کی روشنی پھیل گئی تو معلوم ہوا کہ اپنا ہی کھیت اور اپنا ہی باغ ہے مگر جلا ہوا ہے۔

اب کہنے لگے کہ ہماری تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ پھر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگا۔ کہ تیری بری رائے کا نتیجہ ہے۔ دوسرے کے کہا، تیرے مشورہ کا ثمر ہے۔ اب وہ لڑکا بولا جس نے اس تدبیر سے

مخالفت کی تھی اور کہنے لگا کہ آپس میں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے سے کیا نفع! اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو تو امید ہے کہ خدا اس سے بہتر کھیت اور باغ ہم کو دے دے۔ اب سب نے توبہ کی اور آئندہ کے لئے باپ کے طریقہ پر چلنے کا عہد کیا، تو دفعتہً سارا باغ اور کھیت ہرا بھرا ہو گیا۔

صاحبو ـــــ صدقہ خیرات سے مال کم نہیں ہوتا۔ اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کنواں کہ اگر اس میں سے پانی نکلتا رہے بھرائی ہوتی رہے تو پانی کی آمد ہوتی رہتی ہے اور اگر بھرائی نہ ہو تو کچھ دنوں کے بعد سوت بند ہو جاتا اور کنواں سوکھ جاتا ہے۔

حدیث میں ہے مَا نَقَصَ الْمَالُ مِنْ صَدَقَةٍ قَطُّ اَوْ کَمَا قَالَ۔ صدقہ سے مال کبھی کم نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دس روپے میں سے اگر دو روپے دے دو تو وہ آٹھ نہ رہیں گے دس ہی رہیں گے یا اسی وقت بیس ہو جائیں گے بلکہ مطلب یہ ہے کہ مال میں برکت ہوگی اور کچھ دنوں کے بعد مال بڑھ جائے گا۔ ایک طریقہ برکت کا یہ بھی ہے کہ مال چوری سے اور دوسری آفتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ کیا تھوڑی بات ہے۔ اور اگر کچھ بھی نہ ہوتا تو مسلمان کے لئے یہ کیا کم ہے کہ صدقہ سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ مسلمان کی شان سے نفع دنیا کی طلب بعید ہے۔ اس کو صدقہ خیرات سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی طلب کرنا چاہیے۔ حکام دنیا کی خوشنودی کے

لئے لوگ کتنا خرچ کرتے ہیں۔ پھر خدا کے لئے خرچ کرنا کیوں مشکل ہے پھر خدا تعالیٰ کے حقوق جو شرعاً مقرر ہیں کچھ زیادہ نہیں ہیں بلکہ بہت تھوڑے سے ہیں جن کا ادا کرنا بہت سہل ہے۔ پھر جس عنوان سے اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق کا اس آیت میں ذکر فرمایا ہے اس نے تو اور بھی ان کو سہل کر دیا۔ چنانچہ اوّل تو یہ ارشاد ہوا کہ ان باغات اور زراعات کو اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیا ہے۔ انشاء۔۔۔ الخ میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب یہ خدا کا دیا ہوا، اسی کا پیدا کیا ہوا ہے تو اللہ کے نام پر خرچ کرنا دشوار کیوں ہے۔ ع

آں کہ جاں بخشد اگر بکشد رواست

دوسرے اس میں ایک اور نکتہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ نعمت کے بیان سے منعم کے ساتھ مخاطب کو محبت ہو جاتی ہے اور محبت کے کے بعد محبوب کے نام پر جان و مال سب فدا کر دینا آسان ہے۔ پس یہاں انشائ۔۔۔ الخ کے مقدم کرنے کے دو مقتضی ہیں۔

ایک یہ کہ سب کچھ اللہ کا دیا ہوا ہے تو بڑے شرم کی بات ہے کہ اُس کے نام پر خرچ نہ کیا جائے اور اُس کا شکر نہ ادا کیا جائے۔ دوسرے اس عنوان کو محبّت پیدا کرنے میں دخل ہے اور محبّت بھی اسباب یسر سے ہے۔

پھر انشائ۔۔۔ الخ کو مقدم کر کے فوراً ہی اپنے حقوق کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ پہلے یہ فرمایا کُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ۔ کہ جب پھل

آجاوے تو پہلے تم کھاؤ پیو کیونکہ تم ضعیف ہو۔ تم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ پہلے دوسروں کو دو۔ اس لئے اوّل خود کھاؤ پیو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض دفعہ لذیذ چیز کسی کے دینے کو طبیعت نہیں مانتی بلکہ جب آدمی اچھی طرح خود کھا لیتا ہے تو بعد میں دوسروں کا خیال آتا ہے۔ تو بھائی کو دو، بہن کو دو۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نفس کو پیدا کیا ہے، تو وہ اس کے خاصہ سے بھی خوب واقف ہیں۔ اس لئے یہ فرمایا کہ پہلے تم خود کھا لو پھر ہمارے نام کا دو۔ یعنی حصاد کے قبل تم کو کھانے پینے کی اجازت ہے۔ خوب کھاؤ پیو اور حصاد کے بعد پھر عشر واجب ہو جائے گا اس وقت ادا کرو۔

اس کے بعد ایک اور سہولت کی رعایت ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے لئے تو پھل آتے ہی کھانا جائز کر دیا اور اپنے حق کے بارے میں فرماتے ہیں۔ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ کہ اللہ کا حق اس وقت ادا کرو جب اس کے حصاد کا وقت آجائے۔ یہاں یہ حکم نہیں دیا کہ پھل آتے ہی خدا کا حق ادا کرو۔

سبحان اللہ — کس قدر رعایت ہے! اور ان رعایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے۔ بشر کی یہ طاقت نہیں کہ اتنی رعایات کر سکے۔ پھر ہمارا علم ہی کیا ہے۔ بہت قلیل! اس لئے محدود رعایات تک ذہن پہنچ جاتا ہے ورنہ خدا کے کلام کے محاسن و کمالات کا احاطہ ہم سے کہاں ہو سکتا ہے۔ نہ معلوم اس میں اور کس قدر نکات

ہوں گے۔ غرض یہاں پر چار طریقوں سے اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق کو آسان کر دیا۔

اوّل یہ فرما کر کہ سب کچھ ہمارا ہی تو پیدا کیا ہوا ہے۔

دوسرے یہ جتلا کر کہ ہم منعم ہیں محسن ہیں اور منعم کے ساتھ محبت کرنا انسان کی فطرت ہے تو ہم محبوب بھی ہیں اور محبوب کے لئے مال تو مال جان فدا کرنا بھی آسان ہے۔

تیسرے یہ فرما کر کہ جب پھل آ جاوے تو پہلے تم خود کھانا شروع کر دو۔

چوتھے یہ بتلا کر کہ ہمارا حق حصاد کے بعد ادا کرو۔ پھل جاتے ہی ادا کرنا ضروری نہیں۔

عشر کی ادائیگی کی ذمہ داری

البتہ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ کے متعلق مجھے ایک بات عرض کرنا ہے۔ وہ یہ کہ ہم اس کی تفسیر میں فقہا کے محتاج ہیں بعض فقہا فرماتے ہیں کہ حصاد سے مراد حصاد بالفعل نہیں بلکہ بالقوہ مراد ہے مطلب یہ ہے کہ جب پھل آفات سے محفوظ ہو جائے تو عشر واجب ہو گیا۔ یہ امام صاحب کا قول ہے۔ اگر مالک نے ایسی حالت کے بعد بیع کیا تو عشر بائع کے ذمہ ہو گا۔ مشتری کے ذمہ نہ ہو گا۔ اور محض پھل آ جانے کے بعد اس حصاد کے قبل اگر بیع کر دیا تو مشتری کے ذمہ عشر ہے بائع کے ذمہ نہیں اور صاحبین کے نزدیک حصاد بالفعل

مراد ہے۔ مگر یہاں ایک نازک مسئلہ اور ہے وہ یہ کہ بعض لوگ کھیر آتے ہی بیع کر دیتے ہیں تو اس کا عشر کس کے ذمہ ہے۔ کھیتوں میں تو بیع میں کوئی خرابی نہیں جب چاہو بیچ دو، کیونکہ وہ تو جڑ سمیت بکتے ہیں گو اس کے عشر میں تفصیل ہے کہ اگر تیاری سے پہلے بیچ دی تو عشر مشتری کے ذمہ ہے اور اگر تیاری کے بعد بیچ دی تو بائع کے ذمہ ہے مگر ہر حال میں بیع جائز ہے بخلاف پھلوں کے کیونکہ یہاں باغ کے درخت نہیں بکتے ہیں اور پھل موجود نہیں ہے تو بیع کس چیز کی؟ کیا معدوم کی بیع ہے۔ سو بیع معدوم باطل ہے۔

مجھے اس وقت اس بیع کا عدم جواز بیان کرنا نہیں ہے کیونکہ یہ تو سب کو معلوم ہو چکا اور ہمیشہ بیان کیا جاتا ہے بلکہ اس وقت مجھے دو باتیں بتلانا ہیں۔ ایک یہ کہ اس صورت میں عشر کس کے ذمہ ہے شاید بیع کرنے کے بعد بائع کو شبہ ہو کہ جب میں نے پھل آنے سے پہلے بیع کر دی تو میرے ذمہ عشر نہ ہوگا کیونکہ پھل میری ملک میں نہیں نمٹا بلکہ مشتری کی ملک میں نمٹا ہے تو سمجھ لو کہ یہ خیال غلط ہے بلکہ اس صورت میں عشر بائع ہی کے ذمہ ہے مشتری کے ذمہ نہیں کیونکہ یہ بیع تو باطل ہے جس سے نہ بائع کی ملک زائل ہوئی نہ مشتری کی اثانیت ہوئی پھل باغ والے کا ہی ہے اور اسی کے ذمہ فقرا کا حق ہے۔ یہ نازک مسئلہ ہے جس کی طرف شاید کسی نے توجہ نہ کی ہو۔ علماء فتویٰ دیتے ہوئے اس بیع کا ناجائز و باطل ہونا ہی ظاہر کرتے ہیں۔ عشر کا سوال نہ کوئی کرتا ہے

نہ وہ جواب دیتے ہیں۔ اس لیئے عام طور سے لوگ اس سے غافل ہیں
دوسری بات یہ بتلانا ہے کہ جو لوگ پھل آنے سے پہلے بیع کرتے ہیں چونکہ یہ بیع باطل ہے اس لیئے وہ خود بھی حرام کھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی حرام کھلاتے ہیں۔ اس میں تبدل ملک سے تبدل عین کا حکم نہیں ہے۔ اس لیئے جہاں تک بیع وشراء کا سلسلہ چلے گا، سب حرام کھانے میں مبتلا ہوں گے۔ جو لوگ جان بوجھ کر کھاتے ہیں وہ تو حرام کھانے کے ساتھ گنہگار بھی ہوتے ہیں اور جو لوگ بغیر علم کے کھاتے ہیں اُن کو گناہ تو نہیں ہوتا مگر ایسا نقصان ہوتا ہے کہ ہمیشہ کو یاد رہتا ہے۔ جیسے زہر بے خبری میں کھا جائے تو گناہ تو نہ ہوگا، مگر نقصان تو پہنچے گا اور وہ نقصان قلب کی ظلمت ہے۔

بیع باطل کے اثرات

اب ایک اور طبقہ رہا جس کو یہ تو علم ہے کہ اس شہر میں باغ کثرت سے پھل نمودار ہونے سے پہلے فروخت ہوتے ہیں مگر یہ علم نہیں کہ بازار میں جو پھل بک رہا ہے وہ کیسے باغ کا ہے تو ان لوگوں پر تحقیق واجب ہے یا نہیں۔

سو اس کا حکم یہ ہے کہ جہاں غالب حالت بیع باطل کی ہو وہاں تحقیق واجب ہے۔

(قُلْتُ وَفِيْهِ اخْتِلَافُ الْفُقَهَاءِ فَقَدْ قَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّ الْوَرَعَ الْاِحْتِرَازُ اِنِ اشْتَرَى يَطِيْبُ لَهٗ اِذَا لَمْ يَعْلَمْ

حُرْمَةَ الْمُشْتَرِیْ بِعَیْنِہٖ وَاللہُ اَعْلَمُ (۱۲ ط)

(میں کہتا ہوں اس میں فقہا کا اختلاف ہے بعض نے کہا ہے
ایسی پسندِ خاطر چیز جس کی بیع کے حرام ہونے کا علم نہ ہو
کے خریدنے سے بچنے اور احتیاط کرنے کو ورع کہتے ہیں)

حرام مال سے باطن کو جو نقصان ہوتا ہے اس کو اہلِ بصیرت خوب جانتے ہیں۔ عبدالرحمٰن خاں صاحب نے مولانا ابوالحسن صاحب لکھنوی کی حکایت مجھ سے بیان کی تھی کہ ایک مرتبہ ان پر اور ان کے خدام و متعلقین پر کئی روز کا فاقہ ہوا۔ پھر ایک دن ایک شخص آپ کے لئے بہت عمدہ بریانی لایا۔ آپ کو کشف سے معلوم ہو گیا کہ یہ بریانی حرام مال سے تیار ہوئی ہے۔ آپ نے خادم کو حکم دیا کہ اس کو کوئی نہ کھائے بلکہ زمین میں دفن کر دیا جائے۔ بعضے مریدوں کے دل میں یہ وسوسہ پیدا کہ شیخ کے دماغ میں ذکر سے خشکی پیدا ہو گئی ہے بھلا کئی روز کے فاقہ کے بعد تو خدا نے رزق دیا آپ نے اس کو دفن کرا دیا۔ مولانا کو اس خطرہ کا کشف ہو گیا تو حکم دیا کہ اچھا اس بریانی کو کھود کر دیکھو۔ دیکھا گیا تو برتن کیڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے اس کو اس لئے دفن کرا دیا تھا کہ تمہارے پیٹ میں جا کر اس بریانی سے یہ بلائیں پیدا ہو جاتیں اور تم کو تکلیف ہوتی۔

اسی طرح حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے شاہجہان پور کے ایک بزرگ نے بیان کیا۔ مولانا میں تو سود کے بچے لوگوں کے

بیٹ میں بولتے ہوئے دیکھتا ہوں پھر کیوں کر ہر ایک کی چیز لے لوں صاحبو — آج کل بیع باطل آم میں بکثرت ہو رہی ہے اور بازار میں ایسے ہی آم فروخت ہو رہے ہیں جن سے بہت کم لوگ احتیاط کرتے ہیں۔ بعضے خود تو متقی ہوتے ہیں مگر اپنی معصوم اولاد کے لئے خرید لیتے ہیں مگر یہ بڑی غلطی ہے۔ جس چیز کا خود کھانا حرام ہے اس کا اولاد کو کھلانا بھی حرام ہے بلکہ جانوروں کو بھی حرام ہے۔ جانوروں کو خود نہ کھلاؤ بلکہ ایسی جگہ رکھ دو کہ وہ خود آ کر کھائیں۔ پھر یاد رکھو جو شخص اپنی اپنی اولاد کو حرام مال کھلاتا ہے، وہ اُن کے اندر شرارت کا مادہ پیدا کرتا ہے۔

چنانچہ ایک بزرگ کا لڑکا بہت شریر تھا۔ کسی نے اس کی وجہ پوچھی، تو فرمایا یہ اُسی رات کا نطفہ ہے جس رات میں بادشاہ کے باورچی نے میری دعوت کی تھی، اور شاہی باورچی خانہ کا کھانا کھلایا تھا۔ یہ اُس کا نتیجہ ہے۔

غرض اس کی ظلمت بڑی سخت ہوتی ہے۔ اس لئے اپنے بچوں کو بھی حرام سے بچانا چاہئے۔ (قُلْتُ وَفِي الْحَدِيْثِ مِنْ حُقُوْقِ الْأَهْلِ وَالْعِيَالِ أَنْ لَا يُطْعِمَهُمُ الْحَرَامَ۔)

حرام سے بچنے کی ترکیب

میں اس بلوہ عام سے بچنے کی ایک آسان تدبیر بتلاتا ہوں جس سے دوسروں کو تو یہ خریدے ہوئے آم حلال ہو جائیں اور حرام کا سلسلہ

تو چلے۔ وہ یہ کہ جو لوگ پھل آنے سے پہلے باغ فروخت کر چکے ہیں، وہ اب پھل آنے کے بعد دو جملے کہہ دیں یا یہ کہہ دے کہ میں قیمت معلومہ پر باغ کا پھل اب بیچتا ہوں۔ مشتری کہہ دے کہ میں خریدتا ہوں صرف دو لفظوں کی بات ہے۔ اس سے یہ ہوگا کہ پہلے جو گناہ ہوا سو ہوا لیکن آئندہ تمام مخلوق کو حرام کھلانے کا تو گناہ نہ ہوگا پہلے گناہ سے اب توبہ کر لیں اور آئندہ گناہ سے بچنے کے لئے یہ دو لفظ کہہ دیں تو بہت کچھ گناہ کم ہو جائے۔

مگر افسوس کہ ہمارے بھائی مسلمانوں کو دوزخ میں جانا منظور ہے مگر یہ دو جملے کہنا منظور نہیں۔ ظالمو! یہ تو کچھ کہنا دشوار نہیں بہت آسان ہے۔ مگر جس کو خدا کا خوف ہو وہی اس تدبیر پر عمل کرے گا۔ عام لوگ تو یہ کہیں گے کہ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ ان دو جملوں سے کیا ہو جائیگا اور ان کے نہ کہنے سے کیا حرج ہوگا۔ میں کہتا ہوں بے شک معاملہ کی صورت تو ظاہر میں وہی رہے گی اور اسی لئے میں اس تدبیر کو آسان کہہ رہا ہوں کہ اس سے تمہارے معاملے پر کوئی اثر نہ پڑے گا، صرف زبان ہلانا پڑے گی۔ مگر اس سے جو گناہ کا پہاڑ سر سے اترے گا اس کی قدر قیامت میں ہوگی۔

لوگ کہتے ہیں کہ شریعت پر عمل کرنا مشکل ہے۔ اسی معاملہ کو لے لو جو تدبیر میں بتلا رہا ہوں اس میں کیا دشواری ہے۔ ہاں کسی کو عمل ہی کی فکر نہ ہو تو اس کا علاج نہیں۔ صاحبو! شریعت آپ کو پریشان

نہیں کرنا چاہتی۔ صرف یہ چاہتی ہے کہ آپ آزاد ہو کر کام نہ کریں بلکہ
شریعت سے پوچھ کر عمل کریں پھر آپ کو معلوم ہوگا کہ احکام شرعیہ
کس قدر سہل و آسان ہیں۔

عشر کے احکام

اب میں عشر کے احکام بیان کرنا چاہتا ہوں۔ سو اوّل تو یہ مسئلہ معلوم کرنے کا ہے کہ عشر اُسی کے ذمہ ہے جس کے پاس کھیت تیار قابل حصاد ہو۔ اسی طرح جس کا باغ ہمٹ گیا ہو اور اگر کھیت پر آفت آگئی ہو یا باغ کا پھول پھل برباد ہو گیا تو عشر واجب نہیں۔

دوسرے یہ کہ بعضے لوگ تو اپنا کھیت خود کاشت کرتے ہیں اور بعضے دوسروں کو کاشت کے لئے دیتے ہیں۔ جو لوگ خود اپنے کھیت کو بوتے ہیں اُن پر تو عشر کا واجب ہونا ظاہر ہے جب کہ زمین عشری ہو اور جو لوگ دوسروں کو دیتے ہیں ان کی چند صورتیں ہیں ایک یہ کہ زمین بٹائی پر دیں۔ اس صورت میں اپنے اپنے حصہ کا عشر دونوں کے ذمہ ہے۔ کاشتکار کے بھی اور زمیندار کے بھی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ زمین ٹھیکہ پر دی جائے مثلاً فی بیگھہ من بھر غلہ لیں گے یا فی بیگھہ دو روپیہ۔ اس صورت میں علماء کا اختلاف ہے کہ عشر کس کے ذمہ ہوگا مگر ہم لوگ یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ عشر کاشتکار کے ذمہ ہے کیونکہ کاشت کا وہی مالک ہے۔

اب ایک مسئلہ قابل غور یہ ہے کہ عشر کس زمین میں ہے تو یاد

رکھو کہ عشر زمین عشری میں ہے اور یہ وہ زمین ہے کہ جب سے مسلمانوں نے اس کو فتح کیا ہے تو وہ زمین کسی کافر کے قبضہ میں نہ آئی ہو۔ اب زمین کی تین حالتیں ہوں گی۔

ایک یہ کہ معلوم ہو جائے کہ یہ زمین مسلمانوں کے ہاتھوں میں آتی رہی ہے اس میں تو عشر کا وجوب ظاہر ہے۔

دوسرے یہ کہ معلوم ہو جائے کہ یہ زمین کافروں کے ہاتھ سے آئی ہے اس میں عشر نہیں ہے۔

تیسرے یہ کہ معلوم نہ ہو کہ یہ کافروں کے ہاتھ سے آئی ہے یا مسلمانوں کے مگر اس وقت وہ مسلمان کے ہاتھ میں ہے۔ یہ بھی باستصحاب حال قسم اول کے حکم میں ہے۔

ایک بات یہ معلوم کرنا چاہئے کہ عشر کی مقدار کیا ہے؟ سو اس کا مدار پانی کے اوپر ہے۔ تو جس زمین کو کنوئیں سے پانی دیا جائے یا جس میں سرکاری نہر سے پانی دیا جائے اس میں پیداوار کا بیسواں حصہ ہے اور جو بارانی ہو اس میں دسواں حصہ ہے۔

ایک بات یہ جاننا چاہئے کہ لوگ عام طور سے کھیت ہی کو محل عشر سمجھتے ہیں، باغات میں عشر کو لازم نہیں سمجھتے حالانکہ باغات میں بھی عشر واجب ہے جب کہ زمین عشری ہو اور اس کی مقدار کا مدار بھی پانی پر ہے۔

عشر کا مصرف

ایک بات یہ جاننا چاہیے کہ عشر کا مصرف کیا ہے تو سمجھ لیجیے کہ اس کا مصرف وہی ہے جو زکوٰۃ کا مصرف ہے کہ اس میں بھی تملیک فقرا واجب ہے اور اس کا مصرف فقراءِ مسلمین ہیں۔ اگر مردہ پر کفن ڈال دیا یا مسجد میں لوٹے منگا دیئے یا فرش بنا دیا یا کافر کو دے دیا تو عشر ادا نہیں ہوا۔

ایک بات اور ہے جس کے بیان کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا، مگر ضرورت کی وجہ سے بیان کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ بعض لوگ جو مولوی ہوتے ہیں وہ زکوٰۃ و عشر کے مصرف میں ایک حیلہ کرتے ہیں مثلاً اُن کو زکوٰۃ کا روپیہ یا عشر کا غلہ مدرسہ کی عمارت میں یا مدرسین کی تنخواہ میں لگانا ہے تو ایک غریب طالب علم کو بلاتے ہیں اور اُس سے کہتے ہیں کہ ہم تم کو کچھ روپیہ زکوٰۃ کا دیں گے۔ تم اس کو لے کر مدرسہ میں ہبہ کر دینا۔ وہ کہتا ہے بہت اچھا۔ اب انہوں نے اس کو روپیہ دے دیا۔ اور اُس نے مدرسہ میں دے دیا۔ مولوی صاحب خوش ہیں کہ زکوٰۃ بھی ادا ہو گئی اور رقم مدرسہ کی عمارت میں یا تنخواہوں میں بھی لگ گئی۔ مگر یاد رکھو کہ یہ حیلہ محض لغو ہے۔

اہل علم وہ گناہ تو نہیں کرتے جو عوام کرتے ہیں مگر علم کے پردہ میں یہ بھی گناہ کرتے ہیں۔ مولویوں کا گناہ بھی مولوی ہوتا ہے۔ اسی طرح صوفیوں کا گناہ صوفی ہوتا ہے۔ صوفیوں کا گناہ یہ ہے کہ تسبیح ہاتھ میں

لئے بیٹھے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے عابد ذاکر شاغل ہیں، مگر
باطن کا یہ حال ہے کہ ؎

از بروں چوں گورِ کافر پر حلل — و اندروں قہرِ خدائے عزّ وجل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید — وز درونت ننگ میدارد یزید

یہ بڑا گناہ ہے کہ لوگوں کو دکھانے کے لئے تسبیح ہاتھ میں رکھے یا گلے میں موٹے موٹے دانوں کی تسبیح ڈال لے۔ عارف اسی کو فرماتے ہیں ؎

ریا حلال شمارند و جام بادہ حرام
زہے شریعت و ملّت زہے طریقت و کیش

ایک دفعہ جب کہ میں تفسیر لکھا کرتا تھا۔ ایک سائل دروازہ پر آیا اور سوال کیا۔ تو گھر سے آٹا بھیج دیا گیا۔ اس نے رد کر دیا اور کہا ہم تو نقد لیں گے اور شور کیا۔ اس شور کی وجہ سے میں اوپر سے اترا کیونکہ اس شور کی وجہ سے میرے کام کا حرج ہوتا تھا۔ میں نیچے اترا اور ان کی صورت دیکھی تو میں شرما گیا۔ کیونکہ ان حضرت کی لمبی داڑھی تھی اور کمبل اوڑھے لنگی باندھے عصا ہاتھ میں کئی تسبیحیں گلے میں ڈالے ہوئے تھے میں نے اوّل تو ان کی داڑھی کا لحاظ کر کے نرمی کے ساتھ کلام کیا کہ شاہ صاحب جتنی کسی کو توفیق تھی اس نے پیش کر دیا۔ اگر منظور نہیں ہے تو یہ شور وشغب کیسا ہے۔ شاہ صاحب نے وہی ایک مرغی کی ٹانگ ہانکی کہ ہم تو نقد لے کر جائیں گے۔ اب مجھے غصہ آگیا اور میں نے ڈانٹا

کہ بہت بک بک نہ لگاؤ۔ اگر نہیں لینا ہے تو سیدھے چلے جاؤ۔ اس پر شاہ صاحب فرماتے ہیں ؎

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالیست ۔۔۔ شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

وہ مجھ کو ڈرانا چاہتے تھے۔ مگر جو متبع شریعت نہ ہو اس سے میں کیوں ڈرتا۔ میں نے ڈانٹ کر کہا کہ شاہ صاحب! آپ کو بھی یہی سمجھنا چاہیئے۔ ع

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست

گو میں کوئی چیز نہیں مگر آپ کو تو یہ احتمال ہونا چاہیئے۔ اس کی کیا وجہ کہ آپ دوسروں کو ڈراتے ہیں اور خود نہیں ڈرتے۔

بس آج کل ان جاہل فقیروں نے دو چار الٹی پلٹی باتیں یاد کر لی ہیں جن سے عوام پر رعب جماتے ہیں۔ مگر علم کی یہ حالت ہے کہ ایک فقیر نے وَالضُّحٰى وَاللَّيْلِ إِذَا سَجٰى کی تفسیر یہ کی اے نفس تیری بھی سجا (مزا) غرض صورت تو یہ کہ شاہ صاحب معلوم ہوں دل میں یہ حالت ہے کہ امراض و معاصی سے بھرے ہوئے ہیں۔ سو ہم بھی ایسے ہی ہیں۔ لیکن جیسے ان شاہ صاحبوں کا گناہ شاہ صاحب ہوتا ہے ہم مولویوں کا گناہ مولوی ہوتا ہے۔ ظاہر میں عمامہ چوغا اور نہایت مہذب اور باطن میں وہ گڑبڑ کہ خدا کی پناہ ــــ!

میں زمانہ طالب علمی میں ایک بار میرٹھ گیا۔ وہ زمانہ نوچندی کے میلہ کا تھا۔ میرا بچپن تھا۔ اس لئے میں بھی میلہ دیکھنے چلا گیا۔ جب میلہ سے واپس

آیا تو حافظ عبد الکریم صاحب رئیس ۔ کے صاحبزادہ غلام محی الدین مرحوم نے مجھ سے پوچھا کہ مولوی صاحب نوچندی کے میلہ میں جانا کیسا ہے۔ میں نے کہا جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی اس غرض سے جائے کہ اس کو فتویٰ دینے کے لئے تحقیق کی ضرورت ہے تا کہ عوام کے سامنے اس کے مفاسد بیان کر سکے تو ایسے شخص کو جانا جائز ہے۔ صاحبزادہ صاحب بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ مولوی گناہ بھی کرتے ہیں تو اس کو جائز کر لیتے ہیں۔

مجھے اس تاویل کے بعد تاویل سے ایسی نفرت ہو گئی ہے کہ اس سے زیادہ نفرت کسی چیز سے بھی نہیں۔ ———————

——————— اور اس تاویل سے مراد وہ تاویل ہے جس سے اپنے نفس کی نصرت مقصود ہو۔ عارف شیرازی اسی کو فرماتے ہیں ؎

ترسم کہ صرفہ برد روز باز خواست

نانِ حلالِ شیخ بہ نانِ حرام ما

یعنی اندیشہ ہے کہیں قیامت میں ہمارا نان حرام شیخ کے نان حلال پر غالب نہ آ جائے۔ کیونکہ ہم تو حرام کو حرام جانتے ہیں اور وہ حرام کو تاویل سے حلال بنا کر کھاتے ہیں۔

عشر و زکوٰۃ میں حیلہ سازی

اب تمہید کے بعد میں کہتا ہوں کہ بعضے اہل علم جو عشر و زکوٰۃ کے مال میں یہ حیلہ کرتے ہیں یہ بالکل واہیات ہے اور اس سے کچھ تبدل کا حکم نہیں ہوتا۔ ان اللہ کے بندوں سے کوئی پوچھے کہ یہ تملیک ہے یا ہیرا پھیری؟ کیا خدا

کو بھی دھوکا دینا چاہتے ہو۔ اللہ تعالیٰ تو دلوں کے حال کو خوب جانتے ہیں
اُن سے ایک ذرّہ بھی پوشیدہ نہیں۔ بھلا تم ہی انصاف کرو جب تم
نے غریب طالب علم سے یہ کہہ دیا کہ ہم تم کو زکوٰۃ کا روپیہ دیں گے۔
اس کو مدرسہ میں دے دینا تو یقیناً وہ روپیہ ہاتھ میں لینے کے بعد اپنے
کو اس کے رکھنے کا مجاز نہیں سمجھتا۔ بلکہ واپسی کو اپنے اوپر لازم سمجھتا ہے
پھر تملیک کیا خاک ہوئی ؎

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند
حق را بسجودے و نبی را بدرودے

ایک جگہ ایک رئیس نے ایسی ہی غلطی کی کہ اُن کو ایک سیّد مولوی
صاحب کو دو سو روپیہ زکوٰۃ کے دینے تھے۔ اُنہوں نے ایک غریب
طالب علم کو بلایا کہ ہم تم کو ایک ثواب کا کام بتلاتے ہیں کرو گے؟
اُس نے کہا، ثواب کے کام سے کیا انکار ہے فرمائیے۔ کہا فلاں
مولوی صاحب کو یہ کتابیں زکوٰۃ میں دیتا ہوں مگر سیّد ہونے کی وجہ سے
اُن کو دے نہیں سکتے ہیں۔ تم کو یہ کتابیں اور روپے دیئے دیتا ہوں، تاکہ
زکوٰۃ ادا ہو جائے۔ پھر تم ان مولوی صاحب کو دے دو تم کو بہت ثواب
ہوگا۔ اُس نے کہا، نیک کام سے کیا انکار ہے لائیے۔ رئیس صاحب نے
وہ کتابیں اُس کو دے دیں۔ وہ لے کر چلتا ہوا۔ رئیس صاحب نے کہا
میاں کہاں چلے؟ کہا اپنے گھر کو۔ رئیس صاحب نے کہا تم سے وعدہ
کیا ہوا تھا۔ کہا، جناب آپ نے ثواب کا طریقہ بتلایا تھا مگر مجھ کو خود ضرورت

ہے ۔ ہیں کسی کو نہیں دیتا ۔ اب رئیس صاحب بہت چپ ہوئے ۔ اُس نے کہا جناب یہ فرمائیے کہ یہ رقم میری ملک ہو گئی یا نہیں ۔ کہا ، ہاں ملک تو ہو گئی کہا پھر آپ کو رنج کیوں ہے ؟ آپ کے ذمہ زکوٰۃ کا ادا کرنا تھا ، آپ اس سے بری ہو گئے آپ کا کیا نقصان ہوا ۔

میں نے یہ حکایت سنی تو بڑا خوش ہوا کہ یہ شخص سمجھ دار نکلا جس نے تملیک کی حقیقت پر عمل کیا اور واقعی جب تک لینے والا اپنے کو مالک نہ سمجھ لے اس وقت تک تملیک کا تحقق ہی کہاں ہو سکتا ہے ؟ مگر اسی واقعہ سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ جو لوگ تملیک کے لیے یہ حیلہ کرتے ہیں اُن کے ذہن میں تملیک کی حقیقت نہیں ہوتی ۔ وہ محض ہیرا پھیری ہی سمجھ کر ایسا کرتے ہیں ۔ اگر اُن کے ذہن میں تملیک کی حقیقت ہوتی تو لینے والا اگر آزادی کے ساتھ عمل کرے اور اُس رقم کو اپنے خرچ میں لائے تو اس سے اُن کو رنج و ملال نہ ہونا چاہئے کیونکہ جب وہ مالک ہو گیا تو شرعاً اس کو پورا اختیار ہے ۔ وہ اس رقم کو جو چاہے کرے ۔ خواہ مدرسہ میں دے یا نہ دے مسجد میں لگائے یا نہ لگائے یہ رنج کرنے والے کون ہیں ۔ مگر مشاہدہ یہ ہے کہ لینے والا غریب اگر اس رقم کو معطی کی مرضی کے خلاف اپنے خرچ میں لے آئے اُن کو رنج ہوتا ہے اور اس شخص کو بُرا بھلا دغا باز فریبی کہنے لگتے ہیں ۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا مقصود صرف ہیرا پھیری ہے تملیک نہیں اور لینے والا اگر اُن کی مرضی کے موافق رقم لے کر مسجد یا مدرسہ کے لیے واپس دے دے تو غالب

یہ ہے کہ وہ محض شرم و لحاظ سے یا بدنامی کے اندیشہ سے دیتا ہے۔ اگر اس کا اطمینان ہو جائے کہ میں اس کا مالک بن چکا ہوں اور اپنے خرچ میں لانے سے بدنام نہ ہوں گا نہ مولوی صاحب کا منہ چڑھے گا تو یقیناً بہت سے غریب واپس دینے پر راضی نہ ہوں گے۔ کیونکہ غریب آدمی کو سب سے پہلے اپنی اور اپنی اولاد کی راحت کا خیال ہوتا ہے۔ جس کے گھر میں فاقہ ہوتا ہو، وہ بے چارہ مدرسہ یا مسجد میں روپیہ دینے کی کیا ہمت کر سکتا ہے اور ہمت بھی کرے گا تو دو چار روپیہ دے گا۔ پانچ سو روپیہ دینے کی غریب آدمی کو ہمت نہیں ہو سکتی جب کہ وہ سمجھ جائے کہ میں اس رقم کا مالک بن گیا ہوں۔ اور جو کوئی ہمت کرے گا سمجھ لو کہ اس نے اپنے کو اس رقم کا مالک نہیں سمجھا بلکہ وہ اپنے اوپر اس رقم کا واپس کرنا ضروری سمجھتا ہے اس لیئے دے رہا ہے۔ اب بتلاؤ یہ تملیک کدھر سے ہوئی؟

اس لیئے یہ حیلہ محض لغو و بیہودہ ہے اور اس سے زکوٰۃ کا ادا ہونا میری سمجھ سے باہر ہے مگر میں جانتا ہوں کہ لوگ حیلہ سے باز نہ آئیں گے اس لیئے میں ایک اور تدبیر بتلاتا ہوں جو حقیقت میں حیلہ نہیں، بلکہ حقیقت ہے اور اس سے بھی وہ مقصود حاصل ہو جاتا ہے، جو حیلۂ مذکورہ سے مقصود ہوتا ہے۔ اس تدبیر کو ہم نے چندہ بلقان میں استعمال بھی کیا ہے۔ عوام تو تقلیداً مان لیں کہ یہ حیلہ نہیں اور علماء کو اگر کچھ شبہ ہو وہ تسلی کر لیں۔

حیلہ سے بچنے کی ترکیب

اب سنو! کہ اگر کوئی ایسی ضرورت ہو کہ زکوٰۃ یا عشر کی رقم ایسے مصرف میں لگانا جہاں تملیک کا تحقق نہیں ہو سکتا۔ مثلاً مسجد میں لگانا ہے یا تملیک کا تحقق تو ہو سکتا ہے مگر جہاں رقم بھیجنا ہے ان لوگوں پر اطمینان نہیں کہ وہ مصرف میں صحیح طور پر استعمال کریں گے یا نہیں وہاں پہلی ترکیب نہ کرو۔ بلکہ یوں کرنا چاہیے کہ مسکین سے کہا جائے کہ اگر تم ثواب چاہتے ہو تو کسی شخص سے اتنی رقم قرض لا کر اس کام میں دے دو اور ہم اس قرض کے ادا کرنے میں تمہاری امداد کر دیں گے۔ جب وہ کسی سے یا تم ہی سے رقم قرض لے کر چندہ میں دے دے اب تم اُس کو زکوٰۃ کی رقم دیدو کہ اس سے تم خواہ اپنا قرضہ ادا کرو یا جو چاہو کرو۔

اس صورت میں مسکین سے وہی رقم واپس نہیں لی جاتی جو اس کو زکوٰۃ میں دی گئی ہے کیونکہ زکوٰۃ کی رقم سے تو وہ اپنا قرض ادا کرے گا جو اُس کا ذاتی خرچ ہے۔ تو اس صورت میں تملیک کا تحقق پوری طرح ہو گیا کہ زکوٰۃ لے کر مسکین اپنے خرچ میں بھی لے آیا۔ البتہ جو رقم اُس نے کسی سے قرض لے کر چندہ میں دی ہے وہ خرچ ہونے سے پہلے مسکین کی ملک سے خارج نہیں ہوتی۔ قبل از خرچ وہ اس کو واپس لینے کا اختیار رکھتا ہے مگر یہ اختیار تو اس حیلہ میں بھی رہتا ہے جو عام طور سے کیا جاتا ہے اس لئے یہ نقص اسی تدبیر کے ساتھ خاص نہیں اور اس کا تدارک یوں ہو سکتا ہے کہ جب مسکین رقم قرض لا کر چندہ میں دے دے اس کو اسی وقت

مدرسہ یا مسجد یا لڑکوں کے فنڈ میں خرچ کر دیا جائے پھر ادائے فرض کے لئے اس کو زکوٰۃ کی رقم دی جائے تو اب واپسی کا حق اس کو نہ رہے گا۔ اور متعارف تدبیر میں کوئی تدارک نہیں جیسا دو سو روپیہ والی حکایت میں اوپر مذکور ہوا کہ وہ طالب علم لے کر چلتا بنا۔

طلباء بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔ وہ عوام کی طرح اس حیلہ سے دھوکا نہیں کھاتے۔ وہ حقیقت میں اپنے کو مالک سمجھ لیتے ہیں۔ مگر پھر جو بعضے واپس دے دیتے ہیں اس کا منشا محض مہتمم یا مدرس کی ناراضی کا خیال ہوتا ہے ــــ الا ما شاء اللہ!

طلبہ کی ہوشیاری پر ایک حکایت یاد آئی کہ بخارا میں ایک طالب علم بازار میں نکلے، تو ایک باندی حسین وجمیل بہت خوبصورت نظر آئی دیکھتے ہی اُن کا دل لوٹ پوٹ ہو گیا۔ مگر اب کیا کریں؟ پیسہ پاس نہیں، دام کہاں سے دیں۔ آپ نے یہ تدبیر کی کہ اپنے ایک امیر دوست کے پاس گئے۔ اُن سے ایک عمدہ سا جوڑا لیا اور خوبصورت گھوڑا لیا، جس کا ساز وسامان بھی بہت قیمتی تھا۔ اس پر سوار ہو کر شاگردوں کو ساتھ لے کر تاجر کے پاس پہنچے اور باندی کے دام پوچھے۔ اُس نے دس ہزار مثلاً دام بتلائے۔ آپ نے کہا، بہت اچھا منظور ہے بیع نامہ لکھ دو اور کل کو ہمارے محل پر آ کر دام لے لو۔ تاجر ان کے لباس اور گھوڑے کو دیکھ کر مرعوب ہو گیا۔ یہ سمجھا کہ بہت بڑے رئیس ہوں گے۔ اُس نے فوراً بیعنامہ لکھ دیا۔ اُنہوں نے خریدتے ہی آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیا اور ذیگر

چلتے بنے۔ بعد میں تاجر کو جب معلوم ہوا تو اب کیا کر سکتا تھا۔ وہ تو آزاد ہو چکی۔

تو دیکھئے کیسی ہوشیاری کی کہ باندی کے مالک بھی ہو گئے اور ایک پیسہ خرچ نہ ہوا۔ اگرچہ ہوشیاری مذموم تھی کہ بے محل تھی لیکن ہوشیاری تو ثابت ہوئی۔ مگر آج کل ان غریبوں کی قدر نہیں۔ لوگ طلبہ کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔ آج کل عقلاء وہ شمار ہوتے ہیں جو لباس سے ٹھٹر بڑ کریں اور جوتوں سے کھٹ پٹ کریں۔ مگر میں سچ کہتا ہوں کہ یہ لوگ طلبہ علم عربی کے سامنے محض جاہل و احمق ہیں۔ ذرا وہ طلبہ سے گفتگو کر کے دیکھیں تو ان کو اپنی عقل کا اندازہ ہو جائے گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ ایسے طالب علم سے گفتگو کریں جس نے کتابیں سمجھ کر پڑھی ہوں۔ کیونکہ ایسے نواب طلبا میں داخل نہیں۔

اسی طرح وہ طالب علم بھی بڑا ہوشیار نکلا جو ساری کتابیں گٹھر باندھ کر اپنے حجرہ میں لے آیا۔ میں اس واقعہ سے بڑا خوش ہوا کہ اچھا کیا تاکہ آئندہ کو لوگ اس حیلہ سے باز آ جائیں۔ لوگوں نے ہیرا پھیری کا نام تملیک دھر لیا ہے۔ کیا خدا سے بھی دھوکا کرتے ہیں۔ ؎

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام　　در غلط اندازی تا خاص و عام
کارہا با خلق آری جملہ راست　　با خدا تزویر و حیلہ کے رواست
کارہا او راست باید داشتن　　رایت اخلاص و صدق افراشتن

عاجبو! حیلہ ایسا تو ہو جس کو دل قبول کرے اور وہ وہی ہے جو

قواعد کے موافق ہو اور نفسانی غرض سے نہ ہو۔ اور وہ کیا حیلہ جس کو تمہارا دل خود نہیں مانتا اور تم خود سمجھتے ہو کہ اس سے تملیک مقصود نہیں۔ اس لئے یہ ترکیب نہ کرو۔ اگر ضرورت ہو تو وہ تدبیر کرو، جو میں نے بتلائی ہے

عشر اور زکوٰۃ کا فرق

ہاں عشر کے متعلق ایک مسئلہ اور سُن لینا چاہیئے۔ وہ یہ کہ زکوٰۃ میں تو حکم یہ ہے کہ اگر صاحب نصاب کے ذمہ قرض ہو تو زکوٰۃ قرض کو منہا کرنے کے بعد بقیہ رقم پر واجب ہوتی ہے مگر عشر میں یہ حکم نہیں مثلاً ایک شخص کے پاس سو روپے جمع ہیں جن پر سال بھی گزر گیا مگر اس کے ذمہ پچاس روپیہ قرض بھی ہیں تو زکوٰۃ تو پورے سو کی واجب نہیں بلکہ قرض کی رقم نکال کر باقی ماندہ پچاس میں زکوٰۃ فرض ہوگی اور عشر میں یہ قاعدہ نہیں بلکہ عشر تمام پیداوار پر فرض ہوگا۔ یہ نہیں کہ بنئے کا قرض ادا کرنے کے لئے غلہ الگ کر کے باقی میں سے عشر نکالا جائے۔

یہ ضروری مسائل تھے عشر کے جن کا بیان کرنا اس وقت مقصود تھا۔ امید یہ ہے کہ انشاء اللہ ضروری بات کوئی نہ رہی ہوگی۔ غرض مقصود میرا یہ ہے کہ اس وقت عام طور پر زمینداروں، کاشتکاروں کے گھروں میں اناج آرہا ہے۔ تو جن پر عشر واجب ہو اور ادا نہ کیا ہو اُن کو ادائے عشر کا اہتمام کرنا چاہیئے اور یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ ہائے دس من میں ایک من یا سو من میں سے دس من اناج نکل جائے گا؟ کیونکہ زکوٰۃ و عشر سے مال میں کمی نہیں آتی۔ انشاء اللہ برکت ہوگی۔ اور اس کی برکت سے

آئندہ پیداوار میں ترقی ہو گی۔ جو لوگ عشر ادا کرتے ہیں تم اُن سے اس کی برکت کا حال پوچھ لو۔ خدا نے اُن کو کس قدر ترقی دی ہے۔

اسی طرح باغ والے بھی پھلوں کا عشر ادا کریں کیونکہ باغات میں بھی عشر واجب ہے جیسا اوپر بتلایا گیا۔

اسراف کی حقیقت

اب میں ایک جملہ ہی کی تفسیر عرض کر کے وعظ کو ختم کرنا چاہتا ہوں تاکہ لطف کامل ہو جائے۔ وہ جملہ یہ ہے

وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ

یہ جملہ وَآتُوا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ سے متصل ہے۔ ترجمہ یہ ہے کہ اسراف نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے ترجمہ تو سب کی سمجھ میں آگیا ہو گا۔ مگر قابل غور یہ ہے کہ وَآتُوا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ سے اس کا کیا ربط ہے؟

عام طور پر تو مفسرین نے یہ فرمایا ہے کہ ربط یہ ہے کہ اوپر حکم ہے فقراء کو دینے کا۔ اس جملہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ فقراء کو اتنا نہ دو کہ اپنا بھی خیال نہ رکھو بلکہ کچھ اپنے اور اپنے اہل و عیال کے واسطے بھی بچا لو۔ اگر ایسا نہ کرو گے بلکہ سب خیرات کر دو گے تو یہ اسراف ہو گا اور اللہ تعالیٰ مسرفین کو پسند نہیں فرماتے۔

میں اس تفسیر کی صحت میں کلام نہیں کرتا۔ واقعی یہ مسئلہ صحیح ہے کہ بعض دفعہ فقراء کو زیادہ دیدینا یا کل پیداوار دیدینا اسراف میں داخل

ہوتا ہے جب کہ دینے والے میں قوت توکل کامل نہ ہو اور پریشانی کا اندیشہ ہو۔ مگر یہ حکم کلی نہیں کہ ہر شخص کے لئے کل مال کا خیرات کرنا اسراف میں داخل ہو۔ کیونکہ حدیث سے حضرت صدیقؓ کا واقعہ ثابت ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ اپنا کل مال خیرات کر دیا۔ اور حضورؐ نے ان کی مدح فرمائی۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سارا مال خیرات کر دینا علی الاطلاق اسراف نہیں۔ پس جو ربط مفسرین نے عموماً بیان کیا ہے، وہ بعض صورتوں میں تو صحیح ہے مگر بعض صورتوں پر منطبق نہیں۔ دوسرے خود نص میں موجود ہے، وَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَهُوَ خَیْرٌ لَّهٗ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حد معیّن سے زیادہ خیرات کرنا مطلقاً مذموم نہیں۔ اس لئے میں ان دو جملوں میں دوسرا ربط بیان کرتا ہوں۔ جو عام تفسیر سے الطف ہے اور ان شاء اللہ قواعد سے صحیح ہے۔

میرے نزدیک ربط یہ ہے کہ جملہ امر میں تو مفقرا کے حق ادا کرنے کا امر ہے اور جملہ نہی میں فقرا کا حق کھا جانے کی ممانعت ہے۔ حاصل

لہ واقعی حضرت حکیم الامت ربط آیات بیان کرنے کے امام ہیں۔ حضرت کو ایسا ربط القا ہوتا ہے جو کتابوں میں تلاش کرنے سے بھی نہیں مل سکتا اور خوبی یہ ہے کہ بے تکلف ربط ارشاد فرماتے ہیں جو دل کو لگ جائے۔ رهٰذا من اٰیات ذوقه فی القراٰن فللّٰه درہ ۱۲۔

یہ ہوا کہ پیداوار میں سے فقراء کا حق ادا کرو۔ اور سارا کا سارا خود ہی نہ کھا جاؤ کہ مسکینوں کا حق بھی کھالو کہ یہ اسراف ہے اور حق تعالیٰ مسرفین کو پسند نہیں فرماتے۔ اور یہ اسراف اس لئے ہے کہ اس میں حد شرعی سے تجاوز ہے اور اسراف کی حقیقت یہی ہے تجاوز عن الحد۔ پس مطلب یہ ہوا کہ مساکین کا حق ادا کرو اور اتنا نہ کھاؤ کہ مسکینوں کا حق بھی نہ بچے:

خلاصہ یہ ہوا کہ جملہ نہی میں زیادہ خیرات کرنے کی ممانعت نہیں بلکہ زیادہ کھا جانے کی ممانعت ہے۔ اور اسراف جیسے انفاق میں ہوتا ہے اکل میں بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام پر ارشاد ہے۔ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا۔ اور ایک آیت میں دوسرے کا مال کھا جانے کو خصوصیت کے ساتھ اسراف فرمایا ہے وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا اور گو عرف میں دوسرے کا حق نہ دینا اور خود ہی سارا مال کھا جانا اسراف نہیں کہلاتا بلکہ اس کو بخل کہتے ہیں مگر لغۃً و شرعاً یہ بھی اسراف ہی کی فرد ہے اور عرفی بخل کو اسراف سے تعبیر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ نفس انسانی کو مال سے محبت زیادہ ہے۔ اس لئے اس کو اسراف کی مذمت زیادہ معلوم ہے بخل کی مذمت اس نظر میں زیادہ نہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ نے بخل کو بھی اسی عنوان سے بیان فرمایا جس سے نفس انسانی کو کراہت زیادہ ہے ں لئے میرے خیال میں یہ تفسیر الطف ہے۔ امید ہے کہ اہل علم اس سے ظوظ ہوئے ہوں گے۔ (سبحان اللہ! یہ ربط تو سنا نہ کتابوں دیکھا عجیب بے تکلف ربط ہے جس سے آیت کی تفسیر بالکل آئینہ ہو گئی۔ متع اللہ

الْمُسْلِمِیْنَ عَامَّۃً وَّمَعْشَرَنَا جَمَاعَۃَ الْخُدَّامِ خَاصَّۃً بِفُیُوْضِہٖ الْقُدْسِیَّۃِ وَعُلُوْمِہٖ الْعِلْمِیَّۃِ. اٰمِیْنَ! اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو عام طور پر اور ہم جماعت خدام کو خاص طور پر فیوض قدسیہ اور علوم علمیہ سے نفع بخشے۔)

اب بحمد اللہ مضمون ہر پہلو سے بیان ہو چکا۔ احکام عشر بھی بیان ہو گئے اور تفسیر آیت بھی بیان ہو گئی اس لئے ختم کرتا ہوں۔ دعا کیجئے حق تعالےٰ ہم کو فہم سلیم اور توفیق عمل عطا فرمائے۔ آمین!

وَصَلَّى اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ صَفْوَۃِ الْاَنَامِ حَبِیْبِ رَبِّہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَسَلَّمَ اَجْمَعِیْنَ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

HINDUSTANI LIBRARY
Estd. 19??
ہندستانی لائبریری
Garden Reach, Calcutta